سلمان سلیم 03067163117
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
سلمان سلیم 03067163117
ستمبر 2022
قیمت 150 روپے
بانی
معراج رسول

لسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

پ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسیج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈمن سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفیکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈمن سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسیج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

جلد 51 • شمارہ 09 ستمبر 2022 • زرِ سالانہ 2000 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 150 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

سنہری یادوں کا سفر

یادیں سدا انسان کے ساتھ رہتی ہیں چاہے وہ خوشگوار ہوں یا
ناخوشگوار...... کبھی یہ دل میں کسک جگاتی ہیں تو کبھی امید کی کرنیں
پھیلاتی ہیں...... ایسی ہی خوب صورت باتوں اور حسین یادوں کا
ایک سفر آج سے تقریباً پچاس سال پہلے

گھر کے ہر فرد کے لئے
ماہنامہ پاکیزہ کراچی

کی صورت شروع ہوا۔ پاپولر ادب کی دنیا میں ایک قندیل روشن ہوئی جو دست بدست چلتی نکھرے اور معطر اجالوں کی پیامبر بنی...... بقول حبیب جالب

اسے بجھا نہ سکے گی ہوا زمانے کی
جلا چلے ہیں لہو سے جو ہم چراغ سحر

الحمدللہ ہم اب گولڈن جوبلی کی طرف گامزن ہیں

انہی سنہری یادوں میں آپ کا بھی روپہلا اور سنہرا خوب صورت سا حصہ کتنا ہے؟ ہمیں بھی بتائیں...... یہ سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین ہی کے لیے تو ہے۔

1...... ماہنامہ پاکیزہ سے پہلا تعارف......؟

2...... پاکیزہ تحریروں سے کوئی تین ایسی باتیں کیا سیکھیں جو آج بھی زندگی کا حصہ ہیں......؟

3...... سینئر یا دور حاضر کے پسندیدہ قلم کار کہ جن کی تحریریں پڑھنے کو آج بھی بے چین رہتی ہیں......؟

4...... کوئی فرمائشی سلسلہ ہے تو ضرور بتائیں۔

مژدہ

جون ایلیا

ہم جو کھنکھناتی ہوئی مٹی سے بنائے گئے، ہم جو خاک کے خمیر سے اٹھائے گئے اور ہم جو خاک میں ہی سلائے جائیں گے۔ ہم فتنہ و فساد کے زمانے میں زندہ ہیں اور دہشتوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا ہے۔ سو ہم پر لازم آیا کہ ہم اپنے اپنے حجروں سے باہر آئیں اور مرنے والوں اور مارنے والوں کو اس المناک حقیقت سے آگاہ کریں کہ زندگی مارنے والوں اور مارے جانے والوں، دونوں ہی سے سوتیلی ماؤں کا سا سلوک کرتی ہے۔ کسی کو ریشم و کمخواب کے بستر پر سلاتی ہے اور کسی کو بچھانے کے لیے گدڑی بھی نصیب نہیں ہوتی لیکن موت سب ہی کو ایک نظر سے دیکھتی ہے، سب کو اپنی چھاتی میں سمیٹ لیتی ہے اور سب کو ایک ہی طور خاک میں ملاتی ہے۔

وہ جو زمین پر بہت اینڈ کر چلتے ہیں، ان کے لیے کسی بھی میدان سے، کسی بھی کھیت یا کھلیان سے ایک مٹھی مٹی اٹھائی جائے اور پھر دل و دماغ کی آنکھوں کے چراغوں کی روشنی میں اُسے دیکھا جائے تو اس میں اب سے لاکھوں برس، ہزاروں اور سیکڑوں برس پہلے گزر جانے والے ہمارے اجداد کے بدن کے ریزے نظر آئیں گے۔ کسی ظالم کے سرِ پرغرور کا ایک ذرّہ، کسی مظلوم کے چیرے ہوئے جگر کا ایک ریشہ اور کسی مقتول کی کتری جانے والی انگلیاں اس مٹھی بھر مٹی میں گھل گئی ہوں گی۔ اس کے کسی ذرّے سے کسی نیک نفس اور برگزیدہ انسان کی خوشبو آ رہی ہوگی اور کسی ذرّے سے خبثِ باطن کی سڑاند اٹھ رہی ہوگی۔

لیکن جون ایلیا، تم جو ایک مٹھی مٹی لیے بیٹھے ہو اور اس میں گزشتگاں کی جھلکیاں دیکھ رہے ہو تو تم ان جھلکیوں کو دیکھ کر کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا سیکھنا اور کیا سکھانا چاہتے ہو؟

میرے بھائی، میرے دوست، میں گویائی سے محروم ہوں اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا اور میں نے تو ابھی زندگی کے مکتب سے کچھ بھی نہیں سیکھا تو میں تمھیں یا کسی کو بھلا کیا سکھاؤں گا۔ میں یہ مٹھی بھر مٹی اپنے حکمرانوں کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ انہیں اپنے بارے میں اور اپنے ایسے کروڑوں کے بارے میں بتاؤں، ان بستیوں کی گلیاں دکھاؤں جن کے نصیب ہمیشہ تیرہ و تار رہے، جن کے مقدر میں کبھی سکھ کی گھڑیاں نہیں لکھی گئیں۔

میرے بھائی، انہیں بتایا جائے کہ یہاں حکمرانوں نے محض تجربے کیے، زیادہ مطلق العنانی کے، زیادہ فرعونیت کے تجربے۔ ہمارے یہاں عوام کے نام پر آنے والوں نے سب سے پہلے عوام کا ہی ٹیٹوا چبایا۔

اس بستی کے معصوم و مظلوم رہنے والوں کے سینے میں امید کے دریا لہراتے ہیں۔ وہ ہر آنے والے کا دامن بہت دردمندی سے، بہت خوش امیدی سے تھامتے ہیں اور ہر مرتبہ دھتکارے جاتے ہیں۔

ایک بار پھر لوگوں کو مژدہ سنایا جا رہا ہے، ایک ایسے بندوبست کی نوید دی جا رہی ہے جہاں پسے ہوئے اور کچلے ہوئے لوگوں کو عزت کی روٹی مل سکے گی، جہاں مظلوموں کو انصاف فراہم ہو سکے گا، جہاں رشوت ستانی اور بدعنوانی کا کوئی گزر نہ ہوگا۔

یہ تمام اچھے جملے، یہ سارے خوب صورت خواب، اس سے پہلے بھی یہاں کے لوگوں کو دکھائے گئے ہیں، اس سے پہلے بھی یہی کہا گیا ہے کہ یہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہیں گی اور یہاں رہنے والوں کی عزتِ نفس کا احترام کیا جائے گا۔

یہاں کے لوگوں نے پہلے بھی ان وعدوں پر اعتبار کیا تھا، یہاں کے لوگ ایک بار پھر نئے وعدوں پر اعتبار کرتے ہیں۔ انہوں نے اس مژدے کو اس امید کے ساتھ سنا ہے کہ یہ وعدے، وعدۂ فردا نہیں ہوں گے۔ وہ اس آس میں ہیں کہ انہیں ایک بار پھر نراس نہیں کیا جائے گا۔

مژدہ سنانے والوں نے بستیوں کو تراشنے کی ذمے داری اپنے سر لی ہے۔ اس دور میں کارِ فرہادی کا دعویٰ یقیناً ایک بڑا دعویٰ ہے۔ یہ دعویٰ جنھوں نے کیا وہ اس پر پورے اتریں اور کروڑوں کے سامنے سرخرو ہوں کہ یہی سب سے بڑی نیکی ہے۔

☆☆☆

عزیزانِ من
السلام علیکم!

ستمبر 2022ء کا سسپنس آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ گزشتہ دنوں شدید بارشوں کے سبب ملک کا بیشتر حصہ سیلابی ریلوں کی زد میں رہا۔ بہت سے لوگ گھر سے بے گھر ہوئے...... ویسے عام دنوں میں بجلی ندارد...... مگر بارشوں میں کئی مقام پر بے احتیاطی کی وجہ سے کئی لوگ کرنٹ لگنے سے جان کی بازی ہار گئے...... اس کے علاوہ متعلقہ محکموں کی ناقص کارکردگی نے سب دعووں اور وعدوں کا پردہ چاک کردیا۔ اخراجات کی مد میں لگنے والا پیسا منتخب نمائندوں کے پاس عوام کی امانت ہے جس سے عوام فائدہ اٹھانے کے بجائے بدقسمتی سے ہمیشہ محروم ہی رہتے ہیں...... بارش جہاں اللہ کی رحمت ہے...... وہاں کسی بھی سبب سے ایسے دل دہلا دینے والے حادثات خوفزدہ کردیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تمام حادثات و سانحات سے ہمیشہ محفوظ رکھے (آمین)۔ نئے اسلامی سال کا آغاز محرم الحرام کے مہینے سے ہو چکا ہے جو ہمیشہ اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ حق کی راہ میں سر کٹانے والے لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب حضرت محمد ﷺ کے نزدیک کتنے بلند مرتبے پر فائز ہیں۔ جن کے واسطے سے مانگی جانے والی دعائیں بھی اللہ رد نہیں کرتا۔ حضرت امام حسینؓ کی یہ عظیم اور لازوال قربانی ہمارے لیے عزم و استقلال اور ہدایت کا ذریعہ ہے۔ ماہ ستمبر کی تاریخیں 6 ستمبر یوم دفاع اور 7 ستمبر یوم فضائیہ کے حوالے سے ہمیشہ یادگار دنوں کے طور پر منائی جاتی رہی ہیں...... لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں عوام کی بہبود بھی تو حکومت کا ہی فرض ہے...... مگر ایوانوں میں بیٹھے ہمارے ہمدرد وزرا صرف الیکشن کے زمانے میں ہی عوام کی محبت میں مالا جپتے ہیں اور ایسے ایسے مسائل اور دکھوں کا ذکر بڑے غمزدہ انداز میں کرتے ہیں کہ سب دم بخود رہ جاتے ہیں! اور ہر پل عوام کو احساس دلاتے ہیں کہ وہ انہیں کبھی کسی مشکل گھڑی میں تنہا نہ چھوڑیں گے مگر...... افسوس صد افسوس، آزمائش کی گھڑیوں میں قوم خود کو کتنا بے بس و مجبور محسوس کرتی ہے، اس کا اندازہ سہولتوں سے فیض یاب ہونے والا طبقہ کر ہی نہیں سکتا۔ کاش اللہ تعالیٰ اس طبقے کو عقلِ سلیم اور دردمند دل سے نواز دے تاکہ پاکستانی عوام خود کو بھی معتبر اور مضبوط خیال کریں۔ چلیں جی، شاید کبھی نہ کبھی تو یہ دعائیں قبول ہو ہی جائیں گی...... اب ذرا چلتے ہیں خطوط کی محفل کی جانب اور اپنے دوستوں کے کچھ حال احوال کی خبر لیتے ہیں۔

✠ **محمد آذین رضوان، کورنگی کراچی** سے خراماں خراماں چلے آرہے ہیں۔ ''اگست 2022ء کا شمارہ سامنے رکھا ہے۔ ٹائٹل بہت خوبصورت لگ رہا ہے جس پر جشنِ آزادی مبارک لکھا جگمگا رہا ہے۔ اللہ کرے یہ جگمگاہٹ یونہی ہمیشہ قائم رہے اور میرا وطن ہمارے گمان سے زیادہ ترقی کرے اور سب سے بہترین دعا کہ اس ملک کے عوام کو بھی اللہ تعالیٰ خوشحالی اور سکون عطا فرمائے اور خدا غارت کردے اس مہنگائی کو۔ کاش مہنگائی کا کوئی وجود ہوتا اور اس پر بم گر جاتا۔ خیر جی، یہ تو جلے دل کی بات تھی۔ ملکی حالات اور قوم کی حالت دیکھ کر ہر محبِ وطن پاکستانی کا دل ایسے ہی جلتا ہوگا جہاں ہر شخص بے چین اور غیر یقینی صورتِ حال کا شکار ہے۔ اللہ پاک ہم سب کی حالت پر اپنا خاص کرم فرمائے (الٰہی آمین)۔ سب سے پہلے تو ہم نے اپنے پسندیدہ اوراق کا مطالعہ کیا یعنی آخری صفحات...... واہ صاحب کیا خوب لطف اندوز ہوئے۔ ''کاروباری چال'' میں طاہر جاوید مغل کی تحریر کا کمال پڑھ کر...... یہ درست ہے، جس طرح دعائیں اپنے حصار میں لے لیتی ہیں، اسی طرح بددعا بھی ایک نادیدہ جال میں قید کرلیتی ہے اور جب تک توبہ نہ ہو تب تک ساری تدبیریں ہی الٹی ہوتی ہیں۔ تاریخی صفحات پر زویا صفوان کی تحریر اپنے تسلسل میں جاری نظر آئی۔ وہ لوگ واقعی سمندر کے عقاب تھے جو ہمیشہ ناانصافی کے خلاف نبرد آزما رہے اور ان کے حصے میں بھی ویسی ہی مشکلات آتی رہیں جو ان رستوں کے مسافروں کے حصے میں آتی رہتی ہیں۔ بہت خوب زویا صفوان صاحبہ۔ ناہید سلطانہ کی تحریر ''ناموس'' نے تو دل موہ لیا۔ کیسی عبرت اثر کہانی تھی۔ دو بہنیں اور دونوں کی قسمت کے

ساتھ ساتھ عادتیں اور فطرتیں بھی کس قدر متضاد تھیں۔ یاسمین نے جیسا کیا، اس کے ساتھ اس سے بھی بُرا ہوتا تو کم تھا۔ لالچ اور ہوس انسان کو ایسے ہی مقام پر لاکر مارتی ہے جہاں سوائے اندھیروں کے اس کے پاس کچھ باقی نہ رہتا۔ ''جنگ باز'' کے تو کیا ہی کہنے۔ کیسی روانی اور واقعات کی فراوانی نے کہانی کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ایک معمولی انسان کی زندگی میں غیر معمولی حادثات نے اسے کتنا خاص بنا دیا تھا۔ ''امیدِ صبحِ جمال'' پڑھ کر بھی لطف آ گیا۔ عیوق بخاری کے قلم کو بھی اب دھار لگتی جا رہی ہے۔ کیسا خوبصورت جذبات کا اظہار ہے۔ ملک سے محبت اس کو کہتے ہیں۔ محمد عباس ثاقب کی تحریر ''کامیابی کی کلید'' نے بھی کافی متاثر کیا۔ مختصر مگر پُراثر تحریر تھی۔ کسی بھی کام کو کرنے کے کچھ اصول اور وجہ تو ہونا چاہیے تب ہی تو رستوں کا تعین ہوتا ہے۔ محفل شعروسخن نے بھی مزہ دوبالا کر دیا۔ ہلکے اور دل کو چھو لینے والے اشعار محفل کی رونق بڑھا دیتے ہیں۔ فاطمہ حسام کی ترجمہ کہانی نے بھی دل خوش کر دیا۔ کمال ہے، موت اس طرح بھی واقع ہو سکتی ہے۔ جو چیز زندگی جینے کی طاقت بڑھا دیتی ہے اس کی نقل موت کو دعوت کتنی آسانی سے دے سکتی ہے، پڑھ کر حیران رہ گئے۔ اس وقت عائشہ نصیر نے بہت جلد سسپنس کے قارئین کے دلوں میں جگہ بنالی ہے۔ بہت خوبصورتی سے مغربی ماحول کی کہانیاں لکھ رہی ہیں، ویلڈن۔ ''کنٹری ہاؤس'' نے بھی اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ ''شہ زور'' کی بات نہ کرنا حق تلفی ہوگی۔ اسما قادری کے قلم سے کون واقف نہیں ہے۔ ہر بار آخر میں باقی واقعات اگلے ماہ پڑھ کر مزہ کرکرا ہو جاتا ہے اور یہی اس داستان کی کامیابی ہے کہ قسط ختم کرتے ہی اگلی قسط کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ سونیا میڈم اور معاذ کے درمیان کہانی کیا رخ اختیار کرتی ہے۔ ''قصہ مختصر'' نے مرزا امجد بیگ کی اہمیت اور بڑھا دی ہے۔ ہر بار ایک سے بڑھ کر ایک قصہ لے کر آتے ہیں اور گویا چھا جاتے ہیں...... اور قصہ مختصر یہ کہ اس بار اگست کا سسپنس واقعی لاجواب رہا۔ ہر کہانی نے دل خوش کیا۔ ہر مصنف نے قارئین کا حق بہ خوبی ادا کیا۔''

✠ عکاشہ سجاد کی تعریف احسان پور سے۔ ''کیا بات ہے جی، آج کل سرورق تو بہت ہی اعلیٰ چھپ رہے ہیں سسپنس کے۔ اس دفعہ کا سرورق بھی نظروں کو بہت بھایا۔ فہرست پر ہلکی سی نظر ڈال کر انشائیہ کی طرف کھسکے جہاں جون انکل حکمت سکھاتے پائے گئے۔ محفل میں وارد ہونے پر مایوسی ہوئی۔ اب مبصرین حضرات کی وہ پہلے جیسی چہکار اور نوک جھونک برقرار نہیں رہی۔ شاید مہنگائی نے چہکنے والوں پر بھی ٹیکس لگا دیا ہے۔ بہرحال روبینہ اشعر کا تبصرہ اچھا لگا۔ ''کامیابی کی کلید'' ایک اچھا ترجمہ تھا۔ جرم کرنے کے لیے بھی عقل چاہیے ہوتی ہے۔ جان کو جان سے مارنے پر وہ اپنی جان عذاب میں ڈال بیٹھی اور جو کام بلا نیچے نہ کر سکی وہ اس کی اپنی عقل نے کھسیا کر، کر دکھایا۔ ''اصحاب الرس'' پڑھی۔ جہالت کی گہری نیند سے جگانے پر جہلا غصہ ہی کرتے آئے ہیں اور پھر یوں ہوا کہ خدا کی نشانی کو مار گرایا گیا۔ ضیا تسنیم اچھا کام کر رہی ہیں۔ بھٹی صاحب بے شک اعلیٰ لکھاری ہیں مگر میرا خیال ہے ''جنگ باز'' سے گزارہ کیا جا سکتا ہے۔ باقی ''شہ زور'' اور ''عقابِ آب'' بیچ میں چھوڑ دی تھیں۔ مکمل ہونے پر ہی تبصرہ ہوگا۔ مغل صاحب کی ''کاروباری چال'' میں لالچی باپ کی لالچ اسے لے ڈوبی۔ شہزاد کی حماقتیں اور مار کو جیسے مخلص یار کا رول بس ٹھیک ہی تھا۔ کہیں کہیں احساس ہوا جیسے کوئی کارٹون پڑھ رہا ہوں۔ بہرحال مغل صاحب کی مزاحیہ کہانی گزارے کے قابل تھی۔ میرا خیال ہے ڈائجسٹ کی قیمت دو سو روپے کر دینی چاہیے۔ پیٹرول کے مہنگا ہونے پر بھی سیاحت کے شائقین نے قدرتی حسن سے محظوظ ہونا ترک نہیں کیا۔ اسی طرح مہنگائی جتنی بھی بڑھ جائے، ہم جیسے لوگ ڈائجسٹ ضرور خریدیں گے۔''

✠ لاہور سے سید شاہد ندیم پہلی مرتبہ شریکِ بزم ہیں۔ ''بڑی بے تابی سے اگست کا سسپنس بک اسٹال سے لے کر گھر پہنچا اور فوراً ہی مطالعہ شروع کر دیا۔ سب سے پہلے معمول کے مطابق تاریخ کے جھروکوں میں گم ہو کر رہ گیا۔ واہ ''عقابِ آب'' واقعی ایک بے مثال تاریخی سلسلہ ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کے بعد میں ہمیشہ آخری کہانی پڑھتا ہوں۔ طاہر جاوید مغل تو میرے پسندیدہ ترین رائٹر ہیں۔ کہانی پڑھنا شروع کی تو ان کے دلکش اور تاثر انگیز اندازِ تحریر میں گم ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے کہانی میں جو مزاح کا تڑکا لگایا تھا، اس نے بار بار ہنسنے اور مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ غرضیکہ یہ کہانی پڑھ کر سیروں خون بڑھ گیا۔ اچھوتا اور نیا موضوع تھا۔ انہوں نے حق ادا کر دیا۔ اللہ انہیں عمر دراز عطا فرمائے اور وہ سدا اسی طرح ہمیشہ یادگار کہانیاں لکھتے رہیں، آمین۔ اس کے بعد ''شہ زور'' سے پنجہ آزمائی شروع کی۔ دانتوں تلے پسینا آ گیا۔ خوب، بہت خوب۔ کہانی اپنے عروج پر ہے۔ پھر حسام بٹ صاحب سے دو دو ہاتھ کیے۔ ان کی کہانی ''قصہ مختصر'' گو کہ مختصر بالکل نہیں تھی۔ ان کے اندازِ تحریر میں ڈوب کر رہ گیا۔

مرزا امجد بیگ نے کیس کو اپنی فنی مہارت اور ذہانت سے خوب پایۂ انجام کو پہنچایا۔ ''جنگ باز'' بھی فل ایکشن میں ہے اور ہر ماہ اختتام نئے سسپنس اور خطرناک موڑ پر ہوتا ہے۔ چھوٹی کہانیوں میں ''امیدِ صبح جمال'' یوم پاکستان کے موضوع پر اچھی تحریر تھی۔ ''معما موت'' نے بھی بہت متاثر کیا۔ تصوف نے ایمان تازہ کر دیا۔ ناہید سلطانہ اختر کی ''ناموس'' بھی بڑی تاثر انگیز تحریر تھی۔ کامیابی کی کلید اور کنٹری ہاؤس نے بھی متاثر کیا۔''

✠ روبینہ اشعر کا خط کراچی سے۔ ''ملک بھر میں ہونے والی مسلسل بارشوں نے ملک میں جو تباہی مچائی ہے اس کو دیکھ کر دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ خاص طور پر بلوچستان کی صورت حال دیکھ کر تو دل غم سے بھر گیا۔ معمول سے زیادہ بارشوں کی پیش گوئی کے باوجود کوئی پلان تیار نہیں کیا گیا اور عوام کو بے رحمی سے سیلاب کے سپرد کر دیا گیا۔ بڑے شہروں میں بھی برساتی پانی کی یہی صورت حال رہی اور غریب بستیوں کے ساتھ ساتھ پوش علاقے بھی پانی میں ڈوب گئے۔ بارش کے پہلے قطرے کے ساتھ ہی حکمرانوں کی کارکردگی بھی بارش کی نذر ہو گئی۔ اللہ پاک رحم فرمائے اور بارشوں کو ملک اور عوام کے لیے رحمت والا کر دے، آمین۔ اداس دل کے ساتھ چلتے ہیں اپنے سسپنس کی جانب۔ ماہِ اگست کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ سرورق قابل دید تھا۔ جون ایلیا کے پُرمغز انشائیے سے مستفید ہوتے ہوئے خطوط کی محفل میں پہنچے۔ اپنی حاضری دیکھ کر دلی سکون محسوس ہوا لیکن کچھ پرانے احباب کی کمی محسوس ہوئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ناہید سلطانہ اختر کی ''ناموس'' پڑھی۔ یہ بات دُرست ہے کہ ببول بو کر کبھی گلاب حصے میں نہیں آسکتے۔ بے وفائی سے جنم لینے والے حزن و ملال اور حسرتوں کا عبرت اثر احوال پڑھ کر بے اختیار ناہید سلطانہ اختر کو داد دینے کو دل چاہا۔ ویلڈن۔ دیارِ غیر میں دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیلنے والے ایک حساس مسافر کی روداد، عیوق بخاری کی ''امیدِ صبح جمال'' میں پڑھنے کو ملی۔ اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو کی قدر دیارِ غیر میں بسنے والوں کو پتا ہے۔ ابرار بھی وطن کی مٹی کی خوشبو کا اسیر ہو چکا تھا جس سے دوری کا درد وہ برداشت نہ کر سکا۔ مرزا امجد بیگ کی ''قصہ مختصر'' لالچ اور اس کے بُرے انجام پر مبنی تحریر زبردست رہی۔ جب انسان اچھے اور پُرسکون حالات میں سانس لے رہا ہو تو اسے مزید عیش و عشرت کی طلب یونہی خوار کر دیتی ہے۔ ماضی میں کاروبار اور زیادہ نفع کے نام پر دغاباز گروہوں نے عوام کو خوب لوٹا اور ان کی عمر بھر کی کمائی اور جمع پونجی سے محروم کر دیا۔ بہرحال بیگ صاحب کی کڑی جرح کے باعث مجرم اپنے انجام کو پہنچے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''جنگ باز'' میں نئے موڑ آرہے ہیں اور سسپنس سے بھرپور واقعات پڑھنے کو مل رہے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ سہراب کی مشکلات کب ختم ہوتی ہیں۔ کہانی اچھی جا رہی ہے۔ امید ہے آگے جا کر مزید سسپنس پیدا ہوگا۔ محبت کے بھید میں چھپی لالچ و طمع اور ہوس کے ہاتھوں قتل کا قصہ فاطمہ حسام کی کہانی ''معما موت'' میں پڑھنے کو ملا۔ کہانی اچھی رہی۔ عائشہ نصیر کی ''کنٹری ہاؤس'' بھی ٹھیک ہی رہی۔ محمد عباس ثاقب کی ''کامیابی کی کلید'' اچھی کہانی تھی۔ پسند آئی۔ طاہر جاوید مغل کی ''کاروباری چال'' بہترین کہانی رہی۔ ویلڈن۔ زویا صفوان کی تاریخی کہانی ''عقابِ آب'' بہت اچھی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کو ان کی اپنی صفوں کے اندر چھپے غداروں سے ہی نقصان پہنچا ہے۔ اتنی معلوماتی اور بہترین تحریر لکھنے پر زویا جی کو ڈھیروں مبارک باد۔ ضیاء تسنیم بلگرامی کی ایمان افروز تحریر بھی شاندار رہی۔ محفل شعر و سخن میں اشعار کا انتخاب خوب رہا۔''

✠ انجم فاروق ساحلی، لاہور سے چلے آرہے ہیں۔ ''امید ہے آپ اور ادارے کے دیگر احباب بخیر و عافیت ہوں گے۔ اس بار سسپنس کا ٹائٹل جاذبِ نظر ہے۔ انشائیہ سلامتی کی راہ کا آغاز خوبصورت اور دعوتِ فکر سے بھرپور ہے۔ ''معما موت'' طوالت بے جا کا شکار، دلچسپ معلوم نہیں ہوئی۔ ''کامیابی کی کلید'' تجسس اور ارتکاز سے بھرپور تحریر ہے۔ ''کنٹری ہاؤس'' متاثر نہ کر سکی۔ ''کاروباری چال'' خوب ہے۔ عقابِ آب، ناموس اور امیدِ صبح جمال اچھی رہیں۔ ''جنگ باز'' میں نادو کی جرأت اور دلیری متاثر کن تھی۔ چھوٹے چھوٹے جملوں سے الفاظ کا استعمال اچھا ہوا۔ ''اصحاب الرس'' ایمانیات کے حوالے سے بہترین تحریر ہے۔ ''شہ زور'' زور آوری سے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اگست 2022ء کے سسپنس کی ادارتی گفتگو اور خصوصی نوٹ دیکھ لیا گیا ہے۔ مہنگائی بے حد بڑھ چکی ہے۔ اگر سسپنس کی قیمت بڑھانا ناگزیر ہو تو بڑھا کر روایتی شان اور اہتمام سے شائع کیا جائے۔ ملک سیاسی و معاشی بحران سے دوچار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے (بہت شکریہ، تبصرہ سسپنس سے دیرینہ وابستگی کا ثبوت ہے)۔''

✠ ملک وحید، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ''اگست کا شمارہ وقت سے پہلے مل گیا۔ ٹائٹل بہت خوبصورت تھا۔ جون ایلیا کا

انشائیہ حسب توقع شاندار رہا۔ کہانیوں میں سسپنس کی سب سے بہترین کہانی زویا صفوان کی ''عقاب آب'' پڑھی۔ کہانی بہت اچھی چل رہی ہے اور تاریخ سے آگاہی ہو رہی ہے۔ زویا صفوان کے قلم کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے، ویلڈن۔ عیوق بخاری کی ''امید صبح جمال'' بھی اچھی رہی۔ فاطمہ حسام کی ''معما موت'' کچھ خاص نہیں لگی۔ ناہید سلطانہ اختر حسب معمول ایک شاندار کہانی ''ناموس'' کے ساتھ حاضر تھیں۔ بہت عمدہ کہانی تھی ویلڈن۔ غائشہ نصیر کی ''کنٹری ہاؤس'' کچھ خاص نہیں لگی۔ محمد عباس ثاقب کی ''کامیابی کی کلید'' اچھی کہانی تھی، پسند آئی۔ طاہر جاوید مغل کی ''کاروباری چال'' بہترین کہانی تھی۔ مرزا امجد بیگ کی ''قصہ مختصر'' جرم وسزا اور کڑی جرح کے درمیان جکڑی ہوئی ایک بہترین کہانی تھی۔ محفل شعر وسخن اشعار کے بہترین انتخاب کے ساتھ زبردست رہی۔''

✠ محمد خواجہ، کورنگی کراچی سے گزشتہ شمارے پر دلچسپ تبصرہ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ ''جون کا شمارہ بروقت موصول ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ شدید گرمی اور شدید بجلی کا بحران، سیاسی ابتری عروج پر، تو چور تو وہ چور۔ اب کہانی نہیں بلکہ سب سامنے ہے۔ لگتا ہے کوئی بھی چور نہیں یا سب چور ہیں۔ پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی، اب کسی بات پر نہیں آتی...... روز خبر ملتی ہے مہنگائی بڑھے گی۔ بس پیٹرول کی قیمت بڑھنے کی دیر ہے۔ سرورق خوبصورت، بہترین رنگ آمیزی کے ساتھ انشائیہ ہمیشہ کی طرح پُرمغز اور جھنجوڑنے والا۔ صرف آخری پیرا بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ دوستوں کی محفل میں اسلام آباد سے ناہید یوسف سرفہرست ہیں۔ مجھ ناچیز کو بھی یاد کیا، شکریہ۔ ملک وحید اور ریاض بٹ کے تبصرے بہت بھرپور انداز میں لکھے گئے۔ عید آ کر چلی گئی، خوشیاں کم اور مہنگائی کی دہشت زیادہ رہی۔ اخراجات تباہ کن، کیا روکیں، کس پر قابو پائیں۔ ہر چیز ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے۔ ''اسیر نفس'' پہلی پسندیدہ کہانی پڑھی۔ بہت دلچسپ، خاندانی نفسانفسی، لالچ، دغا بازی پھر چالاکی، مجرمانہ سرگرمی، بھائی بھائی کا گلا کاٹ گیا۔ امجد بیگ کی ذہانت نے آخر پردہ فاش کر ہی دیا۔ ساری چال الٹ کر رکھ دی۔ ''جنگ باز'' کی چوتھی قسط۔ یہ کہانی ایک غریب بستی سے نکل کر بڑی تیزی سے اردگرد پر محیط ہو رہی ہے۔ ہنگامہ خیزی، ماحول کی عکس بندی نے دلچسپی کو بڑھا دیا ہے۔ حالات خطرناک رخ بدلتے جا رہے ہیں۔ ''اصحاب الرس'' کنوئیں والے۔ مذہبی تاریخ پر ایک اچھا معلوماتی اور نصیحت آمیز مضمون۔ ''بھید بھری'' اللہ نے ہر انسان میں کچھ قدرتی صلاحیتیں رکھی ہیں جس سے کچھ لوگ خلق خدا کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ ایک فن آئینہ بینی ہے۔ آئینہ بینی ایک سائیکولوجی ہے۔ عشق وحسد کی آگ اور بھی چالاکی کے ساتھ قتل جس کا سراغ عملی طور پر لگانا ممکن نہ ہوسکا لیکن لڑکی کی سائیکولوجی کی طاقت نے گزرے ہوئے ماضی کے جرم کا پتا لگا ہی لیا اور اصل مجرم سے جرم قبول کروالیا۔ اچھی کہانی ہے۔ ''بے سمت مسافر'' انتہائی اچھی گھریلو کہانی۔ زندگی عجیب فلسفہ ہے۔ سب کو چاند نصیب نہیں ہوتا۔ آئیڈیل ملنا مشکل ہے۔ خدا کی رضا پر قائم رہنا اور آئیڈیل خود تعمیر کرنا ہی کامیابی ہے۔ ہزاروں رشتے برداشت اور تسلیم ورضا سے کامیاب ہو رہے ہیں مگر کچھ ناسمجھ اپنی گھریلو زندگی تباہ کر بیٹھتے ہیں۔ ایسی ہی کہانی ہے۔ جب سمجھ آجاتی ہے تو سب کچھ اچھا ہو جاتا ہے۔ اس میں مرد کی اعلیٰ ظرفی دکھائی گئی ہے۔ اس کہانی سے سب مرد وزن کو سبق سیکھنا چاہیے۔ ''گیبریلا'' ڈاکٹر شیر شاہ اس دفعہ اپنے ماحول سے نکل کر یورپ کی جانب پیش قدمی کر بیٹھے۔ بڑی تیکھی تحریر لکھی۔ مغرب کی تہذیب ہمیشہ بے راہ روی پر منحصر ہوتی ہے۔ بہت مہذب معاشرہ نہیں۔ اپنی تہذیب، مذہب اور خاندانی وابستگی کو ڈھونڈنے والے اس تہذیب میں شامل نہیں ہوسکتے۔ عورت کی کشش قدرتی طور پر ہر مرد کو متاثر کرتی ہے۔ اس نے گیبریلا کو اپنے فلسفے کے تحت سمجھایا۔ وہ پُرسکون بھی ہوگئی لیکن یہ کس طرح ممکن ہوسکتا تھا کہ عورت اپنی محبت اور ایثار لٹادے مگر وہ مرد ہو کر ''گے'' ہم جنس پرست...... ناممکن۔ غیر فطری حالات میں ساتھ رہنا۔ ''منافق زدہ'' مصنف نے اچھی کہانی لکھی۔ وہی دولت کی ہوس، منافقانہ چالیں لیکن قدرت کو جو کرنا ہے، وہ کرتی ہے۔ کتنی ہوس، چالاکی سے کئی مل کر جال بنتے ہیں، سب کا سب دھرا رہ جاتا ہے۔ اس دفعہ کے شمارے میں کہانیوں کا عمدہ انتخاب کیا گیا ہے۔ اشعار کی محفل بھی ہے لیکن کچھ کم مزہ آیا۔ کوئی عمدہ انتخاب نظر نہیں آیا۔ ہمارے ایریا مارکیٹ کا پوسٹ آفس اکثر خط گم کر دیتا ہے اس لیے دور جا کر خط پوسٹ کرنا پڑ رہا ہے (یہی تو محبت کا ثبوت ہے۔ اللہ آپ کا سسپنس کے ساتھ رشتہ قائم رکھے)''

اب ان قارئین کے نام جن کے خطوط محفل میں شائع نہیں ہوسکے۔

محمد اکرم، جہلم۔ عبدالباری، کراچی۔ حسنین میمن، حیدر آباد۔ ہاشم رضا چانڈیو، شہداد پور۔ سلار خان، سلام آباد۔ میاں قمر شہزاد، لاہور۔ محمد ریاض انصاری، ملکوال (رکن)۔ خاور اختر، ملتان۔

پانچواں اور آخری حصہ

عقابِ آب

زویا صفوان

عہد کوئی بھی ہو... جب جب طاقت اور گھمنڈ کی بساط بچھی... تو ظلم سے نجات کے لیے نچلی سطح سے بغاوت نے جنم لیا اور پھر بڑی بڑی سازشوں کے پردے چاک ہوتے چلے گئے... کہ یہی دستور ہے دنیا کا اور موسم کے بدلاؤ میں بھی یہی سبق پوشیدہ ہے۔ یہ اور بات کہ انسان سمجھ کر بھی نظر انداز کرے مگر... اس دور کے انسانوں نے نظر انداز کرنے کی غلطی کے بجائے نظروں میں قید کرلینے کی عقل مندی کرڈالی... لہٰذا پھر کیسے ظلم کی رسّی نہ کٹتی اور بغاوت کے پیروں تلے ظالم کیسے نہ روندے جاتے... یہی تو کمال ہے درست وقت کے درست فیصلے کرنے کا... اور انہوں نے جو فیصلہ کیا شاید اس وقت کا یہی تقاضا بھی تھا۔

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

چارلس انہی خیالات میں غرق تھا کہ جرمن فوج کا سپہ سالار اس کے پاس چلا آیا۔ وہ موجودہ حالات میں وسائل سے شدید محرومی، سامان رسد کی عدم فراہمی اور شہر کی فصیلوں سے مسلمانوں کی توپوں سے برسائے گئے گولہ بارود کے مہلک نتائج سے پریشان تھا۔ اسے ساحل سمندر سے وقتی پسپائی ہی باعزت فیصلہ محسوس ہورہی تھی۔ اس صورت میں انہیں ساحل تک پہنچنے کے لیے کم ازکم پندرہ میل کی مسافت طے کرنا تھی۔ سپہ سالار کی یہ تجویز کورٹز کو سخت ناگوار گزری۔ وہ پسپائی یا مہذب لفظوں میں جنگی حکمت عملی کے تحت واپسی کو قابلِ ہزیمت سمجھتا تھا۔ چارلس کو البتہ منجنیقیں، توپیں، خیمے اور اسی قسم کا دیگر سامان لے کر پندرہ میل کی مسافت طے کرنے میں شدید تحفظات تھے۔ راستوں کی ناہمواری، ٹیلے، گڑھے، پہاڑی گڑھے، کیچڑ، موسلا دھار بارشیں اور ان سب سے بڑھ کر مسلمانوں کے متوقع حملے، پندرہ میل کا وہ فاصلہ یقیناً مہلک بنادیتے۔

چارلس کی یہ منطق جان کر سپہ سالار زچ ہوگیا۔

''ہم نہ جانے کتنے روز سے بھوک اور پیاس کی تکلیف برداشت کررہے ہیں۔ اس صورت میں ہمارا دشمن بہ آسانی ہم پر غالب آجائے گا۔''

کورٹز نے ناگواری سے اسے دیکھا اور کہنے لگا۔

''لیکن میں نے تو اکثر فوجیوں کو گھوڑے ذبح کرکے اپنی بھوک مٹاتے دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سامان رسد کے بغیر سپاہی گھوڑوں سے اپنی بھوک مٹا سکتے ہیں۔''

''یہ خیال ذہن میں لاتے وقت اتنا بھی سوچ لیتے کہ سارے گھوڑے یونہی بھوک مٹانے کے لیے کھائے جاتے رہے تو جنگ میں کیا کریں گے؟ اگر واپسی اختیار کرنا پڑی تو ایسی صورت میں پیدل سفر کیسے طے ہوگا؟'' جرمن سپہ سالار نے جھنجلا کر اسے جواب دیا۔

چارلس نے یہ بحث ختم کرنے کے لیے سپہ سالار کو کہا۔

''تمہارے لیے فی الحال بہتر یہی ہے کہ مورچے سنبھال لو۔ سامانِ رسد کے بارے میں پھر کوئی فیصلہ کرلیا جائے گا۔''

''لیکن جناب! تاخیر کسی صورت مناسب نہیں ہے۔ اس معاملے کو فوراً بھگتانا ہوگا۔'' سپہ سالار نے عاجز آکر کہا۔

اس لمحے وہ بھی ڈوریا جیسی بے بسی اور جھنجلاہٹ محسوس کررہا تھا۔

''زبان سنبھال کر بات کر ورنہ تیرا انجام بہت برا ہوگا۔'' چارلس طیش میں آیا۔

''اس سے زیادہ برا اور کیا ہوسکتا ہے؟'' وہ نقاہت سے بولا۔

اسے یقین ہوگیا تھا کہ چارلس کی شکم سیری اور کم ظرفی اسے کبھی ان کی تکلیف واذیت کا اندازہ نہیں ہونے دے گی۔ وہ تاسف سے سر ہلاتا ہوا واپس چلا آیا۔ مسلسل فاقوں کی نقاہت سے اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ اس کے جاتے ہی ڈوریا بھی محاذ کا جائزہ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ سپاہیوں کی بُری حالت اور کسمپرسی دیکھ کر اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کیفیت میں وہ مزید ایک روز بھی وہاں مقیم رہے تو جنگ کے قابل رہیں گے نہ ہی واپسی کا سفر طے کرنے کے اہل۔

اس کے ان خدشات سے آگاہی کے بعد کورٹز کے چہرے پر حقارت جھلکنے لگی۔ وہ ایک بار پھر یہ جتانے سے باز نہ آسکا کہ ڈوریا قسمت کی یاوری یا سیاسی جوڑ توڑ سے ہی اس مقام تک پہنچا ہوگا۔ بصورتِ دیگر اس کا رویہ اور ذہنی ناپختگی کسی صورت بھی اس عہدے کی اہل نہیں ہے۔ وہ آغازِ سفر سے ہی منحوس زبان استعمال کررہا ہے۔

ڈوریا یہ سنتے ہی تاؤ میں آگیا۔ اس نے اپنے تاثرات پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے کورٹز کو نظرانداز کیا اور چارلس کی جانب متوجہ ہوکر کہنے لگا۔

''شہنشاہ معظم! میں کورٹز کے حق میں اپنے عہدے سے دستبردار ہوتا ہوں۔ ان حالات میں بہتر یہی ہے کہ یہ عہدہ کورٹز سنبھال لے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ بہتر انداز میں بھوک پیاس سے نڈھال فوج کو لڑا سکے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ خداوند کی منشا یہی ہے کہ ہم جنگ جاری نہ رکھیں۔'' چارلس نے ایک لحاتی توقف کے بعد بوجھل انداز میں کہا۔

کورٹز، چارلس کی پاسیت پر جزبز ہونے لگا تاہم وہ اس کے کسی بھی فیصلے پر انگلی اٹھانے کا مجاز نہیں تھا۔ چارلس نے فوری طور پر ساحل واپسی اور ''مصلحت اندیشانہ پسپائی'' کا حکم دے دیا۔ فوج میں بھی بلا تاخیر اس بات کا اعلان کردیا گیا۔ سپاہیوں نے سکھ کا سانس لیا۔ توپیں، منجنیقیں، خیمے اور اس نوعیت کا دوسرا سامان وہیں چھوڑ کر فوج نے محاصرہ اٹھایا اور ساحل کی جانب روانہ ہوگئے۔

ان کی روانگی بھی ایک عبرت ناک منظر تھی۔ جوتوں میں پانی بھرنے کے باعث تیز رفتاری سے سفر کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کی جانب سے مختلف اطراف سے حملوں نے یہ سفر دشوار تر کردیا۔

چارلس نے ایک بار پھر عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان حملہ آوروں پر جوابی حملے کا حکم صادر کر دیا۔ اس کے سامنے ہی واقع ایک بلند ٹیلے کو مور چابندی کے لیے منتخب کر لیا۔ اس کا گمان تھا کہ بلندی پر پانی جمع نہ ہونے کے باعث مسلمانوں پر بہتر انداز میں حملہ ہو سکے گا لیکن یہ گمان ایک بار پھر بھیانک انجام کا سبب بن گیا۔ مسلمانوں کا دفاع حملے سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوا۔ اسی دفاع میں انہوں نے چارلس کے بھوکے پیاسے نیم جان اعصابی شکستگی کا شکار سپاہیوں کا دل کھول کر قتلِ عام کیا۔ ان مقتولین میں تین سو رومی جنگجو بھی شامل تھے۔ بقیہ سپاہ بہ مشکل ساحل تک پہنچی اور نہایت اضطراب سے سامانِ رسد سے بھرے جہاز تلاش کرنے لگی۔ انہیں جہاز ملے تو سہی لیکن اس حال میں کہ ہر سو عملے کی لاشیں عبرت ناک انداز میں بکھری ہوئی تھیں۔ ان مقتولین میں تین سو رومی جنگجو بھی شامل تھے۔ اس قتلِ عام نے چارلس کو مزید اعصابی شکستگی میں مبتلا کر دیا۔ بعد ازاں مسلمانوں نے اس ٹیلے کا نام ہی ''نائٹوں کا قبرستان'' رکھ دیا۔

سامانِ رسد یہاں بھی ناپید تھا۔ اِکا دُکا جہازوں پر اناج موجود تو تھا لیکن فوج کی ضروریات کے لیے قطعی ناکافی تھا۔ سپاہ کی ہمت اب بالکل ہی جواب دے چکی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ یہ بھی درپیش تھا کہ ساحل سے مزید کہاں سفر کیا جائے؟ ان کی نظریں چارلس پر ہی مرکوز تھیں کہ وہ بارسلونا یا باب الاذن میں کسی ایک کا انتخاب کرے۔ جرمن سپہ سالار کو ہنوز ایسے عناصر بھی دکھائی دے رہے تھے جو باب الاذن لوٹنا چاہتے تھے۔ ان کے لیے ساحل تک یہ پسپائی کسی ہزیمت سے کم نہ تھی۔ سپہ سالار ان لوگوں کی عاقبت نااندیشی پر تاسف اور طیش کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا؟

چارلس کی جانب سے ہنوز خاموشی ہی طاری تھی۔ سپہ سالار کو اب اس خاموشی سے بھی خوف ہی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چارلس کے پے در پے غلط فیصلوں کا انجام بہت اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ ایک اور غلط فیصلہ شاید ان کے تابوت میں آخری کیل ہی ثابت ہوتا۔ چارلس اس کی توقعات پر پورا اترا۔ اس نے دوبارہ شروع ہو جانے والی دھواں دھار بارش اور طوفانی جھکڑوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ڈوریا کو بارسلونا سے سامانِ رسد منگوانے کا حکم دے دیا۔ وہ اس رسد کا غیر معینہ مدت تک انتظار کر لیتا لیکن ناکام واپسی کا بار اٹھانا اسے ہرگز گوارا نہیں تھا۔

کورٹز اس فیصلے پر خوشی سے جھوم اٹھا۔ اسے بھی ب نیل و مرام واپسی کسی صورت گوارا نہیں تھی۔ ڈوریا ایک بار پھر سر پیٹنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ ہر بار ایک ہی بات دہراتے اور انہیں سمجھاتے ہوئے اب تھک چکا تھا تاہم ایک آخری کوشش کے تحت کہنے لگا۔

''آپ دونوں زمینی حقائق کو کیوں نظر انداز کر رہے ہیں؟ یہ حفاظت واپسی کی قدر سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ابھی تو مسلمانوں نے صرف ایک ٹیلے کو نائٹوں کے قبرستان کا نام دیا ہے۔ یہی صورتِ حال برقرار رہی تو مجھے خدشہ ہے کہ یہ ملک اور شہر ہمارا قبرستان ثابت ہوگا۔ آپ یہ کیوں نہیں سمجھ رہے کہ اس موسم میں سامان رسد لینے کے لیے بارسلونا جانے کی ہامی کون بھرے گا؟ حسن آغا ہمارے کسی بھی جہاز کو یہاں سے نکلنے ہی نہیں دے گا۔ بالفرضِ محال وہ بھی موسم کی خرابی کا شکار ہو گئے اور کہیں رک کر موسم میں بہتری کا انتظار کرنے لگے تو مئی سے پہلے کسی صورت بھی ہم تک نہ پہنچ سکیں گے۔ اس وقت تک ہم یہاں بیٹھے آخر کیا کریں گے؟ میں خلیج ٹیمنڈ فاسٹ سے یہاں تک براستہ خشکی ہی پہنچ سکا ہوں۔ سمندری سفر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہاں آپ کے لیے دو تہائی جہاز موجود ہیں۔ ہمارے پاس یہ آخری موقع ہے۔ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے تو اپنے وجود کا آخری نشان بھی کھو بیٹھیں گے۔''

چارلس اس حقیقت پسندانہ تجزیے پر خاموش رہ گیا۔ اسے اپنا وجود انگاروں پر لوٹتا محسوس ہونے لگا۔ اس نے ایک توقف کے بعد کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں ٹیمنڈ فاسٹ پہنچنے کے لیے تیار ہوں۔ باقی ماندہ گھوڑے منگوا کر سپاہیوں کو بھی سفر کی تیاری کا حکم جاری کر دو۔'' کورٹز کی نیت ہنوز خراب تھی۔ وہ الجزائر کے علاوہ کسی شہر کی تسخیر کرنا چاہتا تھا۔ ناکام واپسی اسے سخت مضطرب کیے ہوئے تھی۔

ڈوریا اس کی سوچ اور نیت بھانپ کر فوراً آئینہ دکھاتے ہوئے کہنے لگا۔

''مزید کہیں بھی پیش قدمی کرنے کا تصور بھی کرنے سے پہلے اس سمندری عفریت کے بارے میں بھی ضرور سوچ لینا جسے دنیا خیر الدین باربروسہ کے نام سے جانتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب تک ہماری یہاں آمد اور حملے کی خبریں خیر الدین تک ہی نہیں بلکہ سلطنتِ عثمانیہ تک بھی پہنچ گئی ہوں گی۔ سلطنتِ عثمانیہ بالکل خاموش نہیں بیٹھے گی۔''

''خیر الدین اتنا بھی بہادر نہیں ہے کہ ایسے موسم میں ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آپہنچے۔'' کورٹز نے منہ بنایا۔

خیرالدین کا ذکر سنتے ہی چارلس کو اپنے وجود میں سرد لہریں سرایت کرتی محسوس ہونے لگیں۔ اسے اتنا اندازہ تو بہرصورت تھا کہ خیرالدین کے حملے کی صورت میں اس کی نقاہت زدہ اور شکستہ فوج دفاع سے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیتی۔ نتیجہ ایک اور ہزیمت کی صورت میں برآمد ہوتا۔ اس سوچ کے بعد وہاں مزید قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے جہاز ساحل پر ہی چھوڑنے کا حکم دیا اور گھوڑوں پر سفر کا آغاز کر دیا۔

ڈوریا نے چارلس کے اس فیصلے پر سکھ کا سانس لیا۔ اس وقت اسے رتی بھر اندازہ نہیں تھا کہ مالٹا سے تعلق رکھنے والے جنگجوؤں نے سامانِ رسد کے لیے اپنی ایک کشتی سسلی روانہ کی ہوئی ہے۔ ڈوریا کا دھیان فی الوقت بہ حفاظت واپسی پر ہی مرکوز تھا۔

☆☆☆

چارلس کا یہ نیا سفر ہرگز آسان ثابت نہیں ہوا تھا۔ ان بر راستے میں کئی بار حملے ہوئے جس کے نتیجے میں کئی سپاہی گرفتار بھی ہوئے۔ بربری مسلمانوں نے تو جرمنی، ہسپانوی اور اٹلی کے جنگجوؤں کو اپنا خصوصی ہدف بنایا ہوا تھا۔ ان کی وحشت نے ہزاروں جنگجو قید کیے۔

اس کے بعد ایک مقام پر پل کی عدم موجودگی کے باعث دریا عبور کرنا دشوار ہونے لگا تو چارلس نے لشکر میں موجود ماہر تعمیرات کو فوری طور پر پل تعمیر کرنے کا حکم دے دیا۔ ماہرین نے پوری جانفشانی سے تعمیر کا آغاز کر دیا۔ یہ کام ابھی نامکمل ہی تھا کہ بربری مسلمانوں نے ایک بار پھر شدت سے حملہ کر کے پل تباہ کیا اور گرفتار شدگان کو غلام بنا کر کھیپ کی صورت میں الجزائر روانہ کر دیا۔

چارلس ان پے در پے واقعات پر آپے سے باہر ہو کر کورٹز سے الجھ بیٹھا۔ اسے یہ بات طیش میں مبتلا کیے ہوئے تھی کہ بربری مسلمان جب اور جیسے دل چاہے انہیں شکست سے دوچار کر دیتے ہیں اور اس کی سپاہ مقابلہ تو درکنار دفاع میں بھی ناکام ہو جاتی ہے۔

کورٹز نے جوابی طور پر سارا ملبا سپہ سالار اور اس کی ناقص حکمتِ عملی پر ڈال دیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اگر وہ فوج کا سپہ سالار ہوتا تو مسلمان ان کی رسد لوٹنے یا انہیں ایسی کسمپرسی میں مبتلا کرنے میں قطعی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ چارلس کی شکستگی میں مزید کچھ اضافہ ہو گیا۔ کورٹز کا یہ مشورہ اس کے دل کو لگا کہ کچھ سپاہیوں کی گرفتاری سے قطع نظر اب انہیں اپنی حفاظت پر بھرپور توجہ دینی چاہیے۔

اس کشمکش میں بالآخر وہ ٹیمنڈ فاسٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تو اسی اثناء میں سسلی سے سامانِ رسد کے ایک جہاز کی آمد نے بھوکے پیاسے سپاہیوں میں جوش وجذبے کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ یہ خوشی بھی پانی کا بلبلہ ثابت ہوئی۔ جہاز کے ناخدا نے چارلس کو خبر دی کہ خیرالدین ان کا تعاقب کرتے ہوئے سامانِ رسد کی لوٹ مار کے لیے اسی جانب گامزن ہے۔ اس خبر نے چارلس کی سٹی گم کر دی۔ اس نے سپاہیوں کو فوری طور پر جہازوں میں سوار ہونے کا حکم دے دیا۔

اب ایک اور سنگین مسئلہ درپیش تھا۔ سپاہیوں کی نسبت جہازوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس کے علاوہ گھوڑوں کی حفاظت بھی ایک سوالیہ نشان تھی۔ ڈوریا اور کورٹز دونوں ہی اس صورتِ حال پر تشویش زدہ تھے۔ چارلس نے مجلسِ مشاورت طلب کی اور ان گھوڑوں کو جہاز پر لادنے کے بجائے سمندر برد کرنے کا حکم دے دیا۔ اس حکم پر وہ سب ساکت رہ گئے۔ ان کے دلوں میں یکدم ہی دکھ کی لہر اٹھی تھی۔

چارلس ان کی کیفیات سے بے خبر ایک ہی منطق پر قائم تھا کہ سواروں سے محروم گھوڑے جب ذاتی طور پر دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تو انہیں زندہ رہنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔

سپاہی اور سپہ سالار اس ظالمانہ حکم پر سراپا احتجاج ہونے کے باوجود اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ چارلس کی ہٹ دھرمی انہیں بھی سمندر برد کروا دینے پر منتج ہو سکتی ہے۔ ڈوریا نے دکھی دل سے گھوڑوں کو سمندر میں گرانا شروع کر دیا۔ سپاہیوں کی آنکھیں بھی اپنے ان دیرینہ ساتھیوں کے اس انجام پر آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

اس کام سے فراغت پاتے ہی چارلس نے بلاتاخیر سپاہیوں کو جہازوں میں مویشیوں کی طرح ٹھنسوا دیا۔ سفر کا ابھی آغاز بھی نہ ہوا تھا کہ بارش ایک بار پھر ان کے حوصلوں کا امتحان لینے چلی آئی۔ طوفان کی شدت سے جہاز بے طرح ٹکرانے لگے۔ اس نئی افتاد پر چارلس اس قدر ذہنی دباؤ میں مبتلا ہوا کہ اس نے جھنجلاتے ہوئے بلا سوچے سمجھے اپنے سر سے تاج اتارا اور سمندر میں پھینکتے ہوئے غصے سے کہنے لگا۔

"تیری عزت اسی میں ہے کہ پانی میں پڑا غوطے کھاتا رہ۔ کیا علم کہ تجھ پر کسی ایسے بادشاہ کی نظر پڑ جائے جو مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہو۔ آج ثابت ہو گیا کہ میرا سر تیرے لائق ہی نہیں۔"

کورنز اس کی حرکات اور الفاظ پر گنگ تھا۔ طوفان کے شدت اختیار کرتے ہی ایک بار پھر سفر ملتوی کر دینے کا خدشہ لاحق ہونے لگا لیکن چارلس نے سختی سے حکم جاری کر دیا کہ خلاصیوں سے کسی بھی طرح بیگار لے کر جہازوں کو قریبی بندرگاہ تک پہنچایا جائے۔

اسی اثناء میں اسے یہ خبریں بھی پہنچ رہی تھیں کہ تناؤ دہ اور باربروسہ کے خوف نے کئی سپاہیوں کو خود کو ہی سمندر برد کر دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کشمکش اور الجھنوں میں ڈوریا بالآخر جہازوں کو بوجیہ تک پہنچانے میں کامیاب ہوگیا۔ آبادی میں آتے ہی بھوک سے بے حال سپاہیوں نے لوٹ مار کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے شہر بھر کے مکانات اور اناج پر قبضہ کر لیا تھا۔ چارلس نے بھی مکمل کروفر سے اپنا شاہی خیمہ نصب کروالیا جس کے اطراف میں ڈوریا، کورٹز اور دیگر اعلیٰ عہدیداروں کے خیمے بھی موجود تھے۔

طوفان سے بپھرے سمندر سے نکل کر پُرسکون آبادی میں آنا ایک خوش کن مرحلہ تھا۔ اس کے علاوہ انہیں بوجیہ کے محلِ وقوع کے باعث باربروسہ، اندلسی عربوں یا افریقی بربری حملہ آوروں کی آمد کا خطرہ نہیں تھا۔ چارلس نے حسبِ سابق کم ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سسلی سے آنے والے جہاز کا سامانِ رسد اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ اس رسد کے حقدار اب صرف شاہی کنبہ اور اعلیٰ عسکری انتظامیہ ہی ہوتی۔ عام سپاہیوں کا اس میں بالکل کوئی حصہ نہ تھا۔

قدرے ذہنی سکون میسر آتے ہی ڈوریا کو اریون کے جاگیرزادے کاسٹرو کا خیال آیا جو گزشتہ کچھ عرصے سے اسے کہیں بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ تلاشِ بسیار کے بعد اسے کاسٹرو اس حال میں ملا کہ اس کے بدن پر صرف ایک پاجامہ تھا۔ بقیہ جسم ایک چادر سے چھپا رکھا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر ڈوریا کے دل میں کم ظرفانہ خوشی پیدا ہونے لگی۔ اسے اپنی مخالفت کرنے اور ان حالات تک پہنچا دینے کے سب ذمے داران پر ہنوز بہت تاؤ تھا۔ اس خوشی میں بہرحال باربروسہ کا خوف بھی اپنا پھن پھیلائے موجود تھا۔ اسے ملنے والی اطلاعات کے مطابق باربروسہ ڈیڑھ سو جہازوں کا بیڑا لے کر روانہ ہو چکا تھا۔

دوسری جانب چارلس کی صورت حال یہ تھی کہ اس کے پاس ایک بھی ایسا جنگی جہاز نہ تھا جس پر وہ راہِ فرار حاصل کر سکتا۔ غیر جانبداری سے دیکھا جاتا تو اندرونِ افریقا بھی کوئی پناہ گاہ موجود نہ تھی اور سسلی کے جہاز بھی خیر الدین کے مقابل آنے کے اہل نہ تھے۔

اس کے علاوہ ایک اور تلخ حقیقت یہ بھی تھی کہ ان کے خلاصی بھی مسلسل فاقہ زدگی اور کوڑا زنی سے مائل بہ بغاوت تھے۔ وہ موت کے خوف سے بالکل آزاد ہو چکے تھے۔ ان مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کرتے ہوئے وقت سرعت سے بیتا۔ طوفان کا زور کم ہونے کی خبر ملی تو چارلس نے سفر کا دوبارہ آغاز کرنے کا حکم دے دیا۔

خیر الدین باربروسہ کے خوف میں مبتلا یہ قافلہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہوا تو ساٹھ میل سفر طے ہونے کے بعد انہیں دوبارہ طوفان نے گھیر لیا۔ طوفانی ہواؤں کے جھکڑ اور موجوں کی سرکشی نے انہیں دوبارہ اسی جانب دھکیلنا شروع کر دیا جہاں سے اس سفر کا آغاز ہوا تھا۔ وہ قافلہ ایک بار پھر بوجیہ پہنچ گیا۔ ڈوریا کا دل اس صورتِ حال پر لحہ بہ لحہ سکون پا رہا تھا۔ چارلس کو خود سے نظریں چراتے دیکھ کر تو وہ مزید خوشی محسوس کرتا۔

چارلس کی شکستگی اور ڈوریا کی مسرت اس وقت سوا تر ہوگئی جب سسلی کے جہاز کے عملے نے چارلس کے اصرار پر دوٹوک الفاظ میں معذرت کی کہ ان کا تجارتی جہاز ایسے خون آشام طوفان کا مقابلہ کرنے کی تاب ہی نہیں رکھتا۔

اس جانب سے مایوس ہوکر چارلس نے پہاڑی چٹانوں کی آڑ میں اپنا خیمہ کچھ اس طرح نصب کروایا کہ خیر الدین باربروسہ کے جہازوں کی جھلک دیکھتے ہی خود پہاڑی چٹانوں کی آڑ میں روپوش ہو جائے۔ آٹھ سلطنتوں کے اس حاکم کی کیفیت بالکل کسی ایسے چوہے کی سی تھی جو اپنی عافیت کے لیے بل تلاش کرتا پھر رہا ہو۔ اس کی امیدیں اب صرف پاپائے اعظم کے بھیجے ہوئے ان بیس پادریوں سے وابستہ تھیں جو ہمہ وقت اس کی کامیابی اور عافیت کے لیے دعاگو رہتے تھے۔

چارلس نے ایک روز اپنے خیمے میں ان پادریوں کے علاوہ ڈوریا، کاسٹرو، کورٹز اور جرمن سپہ سالار کو طلب کر کے پادریوں سے دریافت کیا۔

''محترم صاحبان! آپ کو وہ دعائیں تو ضرور آتی ہوں گی جن سے پیغمبروں نے اپنے بدترین مصائب میں مانگ کر مشکلات آسان کی تھیں؟''

''جی ہاں شہنشاہ! بالکل آتی ہیں۔'' سربراہ نے جواب دیا۔

''تو پھر گریہ و زاری کرتے ہوئے وہ دعائیں مانگتے کیوں نہیں ہو؟ شاید اس طرح خداوند کو ہماری حالت پر رحم آجائے اور ہم اپنی جانب تیزی سے بڑھتے ان دو طوفانوں

سے نجات پالیں۔'' وہ بے بسی سے کہنے لگا۔
''آپ کن دو طوفانوں کی بات کر رہے ہیں شہنشاہ معظم؟'' سربراہ نے پوچھا۔
''ایک طوفان تو وہی ہے جس نے بارسلونا سے روانگی کے وقت سے ہی ہمیں اپنی خونخواری کی زد میں لیا ہوا ہے۔ دوسرا طوفان خیر الدین باربروسہ اس سے ... وہ ہولناک ہے۔ وہ اپنے ڈیڑھ سو جنگی جہازوں کا بیڑا لیے ہماری جانب بڑھ رہا ہے۔ اگر وہ یہاں پہنچ گیا تو میرے پاس خودکشی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔ میں خود کو اس کا قیدی کبھی نہیں بننے دوں گا۔''
چارلس ذہنی شکستگی کی انتہائی نہج تک پہنچ چکا تھا۔ اس خبر نے پادریوں کی سٹی بھی گم کر دی۔ اپنی عافیت خطرے میں نظر آتے ہی انہوں نے شدید گریہ وزاری سے دعائیں مانگنے کا آغاز کر دیا۔
''میں یہ بات کبھی فراموش نہیں کروں گا کہ ہماری اس شکست کی وجہ موسم کی خرابی نہیں بلکہ سپاہ کی بدنظمی، غیر ذمے داری اور ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی تھی۔ وہ اپنے ہمراہ سامان رسد کچھ زیادہ مقدار میں لے آتے اور باب الاذن میں تھوڑی اور مزاحمت کر لیتے تو ایسے شرمناک انداز میں پسپائی اختیار نہ کرنا پڑتی۔ میں آٹھ سلطنتوں کا حاکم ہوں۔ اس چھوٹے سے قطعۂ زمین الجزائر کی میرے سامنے بھلا کیا حیثیت تھی؟''
وہ تاسف سے بڑبڑاتے ہوئے اپنے احمقانہ فیصلوں کو بالکل نظر انداز کر چکا تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ جس قطعۂ زمین کو وہ غیر اہم ثابت کر رہا تھا وہیں پر اس کے سیکڑوں جہازوں، سامان رسد اور سپاہیوں کا مدفن تھا۔ جن مسلمانوں کو وحشی اور ناپاک قرار دے رہا تھا اب انہی کے گھروں میں اس کے ملک کی اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی خواتین کنیزیں بن کر رہنے پر مجبور تھیں۔ اس کے علاوہ وہ موسم کے تغیرات کو قدرت کی منشا نہیں بلکہ ڈوریا کی نحوست اور بدنیتی قرار دے رہا تھا۔ وہ ڈوریا کا یہ ''گناہ'' کسی صورت فراموش نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے ہر موقع پر اپنی زبان سے نحوست اور بدشگونی کے کلمات نکال کر اس کی مشکلات میں اضافہ ہی کیا تھا۔
ڈوریا کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ اس کم عقل اور عاقبت نااندیش کی بدگوئی مزید برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔
''بہتر ہے کہ میں اب اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ مجھے اور جووانیکیو کو اس لشکر سے الگ ہی سمجھیے۔ میں اپنی بقیہ زندگی اب جووانیکیو میں بہترین صلاحیتیں پروان چڑھاتے ہوئے ہی بسر کروں گا۔''
اس کے تلخ انداز پر مجلس مشاورت میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ اس سکوت میں صرف پادریوں کی زیر لب مانگی جانے والی دعائیں شہد کی مکھیوں سی بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ چارلس کوئی سخت بات کہنے کے لیے لب کشائی کرنے ہی والا تھا کہ ایک عسکری عہدیدار کی آمد ہوئی۔ وہ جوش و مسرت سے بے حال دکھائی دے رہا تھا۔
''شہنشاہ معظم! خداوند نے ہماری سن لی۔ خیر الدین باربروسہ کا بحری بیڑا بھی طوفان کی زد میں آ گیا ہے۔ اس کا الجزائر پہنچنا اب ناممکنات میں سے ہے۔''
چارلس نے خوشی سے نہال ہو کر پادریوں کی جانب دیکھا جن کی دعاؤں کی قبولیت سے اسے یہ دن اور لمحہ دیکھنا نصیب ہوا تھا۔
''شہنشاہ معظم! مجھے اب اجازت دیجیے۔ کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔'' ڈوریا نے عجلت میں کہا۔
چارلس نے اس کی جانب توجہ کیے بغیر سر ہلا کر جانے کی اجازت دے دی۔ ڈوریا اپنی ہی سوچوں میں الجھا وہاں سے چلا آیا۔ اس کے ذہن میں سب سے پہلا خدشہ اہل بوجیہ کی جانب سے سرسرا رہا تھا۔ گزشتہ کچھ دنوں سے چارلس کے فوجی ان کے حصے کی غذا پر غاصبانہ قبضہ کر چکے تھے۔ اس کا وجدان مسلسل گواہی دے رہا تھا کہ بوجیہ کے رہائشی اب غیر متزلزل انداز میں متحد ہونے والے ہیں۔ اس نے بارہا انہیں ادھر ادھر غائب ہوتے بھی دیکھا تھا۔
اس کے بعد دوسرا خدشہ بھی کسی سانپ کی طرح کنڈلی مار بیٹھتا، اس نے واضح طور پر بارہا محسوس کیا تھا کہ ان کا اسلحہ تیزی سے کم ہو رہا ہے۔ یہ انکشاف اور پھر اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کسی بھی طور نظر انداز کیے جانے کے قابل نہ تھی۔ یہ اسلحہ یقینی طور پر بوجیہ والوں کے پاس ہی پہنچ رہا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی بالکل واضح تھی کہ اندرونی افریقا کے رہائشی بھی اہل بوجیہ سے ہی ہمدردی رکھتے تھے۔ کوئی ذی ہوش شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ یہ اسلحہ لازماً چارلس کے خلاف ہی استعمال ہونا تھا۔ ڈوریا کو بھی حالیہ طور پر ہی علم ہوا تھا کہ چارلس نے اپنی سپاہ کو حکم دے رکھا تھا اگر بوجیہ کے رہائشی کسی بھی قسم کی بغاوت پر مائل نظر آئیں تو انہیں بلالحاظ

موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

حالات و واقعات کے پیشِ نظر ڈوریا کا یہ ڈر بھی فطری تھا کہ اگر ان بدترین حالات میں کوئی نئی جنگ چھڑی اور الجزائری اس بات سے آگاہ ہو گئے تو چارلس کے لیے جان بچا کر نکلنا محال ہو جائے گا۔ ڈوریا نے اس صورتِ حال پر کچھ دیر مزید غور و فکر کیا اور بادلِ ناخواستہ دوبارہ چارلس سے ملاقات کے لیے چل دیا۔

''کہو، ضروری کام بڑی جلدی نمٹا آئے تم؟'' چارلس نے طنز کیا۔

''شہنشاہ معظم! میں ایک التجا کرنا چاہتا ہوں کہ سپاہیوں کو مقامی افراد سے چھیڑ چھاڑ کرنے سے روک دیں۔ یہاں سے بخیریت نکل جانے میں ہی ہماری سب سے بڑی کامیابی ہے۔'' اس نے نرمی سے بات کا آغاز کیا۔

''میں اپنا حکم واپس نہیں لوں گا۔ مقامی افراد کسی بھی بغاوت پر موت کا تحفہ ہی حاصل کریں گے۔'' چارلس نے سفاکی سے کہا۔

''ان بے چاروں پر تو پہلے ہی ظلم کے پہاڑ ٹوٹ چکے ہیں۔ ہم ان سے غذا تک چھین چکے ہیں۔ ہماری ہی وجہ سے وہ شدید فاقوں کا شکار ہیں۔ اب یہ نئی سزا دینا کہاں کی انسانیت ہے؟'' ڈوریا اپنا دل بوجھل محسوس کرنے لگا۔

چارلس نے بغور اس کی جانب دیکھا اور ایک بار پھر طنزاً کہنے لگا۔

''تیرے بارے میں کچھ عرصہ پہلے میرے دل و دماغ میں پلنے والا گمان بالکل درست تھا۔ بڑھاپے نے تجھے کم ہمت اور بزدل بنا دیا ہے۔''

''یہ تو خیر سبھی جانتے ہیں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہاں گزرتے وقت اور اب بڑھاپے نے میری دور اندیشی اور معاملہ فہمی میں مزید اضافہ کیا ہے اور میری معاملہ فہمی کہتی ہے کہ بلاوجہ کسی کے ساتھ بھی زیادتی نہیں کرنا چاہیے۔'' ڈوریا کے انداز میں ہلکی سی تلخی در آئی۔

''اور میں نے اہل بوجیہ کے خلاف جو فیصلہ سنایا ہے وہ میری دور اندیشی اور معاملہ فہمی ہے۔'' چارلس نے طیش سے کہا۔

''معاف کیجیے گا شہنشاہ معظم! میں اس بات سے بالکل متفق نہیں ہوں۔'' ڈوریا نے ایک بار پھر صاف گوئی سے کہا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ چارلس پر اس قدر شدید اثر مرتب ہوگا۔

چارلس کی پھٹی نظروں میں بے یقینی اور طیش ہلکورے لے رہے تھے۔ اس لمحے اسے شدت سے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ ملازمین اور شہنشاہیت میں فاصلہ نہایت غیر فطری انداز میں سمٹ گیا ہے۔ یہ علامت بالکل اچھی نہ تھی۔ وہ عجیب و غریب تناؤ بھرے لمحات تھے۔ سابقہ ذہنی دباؤ اور اپنے ہی ملازمین کی خودسری نے اس کا دماغ اس قدر الٹا دیا کہ وہ یکدم شدید جذباتیت میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے طیش سے چلاتے ہوئے کہا۔

''کیا تم لوگوں کو علم نہیں کہ میں کون ہوں؟ جانتے نہیں ہو کیا مقام ہے میرا؟ میں چارلس ہوں...... چارلس! میں آٹھ حکومتوں کا تنِ تنہا حکمران ہوں۔ میری مرضی کے بغیر وہاں کوئی پتا بھی نہیں ہلا سکتا۔ میری کہی ہوئی بات اٹل قانون ہے۔ مجھ سے بے تکلف ہونے یا سرکشی دکھانے والوں کو دوسرا سانس لینا بھی نصیب نہیں ہوگا۔''

اس کی حالت اور ہذیانی انداز نے حاضرین کو ساکت کر دیا۔ کاسٹرو اس کیفیت اور ڈوریا پر آنے والے متوقع عتاب پر بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ اس نے جلتی پر تیل کا کام کرنے کے لیے چارلس کو نہایت ادب اور ملائمت سے مخاطب کر کے کہا۔

''تکبر ہمیشہ انسان کو خوار کرتا ہے شہنشاہ معظم! اس کا تکبر بھی اسے کسی نہ کسی روز غرق کر دے گا۔ ویسے ایک غلطی ہم سے بھی تو ہوئی نا! ہمیں پہلے ہی اندازہ کر لینا چاہیے تھا کہ اس کا دماغی توازن درست نہیں ہے۔ اسے اپنے ہمراہ لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

چارلس نے پسندیدہ نظروں سے کاسٹرو کو دیکھا۔ وہ اس کی بات سے قدرے پُرسکون ہو گیا۔ ڈوریا نے یہ حالات دیکھے تو واپسی کی اجازت لے کر وہاں سے لوٹ آیا۔ باہر آتے ہوئے وہ زیرِلب محض اتنا ہی کہہ سکا۔

''خداوند ہمارے بادشاہ پر رحم ہی فرمائے۔ یہ مشیر اور ہمدرد اسے کہیں کا بھی نہیں چھوڑیں گے۔ پتا نہیں بادشاہ کی یہ خود پسندی اور کم فہمی ہمیں مزید کیا کیا کچھ دکھائے گی؟''

☆☆☆

اس روز شام ہوتے ہی بارش نے زور پکڑ لیا۔ اس صورتِ حال نے وجود میں شدید گھٹن اور مایوسی پیدا کر دی۔ ایسا محسوس ہوتا رہا کہ وہ اب الجزائر سے بھی نکل ہی نہیں سکیں گے پھر حالات نے یکدم ایسی کروٹ لی کہ یہ مایوسی اور پژمردگی مستعدی و توانائی میں ڈھل گئی۔ اطلاع ملی تھی کہ افریقا کے اندرونی حصوں سے مختلف لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ وہ اپنے بشرے سے بالکل بے

خوف اور بے نیاز دکھائی دے رہے تھے۔
دوسری جانب ایک عجیب تر صورت حال یہ بھی تھی کہ بجلی چمکنے اور بادل گرجنے سے بوجیہ کے رہائشی سربسجود ہوجاتے۔نو واردانہیں دبے لفظوں میں اور کہیں علی الاعلان ایک ہی بات سمجھا رہے تھے۔ ہر سمت یہی الفاظ سرگوشیوں میں گونجتے سنائی دیتے۔
''چارلس اور اس کی فوج اپنے ہمراہ نحوست کا انبار اٹھالائے ہیں۔ ہمارے دیوی دیوتا لازماً ان سے خفا ہیں۔ بجلی کی یہ چمک، بادلوں کی گرج اور طوفانی بارشیں اسی خفگی کا اظہار ہے۔ جاؤ......اور چارلس سے درخواست کرو کہ واپس چلے جائیں کیونکہ اسی صورت میں طوفان باد و باراں سے نجات مل سکتی ہے۔''
مقامی افراد نے متفقہ طور پر چارلس سے ملاقات کا ارادہ کرلیا۔ چارلس کو جب ان بے لباس، بارش سے شرابور بدن لیے آنے والے افراد کے بارے میں علم ہوا تو اس نے ملاقات سے انکار کردیا۔ وہ لوگ اپنی مقامی زبان میں جانے کیا کچھ کہتے رہے۔ چارلس نے ناسمجھی سے جھنجلاتے ہوئے انہیں وہاں سے مار بھگانے کا حکم دے دیا۔
ڈوریا کو ان لوگوں کی حالت پر ترس آنے لگا۔ وہ خود بھی ان کی زبان سے لاعلم ہی تھا تاہم اشاروں کنایوں سے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ مقامی افراد بھی ماضی قریب میں اس کے رویّے کی بدولت اس پر خاصا اعتبار کرنے لگے تھے۔ وہ چارلس سے مایوس ہوکر ایک درّے میں جمع ہوگئے۔ کچھ ہی دیر میں اسلحہ بھی ان کے پاس پہنچا کر یہ بات ذہن نشین کروائی گئی کہ رات کو ہونے والی دھواں دھار بارش میں چارلس اور اس کے فوجیوں پر حملہ کردیا جائے۔ دیوتا ان کے بھرپور ہمنوا ہوں گے اور ان کی ہلاکت کے بعد بوجیہ نحوست کے آسیب سے آزاد ہوجائے گا۔
ڈوریا کو اس نئی شورش کی خبر ملی تو اس نے بھی اپنی سپاہ کو رات کی تاریکی میں بارش کے دوران شب خون مارنے کا حکم دے دیا۔ اس کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ وہ اپنے خیمے خالی کرکے پہاڑیوں میں روپوش ہوجائیں۔ اس کے بعد جب بوجیہ کے رہائشی خیموں پر حملہ آور ہوں تو ان پر عقب سے حملہ کرکے غلبہ پالیا جائے۔ اس کے وجود میں ایک خلش یہ بھی پنپ رہی تھی کہ اندرونی مقامی قبائل اہلِ بوجیہ کی مدد کرکے انہیں جنگ وجدل کا راستہ دکھا رہے ہیں۔
اس کے بعد یہ خلش کہیں نہ کہیں یہ خدشہ اختیار کرلیتی کہ بوجیہ کے رہائشیوں کو مقامی الجزائری مسلمانوں کا تعاون بھی حاصل ہے۔ اس طرح یہ معرکہ براہِ راست عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان برپا ہوجاتا تھا۔ اس کی بے حد احتیاط کے باوجود چارلس تک یہ خبر پہنچ گئی۔ وہ ایک بار پھر جذباتی بحران کا شکار ہوکر بوجیہ کی آبادی تہس نہس کرنے کا حکم دینے لگا۔ ڈوریا اس کی حالت پر تاسف محسوس کرنے کے سوا کچھ بھی نہ کرسکتا تھا۔ وہ اپنی اس ذہنی ابتری کا درحقیقت خود ہی ذمے دار تھا۔ چارلس کی یہ کیفیت نظر انداز کرتے ہوئے وہ بھی حملے کے لیے مستعد ہوگیا۔ جرمن، ہسپانوی اور اطالوی سپاہی پہاڑیوں میں روپوش ہوکر اپنے خیموں پر نظریں جمائے رہے۔ چارلس البتہ ساحل پر لنگر انداز سسلی کے تجارتی جہاز میں پناہ لے چکا تھا۔
اس دوران قدرت کی کرنی ایسی ہوئی کہ بارش یکدم تھم گئی۔ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج البتہ ہنوز جاری تھی۔ وقت دھیرے دھیرے سرکتا رہا۔ ڈوریا کے سپاہی ایک متوقع سنسنی خیز مقابلے کی آس لیے سخت مضطرب تھے۔ ان کے اس اضطراب سے بے خبر اہلِ بوجیہ نہایت معصومیت سے آسمان پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ انہیں فراہم کردہ منصوبے کے تحت حملہ موسلا دھار بارش میں کرنا تھا اور بارش اب بوندا باندی میں تبدیل ہوچکی تھی۔
وہ شب یونہی دوطرفہ انتظار میں بیت گئی۔ مقامی افراد کو بارش جبکہ ڈوریا کے سپاہیوں کو ان کی نقل وحرکت کا انتظار تھا۔ اگلی صبح صورتِ حال سے آگاہی پر ڈوریا اور چارلس بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چارلس ہنوز ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ اسے علی الصباح بھی ماہرینِ موسمیات نے بتایا تھا کہ موسم کے تغیرات یونہی جاری رہیں گے۔ سمندر بپھرے رہنے کے بھی قوی امکانات ہیں۔ اس پر مستزاد خیر الدین باربروسہ کی آمد اور ممکنہ شکست یا گرفتاری کے اندیشوں نے الگ مضطرب کیا ہوا تھا۔ اسے خیر الدین کے بارے میں تازہ ترین صورتِ حال کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔ چارلس کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اندھیرے میں سنسناتے تیر کی طرح اس کا شکار کرے گا۔ خوف تھا کہ راتوں کی نیند اڑائے دے رہا تھا۔

☆☆☆

چارلس کی ان کیفیات سے بے خبر خیر الدین باربروسہ بھی اپنے معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ وہ الجزائر کے بارے میں صرف اتنا ہی جان سکا تھا کہ اسے مختلف ممالک کے اشتراک واتحاد سے ہدف بنایا گیا ہے۔ پانچ سو جہازوں، حسن آغا کی مجموعی بحری قوت کے بارے میں بھی

مکمل آگاہ تھا۔ وہ چارلس کے دیو قامت اور قلعہ نما متحرک جہازوں کا ایک دو روز تک ہی مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس کے بعد ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ وہ اپنے ڈیڑھ سو جہازوں کے ساتھ ہر ممکنہ رفتار سے سسلی کے مشرقی ساحل ''سیرا کیوز'' پہنچا تھا۔ سسلی کی شکستہ حال بحریہ نے خیرالدین کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن اسے روکنے میں بالکل ناکام رہے۔ خیرالدین مالٹا کے شمالی حصے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا جہاں جنگجوؤں کی کشتیوں نے اپنے چھاپا مار دستوں سے اس کے جہازوں کو اپنا ہدف بنایا۔

خیرالدین کو ان حملوں کے بجائے موسم کی اچانک طوفانی کروٹ نے رکنے پر مجبور کیا۔ اس کے ماہرینِ موسمیات نے واضح طور پر بتادیا تھا کہ موجودہ حالات میں الجزائر پہنچنا خام خیالی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اپنے منصوبے التوا میں پڑتے دیکھ کر خیرالدین کا ذہن مالٹا کے جنوب میں واقع تیونس کی جانب بھی مبذول ہوا لیکن سلطان سلیمان کا حکم آڑے آجاتا۔ سلطان نے خیرالدین کو محض الجزائر کی مدد کے لیے روانہ کیا تھا۔ اس لیے تیونس پر حملہ کسی صورت بھی ممکن نہیں تھا۔

وقت بیتتا رہا۔ خیرالدین کی ذہنی قلابازیاں جاری رہیں۔ اس تجزیے کے بعد الجزائر تک رسائی کے صرف دو راستے تھے۔ پہلا راستہ مالٹا اور سسلی کے درمیان سے گزرنے والی جبکہ دوسری مالٹا سے تیونس کی درمیانی آبی شاہراہ تھی۔ طوفانی موسم، مالٹا اور سسلی مزاحمت کار تھے۔ وہ الجزائر تک رسائی کی شدید خواہش کے باوجود بحری بیڑے کو کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے طلایہ گردوں سے بھی مسلسل یہی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں کہ مزید سفر ہلاکت خیزی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

''اب ہمیں کیا کرنا چاہیے امیر؟ کیا واپسی کا سفر اختیار کرنا بہتر ہوگا؟'' درگوت نے استفسار کیا۔

''نہیں! یہ تم نے سوچ بھی کیسے لیا؟'' خیرالدین سنجیدہ ہوا پھر ایک توقف سے کہنے لگا۔

''شاید تمہارے ذہن میں یہ بات گردش کرنے لگی ہے کہ باربروسہ اب عمر کے اس حصے میں آگیا ہے جہاں کوئی بھی شخص صرف آرام کا طلبگار رہتا ہے۔'' اس نے اپنی عمر کی چھٹی دہائی کی جانب بے رحمانہ تجزیہ کیا۔

''کچھ آرام تو آپ کا حق ہے نا امیر!'' صنعان نے پُرخلوص تشویش جتائی۔

"نہیں میرے عزیز! تمہارا خلوص اپنی جگہ بجا لیکن میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں آرام نہیں کرسکتا۔ ابھی تو بہت سے کام نمٹانے ہیں۔" اس نے مزید سنجیدگی سے کہا۔

"آپ کے ذہن میں اس وقت کیا حکمتِ عملی ہے امیر؟" صالح رئیس نے الجھ کر دریافت کیا۔

"یہ تو خیر سیدھی سی بات ہے۔" درگوت فوراً کہہ اٹھا۔ "میرا خیال ہے کہ امیر "جزیرہ رہوڈز" کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کریں گے۔"

خیر الدین مبہم سے انداز میں مسکرا دیا۔ جزیرہ رہوڈز ماضی میں سلطان سلیمان کا مفتوحہ علاقہ تھا۔ بعدازاں اسے چارلس نے اپنی شرپسندانہ کارروائیوں کا مرکز بنالیا تھا۔

"میں تمہاری صلاحیتوں کا یونہی معترف نہیں ہوں درگوت!" خیر الدین نے شفقت سے اس کی جانب دیکھا۔

صالح رئیس، درگوت کی اس اہمیت پر ایک بار پھر تلملا کر رہ گیا۔ یہ بات حقیقت تھی کہ وہ گزشتہ کچھ عرصے سے حسد، بغض، کینہ پروری اور اضطراب کا بے طرح شکار ہوا تھا۔ درگوت اور صنعان کی اہمیت اسے کانٹوں پر لوٹنے پر مجبور کیا کرتی۔ ذہن ہمہ وقت کسی نہ کسی انتشار کا شکار ہی رہتا۔ رہوڈز کے سفر کے دوران اس کے منفی جذبات مزید شدت سے عود آئے۔ اس کے دل میں ایک ہی تمنا سر اٹھانے لگی تھی کہ وہ ان دونوں پر اپنی برتری ثابت کردے۔ وہ سفر کے التوا سے ناخوش تھا کیونکہ حسن آغا کی بہرصورت مدد اس کی شدید خواہش تھی۔

رہوڈز منتقل ہوجانے پر ایک نئی صورتِ حال سامنے آئی۔ بحیرۂ روم کی جنوب مغربی سمت سے آنے والے ایک قافلے سے چند تاجروں نے خیر الدین کو چارلس کی تباہ کن صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس کے ایک سو سینتالیس جہاز ڈوبنے، سامانِ رسد سے محرومی اور فوج کی فاقہ کشی کی خبریں بھی اس دوران خیر الدین تک پہنچی تھیں۔ یہ اطلاعات بلاشبہ خوش کن تھیں۔ الجزائر کی مدد قدرت نے ازخود ہی کردی تھی۔

"امیر! میرا خیال ہے کہ ہمیں ان تاجر کی باتوں پر آنکھیں بند کرکے یقین نہیں کرلینا چاہیے۔ ہمیں خود الجزائر جاکر صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہیے۔" درگوت مضطرب تھا۔

"میں بھی یہی کہنا چاہ رہا تھا امیر!" صالح رئیس نے بھی فوراً جواب دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ حسن آغا کی مدد کے لیے مجھے الجزائر جانے کی اجازت ضرور دیں گے۔"

خیر الدین ان دونوں کی بات پر خاموش رہ گیا۔ اس کی جہاندیدہ نظریں ان کی باہمی مسابقت بھانپنے لگی تھیں۔ اس نے نرمی سے صالح رئیس کو تیونس جاکر وہاں کے حالات کا اچھی طرح جائزہ لینے کے لیے قائل کرلیا۔ اس جائزے کے بعد ہی وہ حتمی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہاں حملے کی صورت میں کس حد تک مزاحمت سامنے آئے گی اور مسلمان رعایا کے تعاون کا تناسب کتنا رہے گا؟

صالح رئیس نے اس کی بات تسلیم کرلی اور دو جہاز لیے تیونس روانہ ہوگیا جہاں ہنوز شاہ حسان کی حکومت تھی۔ مسلمان حلق الوید میں مقیم چارلس کی عیسائی فوج کے خلاف تھے۔ تازہ ترین صورتِ حال یہ تھی کہ عیسائیوں نے ساحل کے قریب ایک قلعہ تعمیر کرلیا تھا جہاں سے شاہ حسان اور تیونس کو زیرِ نگرانی رکھا جاتا۔ صالح رئیس کے دونوں جہازوں کا عملہ تاجروں کے بھیس میں حلق الوید کی بندرگاہ میں داخل ہوا۔ صالح کو ایک اطمینان بہرحال یہ بھی تھا کہ یہاں اسے ذاتی شناخت میں پہچاننے والا کوئی بھی شخص نہیں۔ وہ بھرپور اعتماد سے جہاز سے نیچے اتر آیا۔

دوسری جانب حلق الوید کے عیسائی دونوں جہاز خالی دیکھ کر خاصے حیرت زدہ تھے۔ ان کی یہ حیرت بھی فطری تھی کہ ان تجارتی جہازوں پر کوئی تجارتی سامان موجود ہے نہ ہی تاجروں کی جماعت۔ نتیجتاً صالح کو تفتیش کے لیے قلعے میں طلب کرلیا گیا۔ صالح اس صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس نے خود کو کردار کے سانچے میں مکمل طور پر ڈھال لیا۔

"کہاں سے آئے ہو تم؟ کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" قلعہ دار نے دریافت کیا۔

"اوہ خدایا! جب سے یہاں آیا ہوں ہر خاص و عام مجھ سے یہی سوال کررہا ہے۔" صالح نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، مجھے علم ہے، تم مقامی لوگوں کو یہ بتاتے پھرتے ہو کہ اس خراب موسم میں تیونس سے اسکندریہ اور شام کے ساحلی علاقوں میں سفر کرو گے۔" قلعہ دار نے اسے اپنی معلومات سے آگاہ کیا پھر ایک دوسرے زاویے سے سوال کیا۔

"یہ جہاز کب خریدے تم نے؟"

"ورثے میں ملے تھے مجھے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ باربروسہ ان پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ آج کل وہ جزیرہ رہوڈز میں مقیم ہے۔ میں اپنے جہاز وہیں جزیرے کے کسی ساحل پر کھڑا کرنا چاہتا تھا لیکن ایسا نہ کرسکا۔ اس لیے اب

تیونس سے تجارتی سفر کا سلسلہ شروع کرنا چاہتا ہوں۔''

صالح بڑی معصومیت سے بولا۔

وہ قلعہ دار کو اپنی سادگی و بے وقوفی کا بھرپور تاثر دے رہا تھا۔ اس کی یہ کوشش کامیاب بھی رہی۔ قلعہ دار نے اس سے پوچھا۔

''تمہارے دونوں جہازوں پر تقریباً تین درجن چپو بردار... موجود ہیں۔ اس کے علاوہ دو درجن سے زائد دیگر کاموں پر مامور افراد بھی شامل ہیں۔ ان کا خرچ کہاں سے پورا کرتے ہو؟''

''ورثے کی دولت سے کام چلا لیتا ہوں بس۔'' وہ اسی سادگی سے کہنے لگا۔

''تمہارے جہازوں پر تلواروں، نیزوں اور بندوقوں جیسا روایتی اسلحہ بھی موجود ہے لیکن انہیں دیکھ کر گمان یہی ہوتا ہے کہ انہیں صرف احتیاطاً رکھا گیا ہے اور ان سے صحیح طرح کام لینا کسی کو آتا ہی نہیں۔''

''ہتھیار جب ہاتھ میں آئیں تو چلانے بھی آ ہی جاتے ہیں۔'' صالح رئیس نے ایک بار پھر وہی بے نیازی جتائی۔

''ان دونوں جہازوں کو ہمارے ہاتھ فروخت کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' قلعہ دار نے استفسار کیا۔

''یہ کیسی بات کہی تم نے؟ ہم اپنی روزی کا ذریعہ کیسے فروخت کر سکتے ہیں بھلا؟'' وہ بدک گیا۔

''تجارت میں کیا رکھا ہے؟ آج کل تو بس ایک ہی ذریعۂ کمائی غالب ہے...... بحری قزاقی۔ اس بارے میں کیا خیال ہے ویسے؟''

قلعہ دار کا یہ سوال سن کر صالح قدرے سنبھل گیا اور ایک توقف سے کہنے لگا۔

''یہ تو شاہی پیشہ ہے میرے بھائی! آج کل بڑے بڑے بادشاہوں نے قزاقوں کو اجرت پر ملازم بنا رکھا ہے جو اپنی جان خطرے میں ڈالے ان بادشاہوں کی تجوریاں بھرتے پھرتے ہیں۔''

قلعہ دار کو پہلی بار اس کے جواب نے اچنبھے میں مبتلا کیا۔

''تم تو خاصے باخبر انسان ہو۔''

''دو جہاز سمندر میں لے کر اترے ہیں تو بنیادی معلومات کے بغیر کیسے یہ کام شروع کر سکتے تھے۔'' وہ ایک بار پھر سادگی میں پلٹ گیا۔

''تمہارا تعلق کس نسل سے ہے؟'' قلعہ دار نے پوچھا۔

''نو مسلم ہوں لیکن ذہنی طور پر اب بھی عیسائیت سے ہی متاثر ہوں۔ اب تو کبھی کبھی اپنے فیصلے کی عجلت پر ملال بھی ہونے لگتا ہے۔''

صالح کے اس جواب پر قلعہ دار کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے قدرے رازدارانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تم راضی ہو جاؤ تو ہم دونوں مل کر قزاقیت اختیار کر سکتے ہیں۔ کچھ آدمی میں تمہیں فراہم کر دوں گا۔ بقیہ تمہارے پاس بھی کافی افرادی قوت ہے۔ جہازوں کی لوٹ مار کرو اور حلق الوید میں آ جاؤ۔ پناہ گزینی کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ آہستہ آہستہ کام بھی رواں ہو جائے گا۔''

''تمہارا مشورہ ویسے دل کو لگتا ہے لیکن اس کے لیے جاں نثار اور وفادار آدمی درکار ہوتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کی لوٹ مار سے انکار کر دیں۔'' وہ ایک توقف سے کہنے لگا۔

''اس کا حل بھی میرے پاس موجود ہے۔'' قلعہ دار نے مزید آہستگی سے جواب دیا۔ ''ہم دونوں مسلمانوں اور عیسائیوں پر مشتمل بحری قزاقوں کا گروہ تیار کریں گے تاکہ دونوں فریقین کی خوب لوٹ مار ہو سکے۔''

صالح رئیس نے کچھ دیر سوچ میں مبتلا ہونے کی اداکاری کی اور مزید رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ عیسائی اور مسلمان قزاقوں کا یہ گروہ موجودہ حالات کے تحت مذہبی تعصب کا شکار نہیں ہوں گے؟''

''اس موضوع پر ہم مزید جزئیات طے کر لیں گے۔ یہ کام مکمل منصوبہ بندی سے ہی شروع کیا جائے گا۔'' قلعہ دار نے تجویز دی۔

''سچ بتاؤں، میں نے بھی کئی بار قزاقیت اختیار کرنے کا سوچا لیکن باربروسہ سے کچھ ڈر لگتا ہے۔ اس کے بارے میں یہی سنا ہے کہ وہ ''عقاب آب'' ہے۔ اس کی موجودگی میں کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ میرے ذہن میں قزاقیت کے کئی نادر منصوبے بھی ہیں۔ اگر ہم دونوں مل کر کام کریں تو ہمیں ترقی سے کوئی نہیں روک سکے گا۔'' صالح نے سرگوشی میں کہا۔

قلعہ دار مزید پُرجوش ہو گیا اور ملائمت سے صالح کو کہنے لگا۔

''آج سے تم میرے مہمان ہو۔ ہم مشترکہ منصوبہ بندی سے کوئی بہتر حل نکال لیں گے۔''

صالح اس پیشکش پر قدرے پُرسکون ہو گیا۔ اسے اپنے مقصد میں جزوی طور پر کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ وہ

قلعہ دار کا مہمان بن کر تیونس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرسکتا تھا۔ اس نے قلعہ دار کو مزید شیشے میں اتارنے کے لیے کہا۔

''ہم فی الوقت اپنا کام بانٹ لیتے ہیں۔ تم عیسائی تاجروں کو میرے جہازوں پر سفر کی ترغیب دو۔ میں مسلمانوں کو آمادہ کرلوں گا لیکن ایک بات اور ذہن میں رکھنا۔ اس کام میں جلد بازی کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ مئی تک تجارتی سفر کے لیے یہ موسم مناسب نہیں ہے۔''

اس پیشکش اور انداز کا قلعہ دار پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے فوری طور پر جواب دیا۔

''تم تیونس میں میرے مہمان ہو۔ تمہیں کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔ تمہارے ساتھ مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ رہا کرے گا۔ وہ بحری قزاقی میں بھی تمہارے مددگار ثابت ہوں گے۔''

صالح یہ معاملات طے کرکے قدرے پُرسکون تو ہوگیا تھا تاہم دل میں کہیں نہ کہیں ایک اور خدشہ بھی سر سر ارہا تھا کہ اسے باربروسہ کا ساتھی ہونے کی حیثیت سے شناخت نہ کرلیا جائے۔ اس صورت میں صالح کا بنا بنایا کھیل خراب ہوسکتا تھا۔ اسے باربروسہ پر بہرصورت اپنی دھاک بٹھانا تھی۔ وہ تیونس میں مسیحی اثرات کا خاتمہ کرکے اسلامی حکومت قائم کرنے کا خواہش مند تھا۔ صالح یہاں کے حالات و معاملات سے اسے مکمل آگاہ کرکے سہولت کار بن جاتا تو یہ بات ثابت ہوجاتی کہ اس کی صلاحیتیں درگوت اور صنعان سے کسی طور بھی کم نہیں ہیں۔

اس سارے عمل میں خدشہ صرف ایک ہی بات کا تھا کہ تیونس میں کسی ایسے شخص سے سامنا نہ ہوجائے جو اس کا صورت آشنا ہو۔ سوچ بچار کے بعد اس نے اپنا کام ایک ایسے علاقے سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا جہاں شاہ حسان کے مخالف افراد رہتے تھے۔ ان علاقوں میں سرفہرست وہ مقام تھا جہاں ''قیروان'' کے لوگ کثیر تعداد میں رہائش پذیر تھے۔ اس نے قیروان کے شیخ سے بھی ملاقات کی۔ اس کے ساتھ نماز ظہر کی ادائیگی کی۔ شیخ نے صالح سے پُرتپاک انداز میں گفتگو کی اور باتوں ہی باتوں میں اسے جتائے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے عیسائی قلعہ دار کا مہمان کیوں بنا ہوا ہے۔

جوابی طور پر صالح نے شیخ کو اس واقعے کی طرف اشارہ کیا جب چارلس کے باج گزار شاہ حسان کے منہ پر ایک لڑکی نے نفرت اور حقارت سے تھوک دیا تھا اور صالح کو اسی وقت اندازہ ہوگیا تھا کہ تیونس میں رہنے کے لیے عیسائیوں کی پناہ بے حد ضروری ہے۔

شیخ کو یہ منطق ناگوار تو گزری تاہم اس نے کسی ناخوشگوار بحث سے گریز ہی کیا۔ اس گفتگو کے دوران کچھ ہی فاصلے پر کھڑا ایک شخص صالح کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ اس کے پاس آیا اور الجھ کر کہنے لگا۔

''میں نے شاید تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھ رکھا ہے۔''

صالح اس سوال پر قدرے گڑبڑا گیا۔ اپنی مہم کے اس نازک ترین موڑ پر وہ کسی خطرے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ سنبھل کر بے نیازی سے کہنے لگا۔

''میں تجارت کے سلسلے میں اکثر یہاں آیا کرتا ہوں تب ہی کہیں دیکھ لیا ہوگا۔''

''نہیں، میرا حافظہ اتنا بھی کمزور نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت چارلس بھی یہیں موجود تھا۔'' وہ مزید الجھا۔

''جب شاہ حسان کو تخت نشین کیا گیا تھا، ان دنوں میں یہیں موجود تھا۔ شاید تب ہی دیکھا ہوگا تم نے۔'' صالح نے بھی مزید بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

''ہاں، شاید تم درست ہی کہہ رہے ہو۔ بہت ہی ہولناک وقت تھا وہ۔ یہاں خون خرابے کی انتہا کردی گئی تھی۔ اس نقصانِ عظیم کی یاد میں مسلمان آج بھی شاہ حسان پر لعنت ملامت کرتے ہیں۔'' وہ جھرجھرا گیا۔

''صرف لعنت ملامت سے کیا فائدہ؟ کیا تیونس بھر میں اتنا باہمت کوئی بھی نہیں ہے کہ شاہ حسان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے غلط ثابت کرسکے یا اس کا تختہ الٹ کر کسی اصول پرست اور باضمیر شخص کو حکومت سونپ سکے؟''

صالح کی بات مکمل ہوتے ہی قیروانی شیخ نے جھنجلا کر کہا۔

''مسجد میں ایسی باتیں کرکے کیوں شاہی عتاب کا نشانہ بننا چاہتے ہو؟ ہوش کے ناخن لو کوئی۔''

صالح اس کی بات پر خاموش ہوگیا تاہم نو وارد شخص خاصا پُرجوش دکھائی دے رہا تھا۔

''آخر کب تک خاموش اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے ہم؟ شاہ حسان کے خلاف محاذ آرائی اب بہت ضروری ہوچکی ہے۔''

''تم یہ باتیں علی الاعلان ایک اجنبی کے سامنے کیوں کررہے ہو؟ کیا تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال و خوف محسوس نہیں ہورہا کہ یہ شخص جاسوس بھی ہوسکتا ہے۔ کیا خبر یہ ہماری گفتگو عیسائی قلعہ دار تک پہنچادے۔'' شیخ نے کہا۔

صالح یکدم چوکنا ہوگیا۔ اس کے لیے اب اپنے منصوبے کے دوسرے حصے پر عمل کرنا بہت ضروری ہوگیا تھا۔

''شیخ محترم! میں نومسلم سہی تاہم اسلام سے میری محبت کسی طور بھی آپ لوگوں سے کم نہیں ہے اور پھر یہاں کون سی خفیہ سازش پنپ رہی ہے جو آپ اتنا خوفزدہ ہورہے ہیں؟''

''بہتر یہی ہے کہ تم دونوں آج شام میرے ڈیرے پر آجاؤ۔ وہاں ہم بلاخوف وخطر گفتگو کرسکیں گے۔'' شیخ نے دوبارہ ٹوکا۔

صالح رئیس خاموش ہوگیا۔ اس نے مغرب کی نماز بھی مسجد میں ادا کی اور شیخ کے ہمراہ ڈیرے پر روانہ ہوگیا۔ وہاں موجود افراد نے اس کی خاصی آؤ بھگت کی۔ ان کی باتوں سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ سبھی حکومت مخالف افراد ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد عشا کا وقت ہوگیا۔ اذان سے قبل وہاں چالیس، پینتالیس سالہ ایک شخص بھی چلا آیا۔ اس پستہ قامت اور گٹھے ہوئے جسم کے حامل شخص کا سبھی نے احترام وگرمجوشی سے استقبال کیا۔ عشا کی نماز باجماعت ادا ہونے کے بعد ڈیرے کا پھاٹک بند کردیا گیا۔ حاضرین کے انداز واطوار اب بے حد سنجیدہ ہوچکے تھے۔ نووارد شخص نے محفل کی صدارت سنبھال لی۔ اس کے اشارے پر شیخ نے تیونس میں عام مسلمانوں کی سوچ واُلجھنوں سے آگاہ کرتے ہوئے خیرالدین باربروسہ کا ذکر بھی کیا جو مسلمانوں کے عدم تعاون سے ہی اب تک اپنے مقصد میں ناکام ہوا تھا۔ اس کا نتیجہ بھی مسلمانوں کی بربادی کی صورت میں ہی نکلا تھا۔

سربراہ محفل یہ ساری گفتگو بہت انہماک سے سن رہا تھا۔ اسی اثناء میں مسجد میں ملنے والا شخص اپنی نشست سے اٹھا اور شیخ سے اجازت لے کر کہنے لگا۔

''محترم! اس ناچیز کی رائے یہ ہے کہ تیونس میں ہلچل برپا ہونے کا وقت بہت قریب ہے۔ میں نے اس اجنبی مہمان کو شناخت کرلیا ہے۔ یہ خیرالدین باربروسہ کا ساتھی صالح رئیس ہے جو نہ جانے کس مصلحت کے تحت اپنی شناخت پوشیدہ رکھے ہوئے ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ ہم پر بھرپور اعتماد کرے اور یہاں آمد کا مقصد کھل کر بیان کرے۔''

اس انکشاف پر سبھی کی گردنیں بیک وقت صالح کی طرف مڑ گئیں۔ نظروں میں بے پناہ مسرت، جوش اور امید ہلکورے کھاتی دکھائی دینے لگی تھی۔ صالح کے لیے اب مزید اداکاری کا مظاہرہ ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ بھی اپنی نشست سے اٹھا اور متانت سے کہنے لگا۔

''میں اپنے اس بھائی کی یادداشت کی داد دیتا ہوں کہ اس نے میری ہزارہا کوششوں کے باوجود مجھے پہچان لیا۔ میں یہاں تازہ ترین حالات کا جائزہ لینے ہی آیا ہوں۔ صورتِ حال کچھ اس طرح ہے کہ چارلس کو الجزائر میں بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ خیرالدین، حسن آغا کی مدد کے لیے ہی ڈیڑھ سو جہازوں کے ہمراہ یہاں آیا تھا۔ قدرت نے اس بساط کو اس طرح لپیٹا کہ عقل ہی دنگ رہ گئی۔ خیرالدین اس وقت رھوڈز میں موسم کی بہتری کا منتظر ہے۔ اسی نے مجھے یہاں بھیجا ہے کہ حالات کا اچھی طرح جائزہ لے کر اسے آگاہ کروں۔ اسی صورت میں وہ یہاں سے شاہ حسان کے قدم اکھاڑ سکے گا۔''

اس کی بات مکمل ہوتے ہی ایک اور شخص اٹھ کر سنجیدگی سے کہنے لگا۔

''مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ تمہیں عیسائیوں کے قلعے میں قیام کی کیا ضرورت تھی؟''

''جواب بہت سادہ ہے میرے عزیز! میں نے اِن پر اپنا اعتماد قائم کیا ہے۔ وہ میری طرف سے بے فکر ہوجائیں گے۔ اس صورت میں ان کے اندرونی رازوں سے واقفیت ملے گی۔ مجھے دونوں جانب سے جیسے ہی حالات موافق نظر آئیں گے، خیرالدین کو اپنے بحری بیڑے کے ساتھ یہاں آنے کا پیغام بھیج دوں گا۔ اس کی آمد کے بعد ہم پہلے الجزائر اور پھر اندلس کے جنوبی ساحلی شہروں کی جانب بڑھیں گے۔ اب ہم دشمن کی سرزمین میں جنگیں برپا کریں گے۔ چارلس اور اس کے باج گزاروں کو مزید ڈھیل دینا کسی بھی صورت مناسب نہیں ہے۔'' وہ متانت سے سمجھانے لگا۔

''تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے۔'' قیروانی شیخ نے جواب دیا۔ ''میں تمہیں یہ ضمانت دیتا ہوں کہ مقامی افراد کی حمایت اور حالات سے تمہیں مکمل آگاہ کریں گے۔ خیرالدین باربروسہ کی یہاں آمد اب بہت ضروری ہوگئی ہے۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ تیونسی افراد کی اکثریت موجودہ حکومت کی مخالف ہے۔ وقت پڑنے پر وہ ہمارا بھرپور ساتھ دیں گے۔''

''آپ سب یہ دعا بھی ضرور کیجیے کہ موسمی حالات بھی کچھ موافق ہوجائیں۔ خیرالدین باربروسہ بلاتامل وتاخیر آپ کی مدد کے لیے یہاں چلا آئے گا۔'' صالح پُرعزم تھا۔

اسی لمحے ایک اور شخص برملا کہہ اٹھا۔

''باربروسہ کو ہم نے پہلے اس لیے مسترد کیا تھا کہ وہ

خانہ بدوش ترک حکومت کا نمائندہ تھا۔ عرب چونکہ ترکوں سے نفرت کرتے ہیں اس لیے خدشہ ہے کہ اس بار بھی ایسی ہی صورت حال کا سامنا نہ کرنا پڑجائے۔''

''آہ...... اس تعصب اور نسلی منافرت نے ہمیں کہیں کا بھی نہیں چھوڑا۔ یہ کیسی عجیب منطق ہے کہ تم تیونس کے مقامی افراد قسطنطنیہ کی مسلم حکومت سے تو عناد رکھتے ہو جبکہ اندلس کی مسلم دشمن حکومت پر مکمل اعتماد جتاتے ہو۔''

''میں آپ کی اس بات سے بالکل متفق ہوں۔'' اس شخص نے کہا۔ ''میں یہی تو چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن افراد کے ذہنوں میں بھی یہ بات اچھی طرح نقش ہو جائے۔ وہ سابقہ غلطی دہرانے کی حماقت نہ کریں۔ وہ سبھی ایک حقیقت اچھی طرح جان لیں کہ خیرالدین باربروسہ ترک ہے نہ عرب۔ وہ محض مسلمان ہونے اور انسانیت کے ناتے سے ہماری مدد کررہا ہے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے۔'' صالح رئیس نے جواب دیا۔ ''میں خود ایک عرب ہوں لیکن ترکوں کے ساتھ دلی طور پر شریک ہو کر عیسائیوں سے جنگ کررہا ہوں اور ان شاء اللہ ہمیشہ کرتا رہوں گا۔''

''تو پھر اب صورتِ حال یہ ہے کہ اگر ہم شاہ حسان کے خلاف مزاحمت کریں تو چارلس کی تباہی اور موجودہ حالت کے باعث قلعے کی عیسائی فوج اپنے مرکز سے بالکل کوئی مدد حاصل نہیں کر سکے گی۔ اس طرح ہمیں اپنے مقصد میں بہت جلد کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ خیرالدین تیونس سے جبرالٹر تک بچے کھچے عیسائیوں کے خلاف کارروائی کر کے افریقا کا پورا علاقہ ان موذیوں سے پاک کر دے گا۔'' قیروانی شیخ نے اعادہ کیا۔

صالح رئیس نے اس بات کی تائید کی اور ان سے روانگی کی اجازت چاہی۔ اسے خدشہ تھا کہ تاخیر کی صورت میں قلعہ دار اس سے طرح طرح کے سوالات پوچھے گا۔ قیروانی شیخ نے اسے اصرار کر کے وہاں شب بسری کے لیے روک لیا۔ اس رات دیگر افراد کی روانگی کے بعد قیروانی شیخ اور صالح ایک بار پھر محوِ گفتگو ہو گئے۔ اس گفتگو کا مرکز عالم اسلام کی بے حسی، عیسائیوں کا اتحاد و مذہبی جنون، مسلمانوں کا باہمی نفاق و تعصب اور خیرالدین کی مخلصانہ بے لوث کاوشوں کے ساتھ اس امر پر بھی زور تھا کہ مسلمانوں کو ازسرِنو برتری حاصل کرنے کے لیے بحری قوت میں اضافے کی بہت ضرورت ہے۔ سلطنت عثمانیہ کی طاقت بھی بحری برتری کی مرہونِ منت ہی تھی۔ اسی لیے مسیحی دنیا ان سے خائف بھی رہتی۔ عرب اسی لیے آج زیردست اور گردش کا شکار تھے۔ اگر ان کے پاس بھی بحری قوت ہوتی تو اندلس کبھی ان پر غالب نہ آپاتا اور اگر غلبے کی کوشش کرتا تو منہ توڑ جواب بھی پا ہی لیتا۔ صالح رئیس اس گفتگو کے دوران قیروانی شیخ کی فراست، دوراندیشی اور معاملہ فہمی پر لحظہ بہ لحظہ حیرت زدہ بھی ہورہا تھا۔ شیخ کا یہ بھی کہنا تھا کہ تیونس کی حکومت تبدیل ہونے کی صورت میں باربروسہ کو یہاں جہاز سازی کا کارخانہ لازماً قائم کرنا چاہیے۔ اس صورت میں مقامی نوجوان بحریہ کی تربیت حاصل کر سکیں گے۔ اسے تیونس کا مستقبل اب قدرے باشعور اور بافہم لوگوں کے ہاتھوں میں پروان چڑھتا دکھائی دے رہا تھا۔ خیرالدین بھی یقیناً اس صورت حال سے آگاہی کے بعد بہت خوش اور مطمئن ہوتا۔

وہ رات اسی گفتگو اور منصوبہ سازی میں بیت گئی۔ صبح کی نماز کے بعد جب صالح قلعے میں پہنچا تو قلعہ دار نے خاصے تیکھے چتونوں سے اس کا استقبال کیا۔

''کہاں تھے تم رات بھر؟ میں نے تمہارا کافی انتظار کیا۔''

''مقامی تاجروں سے مل کر انہیں اعتماد میں لینے کی کوشش کرتا رہا۔ مستقبل قریب میں یہ لوگ ہمارے لیے بہت کارآمد ثابت ہوں گے۔'' صالح نے طے شدہ جواب دیا۔

''اچھا! قیروانی شیخ کب سے تاجر ہو گیا ویسے؟ مجھے تو مصدقہ اطلاع ملی ہے کہ تو اس سے مسجد میں کافی دیر تک باتیں کرتا رہا ہے۔ وہاں کسی شخص نے تجھ سے پہلے بھی ملاقات کا دعویٰ بھی کیا ہے۔''

قلعہ دار کے اس جواب سے صالح کو یقین ہو گیا کہ اس کے جاسوس یقیناً مسلمانوں کے بھیس میں ہر جگہ ہی موجود ہیں۔ صالح نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''ہاں، ایسا کچھ کہہ تو رہا تھا وہ۔ خیر، میں ایک تاجر ہوں۔ مختلف علاقوں میں میری آمدورفت جاری رہتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہیں دیکھ ہی لیا ہو مجھے۔''

قلعہ دار کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہوا پھر کسی سوچ کے تحت کہنے لگا۔

''قیروانی شیخ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اسے یہاں کے انتشار پسندوں کی تحریک کا نمائندہ ہی سمجھ لو۔ اگر اس سے ربط بڑھاؤ گے تو شاہ تجھے بھی اسی کا رکن سمجھے گا۔ ہوسکتا ہے ردعمل کے طور پر تجھے ملک بدر کر دے یا کہیں قید کر کے تیرا وجود ہی فراموش کر بیٹھے۔ اس صورت میں تو جانے کتنے برس قید خانے میں گلتا سڑتا رہے گا۔''

''تیری بات اپنی جگہ درست ہے لیکن اس جیسے لوگ ہی میری اولین ترجیح ہیں۔ اگر ان سازشیوں کو طاقتور بنا دیا جائے تو یہ حکومت سے الجھ جائیں گے۔ اس کشمکش سے ہمیں فائدہ پہنچے گا۔ میں ان عناصر کو زیادہ سے زیادہ فعال بنانا چاہوں گا۔'' صالح نے تجویز دی۔

''میں یہاں کے حالات سے زیادہ آگاہ نہیں ہوں۔ ہمارے لیے بہتر ہے کہ انتظامی معاملات میں بالکل دخل نہ دیں کیونکہ شاہ کو ہم سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہونا چاہیے۔'' قلعہ دار نے سمجھایا۔

''میں تیرے اندازِ فکر سے متفق نہیں ہوں کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ شہر میں انتشار بڑھنے کی صورت میں حکومت کمزور ہوگی۔ بادشاہ کو لامحالہ طور پر تمہاری ضرورت پیش آئے گی اور نتیجتاً تم یہاں اپنی سوچ سے بھی زیادہ فوائد حاصل کرلو گے۔''

صالح کی اس دلیل پر قلعہ دار ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔ بعد ازاں اس نے اپنے چند ساتھیوں سے بھی مشاورت کی۔ سبھی کو صالح رئیس کی یہ تجویز بہت پسند آئی۔ موجودہ حالات ان کے سامنے ہی تھے۔ چارلس اپنے مصائب کی وجہ سے کوئی مدد فراہم کرنے سے قاصر تھا۔ مناسب یہی تھا کہ تیونس میں زیادہ سے زیادہ بالواسطہ دخل اندازی کی جائے اور اس کام کے لیے صالح ہی بہترین انتخاب تھا۔ قلعہ دار نے اسے حکومت کے خلاف سازشوں کی اجازت دے دی تاکہ شاہ حسان فتنوں پر قابو پانے کے لیے قلعہ دار کی مدد طلب کرے۔ تیونس میں انتشار پیدا ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ مقامی متمول افراد اور تاجر لامحالہ طور پر کسی بہتر اور پُرامن مقام کی طرف نقل مکانی کرتے۔ اس مقصد کے لیے جہازوں کی ضرورت ناگزیر تھی۔ ان کی منتقلی کے دوران بحری قزاقی کا سلسلہ بھی شروع ہوسکتا تھا۔

قلعہ دار کی جانب سے مطمئن ہوکر صالح، قیروانی شیخ کے پاس پہنچ گیا جہاں اس لمحے ایک خصوصی مجلس مشاورت رواں تھی۔ موضوع بحث بہرحال شاہ حسان ہی تھا۔ اب ایک نئی تجویز بھی زیرِ غور تھی کہ شاہ حسان کے بجائے اقتدار اس کے بیٹے ''حمید'' کو منتقل کردیا جائے۔ شاہ حسان کا وجود اب اہلِ تیونس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوچکا تھا۔

صالح کو اس مجلس میں کئی سربرآوردہ افراد بھی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ہر ایک کا بغور جائزہ لیتے ایک چہرے کو دیکھ کر بے طرح چونکا۔ اس کے سامنے شہزادہ حمید موجود تھا۔ گویا وہ بھی اپنے والد کے خلاف سازشی منصوبے میں مکمل طور پر شریک تھا۔ اسی لمحے صالح کو بھی وہ اپنی جانب اسی طرح چونک کر متوجہ ہوتا محسوس ہوا۔ وہ قیروانی شیخ کی طرف جھکا اور رازدارانہ انداز میں دریافت کیا۔

''کون ہے یہ شخص؟ آج سے پہلے تو یہ کبھی یہاں دکھائی نہیں دیا۔''

شیخ نے دزدیدہ نظروں سے مسندِ صدر پر براجمان اس پستہ قامت اور گٹھے ہوئے شخص کی جانب دیکھا۔ صالح کی حسیات بھی اسی سمت مبذول ہوگئیں۔ وہ اب اس کی اصلیت سے واقف ہوچکا تھا۔ بظاہر معمولی دکھائی دینے والا وہ شخص ''صمد'' نہایت غیر معمولی تھا۔ اس کا شمار تیونس کے صفِ اول کے تاجروں میں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ شاہ حسان کا مشیرِ خاص بھی تھا۔ اس کا کردار بھی کم و بیش صالح جیسا ہی تھا۔ وہ بحیثیت مشیر دربار میں سازشیوں کے خلاف تقریریں کرتا۔ شاہ حسان کو یقین دلاتا کہ عنقریب سازشیوں کا قلع قمع ہوجائے گا۔ دوسری جانب اس نے شہزادہ حمید کی سرپرستی اور راہنمائی بھی سنبھال رکھی تھی۔ وہ اسے مسندِ اقتدار تک لانے کے لیے بھرپور تعاون کررہا تھا۔ شہزادے کے سوال کا جواب بھی صمد نے ہی دیا اور صالح رئیس کا مختصر تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''اسے قدرت کی جانب سے ایک تحفہ سمجھ لیجیے۔ یہ بہت سے قفلوں کی کنجی ہے۔ وقت پڑنے پر ہمیں سلطنتِ عثمانیہ کی مدد دلوا سکتا ہے۔ ہسپانیہ کو ناکوں چنے چبوا سکتا ہے اور ہمیں بھی موجودہ بحران سے نہایت خوش اسلوبی سے نکال سکتا ہے۔''

''میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ آپ لوگ کسی اجنبی پر اتنی جلدی اعتبار کیسے کرسکتے ہیں؟ میرے والد کا علم نہیں ہے کیا آپ کو؟ وہ اپنے جاسوسوں کو نہایت ماہرانہ انداز میں استعمال کرسکتے ہیں۔ اگر کبھی ہمارا یہ منصوبہ قبل از وقت ان کے علم میں آگیا تو مجھ سمیت ہر ایک شخص بھیانک انجام سے دوچار ہوگا۔'' شہزادہ مضطرب تھا۔

صالح رئیس اس کی کیفیات بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ اس نے نہایت متانت سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کے خدشات بالکل بجا ہیں لیکن میرے بارے میں قطعی بے فکر رہیں۔ میری گواہی وقت خود ہی دے گا۔ میں آپ سے اس حد تک تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں کہ شاہ حسان کے حق میں قلعے میں موجود عیسائی فوج کو حرکت میں آنے سے روک دوں گا۔''

''اے عرب ملاح! تم شاید کسی نشے کے عادی ہو ورنہ اتنے بڑے دعوے نہ کرتے۔''

شہزادے کی اس بات پر صمد بے چین ہوگیا۔ اس کا یہ انداز صالح رئیس کو ناگوار گزرتا تو عین ممکن تھا کہ وہ ان کی مدد سے ہی ہاتھ اٹھالیتا۔ قیروانی شیخ کی کیفیات بھی کم وبیش یہی تھیں۔ اس نے شہزادے کو مخاطب کر کے کہا۔

''اگر آپ کو کسی قسم کے تحفظات ہیں تو ہم آپ کو شاہ حسان کی معزولی تک کہیں روپوش کردیتے ہیں۔''

''یہی بہتر ہے۔ موجودہ حالات وواقعات کے تحت میں کسی پر اعتبار نہیں کرسکتا...... کسی ایک پر بھی نہیں۔'' اس نے دوٹوک کہا۔

صمد کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ اسے حقیقتاً یہ بات ناگوار گزری تھی کہ ان کے خلوص وتعاون کے باوجود شہزادے کو ان پر اعتبار ہی نہیں ہے۔ اس نے خاموشی سے قیروانی شیخ کو شہزادے کے ساتھ جانے کا اشارہ کردیا۔ ان کے جاتے ہی صالح رئیس نے بدمزگی سے کہا۔

''گستاخی معاف محترم! مجھے تو شاہ حسان کی معزولی اور شہزادے کو تخت نشین کرنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آرہا۔ شہزادہ اعصابی طور پر مضبوط ہی نہیں۔''

''فائدہ تو بہرحال ہوگا۔'' صمد نے معنی خیزی سے کہا۔ ''شاہ حسان، چارلس کا باج گزار ہے۔ اس کے بیٹے کو اقتدار سونپنے کا مطلب درحقیقت عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ اس طرح ہم تیونس میں مکمل اسلامی طرزِ حکومت اور اصلاحات نافذ کرسکیں گے۔''

صالح رئیس یہ بات سن کر خاموش ہوگیا۔ اس کے دل ودماغ میں ایک کشمکش برپا تھی۔ وہ بنیادی طور پر کسی تیونسی پر بھروسا نہیں کرتا تھا۔ اہلِ قیروان کی اسلام پسندی اور حب الوطنی پر اسے رتی بھر شبہ نہیں تھا۔ تاہم مجموعی طور پر ان کی اکثریت ملکی اور سیاسی امور کی سمجھ بوجھ سے محروم تھی۔ دوسری جانب سلطنتِ عثمانیہ سے بیزاری میں بھی ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہورہا تھا۔ اس کے وجود میں اب قوم پرستی کا عنصر غالب آنے لگا تھا۔ عرب ہونے کی حیثیت سے اسے خانہ بدوش ترکوں کی زیردستی مجروح کیا کرتی۔ وہ ترکوں کا ساتھ دینے کے لیے فقط اس لیے مجبور تھا کہ خیرالدین باربروسہ نے سلطنتِ عثمانیہ کو اپنا سرپرست بنایا ہوا تھا۔ دل میں کہیں ایک یہ خواہش بھی پنپتی تھی کہ وہ خیرالدین کی مدد سے عربوں کو متحد کر کے انہیں اپنی تقدیر پر مختار وغالب بنادے۔

صالح کو اپنی سوچوں میں الجھے دیکھ کر صمد شدید مضطرب ہوگیا۔ اسے گمان ہونے لگا کہ صالح شہزادے کی باتوں سے بدظن ہوکر اپنا ارادہ ترک نہ کردے۔ یہ صورت حال ان کے لیے بہت تباہ کن ثابت ہوتی۔

''کیا بات ہے؟ اس قدر الجھے ہوئے کیوں ہو؟'' صمد نے تشویش سے دریافت کیا۔

''فی الوقت تو تیونس کے مستقبل پر چھائے تاریک بادلوں کی بابت فکرمند ہوں۔ شہزادے کو اقتدار مل جانے کی صورت میں بھی مجھے حالات بہتر ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔ ہسپانیہ سے اس قدر آسانی سے نجات نہیں ملے گی۔ ان کا قلعہ اور فوج تو پھر بھی یہیں موجود رہے گی۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اس قدر محنت خوامخواہ ہی کررہے ہیں؟ شہزادے کو اقتدار سونپ دینے کے بعد بارہ اہم عہدیداروں پر مشتمل ایک مجلسِ مشاورت قائم کی جائے گی۔ حکومتی فیصلے اسی مجلس کے ہاتھ میں ہوں گے۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ لوگوں کو جو مناسب لگے، کرلیجیے گا۔ میرا کام صرف اتنا ہے کہ عیسائی فوج کو شاہ حسان کی مدد سے روکوں۔ اس کے بعد سب کچھ آپ کے ہی ذمے۔ سیاہ کریں یا سفید۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ ہاں، البتہ مستقبل میں کبھی ہماری مدد کی ضرورت ہو تو کوئی پیغام بھجوا دیجیے گا۔'' صالح نے بیزاری سے کہا۔

صمد کا اضطراب سوا تر ہوگیا۔ وہ اس کے قریب ہوا اور رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔

''جناب! ایسا مت کیجیے گا۔ ہم دونوں ہی کا تعلق عرب نسل سے ہے۔ اس ناتے ہمارا روحانی رشتہ زیادہ مضبوط ہونا چاہیے۔ کم ازکم میری تو یہ شدید خواہش ہے کہ تیونس میں آنے والے اس ممکنہ انقلاب کی دید کے لیے آپ اختتام تک ہمارے ساتھ رہیں۔ باقی رہی بات مدد کی، تو وہ آپ ہی کے توسط سے حاصل کی جاتی رہے گی۔''

صمد کی اس بات نے صالح کے وجود میں دبی چنگاری کو ایک شعلہ بنا کر بھڑکا دیا۔ اس لمحے ذہن میں ایک ہی سوچ تھی کہ قدرت اسے اپنے ارادوں کی تکمیل کا ایک سنہری موقع فراہم کررہی ہے۔ عرب اتحاد کے نام پر اقتدار حاصل کر کے وہ ایسے سبھی اقدامات کرسکتا ہے جس کے خواب جانے کتنی مدت سے آنکھوں میں بسے تھے۔ عربوں کے لیے جہاز سازی کے کارخانے' عربوں کی علیحدہ بحریہ' شام سے طنجہ تک کی بندرگاہوں پر عربوں کا تسلط ایک ایسا

خواب تھا جسے صالح رئیس سلطنت عثمانیہ کے ماتحت خیر الدین، پیالی پاشا اور درگوت کی موجودگی میں مکمل کرہی نہیں سکتا تھا۔اسے درگوت اور صنعان کے سامنے اپنی صلاحیتوں کی نظر اندازی ہمیشہ خار بن کر چبھتی تھی۔ وہ انقلابی لمحات تھے۔ صالح نے اپنے ان ساتھیوں کا دیرینہ تعلق، ان کی محبت وخلوص اور جدوجہد ایک ہی پل میں نظر انداز کردیں۔ عرب اتحاد اور عرب بحریہ کے علیحدہ قیام نے بصارت ہی نہیں بلکہ بصیرت کو بھی چکاچوند کردیا تھا۔اسے اپنا وجود شام سے طنجہ تک کی طویل ترین ساحلی پٹی کا بلاشرکت غیرے اور طاقتور ترین حکمران محسوس ہونے لگا۔ دل ودماغ پر ایک ہی سوچ دستک دے رہی تھی کہ قدرت نے اسے بہترین وقت پر تیونس بھیجا ہے۔ وہ یہاں اپنی صلاحیتیں منوانے کے ساتھ خیر الدین باربروسہ کی طرح بہترین انفرادی شناخت حاصل کرسکتا ہے۔

ان خیالات سے مغلوب ہوکر اس نے صمد کو مکمل یقین دہانی کروائی کہ وہ تیونس کے حالات میں تبدیلی کے لیے ہر طرح سے ان کے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہے۔ اسی اثناء میں قیروانی شیخ بھی وہاں چلا آیا اور صالح سے معذرت کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''شہزادہ کسی اجنبی پر اعتبار کرنے سے خائف تھا میرے عزیز! وہ اس وقت اپنی ذہنی کیفیات کی وجہ سے شدید تحفظات کا شکار ہے۔''

''میں اس کی کیفیات سمجھ سکتا ہوں۔'' صالح نے متانت سے کہا۔ ''عین ممکن ہے کہ تم دونوں بھی میرے بارے میں ایسا ہی کچھ سوچتے ہو۔ میں نے چند لمحے پہلے تیونس سے جانے کا ارادہ جتایا اور اب یہاں قیام کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کشمکش پر تم دونوں بھی یقیناً مشتبہ رہو گے لیکن اب میں تمہیں کسی دھوکے میں نہیں رکھوں گا۔ میرے ذہن نے عرب اتحاد کا خیال سجھایا ہے۔ میں ترکوں کے مقابلے میں ایک الگ بحریہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔''

''خوب! اس طرح تو ہم ترکوں کے تسلط سے آزاد ہوجائیں گے۔ عرب دنیا میں باربروسہ جیسا نام بھی پیدا کرسکیں گے۔'' قیروانی شیخ کے خواب بھی یکدم عود آئے۔

اگلے کچھ لمحے وہ شاہ حسان کی معزولی کے مراحل کی حکمت عملی طے کرتے رہے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ وزراء اور سلطانی عہدیداران کو غائب کردیا جائے۔ اس کے بعد ان میں سے کوئی ایک شخص شاہ حسان سے بیٹے کے حق میں حکومت سے دستبرداری کا مطالبہ کردے۔ شاہ یقینی طور پر یہ بات تسلیم نہیں کرے گا اور اپنی فوج حرکت میں لے آتا۔ فوج بھی اس کا ساتھ نہ دیتی۔ پھر وہ لمحہ آتا جب وہ عیسائی فوج سے مدد طلب کرتا۔ وہ محاذ صالح کے زیر کمان ہوتا۔ عیسائی سپاہ بھی اس کا ساتھ نہ دیتی اور یوں شہزادہ حمید یہ آسانی مسند اقتدار سنبھال لیتا۔

صالح نے البتہ اس موقع پر ایک اور خدشے کا اظہار کرتے ہوئے ان کی توجہ شہزادہ حمید کی جانب مبذول کروائی۔ مستقبل قریب میں اگر وہ ان کے زیر اثر رہنے سے انکاری ہوجاتا تو سارا منصوبہ ہی چوپٹ ہوکر رہ جاتا۔ صالح کے نزدیک بادشاہت کا وجود ہی ان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا لیکن المیہ یہ تھا کہ بادشاہت کے بغیر ملکی انتظام وانصرام رواں بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ صمد نے ایک لمحاتی توقف کے بعد جواب دیا۔

''تاریخ گواہ ہے کہ بادشاہت کے بغیر بھی ملکی انتظام وانصرام رواں رہ سکتا ہے۔ آج سے سترہ، اٹھارہ سو سال قبل فنیقیہ کے تاجر حکمران تھے۔ ہملکر برقہ، ہینی بال اور ہسدروبال ان کے نامور سپہ سالار گزرے ہیں۔ ان کا طرزِ حکومت یہ تھا کہ سو افراد پر مشتمل ایک مجلس حکومت کرتی۔''

''خوب! یہ تجربہ تو ہم بھی کرسکتے ہیں۔'' قیروانی شیخ پُرجوش ہوا۔ ''سو کے بجائے پچیس افراد پر مشتمل مجلس تشکیل دے لی جائے گی۔''

''یہ تجویز بظاہر بہت خوش کن لیکن عملی طور پر ناقابلِ نفاذ ہے۔ بادشاہت کے اس دور میں بیک وقت اتنے بادشاہوں کی حکومت کون تسلیم کرے گا؟''

صالح کے اس اعتراض پر قیروانی شیخ اور صمد ایک بار پھر سوچ میں مبتلا ہوگئے تاہم اس فیصلے کی حتمی شکل شاہ حسان کی معزولی تک مؤخر کردی گئی۔ اس ملاقات اور بحث و تمحیص کے بعد انہوں نے اپنے منصوبوں پر عمل درآمد کے لیے کمر کس لی اور بنیادی نکتہ فراموش کربیٹھے کہ شاہ حسان کے اہلکار انہی کے درمیان موجود تھے۔ وہ اس سازشی اتحاد کی خبریں بادشاہ کو فوری طور پر پہنچا رہے تھے۔ شاہ حسان فی الوقت کسی مصلحت کے تحت ہی کوئی ردعمل دینے سے گریزاں تھا۔ وہ انہیں کسی خاص وقت میں مشترکہ طور پر شکار کرنا چاہتا تھا۔

دوسری جانب صالح رئیس بھی ایک حقیقت سے بے خبر تھا کہ اس کے عملے میں خیر الدین باربروسہ اور سلطان سلیمان کے خصوصی اہلکار موجود ہیں۔ وہ اس مہم کے آغاز سے ہی صالح کی نگرانی پر مامور تھے لہٰذا سلطان سلیمان تک

صالح پر قومیت پسندی کے غلبے کی خبر سب سے پہلے پہنچی۔ اس کے بعد بار بروسہ کے نمائندوں نے بھی یہ اطلاع فراہم کردی کہ ابتدائی چند روز دیانت دارانہ انداز میں کام کرنے کے بعد صالح ''عرب اتحاد'' کے درپے ہوگیا ہے۔

بار بروسہ کے لیے سب سے تکلیف دہ خبر یہ تھی کہ صالح تیونس کی سیاست میں گلے گلے تک دھنس چکا ہے۔ اس نے سلطنتِ عثمانیہ کو ترک خانہ بدوشوں کی حکومت قرار دے کر اس کے مقابل عرب بحریہ کا قیام ضروری سمجھا ہے۔ اگر یہی قیام وہ مسیحی بحریہ کے مقابلے میں کرتا تو بار بروسہ کے دل میں اس کی قدر و منزلت بے پناہ بڑھ جاتی۔

اس ذہنی فتور کے بعد اب صالح کا بار بروسہ کی بحریہ میں شامل رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ خیر الدین کو بوجھل دل و دماغ سے اب کچھ اہم فیصلے کرنے تھے۔

☆☆☆

سلطان سلیمان اور خیر الدین تک پہنچنے والی ان اطلاعات سے بے خبر صالح اپنے خوابوں کی تکمیل میں دوڑ دھوپ کرتا رہا۔ اس نے قلعہ دار کو اس بات کے لیے راضی کرلیا کہ شاہ حسان کی جانب سے امداد طلب کیے جانے پر فوری ردعمل کا مظاہرہ نہ کرے۔ مدد کا بہلاوا دے کر وقت گزاری کرتے رہنا ہی بہتر تھا۔ اس دوران شہزادہ حمید اقتدار سنبھال لیتا۔ ایک کمزور اور ناتجربہ کار شخص کی حکمرانی ان کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوتی۔

قلعہ دار اس کی باتوں سے قائل ہوگیا۔ کچھ روز بعد صالح نے شہزادے سے ملاقات کی۔ اسے قلعہ دار کے اپنی ذات پر اعتماد اور اپنے اقدامات کے متعلق بتا کر ذاتی اعتبار میں اضافہ کرلیا۔ وہ دوطرفہ سیاست کے یہ معاملات بہت خوش اسلوبی سے رواں رکھے ہوئے تھا۔

ان کوششوں میں مگن صالح کو پہلی بدمزگی کا سامنا اس وقت کرنا پڑا جب اس کے ساتھیوں نے تیونس سے روانگی کا اصرار شروع کردیا۔ وہ تیونس میں اس کی حد درجہ دلچسپی کی وجہ سے بہرحال بے خبر نہیں تھے۔ ان میں ''نوری'' نامی ایک یونانی نژاد ساتھی نے اسے بہتیرا سمجھایا کہ سلطنتِ عثمانیہ، ملّتِ اسلامیہ کی بہتری کے لیے ہی کوشاں ہے۔ اس سے کسی قسم کا عناد رکھنا جائز نہیں۔ صالح نے اس کی کسی بھی بات پر کان نہ دھرے۔ اس کی قوم پرستی اور تعصب اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ کسی مثبت پہلو کی جانب دھیان جا کے ہی نہ دیتا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی سوچ راسخ ہو چکی تھی کہ ترک، اسلام کے نام پر ان کے حکمران بن گئے ہیں۔ وہ عرب علاقوں میں بھی اپنے نمائندے حاکم بناتے ہیں۔ عربوں کا یہ استحصال مزید جاری نہیں رہنا چاہیے تھا۔ نوری اس کے ان خیالات پر دکھ و تاسف سے خاموش ہوکر رہ گیا۔

صالح رئیس اپنے منصوبوں پر بہت برق رفتاری سے عمل پیرا تھا۔ اس کے مشورے پر قیروانی شیخ نے شہزادے کو ایک غار میں روپوش کردیا تاکہ بادشاہ کو معزول کرنے کے بعد اسے بہ حفاظت حلیفوں کے مابین محل میں پہنچایا جاسکے۔

ایک طرف یہ سرگرمیاں جاری تھیں تو دوسری جانب شاہ حسان کو اس سازش میں ملوث باغیوں کی فہرست تھمادی گئی۔ اس کے پاس ہی موجود صمد کی رنگت بے طرح متغیر ہوئی۔ اسے اپنا منصوبہ اور خواب ہی نہیں بلکہ اپنی ذات کے پرخچے اڑتے بھی دکھائی دیے تھے۔ اگلے چند لمحے دشوار ترین تھے۔ پھر صمد کو اپنی رکتی سانسیں بحال ہوتی محسوس ہوئیں۔ فہرست میں صمد کا نام شامل نہیں تھا۔

''اس فہرست میں صالح رئیس کا نام شامل نہیں ہے لیکن میرا حکم ہے کہ اس عرب ملاح کو گرفتاری کے بعد میرے پاس علیحدہ پیش کیا جائے۔'' اس نے صمد کو مخاطب کیا۔

''ایسا ہی ہوگا بادشاہ سلامت! آپ کے ہر مجرم کو عبرتناک سزا دی جائے گی۔'' صمد نے فوراً یقین دلایا۔

''الجزائر سے کیا اطلاعات آئی ہیں؟'' شاہ حسان کا اشارہ چارلس کی جانب سے موصول ہونے والی امداد کی طرف تھا۔

جوابی طور پر صمد نے تفصیلاً چارلس پر پڑنے والی موسمی افتاد، بوجیہ میں قیام اور خیر الدین بار بروسہ کے ڈیڑھ سو جہازوں کے بحری بیڑے کے تعاقب سے آگاہ کردیا۔ صمد نے اسے اس بات کا بھی دلاسا دیا کہ چارلس نے محض پسپائی اختیار کی ہے لہٰذا تیونسی عیسائی فوج ان کی مدد کرنے کی قطعی پابند ہے۔

''باغیوں کو سزا دینے کا عمل کب شروع ہوگا؟'' اس نے بے چینی سے دریافت کیا۔

''بہت جلد بادشاہ سلامت! لیکن ناچیز کا مشورہ ہے کہ اس مرحلے کو کل تک مؤخر کردیں۔ میں آج سب باغیوں کے نام ایک خصوصی شاہی مراسلہ جاری کرواؤں گا جس کی رو سے انہیں علم ہوگا کہ وہ بادشاہ کی جانب سے حسنِ کارکردگی کے صلے میں خصوصی انعام و اکرام کے مستحق قرار

پائے ہیں۔ انعام کا یہ لالچ انہیں کہیں بھی فرار نہیں ہونے دے گا اور وہ سر کے بل دوڑتے ہوئے دربار میں چلے آئیں گے۔''

شاہ حسان نے پُرسوچ انداز میں سر کو جنبش دی۔ اسے صمد کی یہ تجویز بہت پسند آئی تھی۔

اگلے روز ہر عہدیدار کا لباس' امید اور باوقار انداز دیدنی تھا۔ یہ سبھی افراد دیوانِ عام میں براجمان تھے۔ یہ عمارت بادشاہ کی شاہی مسند کے سامنے موجود تھی۔ صمد بادشاہ کے دائیں جانب موجود تھا۔ شاہ حسان نے غداروں کی فہرست کاتب کو تھمادی تاکہ وہ اس کے اشارہ کرتے ہی غداروں کے نام پکارنا شروع کردے۔ اس کے بعد بادشاہ نے مخصوص انداز میں تالی بجا کر سپاہیوں کا دستہ طلب کیا۔ یہ اشارہ پاتے ہی عقبی دروازے سے مسلح سپاہیوں کا ایک دستہ برآمد ہوا اور اس کے ایک جانب کھڑا ہوگیا۔ شاہ حسان کے اشارے پر غداروں کے نام یکے بعد دیگرے پکارے گئے۔ اپنا نام سنتے ہی ہر عہدیدار نشست سے کھڑا ہوتا اور لباس کی تلاشی کے بعد ایک جانب جا کھڑا ہوتا۔ ان کے دل انعامات کے تصور سے بلیوں اچھل رہے تھے۔ صالح رئیس کا نام سب سے آخر میں پکارا گیا اور اس کے سامنے آتے ہی شاہ حسان بے طرح چونک گیا۔

''یہ شخص تو خیرالدین باربروسہ کا ساتھی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس سازش کا اصل روحِ رواں باربروسہ تھا۔'' وہ ہڑبڑا کر کہنے لگا۔

صالح اس کی کیفیت سے بہت محظوظ ہوا۔

''تو نے مجھے بالکل درست شناخت کیا لیکن افسوس تجھے اس شناخت پر تاسف یا خوف محسوس کرنے کا زیادہ وقت نہیں ملے گا۔''

شاہ حسان کو اس کے اطوار کھٹکنے لگے۔ صمد نے اسے نہایت ملائمت سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بادشاہ سلامت! فہرست میں ایک غدار کا نام موجو نہیں ہے۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر میں نے الگ کاغذ راندراج کیا تھا۔''

شاہ حسان نے اس کے ہاتھ سے کاغذ تھام لیا اور درج شدہ نام پڑھ کر بدک گیا۔

''شہزادہ حمید بن حسن...... وہ تو فرار ہو چکا ہے۔ اس کا نام کیوں پکارا جائے گا؟''

''ہم نے شہزادے کی جائے پناہ تلاش کرلی ہے۔'' صمد نے اس کی کیفیت سے مزید حظ اٹھایا۔

''ان سب غداروں کو موت کی سزا دی جاتی ہے۔ ان کی گردنیں اڑا دی جائیں۔'' شاہ حسان نے طیش میں کہا۔

''ایسا کیسے ممکن ہے جناب؟'' وہ معصومیت سے بولا۔ ''دنیا کی کوئی بھی عدالت ملزم کو اپنی صفائی میں دلائل دینے کا حق ضرور دیتی ہے۔''

''میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ ان بیسیوں افراد کے دلائل سنتا پھروں۔'' اس نے جھنجلا کر جواب دیا۔

''تو ان کی وکالت میں کیے لیتا ہوں۔ انہوں نے بھی آپ کے خلاف ایک مقدمہ دائر کرنا ہے جس میں یہ فردِ جرم عائد ہے کہ آپ نے اپنے سامنے اندلس کی عیسائی سپاہ سے تیونس میں لوٹ مار کروائی' قتل وغارت کا بازار گرم کیا اور خواتین کی آبروریزی پر بھی مجرمانہ غفلت اختیار کی۔'' صمد اطمینان سے بولا۔

''ان کمتر لوگوں کی کیا مجال کہ یہ میرے خلاف اس طرح مقدمے دائر کرتے پھریں؟ میں ان سب کی گردنیں اڑادوں گا۔'' وہ طیش میں چلّایا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان کے سر قلم کردیں۔

سپاہی اپنی جگہ پر بالکل ساکت کھڑے رہے۔ ان کا یہ انداز دیکھ کر شاہ حسان کا دماغ الٹ گیا۔ وہ غصے میں مغلظات کی بوچھاڑ کرتا اب اس سازش کی مکمل اصلیت بھانپ گیا تھا۔ اسی دوران شہزادہ حمید بھی کسی جانب سے نمودار ہوا اور سپاٹ نظروں سے والد کی یہ کیفیات دیکھنے لگا۔ شاہ حسان اب چیخ چیخ کر قلعہ دار اور عیسائی فوج کو اپنی مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ صمد آگے بڑھا اور اس کے سر سے تاج نوچ کر اتار لیا۔ قیروانی شیخ بھی آگے بڑھا اور ایک تلوار کی نوک اس کی پشت سے لگادی۔ اس کے اشارے پر صالح رئیس نے ایک کاغذ شاہ حسان کو تھمایا اور سفاکی سے کہنے لگا۔

''اس پر دستخط کرو فوراً ورنہ یہ تلوار تمہارے بدن میں پیوست ہوجائے گی۔''

شاہ حسان نے پھٹی نظروں سے کاغذ کا جائزہ لیا۔ اس میں مختلف الزامات پر فردِ جرم عائد کی گئی تھی۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے دستخط کردیے۔ اس کے بعد شاہ حسان کو دھکیلتے ہوئے ایک جانب لے جایا گیا۔ صمد نے نہایت احترام سے شہزادہ حمید کا بازو تھاما اور مسند پر بٹھا کر تاج اس کے سر پر سجا دیا۔ اس کے اگلے حکم پر شہر بھر میں چراغاں اور جشن کا اہتمام کیا جانے لگا۔

اس ماحول اور رنگینی سے لطف اندوز ہوتے صالح

کچھ دیر بعد قلعہ دار سے ملاقات کے لیے چل دیا۔ قلعہ دار حالات کی اس نئی کروٹ پر سخت مضطرب تھا۔
''یہ سب بہت غلط ہوا ہے۔ شاہ حسان کو معزول نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔'' اس نے گہری نظروں سے صالح کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''یہ سب اہلِ تیونس کے اندرونی معاملات ہیں۔ جو ہوا اچھا ہی ہوا ہوگا۔'' صالح نے دانستہ طور پر بے نیازی جتائی۔
''ہاں، یہ بات تو نے بالکل درست کہی۔ جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ کم از کم اس سے مجھے اتنا تو علم ہو گیا کہ تو خیر الدین باربروسہ کا ساتھی ہے۔''
قلعہ دار کی اس باخبری نے صالح کو وقتی طور پر گڑبڑا دیا۔ اسے اپنی کم اندیشی پر بھی تاؤ آیا تھا کہ دربار میں عیسائی اہلکاروں کی موجودگی اس بار بھی کیونکر فراموش کر دی۔ اس نے سنبھلتے ہوئے قلعہ دار کو جواب دیا۔
''میرا ماضی جو بھی رہا ہو، میں تم لوگوں کے تعاون سے بحری قزاقی کا آغاز اب بھی کرنا چاہتا ہوں۔''
''یہ قزاقی کاغذ کے جہازوں پر کرو گے کیا؟'' قلعہ دار درشتی سے کہنے لگا۔
''تیرا دماغ تو نہیں چل گیا۔ میرے پاس دو جہاز اور عملہ موجود ہے۔'' صالح کو اس کے انداز پر غصہ آیا۔
''تیرا اس میں کوئی قصور نہیں۔'' وہ طنزاً ہنسا۔ ''تو نے مجھے دھوکے میں رکھا اور جوابی طور پر تجھے بھی دھوکا ہی ملا۔''
یہ کہہ کر قلعہ دار نے ایک کاغذ اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس میں درج عبارت نے صالح کے ہوش اڑا دیے۔ اس کے نائب نوری نے واضح طور پر لکھا تھا کہ عملہ، صالح کی دہری روش سے بالکل مطمئن نہیں تھا۔ اس نے خیر الدین کی جانب سے سونپی گئی ذمے داری کو نظر انداز کرتے ہوئے تیونس کی سیاست میں الجھ کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ سلطنت عثمانیہ کے مقابلے میں عرب بحریہ اور عرب اتحاد کا قیام صریحاً بغاوت تھی۔ اس دوران صالح نے ایک بار بھی حسن آغا سے رابطہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی باغیانہ روش سے تنگ آ کر ہی نوری نے باربروسہ سے خود رابطہ کیا تھا۔ اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد وہ اسی کے حکم پر عملے سمیت رہوڈز روانہ ہو رہا ہے۔ اس خط کے اختتام پر نوری نے صالح کی اعلیٰ بحری صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے ذہنی فتور پر تاسف کا اظہار کیا تھا۔ وہ اس کے راہِ راست پر آنے اور بہترین مستقبل کے لیے دعاگو بھی تھا۔

صالح رئیس کو اپنے قدموں تلے حقیقتاً زمین کھسکتی محسوس ہوئی تھی۔ اب وہ باربروسہ کی نظروں میں دائمی طور پر معتوب ہو چکا تھا۔
''تو تمہارا عرب اتحاد کیسے پروان چڑھے گا اب؟ جہاز سازی کے کتنے کارخانے قائم کر لو گے؟'' قلعہ دار نے ایک بار پھر طنز کیا۔
''کاش عرب اس قابل ہوتے۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''لیکن میں بھی اپنے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر ضرور کروں گا۔''
''تمہارے اس دھوکے کے جواب میں میرا دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں گرفتار کر کے ہسپانیہ روانہ کر دوں لیکن اس سے مجھے کوئی بھی ذاتی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ دوسرا خیال یہ بھی آتا ہے کہ تم ہسپانیہ کی بحریہ میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اس طرح تم باربروسہ سے انتقام بھی لے سکتے ہو۔'' قلعہ دار نے اسے نئی تجویز دی۔
''قزاقیت تو میں ضرور شروع کروں گا۔ عرب اتحاد بھی قائم کر کے دکھاؤں گا۔'' وہ پُرعزم تھا۔
''اپنے نئے شاہی دوستوں کے متعلق کسی مدد کے گمان میں مت رہنا۔ یہاں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا۔'' قلعہ دار نے تنبیہ کی۔
صالح رئیس وہاں سے رخصت ہو کر قیروانی شیخ کے پاس چلا آیا جس نے شاہ حسان کی آنکھوں میں آتشیں سلائیاں پھیرنے اور غداروں کو عبرتناک سزائیں دیے جانے کی رسم سے آگاہ کیا۔ صالح کو اس بات پر شدید حیرانی تھی کہ چند گھنٹوں میں ہی شہزادے کو سلطنت میں کون سے غدار نظر آنے لگے ہیں۔ اس نے قیروانی شیخ کو بھی اپنی حیرت سے آگاہ کیا تو وہ بے نیازی سے کہنے لگا۔
''یہ امورِ سلطنت ہیں۔ آپ ابھی ان سے واقف نہیں۔ آپ نے فی الوقت بحری دنیا کے رموز دیکھے ہیں۔ یہ دنیا بالکل ہی منفرد ہے۔''
صالح اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ قیروانی شیخ اسے اپنے ہمراہ لیے شاہی محل روانہ ہو گیا۔ انہیں محل میں داخلے کے لیے کسی بھی روک ٹوک کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ نئے بادشاہ حمید نے ان کی آمد کی اطلاع سن کر انہیں ''دارالضیافت'' پہنچانے کا حکم دے دیا۔ صالح رئیس ہر ایک شے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ دارالضیافت والے کمرے میں نشستوں کا انتظام بہترین تھا تاہم کہیں بھی کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ قیروانی شیخ صالح کو کمرے کی آرائش و ترتیب کے پس منظر سے آگاہ کرنے لگا۔ مخصوص

زرنگار کرسی پر شاہ حمید کو براجمان ہونا تھا۔ دیگر کرسیوں پر شاہ کے وفادار اور جاں نثار اپنی نشستیں سنبھالتے۔

صالح کو بائیں جانب ایک انوکھا منظر دکھائی دیا۔ وہاں بڑے بڑے تختوں سے چوڑے چوڑے لکڑیوں کے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے جن سے لوہے کی لٹکتی زنجیریں بھی منسلک تھیں۔ قیروانی شیخ اسے ہر ایک گوشے سے آگاہ کرتا رہا۔

صالح کو اس کا انداز بہت عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا رویہ کچھ ایسا تھا کہ وہ یہاں کا منتظم اعلیٰ بن گیا ہو۔ انہی سوچوں میں الجھے اب وہ شیخ کے ساتھ ایک ایسی کوٹھری تک چلا آیا جہاں گڑھے میں شدید آگ دہک رہی تھی۔ صالح کو اس آگ کے اندر لوہے کی دو سلائیاں بھی دبی ہوئی نظر آئیں۔

''یہ سلائیاں کس لیے ہیں اور آپ نے مجھے ان زنجیروں کے متعلق بھی کچھ نہیں بتایا؟'' صالح نے پوچھا۔

''یہ سلائیاں تھوڑی دیر بعد شاہ حسان کی آنکھوں میں پھیر دی جائیں گی اور زنجیروں والے تختوں سے غداروں کو جکڑا جائے گا۔ اس کے بعد ان کے لیے مختلف سزائیں تجویز ہوں گی۔'' اس نے بے نیازی سے بتایا۔

صالح گہری خاموشی سے وہاں ہر شے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس خاموشی کی ایک بڑی وجہ قیروانی شیخ کا رویہ بھی تھا۔ وہ اس وقت صمد کی طرح برتاؤ کرتا دکھائی دے رہا تھا اور محل میں داخلے کے بعد صمد کہیں دکھائی ہی نہیں دیا تھا۔ صالح بے اختیار اس کی بابت دریافت کر بیٹھا۔

''مضطرب کیوں ہو رہے ہیں؟ صمد سے بھی بہت جلد ملاقات ہو جائے گی۔ تم فی الحال عرب بحریہ کے قیام میں سرمایہ کاری کا تخمینہ لگا کر مجھے آگاہ کرو۔'' قیروانی شیخ نے یکدم اپنا اندازِ تخاطب تبدیل کیا۔

اسی اثناء میں شاہ حمید نے انہیں اپنے پاس طلب کر لیا۔ قیروانی شیخ موقع غنیمت جان کر عرب بحریہ کے قیام کی اہمیت بیان کرنے لگا۔

''یہ کام اتنا بھی آسان ثابت نہیں ہوگا۔'' شاہ حمید نے اسے فوراً ٹوکا۔ ''سب سے پہلی رکاوٹ تو سرمایہ کاری میں کمی ہے۔ ہمارے پاس اتنا سرمایہ ہی کہاں ہے کہ جہاز سازی کے کارخانے قائم کر سکیں۔ اس کے بعد ہسپانوی قلعہ دار مخالف بن جائے گا۔ وہ ہمارا ایک بھی جہاز حلق الوید میں نہیں اترنے دے گا۔''

''چارلس کی شکستگی اور درماندگی ابھی اس قابل نہیں کہ وہ اپنے قلعہ دار کی کوئی مدد کر سکے۔ پھر ہمارے ساتھ صالح رئیس بھی تو ہے۔ یہ باربروسہ کو ہمارا پیغام پہنچا کر اس کی امداد فراہم کروا دے گا۔'' قیروانی شیخ نے فوراً اگلی تجویز دی۔

''ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ باربروسہ چارلس کا حریف ہے۔ ہم اسے اپنی مدد کے لیے کیسے طلب کر سکتے ہیں؟'' شاہ حمید نے پھر ٹوکا۔

ان دونوں کی بحث نظر انداز کیے صالح رئیس اپنی ہی سوچوں اور خدشات میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے تاحال قیروانی شیخ کو اس حقیقت سے آگاہ نہیں کیا تھا کہ باربروسہ اور اس کے تعلقات منقطع ہو چکے ہیں اور اب وہ اس سے امداد طلب کرنے کا مجاز ہی نہیں۔

دوسری جانب قیروانی شیخ بھی شاہ حمید کو قائل کرنے میں ناکامی پر خاصی مایوسی کا شکار ہو رہا تھا۔ اس نے شکستگی سے اتنا کہہ کر گفتگو کا اختتام کر دیا۔

''آپ کی بادشاہت میں اب محض چند گھنٹے ہی باقی رہ گئے ہیں۔ آپ کے والد کی آنکھوں میں آتشیں سلائیاں پھیرنے اور غداروں کی ہلاکت میں بھی اب زیادہ وقت نہیں۔ اس لیے عرب بحریہ کے مسئلے پر کوئی حتمی بات ہو جانا ہی بہتر ہے۔''

شاہ حمید نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔ اگلے چند گھنٹے بھی گویا چشم زدن میں ہی بیت گئے۔ قیروانی شیخ، صالح رئیس کو دوبارہ محل کے مخصوص حصے میں لے گیا۔ کچھ ہی دیر میں بادشاہ حمید بھی وہاں پہنچ گیا۔ صالح رئیس کو یہ دیکھ کر کافی اچنبھا ہوا کہ اس کے محافظ دستوں میں ایک بھی سابقہ یا شناسا چہرہ موجود نہ تھا۔ یہ سبھی محافظ قیروانی تھے اور یہ بات بھی واضح تھی کہ ان کا تقرر قیروانی شیخ نے ہی کیا تھا۔ اس کے بعد ان قیدیوں کو تختوں سے منسلک زنجیروں سے جکڑ دیا گیا۔

صالح رئیس کے لیے اپنی بصارت پر یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے ان چہروں کی دید تھی جنہوں نے شاہ حسان کی معزولی میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ صالح کو تو اب تک یہ گمان تھا کہ وہ سبھی افراد اعلیٰ انتظامی عہدوں کے مستحق قرار پائیں گے لیکن صمد جیسے بااختیار اور ذی شعور شخص کو بھی انہی قیدیوں میں دیکھ کر اس کی سٹی گم ہو گئی۔ صالح، قیروانی شیخ کو کسی دوسرے معاملے میں متوجہ دیکھ کر صمد کے پاس گیا اور دبی آواز میں پوچھنے لگا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ تیرا اور تیرے ساتھیوں کا ایسا انجام تو میں نے تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔''

صالح کی اس بات پر صمد نے قیروانی شیخ کو ڈھیروں مغلظات سے نوازتے ہوئے کہا۔

''یہ سب اسی ملعون کا کیا دھرا ہے۔ اسی نے ہم سب کو گرفتار کروایا ہے۔''

''لیکن شاہ حمید کی عقل پر کیوں پتھر پڑ گئے ہیں؟ وہ اس قدر احسان فراموش کیسے ہو گیا کہ خود کو اقتدار میں لانے والوں کو ہی مجرم بنا دیا؟'' صالح مزید حیران ہوا۔

''یہ بھی اسی بدطینت انسان کا کیا دھرا ہے۔'' صمد نے دانت پیسے۔ ''اس نے شاہ حمید کو یہ باور کروایا ہے کہ شاہ حسان سے غداری کرنے والے مستقبل میں اس کے خیر خواہ کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ موقع ملتے ہی کسی نئے شخص کو اپنا بادشاہ بنا لیں گے۔''

صالح نے یہ سن کر تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''یعنی اب تیونس کو قیروانیوں نے یرغمال بنا لیا ہے لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آرہی کہ اس سازش میں تو خود میں بھی شریک تھا پھر قیروانی شیخ نے مجھے اب تک کیوں آزاد چھوڑا ہوا ہے؟''

''کیونکہ وہ تمہارے تعاون سے عرب بحریہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ ایک بار اس بحریہ کا وجود عمل میں آگیا، اس کے بعد وہ اپنا نام بطور ''بانی'' درج کروا کے تمہیں بھی بلا تامل قتل کروا دے گا۔'' صمد نے انکشاف کیا۔

صالح کا بدن سنسنا کر رہ گیا۔ اس کے مزید کچھ بھی کہنے سے قبل قیروانی شیخ دوبارہ اسی سمت چلا آیا۔ اس کے ساتھ پابجولاں شاہ حسان بھی تھا۔ چند ہی لمحوں میں شاہ حمید مسندِ شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔ اس کے بیٹھتے ہی نئے محافظوں اور نئے درباری اراکین نے بھی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔

قیروانی شیخ نے شاہ حسان کی فردِ جرم پڑھ کر سنائی اور اسے نابینا کر دینے کی سزا کا اعلان کر دیا۔ دیگر باغیوں کے لیے البتہ سولی پر چڑھائے جانے کی سزا تجویز ہوئی۔ شاہ حمید نے فوراً سزا نامے پر دستخط کیے اور بے تاثر نگاہوں سے اپنے والد کی جانب دیکھنے لگا جسے زبردستی فرش پر لٹانے کے بعد کئی آدمی دبوچ کر وہیں بیٹھ گئے تھے۔ شاہ حسان کی چیخ و پکار اور التجائیں دل دہلائے دے رہی تھیں۔ حبشیوں نے اشارہ پاتے ہی اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دیں۔ کربناک چیخیں ختم کرنے کے لیے منہ میں ڈھیروں روئی ٹھونس دی گئی۔

دیگر قیدیوں میں سب سے پہلے صمد کو سولی پر چڑھایا گیا۔ اس کے بعد دیگر اہم عہدیداران کو بھی اسی انداز میں عدم روانہ کر دیا گیا۔ صالح رئیس یہ مناظر دیکھ کر اپنے ہم قوم افراد سے نہایت مایوس ہوا۔ اسے عرب اتحاد کا خواب بھی خواب ہی رہتا محسوس ہو رہا تھا۔ صمد کا آخری انکشاف یاد کر کے اب یہاں مزید قیام کا خیال بھی احمقانہ تھا۔ اس لمحے صالح رئیس کو اپنا وجود خلا میں معلق محسوس ہوا۔ وہ خیر الدین باربروسہ کے پاس لوٹ سکتا تھا نہ ہی عربوں کے ساتھ مزید قیام کر سکتا تھا۔ اس کی آخری امید الجزائر تھا جو اسے قبول کر سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں فرار کا منصوبہ بہت تیزی سے پروان چڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے اس منصوبے پر بہت تیزی سے عمل درآمد کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسی صورت میں وہ عیسائی قلعہ دار کی آمد سے قبل منظرِ عام سے غائب ہو سکتا تھا۔

صالح براستہ خشکی الجزائر روانہ ہو گیا۔ اس سفر کے دوران بھی وہ مسلسل ذہنی آزار میں مبتلا تھا کہ باربروسہ اس کا جرم کبھی معاف نہیں کرے گا۔ ترک بحریہ اور سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف عرب بحریہ کے قیام کی کوشش سنگین جرم اور بغاوت سے کم نہ تھی۔

شب و روز کا یہ سفر بالآخر الجزائر میں اختتام پذیر ہوا۔ وہاں کی صورتِ حال ابتر تھی۔ ساحل پر شکستہ جہازوں کا ڈھیر دکھائی دے رہا تھا۔ حملہ آوروں کی پھیلائی گئی گندگی کی صفائی کا عمل بھی جاری تھا۔ ہر طرف متعفن لاشوں کی بدبو سانس لینا دشوار کرنے لگی۔ صالح رئیس کو حسن آغا کی تلاش تھی۔ وہ ساحل پر بھٹکتے ہوئے حسن کو تلاشنے میں مگن تھا کہ اسے باربروسہ کا ایک اور قریبی ساتھی دکھائی دیا۔ وہ بھی صالح کی جانب ہی متوجہ تھا۔ اس کی طیش زدہ نظروں اور چہرے پر در آنے والی سختی سے صالح کو اندازہ ہو گیا کہ باربروسہ نے اس کی باغیانہ روش کے متعلق سبھی کو مطلع کر دیا ہے۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے ایک بار پھر حسن آغا کی تلاش میں مگن ہو گیا۔

حسن ان دنوں پہاڑی درّوں میں لاشوں کو ٹھکانے لگوا رہا تھا۔ صالح سے اس کی ملاقات بھی پہاڑی درّے پر ہی ہوئی۔

''کہاں سے آرہے ہو بھئی اور اکیلے کیوں ہو؟'' اس نے تپاک سے دریافت کیا۔

''تیونس سے تنہا ہی آیا ہوں۔ میرا اب کوئی ساتھی نہیں ہے۔''

صالح کے اس انکشاف اور پھر ذریعۂ سفر نے حسن آغا کو دنگ کر دیا۔

''باربروسہ سے تیرا کوئی رابطہ ہوا ہے کیا؟'' صالح نے اس کی کیفیت نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''نہیں، اس خطرناک موسم نے موقع ہی کہاں دیا۔''

وہ سنبھل کر بولا۔
صالح اس کے جواب اور انداز پر خاموش ہوگیا۔
''اب تم آئے ہو تو میری کچھ مدد ہی کردو۔ چارلس اور اس کے ساتھی اپنا مال واسباب یہاں چھوڑ کر فرار ہوگئے ہیں۔ میرے آدمی ان کی صفائی کررہے ہیں۔ تم بھی ہاتھ بٹادو۔''
حسن کی اس فرمائش پر صالح نے تھکاوٹ کے باوجود ہامی بھرلی۔
شام کے بعد حسن نے صالح کے لیے خیمے اور بستر کا بندوبست کردیا۔ صالح نے اس دوران حسن آغا سے مزید گفتگو کی ذہن سازی کی ہوئی تھی۔ اس نے تمہید باندھتے ہوئے کہا۔
''چارلس جس قدر شکستگی سے بوجھ گیا ہے، ہم چاہیں تو اس پر حملہ کرکے نیست ونابود بھی کرسکتے ہیں۔ اسے فنا کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔''
''میرے پاس فی الحال اتنی بحری قوت نہیں۔ پھر موسم کی خرابی بھی تو الگ آزار بنی ہوئی ہے۔'' اس نے ٹالا۔
''اگر مجھے ڈیڑھ درجن کے قریب جہاز اور دو چار ہزار سپاہی مل جائیں تو میں یہ کام بہ آسانی انجام دے لوں گا۔'' صالح نے پیشکش کی۔
''اس موسم میں ایسا خطرہ مول لینے کا مشورہ نہیں دوں گا میں تمہیں۔ ویسے تمہارے اپنے جہاز کہاں ہیں؟'' اس نے بظاہر عام سے انداز میں دریافت کیا۔
''میں براستہ خشکی یہاں آیا ہوں۔ جہاز اب میرے پاس نہیں ہیں۔''
صالح کے جواب سے حسن آغا کے ہونٹوں پر معنی خیز تبسم جھلکا۔
''یعنی مجھے ملنے والی اطلاعات بالکل درست تھیں۔ تم نے عرب اتحاد قائم کرنے کے لیے باربروسہ کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔''
''نہیں، ایسا کیسے ممکن ہے بھلا؟ میرے خلاف بڑی زبردست سازش کرکے باربروسہ سے غلط بیانی کی گئی ہے۔ اصل معاملہ کچھ یوں تھا کہ تیونس کے عرب اپنے اتحاد سے عرب بحریہ تیار کرنے میں میری مدد چاہتے تھے لیکن مجھے اس دوران اندازہ ہوچکا تھا کہ اتنا سرمایہ محنت اتحاد اور پھر جہاز سازی کے کارخانے جیسی جدوجہد ان کے بس کا روگ ہی نہیں۔''
وہ طے شدہ حکمتِ عملی کے تحت کہنے لگا۔
''حاسدین ہمیشہ یونہی جڑیں کاٹا کرتے ہیں۔ مجھے تمہاری حالت کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہے۔ میری مانو تو باربروسہ کے کسی حتمی فیصلے تک یہیں قیام کرلو۔ میں بھی بھرپور کوشش کروں گا کہ تم دونوں کے باہمی اختلافات ختم کروانے میں اپنا کردار ضرور ادا کروں۔''
حسن آغا کی اس پیشکش پر صالح خاموش ہوگیا۔ وہ اگلے دو روز تک حسن کے ساتھ ہی رہا۔ حسن نے اسے چارلس کا چھوڑا گیا سامان، توپیں، اس سے لوٹا گیا اناج کا ذخیرہ دکھایا۔ بھوک ونقاہت کے باعث وہیں رہ جانے والے عیسائیوں اور جشنِ فتح منانے کے لیے آنے والی عیسائی خواتین کا نظارہ بھی ایک عبرت ناک منظر تھا۔ قیدیوں کے بارے میں حسن آغا کا یہی ارادہ تھا کہ مناسب وقت آنے پر انہیں اسکندریہ یا شام فروخت کرکے اچھے دام کھرے کرلیے جائیں۔
حسن آغا کی اس خوش اخلاقی اور مہمان نوازی سے صالح کو کچھ حد تک امید ہوچلی تھی کہ وہ باربروسہ کو اس کی سنائی گئی کہانی پر قائل کرلے گا۔ اسی دوران حسن کو باربروسہ کا پیغام موصول ہوا۔ اس نے سختی سے تاکید کی تھی کہ صالح کو بہرصورت اپنے پاس ہی مقیم رکھے۔ اگر باربروسہ اگلے کچھ روز میں الجزائر نہ پہنچ سکا تو وہ اسے صالح کے بارے میں حتمی فیصلے سے آگاہ کردے گا۔ صالح کی خوش قسمتی ہی تھی کہ ایک روز ساحل پر باربروسہ کے دیرینہ ساتھی عبداللہ سے ملاقات ہوگئی۔ عبداللہ اس کے احسانات کی وجہ سے خاصا زیرِ بار تھا۔ وہ مضطرب سے انداز میں صالح کو کہنے لگا۔
''یہ تم نے کیا کردیا استاد صالح؟ باربروسہ کو اپنا مخالف کیوں بنالیا؟''
''وہ سب میرے خلاف ایک سازش تھی۔ حسن آغا اور میں مشترکہ طور پر اسے قائل کرلیں گے۔'' وہ اعتماد سے بولا۔
''کس بھرم میں جی رہے ہو استاد صالح؟'' اس نے اپنا سر پیٹا۔ ''تمہیں تو یہ بھی علم نہیں ہوگا کہ باربروسہ نے حسن آغا کو ایک پیغام بھجوایا ہے کہ تمہیں بالکل اِدھر اُدھر نہ ہونے دیا جائے۔''
''مجھے واقعی کچھ علم نہیں۔'' صالح سٹپٹایا۔
''تمہارے لیے حالات بہت خطرناک صورتِ حال اختیار کرتے جارہے ہیں استاد! اندرونِ خانہ اطلاعات دوں تو تمہیں قیدی بنانے کے بعد قسطنطنیہ بھیجے جانے کا قوی امکان

ہے۔ وہاں یقینی طور پر باربروسہ تمہارے خلاف مقدمہ غداری کا فیصلہ سنادے گا۔ ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ تمہیں سلطان سلیمان کے سپرد کردیا جائے گا۔ علم ہوا ہے کہ وہ بہت ہی طیش زدہ ہے۔ بارہا ایک ہی عزم کا اظہار کررہا ہے کہ عرب بحریہ کے قیام کی پاداش میں صالح رئیس کو عبرت کا نشان بنادے گا۔''

صالح کو شدید خوف محسوس ہوا۔ اسے اپنے لیے کہیں کوئی امان نظر ہی نہیں آرہی تھی۔ بقا کے لیے اب کوئی فوری فیصلہ ناگزیر تھا۔ قدرت کو شاید اس کی حالت پر رحم آگیا۔ اسی روز بوجیہ میں مقیم چارلس کی جانب سے ایک تین رکنی وفد کی الجزائر آمد ہوئی۔ وہ اپنے ہمراہ ایک الگ ہی نوعیت کا مطالبہ لے کر آئے تھے۔ انہیں قیدی خواتین میں سے کیتھی نامی ایک ایسی لڑکی کی تلاش تھی جو اراگون کے جاگیر زادے کاسٹرو کی منظورِ نظر تھی۔ کاسٹرو نے حسن کو کیتھی کے عوض منہ مانگے دام دینے کی ہامی بھری تھی۔ حسن نے اپنے اہلکاروں سے قیدی خواتین میں منادی کروا کے کیتھی کی تلاش کا حکم دیا۔

اگلے نصف گھنٹے کے بعد بھی کیتھی کہیں سے برآمد نہ ہوئی تو وفد کے ارکان گھروں کی تلاشی کا اصرار کرنے لگے۔ وہ بردہ فروشوں کے بازار میں اپنے ہم وطنوں کی ارزاں ترین فروخت اور کسمپرسی دیکھ کر اپنے جذبات بہ مشکل ضبط کیے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد اتنا علم ہوا کہ کیتھی کسی قبائلی کی تحویل میں ہے۔ حسن کی اس مصروفیت کے دوران صالح نے اس عیسائی وفد سے گفتگو کا ارادہ کرلیا۔ بھیانک مستقبل کی دید نے اسے فوری فیصلے پر مجبور کیا۔ اسے اب سلامتی کا ایک ہی در نظر آرہا تھا کہ چارلس سے الحاق یا بحیرۂ روم میں نجی حیثیت سے قزاقی کا آغاز کردے۔ وہ وفد کے پاس گیا اور انہیں اپنا تعارف کروانے کے بعد چارلس سے ملاقات پر اصرار کرنے لگا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ چارلس کے لیے خاصا سودمند ثابت ہوسکتا ہے۔ وفد کے ارکان نے بے دلی سے ہامی بھرلی۔ اسی دوران کیتھی بھی ایک قبائلی سردار کے گھر سے برآمد ہوگئی۔ سردار نے منہ مانگی قیمت پر اسے عیسائیوں کے حوالے کردیا۔

وفد کی روانگی کے بعد صالح نے کسی نہ کسی طور ان کا تعاقب شروع کردیا۔ ان اراکین کو پہلے تو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ صالح رئیس، چارلس کی گرفتاری کے لیے یہاں آیا ہے۔ اس کے شدید اصرار اور منت سماجت پر وہ اسے بے دلی سے چارلس کے خیمے تک لے آئے۔ وہاں موجود سبھی عیسائی ایک عرب مسلمان کو دیکھ کر حیران ہورہے تھے۔ صالح رئیس کو بھی اپنے دل میں ایک عجیب سی خلش محسوس ہورہی تھی۔ بقا کی جبلی خواہش اسے مسلمانوں کے بدترین دشمن کے در پر لے آئی تھی۔

تینوں ارکان کیتھی کو لیے خیمے میں داخل ہوگئے جہاں چارلس اور ڈوریا مے نوشی میں مگن تھے۔ چارلس، کیتھی کے بربری لباس کو دیکھ کر خاصا مشتعل ہوگیا۔ اس نے باربروسہ کی شان میں بالخصوص اور مسلمانوں کے لیے بالعموم دشنام طرازی کا آغاز کردیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے اپنے خدمت گار کو کاسٹرو کے پاس روانہ کردیا تاکہ وہ اسے کیتھی کی آمد کی اطلاع دے سکے۔ وفد کے ارکان نے موقع دیکھ کر چارلس سے صالح رئیس نامی ایک عرب ملاح کا ذکر کردیا۔ ڈوریا یہ نام سن کر حیرت سے اچھل ہی پڑا۔

''صالح رئیس! وہ یہاں کیسے آگیا؟ کہاں ہے اس

سنہرے اقوال

☆ ظالم کو معاف کردینا مظلوموں پر ظلم ہے کیونکہ ظالم سانپ کی طرح ہوتا ہے جسے اگر چھوڑ دیا جائے تو وہ ضرور ڈستا ہے۔

☆ عادت اکثر ضرورت میں بدل جاتی ہے اس لیے بُری عادتوں کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔

☆ اصل خوبصورتی فن کی ہونی چاہیے۔

☆ غافل نہ بیٹھ اور اس دنیائے فانی کے چندروزہ گھروندے سے دل نہ لگا۔

☆ دوست ایسے شخص کو بنانا چاہیے جس کا ظاہر و باطن ایک ہو۔

☆ بڑے ہونے میں بڑے دکھ ہیں۔ چھوٹوں کو یہ سختیاں نہیں۔ ستارے امن سے ہیں، گہن چاند سورج کے لیے ہے۔

☆ اصل بڑے وہ ہیں جو اپنے منہ سے نہیں کہتے کہ ہم بڑے ہیں۔ ہیرا کب کہتا ہے کہ میں ہیرا ہوں؟

☆ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ساس چاہتی ہے کہ اس کا بیٹا سوفیصد اس کا رہے اور بہو چاہتی ہے کہ اس کا شوہر سوفیصد اس کا رہے۔ اگر دونوں اپنی فیصد میں بڑی فراخ دلی سے کمی کرلیں تو مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔

☆ اگر سکھی اور کامیاب رہنا چاہتے ہو تو کل کا کام آج کرلو اور آج کا کام ابھی کرلو۔

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

وقت؟'' اس نے مضطرب ہو کر دریافت کیا۔
''باہر موجود اپنی طلبی کا منتظر ہے۔'' ایک رکن نے بتایا۔
''کون ہے یہ شخص؟ نام تو کہیں سنا ہوا لگ رہا ہے۔''
چارلس نے شراب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔
''خیر الدین باربروسہ کا ساتھی ہے اور اس کا کوئی بھی ساتھی معمولی نہیں ہوا کرتا۔'' وہ نرمی سے بولا۔
''خیر الدین...... سمندری پانیوں کا وہ عقاب کیسا ہے؟ اب تک تو تیز رفتاری سے دوڑتا تھک گیا ہوگا۔''
چارلس کی یہ بے سروپا باتیں ڈوریا کے لیے نئی نہیں تھیں۔ الجزائر میں پڑنے والی افتاد کے بعد چارلس ذہنی طور پر خاصا غیر متوازن ہو چکا تھا۔ شراب نوشی میں کثرت کے ساتھ خوراک بھی بے اعتدال تھی۔ وہ اپنے امور سلطنت سے لاتعلق ہو کر صرف بسیار خوری کی جانب مائل نظر آتا۔ گٹھیا کا مرض بھی شدت اختیار کر چکا تھا۔ طبیب اسے گوشت سے ہر ممکن پرہیز کی تلقین کرتے لیکن وہ تھا کہ خنزیر کے گوشت سے ہاتھ روک کے ہی نہ دیتا۔
چارلس کی ان باتوں اور دگرگوں حالت کو تاسف سے دیکھتے ڈوریا، صالح کے پاس گیا اور اسے لیے خیمے کے اندر چلا آیا۔ چارلس نے اسے دیکھتے ہی ایک بار پھر بے معنی گفتگو کا آغاز کر دیا۔ صالح اس کی حالت اور اندازِ گفتگو دیکھ کر شدید حیران تھا۔ ڈوریا اسے لیے دوسرے خیمے میں چلا آیا۔
''تم یہاں جاسوسی کے لیے آئے ہو یا باربروسہ نے تمہیں چارلس کی گرفتاری کے لیے بھیجا ہے؟''
''ایسا کچھ بھی نہیں۔ میرا فی الوقت باربروسہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ ایشیائے کوچک کے کسی دور افتادہ مقام پر موسم کی تبدیلی کا منتظر ہے۔ میں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔'' وہ پژمردگی سے کہنے لگا۔
''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ تم یقیناً کسی خاص مقصد کے تحت مجھ سے یہ جھوٹ بول رہے ہو۔'' ڈوریا بے یقینی سے بولا۔
''ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ میرا باربروسہ سے نظریاتی اختلاف ہو گیا تھا۔ میں اپنی قوم کے ساتھ ہونے والی ناانصافی برداشت نہیں کر سکا اس لیے عرب اتحاد کے درپے ہو گیا۔ میری بدقسمتی تھی کہ یہ کوشش آغاز میں ہی ناکام ہو گئی۔''
ڈوریا خاموشی سے اس کی گفتگو میں سچائی تلاشنے لگا۔ باربروسہ ماضی میں پیری ویزا کے معرکے میں خود کو فروخت کرنے کی پیشکش سے اسے خاصی زک پہنچا چکا تھا۔ ان دونوں کے درمیان مزید گفتگو کی ابتدا سے پہلے ہی چارلس کا ایک خصوصی اہلکار آیا اور عجلت میں کہنے لگا۔
''شہنشاہ معظم نے فوری طور پر سفر کی تیاری کا حکم دیا ہے۔''
''ایسی کیا افتاد آن پڑی ہے یہاں؟'' ڈوریا حیران ہوا۔
''انہیں صالح رئیس کو یہاں دیکھ کر تحفظات محسوس ہونے لگے ہیں کہ خیر الدین باربروسہ کی آمد بھی کسی وقت ہی متوقع ہے۔ انہوں نے صالح کے بارے میں بھی یہی ہدایت کی ہے کہ وہ فوری طور پر الجزائر پہنچ جائے اور باربروسہ کو مطلع کرے کہ اس سے مصالحت کی کوئی صورت نہیں نکل سکتی۔''
صالح یہ سن کر مایوس ہو گیا۔ وہ اپنے مدار سے ہٹ کر شدید ملال کا شکار تھا۔
''تم ہمارے ساتھ ہی بارسلونا چلو۔ وہاں پہنچ کر مزید گفتگو اور معاملات طے کریں گے۔'' ڈوریا نے پیشکش کی۔
صالح کے پاس سرِ تسلیم خم کر دینے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔
بارسلونا تک کا وہ سفر صالح کی زندگی کا انوکھا اور مشکل ترین دور تھا۔ ایک خلش اور احساسِ ندامت مسلسل دامن گیر رہی۔ ایک لغزش نے اسے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا تھا۔ جس عقابِ آب کے ہمراہ وہ اپنے شکار پر جھپٹ کر اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا، آج اسی عقابِ آب سے بچاؤ کے لیے وہ بھی بزدلوں کی طرح فرار ہونے پر مجبور تھا۔ یہ سلسلہ اب جانے کب تک جاری رہنا تھا۔

☆☆☆

خیر الدین باربروسہ اپنے اس قریبی ساتھی کی بغاوت پر تا حال ملول تھا۔ اسے صالح کی قوم پرستی اور مفاد پسندی نے شدید دکھ پہنچایا تھا۔ الجزائر میں حالات بہتر ہونے کے بعد وہ رہوڈز سے قسطنطنیہ واپس چلا گیا۔ کچھ وقت اور گزرا تو وہ سمندری سفر سے گریز کرنے لگا۔ بڑھتی عمر نے اب اسے ان چاہی پژمردگی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ کسی بھی مہم کے لیے درگوت، پیالی پاشا اور صنعان کو ہدایات دے دیا کرتا۔ درگوت کی بہادری اور لگن سے اسے امید ہو چلی تھی کہ وہ اس کے ادھورے خوابوں کی تکمیل ضرور کرے گا۔
اگلا ڈیڑھ برس یونہی جمود اور پژمردگی میں بیت گیا۔ ایک روز سلطان سلیمان اس سے ملاقات کے لیے چلا آیا۔ باربروسہ نے خوشگوار حیرت اور بھرپور تپاک سے اس کا استقبال کیا۔ ابتدائی علیک سلیک اور اچھے دنوں کی بہترین یادیں دہرانے کے بعد سلطان کہنے لگا۔

''چارلس اب بحری جنگوں میں حصہ نہیں لیتا۔ حکومت کے لیے وہ اپنے بیٹے فلپ کو تیار کر رہا ہے۔''

''موذی نے یقیناً اپنی جانشینی میں ایک موذی ہی تیار کیا ہوگا۔'' وہ نقاہت سے کہنے لگا۔

''ڈوریا اپنے متبادل کے طور پر جوانیکیو کو تیار کر رہا ہے۔'' سلطان نے ایک اور خبر دی۔

''بہادر لڑکا تھا۔ یقیناً بحری میدان میں خوب ناموری حاصل کرے گا۔'' اس نے کشادہ دلی سے اعتراف کیا۔

''فرانس کا بادشاہ فرانسس بھی انتقال کر گیا ہے۔''

''یعنی میرے سبھی مقابل آہستہ آہستہ اپنا وجود کھونے لگے ہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''ہاں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم بھی خود پر بڑھاپا طاری کر کے اپنی پرواز ترک کر دو۔'' سلطان نے فوراً ٹوکا۔ ''تم اب بھی بھرپور توانا اور جوان ہو۔''

''جوانوں کو بھی تو مسلسل جدوجہد کے بعد آرام کی ضرورت پیش آ ہی جاتی ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ میں بھی ذرا ستانے بیٹھ گیا ہوں۔''

باربروسہ کا انداز ایسا دوٹوک تھا کہ سلطان مزید کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

''تمہارے اس وقفۂ آرام میں بحری کمان کون سنبھالے گا؟'' اس نے ایک توقف کے بعد دریافت کیا۔

''درگوت! اس کام کے لیے اس سے بہتر شخص کوئی بھی نہیں۔'' وہ برملا کہہ اٹھا۔ ''وہ جہاز سازی سے متعلق ایک ادنیٰ مزدور سے لے کر اعلیٰ کاریگر تک کی خصوصیات کا مالک ہے۔ قباحت صرف ایک ہے کہ کسی بھی شہر یا قلعے پر حملے کی صورت میں وہ بھائی عروج کی طرح احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی بہادری، دوراندیشی اور مصلحت پسندی پر غالب آ جاتی ہے۔ درگوت کی یہی شخصی کمزوری مجھے مایوس کر دیا کرتی ہے۔''

اس کے بعد سلطان نے خیرالدین کے ہمراہ جہاز سازی کے کارخانے کا معائنہ بھی کیا۔ مختلف امور پر گفتگو بھی جاری رہی۔ سلطان نے تجویز دی کہ درگوت کو امیرالبحر جبکہ صنعان کو اس کا مشیر خاص مقرر کر دیا جائے۔ پیالی پاشا بری امور سنبھال لے گا۔

''مناسب خیال ہے لیکن مجھے درگوت کی جانب سے شبہ ہے کہ وہ سلطان کے سوا کسی کی برتری اور حکم کو گوارا نہیں کرے گا۔'' اس نے خدشہ ظاہر کیا۔

''وہ بحری امور میں مختار کل ہوگا۔ اس کے معاملات اور فیصلوں میں کوئی بھی دخل اندازی نہیں کرے گا۔'' سلطان نے فوراً کہا۔

باربروسہ خاموش ہو گیا۔ ان دنوں اس کے مزاج پر خاموشی اور بے نیازی غالب رہنے لگی تھی۔ صالح رئیس کی بے وفائی بھی تا حال دل کا ناسور بنی ہوئی تھی۔ اس کی قوم پرستی نے باربروسہ کے ذہن میں ایک دائمی خلش پیدا کر دی تھی۔ جس کام اور خواہش کی تکمیل میں اس کا بھائی عروج پاشا اپنی جان کی بازی ہار گیا تھا، خیرالدین بھی بھرپور کوشش کے بعد اس مرض کا خاتمہ نہیں کر پایا تھا۔ صالح کے دل و دماغ پر غالب آنے والی قوم پرستی نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ عروج پاشا کی طرح اس کا سفر بھی رائگاں ہی رہا ہے۔ عرب اور غیر عرب کا یہ تنازعہ سلطنت عثمانیہ کو دیمک کی طرح کھوکھلا کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

''صالح رئیس کے بارے میں کوئی خبر ملی؟'' سلطان کے استفسار نے اس کے دل میں چٹکی سی بھری۔

''بارسلونا پہنچ چکا ہے وہ۔ دکھ تو یہ ہے کہ اب اس سے دشمن کی صف میں سامنا ہوگا۔'' باربروسہ نے گہری سانس لی۔

''ایک صالح رئیس ہی کیا؟ تیونس بھر اسی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ آج بھی سلطنت عثمانیہ کے بجائے اندلس کے عیسائیوں کو ترجیح دیتے ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ مسائل ختم ہو جائیں گے۔'' سلطان پُرامید تھا۔

باربروسہ نے ایک بار پھر خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔ اس کے دل و دماغ میں ایک ہی خدشہ غالب تھا کہ دشمن نے ان کی کمزوری بھانپ لی ہے اور اب وہ اسی میدان میں کھل کھیلتے ہوئے دلوں میں دبی تعصب کی چنگاریوں کو مزید ہوا دیتا رہے گا۔ عالم اسلام کو اس ناسور سے پاک کرنے کی خواہش تا حال تشنہ تھی اور نہ جانے کب تک یونہی تشنہ ہی رہتی۔ سلطان اس کی حالت دیکھ کر مایوسی کا شکار ہونے لگا۔ اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ زندگی بھر مختلف جنگوں میں فتح یاب ہونے والا باربروسہ اپنی داخلی جنگ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے لگا ہے۔ مسلم دنیا کا باہمی انتشار اس کے وجود سے توانائی چھین چکا ہے۔

سلطان سے ملاقات کے کچھ ہی روز بعد باربروسہ علیل ہو گیا۔ درگوت اور صنعان ہمہ وقت اس کی تیمارداری میں مگن رہتے۔

''بحریہ کی کمان اب تم نے سنبھالنا ہے درگوت! دشمن

کو کبھی خود پر حاوی ہونے کا موقع نہ دینا۔‘‘ اس نے شفقت سے درگوت کو مخاطب کیا۔

’’آپ راہنمائی کے لیے میرے ساتھ ہوں گے تو میں کوئی غلطی کیسے کرسکوں گا بھلا؟‘‘ درگوت نے اس سے زیادہ خود کو دلاسا دیا۔

باربروسہ اب صنعان کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔

’’درگوت کی بہرصورت اطاعت کرتے رہنا۔‘‘

’’آپ کا حکم میرے لیے ہر بات سے اہم ہے امیر! میری جانب سے آپ کو شکایت کا کبھی کوئی موقع نہیں ملے گا۔‘‘ اس نے خلوص سے جواب دیا۔

’’صالح رئیس کو ایک بار اس کے اعمال کی سیاہی ضرور دکھانا۔ اسے ایک بار ضرور احساس دلانا کہ میں اس پر شدید اعتبار کرتا تھا۔‘‘ وہ دکھ سے کہنے لگا۔

’’ہم دنیا کے آخری کونے تک اس کا تعاقب کریں گے امیر! بہت جلد آپ کے قدموں میں ڈھیر ہوگا وہ۔‘‘ درگوت نے عزم جتایا۔

’’میری تدفین ’’شاخ زریں‘‘ کے قریب کروانا۔ میرا مقبرہ شاخ زریں میں کھڑے جہازوں سے نظر آنا چاہیے۔‘‘

باربروسہ کی اس فرمائش اور آنکھوں میں لحہ بہ لحہ بجھتی جوت نے انہیں آبدیدہ کر دیا۔ دلاسے، امیدیں اور علاج کچھ بھی کارگر نہ ہوا اور ایک روز باربروسہ اپنے ادھورے خوابوں کی خلش سمیٹے آخری سفر پر روانہ ہوگیا۔ سلطان نے اس کی قبر پر ’’مات امیر البحر‘‘ کندہ کروایا اور یہ فرمان بھی جاری کیا کہ ہر ترکی بیڑا کسی بھی مہم پر روانگی سے قبل باربروسہ کی قبر پر فاتحہ خوانی کرنے اور اس کے بعد ایک توپ کی سلامی بھی دی جائے۔

☆☆☆

مریم نے اپنی گود میں خوابیدہ بچے کی پیشانی پر محبت بھرا بوسہ ثبت کیا اور اسے بستر پر ایک جانب لٹا دیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی کی واضح جھلک تھی۔ اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے طاق میں رکھا قرآن پاک اٹھایا اور کپکپاتے لبوں سے تلاوت کرنے لگی۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ منذر بھی وہیں چلا آیا۔ اس کے چہرے پر بھی خاصی سنجیدگی اور آزردگی ثبت تھی۔

’’داؤد سو گیا ہے کیا؟‘‘ اس نے خوابیدہ بیٹے کو دیکھ کر برسبیل تذکرہ دریافت کیا۔ بیٹے کا نام ہی نہیں نقوش اور خوشبو بھی اسے شہید بھتیجے کی یاد دلایا کرتا۔ بھتیجے کی کمی مزید کھلنے لگتی۔

’’جی ہاں۔ آپ نے کھانا ابھی کھانا ہے تو میں نکالے دیتی ہوں۔‘‘ مریم نے محبت سے پوچھا۔

’’نہیں۔ تم تلاوت جاری رکھو۔ مجھے ابھی کھانے کی بالکل تمنا نہیں۔‘‘ منذر نے افسردگی سے جواب دیا۔

مریم نے مزید کچھ دیر تلاوت جاری رکھی اور پھر منذر کے پاس آبیٹھی۔

’’امیر کی کمی کیسے پوری ہوسکے گی؟‘‘ اس نے آزردگی سے باربروسہ کی رحلت کی جانب اشارہ کیا۔

’’یہ کمی تو خیر کبھی بھی پوری نہیں ہوگی۔‘‘ وہ بھی دلگیر تھا۔

’’ان کے بہت سے خواب ادھورے رہ گئے۔‘‘ مریم کو خلش محسوس ہوئی۔

’’ہاں، وہ بھی عروج پاشا کی طرح مسلم اتحاد کو مضبوط نہ کرسکا۔‘‘

’’صالح رئیس کی دغا بازی ان کے دل کا ناسور بن گئی۔‘‘ مریم تاسف سے کہنے لگی۔

’’صالح رئیس اپنے اعمال کی سزا ضرور بھگتے گا۔ وہ چارلس اور ڈوریا کے پاس کبھی مطمئن نہیں رہ سکے گا۔‘‘ وہ تلخ ہوا۔

’’کیا درگوت امیر باربروسہ کا حقیقی جانشین ثابت ہوسکے گا؟‘‘ مریم کو کئی تحفظات لاحق تھے۔

’’مجھے قوی امید ہے ایسا ہی ہوگا۔ صرف وہی امیر کے ادھورے خوابوں کی تکمیل کرسکتا ہے۔ وہ باربروسہ کے ہر مجرم کو عبرت کا نشان بنائے گا۔ چشم فلک ایک نئی داستان رقم ہوتے دیکھے گی۔ اس چشم نے اب تک عقاب آب کی پرواز اور شکار دیکھے تھے۔ اب وہ درگوت کی ہمت و بہادری کی گواہ بنے گی۔‘‘

’’پروردگار! امیر کو ہر کروٹ جنت نصیب فرمائے۔‘‘ مریم نے خلوص سے دعا کی۔

’’آمین...... اور پروردگارِ عالم اسلام کو خوابِ غفلت سے بیدار کر کے دائمی اتحاد نصیب فرمائے۔‘‘ منذر بھی دعا گو تھا۔

مریم کی آنکھوں سے آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے۔ اس قدر شکستہ حالی کے باوجود نئے خوابوں نے آنکھوں کے دریچوں پر دوبارہ دستک کا آغاز کر دیا تھا۔

(ختم شد)

ماخذات:

سلیمان عالی شان... تاریخ افریقا...

تاریخ الجزائر   خلافتِ اندلس

ہماری محبت کی کہانی وہیں ختم ہوئی۔ تابوت میں پڑے زندگی سے عاری اس کے مُردہ وجود کے ساتھ......
اور میں اس کی سمت یوں دیکھ رہی تھی جیسے کنوئیں میں گری ہوئی کوئی پینی۔

میں نے اپنی تمام خواہشات اس پر قربان کر دی تھیں، میں اتنی بے وقوف تھی کہ میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ وہی وہ مرد ہے جو میری قسمت بدل سکتا ہے۔ میں نے خود ہی اپنے آپ پر ظلم کیا۔ میں جیسے کسی فیری ٹیل میں جی رہی تھی۔

اور مجھے ملا کیا؟ صرف مایوسی، فریب اور دکھ کی وہ گہرائیاں جن سے میں ہمیشہ نا آشنا رہی تھی۔

یہاں تک کہ اپنے جس روپ کو وہ دنیا کے سامنے پیش کرتا تھا وہ جیسا ہونے کا دکھاوا کرتا تھا، وہ بھی ایک عظیم دھوکا تھا۔

اس کے پاس اور تھا ہی کیا۔ ایک موتیوں سی چمکدار

کبھی کبھی انسان محبت کے رستے پر چلتے چلتے اچانک سمت بدل کر نفرت کی راہ پر قدم رکھ دیتا ہے... ایسا کیوں ہوتا ہے... بس یہی وہ نقطہ ہے جسے ہر کوئی نہیں سمجھ پاتا کہ محبت کو نفرت میں بدلنے کے لیے باہر کی سازشوں کی ضرورت نہیں پڑتی... یہ تو اس کا اندر ہی ہوتا ہے جو باقاعدہ منصوبہ ساز ہوتا ہے... وہ جو ٹوٹ کر محبت کرتی تھی... جب اعتبار ٹوٹا تو وہ بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی۔

محبت کی راہ پر چلنے والے دو مجرم مسافروں کا انجام

بعد از مرگ

عائشہ نصیر

مسکراہٹ، چند مہربان الفاظ اور بھاری جیبوں کا وزن......
وہ جانتا تھا اس سے کیسے کام لینا ہے......اس نے زندگی میں بھی اپنے اس فن سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اب اپنی موت کے بعد بھی، جب اس کی والدہ.... گھر کے عقبی حصے میں تعزیت کے لیے آنے والوں میں گھری ہوئی تھیں، بہت سے لوگ اس کی لاش کو دیکھنے کے موقع کے لیے میرے پیچھے انتظار کر رہے تھے لیکن کسی نے مجھے جلدی کرنے یا وہاں سے ہٹنے کے لیے نہیں کہا۔ مرنے والے کی غمزدہ منگیتر کو کون جلدی کرنے کے لیے کہہ سکتا ہے؟ خاص طور پر جب ہماری جوڑی کو ایک پرفیکٹ میچ سمجھا جاتا تھا۔

اور میں بھی سمجھتی تھی اس وقت تک جب تک کہ اس کے رازوں نے اس کی اس شبیہہ کو دھندلا نہیں دیا۔ میں نے اپنی انگلیوں کو اس کے گال پر پھیرا، یخ اور زرد رخساروں کے نیچے اس کا ٹھہرا ہوا خون۔ ''میں اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔'' میں دھیرے سے بڑبڑائی تھی اور پھر خود پر ہی حیرت ہونے لگی۔ یہ میں کیسے کر سکتی ہوں؟

میرے دل نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ بے بسی سے آنسو ایک بار پھر میرے رخساروں پر بہہ نکلے۔

اس کے ڈارک براؤن بال، اس کا پیلا چہرہ اور سیاہ سوٹ جو صرف اس موقع کے لیے تیار کیا گیا تھا، میری اداسی کی دھند میں دھندلایا ہوا تھا۔ ابھی تو وہ اپنی جوانی کے جوش میں تھا، ابھی تو وہ تیس کا بھی نہیں ہوا تھا۔

''میری۔'' ایک ہاتھ نے ہلکے سے میرے بازو کو تھپتھپایا۔ ''تم پانچ منٹ سے یہاں کھڑی ہو۔''

میں نے نظریں اٹھا کر اپنی دوست کیٹی ایورلی کو دیکھا، جو میرے پاس کھڑی تھی، اس کی نیلی آنکھوں میں فکرمندی اور ترحم بھرا ہوا تھا۔

اس کے ماتمی ہیٹ کے جالی والے پردے نے اس کی پیشانی کو ڈھکا ہوا تھا، اس کے چیری جیسے سرخ ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ وہ مجھے اسی ترس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے بچپن میں دیکھا کرتی تھی جب میں اپنے پیارے ''سلکی'' کے کھو جانے پر روتی۔

بس فرق صرف اتنا تھا کہ یہ آٹھ ہفتے کا کوئی بلی کا بچہ نہیں تھا جسے ہم دفن کرنے جا رہے تھے۔

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اس کی گرم انگلیاں جارج کی ٹھنڈی لاش سے بہت مختلف تھیں۔ ''آؤ میرے ساتھ، آتشدان کے پاس بیٹھو۔'' وہ مجھے دور لے آئی۔ اس نے میرے خیالات کو بھٹکا دیا تھا..... اسے ایسا کرنے کی ہمیشہ سے آزادی تھی۔ جیسے جارج کو تھی جب میں نے اس پر بھروسا کیا تھا۔

میں کتنی بے وقوف تھی۔ میں نے ایک سسکی اپنے لبوں میں ہی دبالی۔

ہم چیس لاؤنج پر جا بیٹھے جس کے گہرے قرمزی رنگ پر سنہری تاروں سے فلیورس۔ ڈی۔ لیس کا ڈیزائن بنایا گیا تھا۔ جلتے ہوئے بلوط کی خوشبو سے میری ناک بھرنے لگی تھی اور میں آگ سے لہرا کر اٹھتے ہوئے اس دھوئیں کو دیکھ کر سوچ رہی تھی...... روح نے بھی ایسے ہی جارج کے جسم کو چھوڑا ہوگا۔

''اسے موت سے بھی ڈر نہیں لگا تھا۔'' میں دھوئیں کو گھورتے ہوئے بڑبڑائی۔ کیٹی نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

''اس نے اپنی نیند میں اس دنیا کو الوداع کہا ہے میری..... جب وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کا یقین ہے۔'' اس نے میرا ہاتھ اتنی زور سے دبایا کہ مجھے لگا وہ میری انگلیاں ہی توڑ دے گی۔ ایسا وہ تب کرتی تھی جب وہ میری بھلائی کے لیے مجھ سے کوئی جھوٹ بولنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''اور کیا پتا جب اس نے اپنی آخری سانسیں لیں تب وہ تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا ہو، شاید..... کیا ہر مرنے والا اپنے آخری لمحات میں اس انسان کو نہیں سوچتا جسے وہ سب سے زیادہ پیار کرتا ہے؟''

''ہونہہ..... ہر پیار کرنے والا۔'' میرے حلق میں کڑواہٹ گھل گئی۔ ''کاش میں تمہیں بتا سکتی کہ جارج کے پاس میرے علاوہ بھی سوچنے کے لیے دوسری عورت تھی۔''

''تمہیں خود کو سنبھالنا ہوگا میری۔'' وہ کھسک کر میرے مزید قریب ہوئی تو اس کی سلک کی اسکرٹ ٹانگوں پر سے سکڑ گئی۔

''ہم میں سے کسی کو اس کی توقع نہیں تھی۔ جارج ایک متحرک آدمی تھا اور تمہارے لیے تو اس کی محبت ہمارے سامنے تھی۔''

''وہ بہت تکلیف کے عالم میں مرا ہے۔'' میرے گرم آنسو میرے گالوں پر گرنے لگے۔ ''اس کی ماں نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی موت سے چند گھنٹے پہلے بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے قے ہو رہی تھی نوکر بالٹیاں لے کر اس کے کمرے میں آ رہے تھے اور وہ اپنے پیٹ کو پکڑے شدید درد سے دہرا ہو رہا تھا۔ کیٹی نے میرا سر اپنے کندھے سے لگایا۔ میں نے

اس کی لیوینڈر کی خوشبو محسوس کی۔
یہ مجھے ہمیشہ ان باغات سے بھرے علاقے کی یاد دلاتی تھی، جہاں اس نے رہنے کا انتخاب کیا تھا۔ ''بند کرو یہ تکلیف دہ باتیں سوچنا۔ اس سے تمہیں کوئی مدد نہیں ملے گی۔''
''تو ان جھوٹی باتوں سے ملے گی جو تم مجھے بہلانے کے لیے کر رہی ہو؟'' میرا لہجہ تیز ہوا۔
''ہاں...... کم سے کم تمہاری ان اذیت دینے والی باتوں سے تو بہتر ہیں......''
''میں بچی نہیں ہوں کیٹی۔'' میں نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر پکڑ لیا۔
پورے کمرے میں رونے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ میں نے جھانک کر دیکھا کہ مجھ سے زیادہ غمگین کون ہوسکتا ہے۔ مسز بلیک بورن، جارج کی والدہ، وہ عورت جنہوں نے اسے جنم دیا تھا۔
وہ اپنے سیاہ ریشم کے لباس میں فرش پر بیٹھی، آگے پیچھے ہل رہی تھی، اس کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔
''میرا بیٹا...... میرا بیٹا! اسے میرے حوالے کر دو۔'' اس کی آواز پھٹی۔ ''پلیز! اسے اس کی ماں کو واپس دے دو۔''
بلیک بورن اس کے پاس آیا، اس کے پاس گھٹنے ٹیک کر، اس کے کان میں سرگوشی کی لیکن وہ نہیں اٹھی۔ اس کے آنسو شدید تر ہوتے اس کی ٹھوڑی سے نیچے بہہ رہے تھے۔
''ایسا مت کرو ہنی۔'' مسٹر بلیک بورن نے لجاجت سے کہا۔ ''ان لوگوں کو مزید غمزدہ نہ کرو جو جارج سے ملنے آئے ہیں۔''
''وہ مرا نہیں ہے۔'' اس نے چلا کر کہا۔ ''وہ زندہ ہے۔ میں جانتی ہوں۔ مجھے صرف دعا کرنی ہے اور اسے گاڈ سے واپس مانگنا ہے۔''
''ایسا نہیں ہوتا۔'' وہ ایک لمحے کے لیے رکے اور حاضرین کو دیکھنے لگے۔ ''اس نے ہمارے جارج کو اپنے پاس بلا لیا ہے۔''
''نہیں، نہیں! میں جانتی ہوں۔ جارج میرے پاس واپس آئے گا۔'' ہارے ہوئے انداز میں سر گھٹنوں پر رکھتے ہوئے وہ بلک بلک کر رونے لگیں۔
کیا یہ پاگل پن نہیں تھا کہ وہ سمجھ رہی تھیں کہ اپنی دعا سے وہ اس سانحے کو بدل سکتی ہیں...... مگر حقیقت یہی تھی اور سب جانتے تھے کہ جارج کی موت جوں کی توں رہے گی۔
کیٹی نے میرے کندھے کو تھپتھپایا۔ ''یہ اداسی تمہاری صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ رومال سے میرے آنسو پونچھنے لگی۔ مجھے احساس بھی نہیں تھا اور مسز بلیک بورن کو روتے دیکھ کر میرے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔
''کیا خیال ہے کل سہ پہر ہم ایک ساتھ چائے پئیں؟'' اس نے یوں کہا جیسے کمرے میں کوئی مردہ وجود نہ ہو، جیسے کسی عام گھر میں کوئی اور عام سی دوپہر ہو۔ ''بولو کیا تم آؤ گی؟''
میں نے سر ہلا دیا۔ میں اس پر اعتراض نہیں کر سکتی تھی۔ یا تو میں اپنے بستر پر لیٹ کر اپنی غلطیوں، اپنے پچھتاووں اور جارج کی دھوکا دہی پر روتی...... یا، میں اپنی عزیز از جان دوست کے ساتھ کچھ گھنٹے گزارتی۔
''ٹھیک ہے۔ میں آؤں گی۔'' میں نے کہا مگر اچانک ہی میری نظر میرے پاس سے گزرنے والی عورت کے سیاہ لباس پر گئی۔ میں نے نظر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھنا چاہا، یہ سمجھے بغیر کہ مجھے اس کا چہرہ دیکھنے کی خواہش کیوں ہوئی اور میں نے اسے پہچان لیا کہ وہ کسی تھی۔ وہ سیدھی مسز بلیک بورن کے پاس چلی گئی، اپنی دس سالہ بیٹی کو ہاتھ سے پکڑے۔ اس کے لباس کے فیتے فرش پر گھسٹ رہے تھے، اس نے اپنا رومال نکالا اور گھٹنوں کے بل مسز بلیک بورن کے پاس بیٹھ گئی...... اپنا بازو ان کے گرد حمائل کر کے وہ انہیں رومال پیش کر رہی تھی۔ میرے اندر طیش کی ایک شدید لہر اٹھی۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی یہاں آ کر منہ دکھانے کی۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی اس گھر میں آئے ...... میں کھڑے ہو کر چیخنا چاہتی تھی۔ میں بھاگ کر اس کے چہرے پر اپنے پنجے گاڑنا چاہتی تھی۔ لیکن ...... میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں بس ہاتھ گود میں رکھے اپنی جگہ بت بنی بیٹھی رہی اور کیٹی میری حالت سے بے خبر تھی۔
اس گھر میں کوئی بھی چیز عام نہیں تھی۔ اس دن کچھ بھی عام نہیں تھا۔
کیٹی کے ساتھ اکیلے ایک دوپہر بھی میری زندگی کے معمولات کو واپس نہیں کر سکتی تھی۔ دنیا کے تمام لوازمات جو کچھ ہوا اسے تبدیل نہیں کر سکتے تھے اور یہ بات مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

''میں نے کل تمہیں اس عورت کو گھورتے ہوئے دیکھا تھا۔'' کیٹی نے لیمن ٹارٹ اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بات کا آغاز اس بات سے کیا جس کے بارے میں شاید اس کا خیال تھا کہ کافی بے ضرر ہے لیکن اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ بات سنتے ہی میرے اعصاب یکلخت تن گئے تھے۔

''کون؟'' میں نے بھی انداز بے پروار کھتے ہوئے اسے یہی تاثر دیا کہ یہ واقعی عام سا سوال ہے۔
''جس کے ساتھ ایک چھوٹی لڑکی بھی تھی۔'' اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جو مسز بلیک بورن کو تسلی دے رہی تھی۔''
''تمہارا مطلب ہے جس وقت وہ رو رہی تھیں؟''
''ہاں اسی وقت۔'' اس نے سر ہلایا۔
میں نے ارل گرے ٹی کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا۔ حلق سے معدے تک ایک آگ سی لگتی چلی گئی۔ میں اس عورت کو جانتی تھی...... میرا اس سے کبھی باقاعدہ تعارف نہیں ہوا تھا۔ میں لندن کی سڑکوں پر کبھی اس سے ٹکرائی بھی نہیں، لیکن میں جانتی تھی کہ وہ کتنی گناہ گار تھی۔ غاصب فطرت والی۔ وہ جو چاہتے ہیں، چھین لیتے ہیں، یہ سوچے بغیر کہ کس سے چھین رہے ہیں۔
''میں اس سے کبھی نہیں ملی۔'' یہ بالکل جھوٹ نہیں تھا۔
''میری۔'' کیٹی مجھے سخت نظروں گھورنے لگی۔ ''اس کی موجودگی نے تمہیں کافی ڈسٹرب کر دیا تھا۔ تمہاری سانسیں تیز ہوگئی تھیں اور تمہارے ہاتھ تمہاری گود میں ایک دوسرے میں جکڑے ہوئے تھے۔ مین نے تمہارا چہرہ نہیں دیکھا، لیکن میں تمہاری کمر، تمہارے کندھوں میں تناؤ دیکھ رہی تھی۔''
''میری وہ حالت مسز بلیک بورن کو روتے ہوئے دیکھ کر ہوئی تھی۔''
''جھوٹی...... تم اسے جانتی ہو۔'' وہ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے مجھے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ''تم اس کی موجودگی سے واضح طور پر پریشان نظر آرہی تھیں۔''
''نہیں......'' میں نے اپنی نظریں اس پر سے ہٹالیں۔
کچھ لوگ ہوتے ہیں جو غصے کے دوران گرم ہوجاتے ہیں۔ ان کا خون ان کے گوشت کے نیچے ابلنے لگتا ہے۔ ان کے گال سرخ ہوجاتے ہیں، جیسے گھوڑے کے چابک سے ہزار بار مارے گئے ہوں۔
لیکن میں نہیں۔ میں سخت ہو جاتی ہوں۔ کسی سرکنڈے کی طرح۔ میرے جسمانی اعضا تن جاتے ہیں۔ جب مجھے جارج کے دھوکے کا علم ہوا تھا میری تب بھی ایسی ہی حالت ہوئی تھی......
اور کبھی کبھی میں غصے کی حالت میں ایک چھڑی کی طرح بن جاتی ہوں...... ان کے سروں پر برسنے کے لیے تیار جو مجھے اس حال میں پہنچاتے ہیں۔

اور اس وقت اس کی پوچھ گچھ نے مجھے اتنا مشتعل کر دیا تھا کہ میں کسی بھی وقت بلاسٹ ہونے کے لیے تیار تھی۔
''کم آن۔'' کیٹی نے اپنا چائے کا کپ گول، روز ووڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ ''ہم دوست ہیں، وہ بھی بچپن کے۔ تم یقیناً مجھے اس پراسرار عورت کے بارے میں بتا سکتی ہو۔''
''میں نے کہا نا نہیں۔'' میرا انداز بے لچک تھا۔
''کیا تھوڑا سا بھی نہیں؟''
میں نے مٹھی بھینچ کر بہت زور سے میز پر ماری تھی، چاندی اور چینی کے برتن پھسلتے ہوئے اس پر لرزتے رہے۔
''خدا کی قسم، کیٹی! جب میں نے کہا نہیں تو مطلب نہیں۔'' ٹیبل کچھ دیر لڑکھڑا کر خود ہی ساکت ہوگئی لیکن میرے غصے نے ہمارے درمیان کے ماحول کو ایکدم ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔
کیٹی نے اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی، اس کی بھویں اوپر کو اٹھی ہوئی اور منہ کھلا رہ گیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بیٹھی خود کو کمپوز کرتی رہی۔
''کیا وہ جارج کی مالکن تھی؟'' اس بار اس نے جو پوچھا وہ سوال کسی خنجر کی طرح میرے سینے میں لگا تھا۔
میں نے ایک ہیجانی سانس لی۔ اپنی کرسی کے لکڑی کے بازوؤں کو سختی سے پکڑ کے اس پر تراشے ہوئے چہروں میں اپنے ناخن گاڑے۔
کیٹی کی آنکھوں میں ہمدردی ابھر آئی۔ ''تمہارا چہرہ سب بتا رہا ہے۔''
''میں نے پہلے ہی تمہیں بہت کچھ بتا دیا ہے۔ جب میں نے تمہیں بتایا کہ اس کی ایک مالکن ہے۔''
''ہم دوست ہیں میری اور دوست ایک دوسرے کے راز بانٹتے ہیں۔''
''ہر راز نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''خاص طور سے وہ جو تم سے متعلق بھی نہ ہو۔''
میں نے چائے کی طرف دیکھا، اس سے اب بھاپ نہیں اٹھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے سوچا کہ اسے سب بتادوں مگر نہیں کر پائی۔ میں اپنے راز گھر پر ہی چھوڑ آئی تھی۔
''میں اپنی ذلت تمہارے ساتھ نہیں بانٹ سکتی۔'' میں اپنی کرسی سے اٹھ کر سینٹ جیمز اسکوائر کی تاریک کوبل اسٹون گلیوں کو دیکھنے کے لیے کھڑکی کی طرف بڑھ آئی۔
''وہ کبھی جارج کی داشتہ تھی مگر اسے اس کی آخری رسومات میں کیوں مدعو کیا جا سکتا ہے؟ شاید اس نے مسٹر اور مسز بلیک بورن کو بھی منالیا ہو اسے اپنی پوتی تسلیم کرنے کے

لیے۔’’ میں نے ایک ماں اور بیٹی کو کھڑکی کے پاس سے گزرتے دیکھا تو اور غصہ آگیا۔ ’’خیر میں نہیں جانتی کہ وہ وہاں کیوں تھی لیکن میں یہ جانتی ہوں کہ جارج نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ اس نے مجھے ان کے بارے میں کبھی بتایا ہی نہیں...... مجھے اس کے ناجائز خاندان کے بارے میں بہت دیر سے معلوم ہوا جب میں نے سوچا......‘‘

’’تم نے کیا سوچا؟‘‘ کیٹی نے تیزی سے بات کاٹی۔

’’......کہ اس کی کالز میں اتنے طویل وقفے کیوں آنے لگے ہیں۔ اس نے دعویٰ کیا کہ ہماری شادی کے دن کی تیاریوں کی وجہ سے وہ کافی مصروف تھا لیکن میں کوئی بیوقوف نہیں ہوں۔ میں نے اپنی میڈ کو ایک دن اس کا پیچھا کرنے کے لیے بھیجا، جب اس نے ایک اور ملاقات ملتوی کرنے کے لیے معذرت کی۔‘‘

’’رہنے دو میری۔ اتنا کافی ہے...... اور مت بتاؤ۔‘‘ کیٹی کو شاید اب پچھتاوا ہونے لگا تھا میری دگرگوں کیفیت دیکھ کر۔ بھلا کون لڑکی اپنے محبوب کی بے وفائی کے قصے ہنس کے سنا سکتی ہے۔

’’تم ہی جاننے کے لیے مصر تھیں تو اب سنو کہ میں کس عذاب سے گزری ہوں۔‘‘

کیٹی اٹھنے کے لیے تیار اپنی سیٹ کے کنارے پر ٹک گئی۔ ’’ہاں ......لیکن میں دیکھ رہی ہوں اس ذکر سے تمہیں تکلیف ہو رہی ہے۔‘‘

’’میری میڈ اس کے پیچھے پیچھے گئی اور اس نے اسے اس فاحشہ کے گھر کی دہلیز پر پایا، اس کے گلے لگتے ہوئے...... اسے بوسہ دیتے ہوئے۔‘‘ کچھ سیال سا میرے رخساروں پر بہہ رہا تھا۔ میں نے اس کا نمکین ذائقہ اپنے لبوں پر محسوس کیا۔ میں ان پچھلے چند ہفتوں میں بہت روئی تھی۔

’’میں نے اس سے پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ پھر مجھے خود اس کی جاسوسی کرنا پڑی اور جب میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے اس عورت کے ساتھ دیکھا تو پھر میں نے دوبارہ اس پر بھروسا نہیں کیا۔‘‘

’’آؤ، میرے پاس بیٹھو۔‘‘ کیٹی نے ہاتھ بڑھایا۔

’’نہیں......‘‘ مجھے ایکدم ہوش آیا...... میں نے پہلے ہی اس کے سامنے کافی منہ کھول دیا تھا۔ اگر میں اور رکتی، ایک اور گھنٹا، چائے کا ایک اور کپ، تو یہ میرے حق میں بہت برا ہوتا۔

’’میں نے آج رات مسز بلیک بورن سے اس کی یاد میں شاعری پڑھنے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے دیر ہو جائے گی اگر

میں یہاں اور رکوں گی تو۔''

''رکو، میری! تمہیں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے جانا چاہیے۔''

میں نے اس کی درخواست یکسر نظر انداز کر کے دروازہ کھولا۔ میں اسے نہیں بتا سکتی تھی کہ کس طرح جارج کی غلطیوں نے مجھے ایک عفریت سے بھی بدتر بنا دیا تھا۔ میں کسی کے سامنے تسلیم نہیں کر سکتی تھی کہ میں نے کیا کیا ہے، ورنہ پھانسی کا پھندا میرا مقدر ہوتا۔

☆☆☆

میں مسز بلیک یورن کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ اس کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ مہمانوں میں سے کوئی ''کوئین ماب'' پڑھ رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا، جب وہ موت کے حوالے سے چند سطروں پر آیا، رات کا بار بار چلنے والا موضوع۔ موت، موت...... انہوں نے اپنی سسکیاں دبانے کے لیے منہ پر رومال رکھ لیا تھا۔ میں نے ان کی پیٹھ سہلائی، جیسا کہ کیٹی میرے لیے کرتی جب بھی میں غمگین ہوتی۔ سلکی کے لیے، جارج کے لیے، کھوئی ہوئی محبت کے لیے۔

وہ اپنی گود کے خالی پن پر، اپنے بیٹے کے کھو جانے پر رو رہی تھیں، جبکہ میں اپنے دل میں چبھتے ..... پچھتاووں کے کانٹوں سے الجھ رہی تھی۔ میں نے کیا کر دیا تھا اور اب ایک لاش تابوت میں زمین کے نیچے پڑی تھی۔

''وہ مرا نہیں ہے۔'' اس کی ماں نے قسم کھائی۔ ''وہ بس سو رہا ہے۔'' ان کی سوئی اسی بات پر اٹکی ہوئی تھی۔ جارج مر چکا تھا۔ وہ دو دن سے سانس نہیں لے رہا تھا۔ اس کی روح آسمان کی سمت پرواز کر گئی تھی، بالکل ایسے ہی جیسے آگ سے دھواں اٹھتا ہے۔

''کیا آپ آج شام کچھ پڑھیں گی؟'' میں نے ان کی توجہ ہٹانے کے لیے پوچھا۔ چاہے ایک منٹ کے لیے ہی سہی۔

''مجھ سے کچھ پڑھا نہیں جائے گا۔'' ان کی آواز لرزی۔

''لارڈ بائرن کی چند سطریں بھی نہیں؟ یا کیٹس؟ میں جانتی ہوں کہ آپ ان دونوں شاعروں کو کافی پسند کرتی ہیں۔''

''وہ کافی عرصے پہلے مر چکے ہیں۔ صرف ان کے الفاظ زندہ ہیں۔'' انہوں نے اپنے بھیگے رومال کی سمت دیکھا۔ ''لیکن میرا جارج نہیں۔ وہ زندہ ہے۔''

''یقیناً...... وہ ہے۔ ہمارے دلوں میں۔'' میں نے سر ہلایا۔

وہ میری طرف متوجہ ہوئیں، ان کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے اور ناک بھی۔

''تم ایک پیاری لڑکی ہو۔'' انہوں نے اپنے ہاتھ کی پشت سے میرے رخسار کو سہلایا۔

میں نے انہیں بھینچی ہوئی مسکراہٹ دی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے کے پچھلے حصے میں ناشتے سے لدی ایک میز کے پاس آ گئی، لیکن میں نے اپنے گلاس میں مشروب ڈالنے کی زحمت نہیں کی۔ میں بس وہیں کھڑی جارج کے دوستوں اور رشتے داروں کے سوگوار چہروں کو دیکھتی رہی۔

نہ جانے کیوں اس وقت اس سے آخری ملاقات کا منظر بار بار میرے ذہن میں کسی بجلی کی طرح چمک رہا تھا۔

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر مجھے دروازے تک لے جانے کی پیشکش کر رہا ہے، ہمارے خالی گلاس اس کے اسٹڈی ٹیبل پر ہیں۔

یکایک ہی میرا وہاں سے بھاگنے کا دل چاہا اور جب میں جانے کے لیے مڑی تو کیٹی سے ٹکرا گئی۔ وہ کب وہاں آئی مجھے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس نے سرمئی لباس پہنا ہوا تھا، اس کے اسکرٹ میں ایکارڈین پلیٹس، نیک لائن پر لیس تھی۔ اس کے بال نفاست سے بندھے ہوئے تھے، اس کی نیلی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے ابھی۔''

''رک جاؤ ذرا...... ایک اور نظم کے بعد۔'' میں اس کی سپاٹ نیلی آنکھوں کے گھورنے سے خوفزدہ سی ہو گئی۔

''میں تمہیں ڈھونڈنے تمہارے گھر گئی تھی۔''

''مجھے لگا مسز بلیک بورن کو میری ضرورت ہو گی اس لیے میں تھوڑا جلدی آ گئی۔'' میں نے کمرے کی اس سمت دیکھا جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھیں۔

''میں نے تمہارے لیے ایک گھنٹا انتظار کیا۔'' وہ ہنوز مجھے گھور رہی تھی۔

''اوہ سوری کیٹی ...... مجھے تمہیں بتا دینا چاہیے تھا۔''

''تم جانتی تھیں کہ میں کتنی فکرمند تھی ......اور انتظار کر رہی تھی۔''

''اچھا......ٹھیک ہے تو اب؟'' میں جھنجلا گئی۔

''پھر میں تمہارے گھر گئی۔'' اس نے اپنے لباس کی جیب سے ایک رومال میں لپٹی کوئی شے نکالی۔ ''اور مجھے یہ ملا۔''

میں اسے دیکھتے ہی ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔

''اب بتاؤ میری۔'' کیٹی نے مطالبہ کیا۔

''اسے دور پھینکو۔''

''اس وقت تک نہیں جب تک تم مجھے یہ نہ بتا دو کہ تم نے اسے کس لیے استعمال کیا ہے۔''

اس نے میرا راز اپنی مٹھی میں دبا رکھا تھا اور اب مجھ سے اسے کھولنے کا مطالبہ کر رہی تھی...... میں جان گئی۔ مجھے اس کے نتائج بھگتنا پڑ سکتے ہیں اگر میں نے فوراً ہی اس کے کانوں میں کوئی جھوٹ نہ پھونکا۔

''چوہے۔'' میں جلدی سے بولی۔ کمرے میں تالیاں بج رہی تھیں۔ ایک اور نظم ختم ہو چکی تھی۔

''آؤ، میرے ساتھ...... گارڈن میں چل کر بات کرتے ہیں۔'' میں نے اسے بازو سے پکڑا لیکن کیٹی اپنی جگہ جمی رہی۔

''یہ اس سے کہیں زیادہ ہے میری۔'' اس نے شیشی کو لپیٹ کر اپنے لباس کی جیب میں واپس ڈالتے ہوئے کہا۔

میں اس شیشی سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک درجن چیزیں کر سکتی تھی۔ اسے ایک ہزار چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتی...... اسے ٹیمز میں پھینک دیتی۔ اسے کسی اور کی جیب میں ڈال دیتی۔ دریافت سے بچنے کے لیے کچھ بھی کرتی۔ میں نے آخر اسے کیوں رکھا تھا؟ شاید میرے اندر خواہش تھی کہ وہ کسی کے ہاتھ لگے۔

''کیا تم مجھ پر یقین نہیں کرتیں؟'' میں نے پوچھا۔

کیٹی نے سر ہلایا۔ ''میں نہیں جانتی، میری۔''

''میرے بیسمنٹ میں چوہوں کی ایک فوج پل رہی تھی۔ مجھے اس کی ضرورت تھی۔''

''ایک آدمی مر گیا ہے۔'' اس کی نظریں اس طرف گھوم رہی تھیں جہاں ایک دن پہلے جارج کی لاش پڑی تھی۔

''کیٹی۔'' میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ ''پلیز، میری طرف دیکھو۔ میں تمہیں سچ بتاؤں گی، جیسا کہ میں ہمیشہ کرتی ہوں۔''

''تم نے مجھے سچ نہیں بتایا جب سلکی کی موت ہوئی تھی۔''

''کیا؟''

''تم اس بلی کے بچے سے پیار کرتی تھیں لیکن جب ایک دن اس نے تمہیں کاٹا تو میں نے دیکھا......'' وہ کانپ گئی۔ ''میں نے تمہیں اس کے پانی میں کچھ ڈالتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب تمہیں کسی سے تکلیف پہنچتی ہے تو تم اس کی زندگی چھین لیتی ہو۔''

''میں تب ایک بچی تھی!'' میں نے احتجاج کرنا چاہا۔

''اور اب ایک عورت ہو۔'' اس نے میری گرفت سے اپنا بازو چھڑایا۔ ''میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ وہ بچپنا تھا...... اب تم میچور ہو اس بگاڑ سے نکل آئی ہو، لیکن میں واضح طور پر غلط تھی۔''

''تمہارا الزام بے بنیاد ہے۔'' میری آواز بہت دھیمی نکلی تھی۔

کیٹی نے میری طرف دیکھا، اس کے ہونٹ مزید کچھ کہنے کے لیے تیار تھے، جب داخلی دروازے پر کچھ ہلچل ہوئی اور پھر قدموں کی آوازیں...... شاعری پڑھنے والا اور دیگر لوگ بھی اس طرف متوجہ ہوئے...... اور کیٹی مجھ سے دور ہوتے ہوئے دروازے کی طرف گئی۔

''قبرستان کا ایک چوکیدار آیا ہے۔'' اس نے چند لمحوں بعد ہی واپس آ کر کمرے میں اعلان کیا۔

مسٹر بلیک بورن اپنی ونگ بیک چیئر سے اٹھے۔ ''میں اس سے بات کروں گا۔''

وہ اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں ساتھ لیے کمرے سے باہر نکل گئے...... مہمانوں کو سرگوشیاں کرتا چھوڑ کر۔

میری اعصابی کشیدگی مجھے توڑنے کے درپے تھی۔ کیٹی نے بھی ان کی باتیں سننے کے لیے دروازے کی سمت جانے کا فیصلہ کیا...... تو مجھے بھی اس کے پیچھے جانا پڑا۔

''تم یہ کیا کر رہی ہو؟'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا جب وہ دروازے کی درز میں سے باہر دیکھ رہی تھی۔

''شش......'' کیٹی نے میرا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا۔ ''وہ جارج کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔''

میں بھی دیکھنا چاہتی تھی لیکن کیٹی کی وجہ سے میں وہ منظر دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ مجھ سے چند انچ لمبی تھی۔

میں نہیں جانتی تھی باہر کیا معاملات چل رہے ہیں لیکن میری ہتھیلیاں نم ہو رہی تھیں اور میرا دل مینٹل پر موجود اورمولو گھڑی کے ساتھ تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ میرے پکڑے جانے تک کے لمحات کو ٹک ٹک کرتے ہوئے۔ میری چھٹی حس مجھ سے کہہ رہی تھی مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ میں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔

''میری اسمتھ۔'' دروازے کی دوسری طرف سے میرا نام بلند ہوا۔ مجھے اپنا آپ پنجرے میں پھنسے کسی جانور جیسا محسوس ہوا۔

کیٹی نے واحد داخلی اور باہر نکلنے کا راستہ روک رکھا تھا۔ میں چاہتی تو اسے صرف ایک دھکا دے کر باہر کی سمت بھاگ سکتی تھی۔

تب ہی کیٹی اچانک خود ہی ایک طرف ہٹ گئی۔ میں نے اسے ایک معجزہ سمجھا اور میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دروازے کی طرف چل پڑی لیکن اس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے روک لیا۔

مسٹر بلیک بورن دروازے سے جھانک رہے تھے......ان کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔

''میری! مسٹر ریڈ فیلڈ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔ آؤ، آؤ لڑکی! ہم اب شادی ملتوی نہیں کریں گے۔''

مجھے ان کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔ میں کسی لاش سے شادی نہیں کرسکتی تھی۔

میں باہر آئی، کیٹی بھی پیچھے تھی۔ مسٹر بلیک بورن نے اس کے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا، ان کے انداز میں عجیب سی سرشاری تھی......نامعلوم سی خوشی۔

انہوں نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا جس کے چہرے پر کہیں کہیں مٹی لگی تھی، اس کے کپڑے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔

''میری اسمتھ؟'' اس نے میری سمت دیکھ کر پوچھا، اس کی آواز کافی گونج دار تھی۔

میں نے سر ہلایا۔ ''جی سر؟''

''مجھے مسٹر ریڈ فیلڈ کہیں۔'' وہ مجھے متجسس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''آپ کے منگیتر زندہ ہیں۔''

میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیا اس نے وہی کہا جو میں نے سنا یا پھر یہ میری حد سے بڑھی ہوئی ذہنی پراگندگی اور احساسِ جرم تھا۔

مین نے مسز بلیک بورن کو ایک بار پھر روتے ہوئے پایا، مگر اس بار یہ رونا خوشی کا تھا۔ ''وہ زندہ ہے! میرے خدا نے میری دعاؤں کو سن لیا۔ وہ زندہ ہے!'' انہوں نے اپنے رومال میں پھونک ماری، اپنے جوڑے ہوئے ہاتھوں پر اپنا سر جھکا دیا۔

''کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے تابوت کی گھنٹی بجائی۔'' مسٹر ریڈ فیلڈ نے وضاحت کی۔ ''میں وہاں سے گزر رہا تھا، جب مجھے گھنٹی کی آواز سنائی دی اور میں قبر کھودنے کے لیے ایک ٹیم لانے کے لیے دوڑا۔ وہ ہمارے چرچ میں، اس وقت، ہمارے پادری کے ساتھ بیٹھا ہے۔''

میں نے پلکیں جھپکائیں۔ ''یقین نہیں آرہا کہ کیا کہوں...... حیرت انگیز۔'' میری کانپتی آواز کو انہوں نے شدید خوشی پر محمول کیا شاید۔

مسٹر بلیک بورن نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''کیا یہ شاندار نہیں ہے، میری؟''

''کیسے؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''وہ صرف بے ہوش تھا، مرا نہیں تھا۔'' مسٹر ریڈ فیلڈ نے اپنی آواز کو دھیمی کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے اسکاٹ لینڈ یارڈ کو اس معاملے کو دیکھنے کے لیے بلایا ہے۔''

اس کی اس بات نے منہ ہی منہ میں بدبداتی مسز بلیک بورن کی دعاؤں میں خلل ڈالا۔ ''کیا؟ کیوں؟'' اس نے پوچھا، اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

مسٹر ریڈ فیلڈ نے اسے نظرانداز کردیا، اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں، وہ مجھے اپنی مائکرواسکوپ جیسی نظروں سے جانچ رہا تھا......

''وہ کمزور ہے، بیمار ہے۔ صدمے میں ہے، لیکن اسے اب بھی اپنی بے ہوشی میں جانے سے پہلے کے آخری لمحات یاد ہیں۔''

میں نے ایک قدم پیچھے ہٹایا، لیکن کیٹی نے میرا بازو پکڑلیا اور مجھے ٹھہرنے پر آمادہ کیا۔

''وہ کہتا ہے کہ اس نے آپ کے ساتھ ''کوکو'' پیا تھا مس اسمتھ اور اس کا ذائقہ کڑوا تھا۔'' اس نے رک کر مجھے دیکھا۔ ''آپ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی اس کا ذہن اندھیرے میں ڈوب گیا۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' مسٹر بلیک بورن نے پوچھا۔

''کیا میرا بیٹا بیمار تھا؟''

مسٹر ریڈ فیلڈ نے اپنا رخ میری طرف سے موڑ لیا۔

''مجھے یقین نہیں ہے۔'' اس نے آہ بھری، اس کے کندھے ڈھلک گئے تھے۔

''آپ کا بیٹا خوش قسمت ہے، تاہم مسٹر بلیک بورن! میں نے تابوت کی گھنٹی صرف دو بار سنی ہے اور پہلی بار، وہ شخص زہر سے بے ہوش ہوگیا تھا۔''

مسز بلیک بورن لڑکھڑانے لگیں...... مسٹر بلیک بورن نے لپک کر انہیں سہارا دیا......ان کی خوشی اس خبر کے ساتھ ہی خوف میں بدل گئی تھی۔

''اسکاٹ لینڈ یارڈ اس معمے کو حل کرلے گا۔'' اس نے یقین دلایا۔

کیٹی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنی طرف گھمایا، اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ میں نے اسے اپنے لباس کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے، شیشی کو سہلاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اسے نہیں پھینکا تھا۔ کم ازکم ابھی تک تو نہیں۔

میرا دل سکڑ رہا ہے، منظر دھندلا رہے ہیں...... میری ٹانگیں بے جان ہو رہی ہیں...... ہاں...... میں پھانسی کے پھندے کو اپنی گردن کے گرد جکڑتا ہوا محسوس کرسکتی ہوں۔

✱✱✱

اسماقادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنونِ حرب وضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرفِ غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جوالمیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہوسکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

محمد سلمان سلیم

گذشتہ اقساط کا خلاصہ
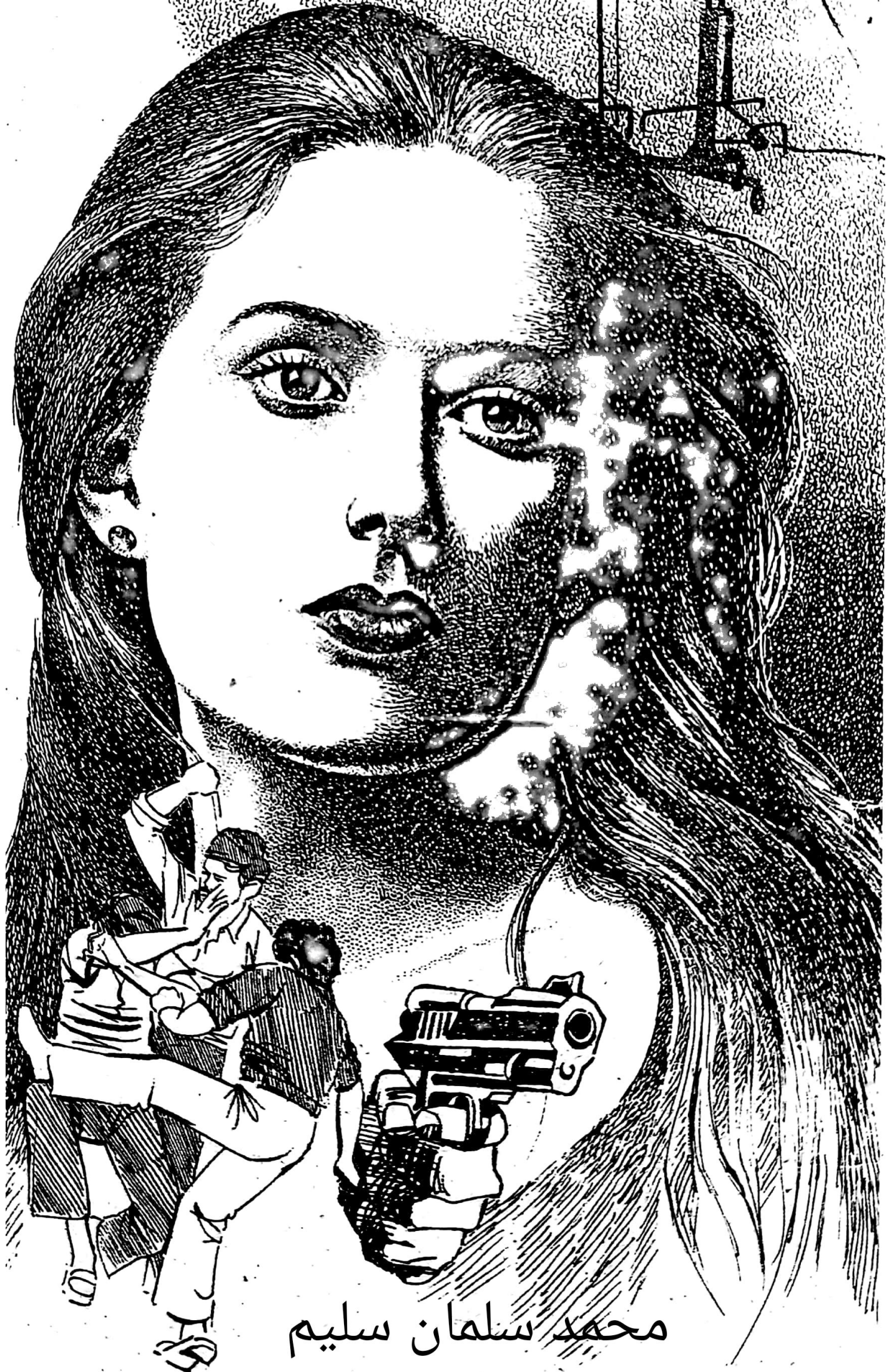
معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیرتعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچادیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کردیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹوگرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہوجانے والے معاذ کو بےخبری میں گھیر کر بری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گرجاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھرلیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آجاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کررہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بےآبرو کرکے ماردیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بےآبرو کردیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کرلیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہوجاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کرکے اسے ان کے حوالے کردیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشریٰ بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہوجاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وقاص اپنے گروہ کے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہرحال وقاص کو تنبیہ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کردیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کرلیتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کرکے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیغو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن سجل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کرلیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہوجاتا ہے۔ ادھر بشریٰ دبئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کرلیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہوجاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا روانگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یاتریوں سے بھری بس کو یرغمال بنالیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگادیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغواکاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہوجاتا ہے۔ صداقت شاہ کے انڈیا

میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، سجل اور سرمد انڈیا روانہ ہوجاتے ہیں۔ ائرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشریٰ اور وقاص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ بنگلے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہوجاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہوجاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لیے جاتے ہیں اور ”را“ کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ادھر بشریٰ باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر سجل کو اس کا شوہر ذہنی اذیت دیتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سجل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرمد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھر لیے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ معاذ، وشنا کے ذریعے عالم اور سرمد کو رہائی دلوانا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وشنا کی گاڑی حادثے کا شکار ہوجاتی ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علینہ پاکستان میں ثوبیہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ثوبیہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ، سجل کے لیے پریشان ہوتا ہے اور اسے وہاں سے نکالنا چاہتا ہے۔ وقاص، علینہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ معاذ سجاش نامی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے تاہم وہ مارا جاتا ہے اور معاذ بھی زخمی ہوجاتا ہے اور اپنا نشان وہاں چھوڑ دیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اس کے ساتھ مل کر موہن نامی ”را“ کے ایجنٹ کو اغوا کر لیتا ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے سجل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ”را“ کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہوجاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجاتی ہے اور اسے اپنے تعاون اور مدد کی یقین دہانی کرواتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہوجاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں شکیل اور جلیل مارے جاتے ہیں اور فیصل اور پانڈے زخمی ہوجاتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدرآباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈم ایکس کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے مگر نواب صاحب کا بیٹا ان کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ سجل کو بھی اغوا کر کے حویلی لے آتا ہے۔ تاہم وہ لوگ عبید کو قبضے میں کر کے وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جارو نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ”را“ کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ ادھر سجل کا بیٹا اعظم اپنی ناک میں پتھر پھنسا لیتا ہے۔ جارو اور معاذ، سجل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا عالم وغیرہ سمیت سب کو ٹھکانا بدلنے کا کہہ کر معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص وغیرہ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلو کا باڈی گارڈ بنتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم جہاں وہ ہوتے ہیں وہ جگہ خطرناک ہوتی ہے۔ خطرہ ان کے سر پر منڈلا رہا ہوتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

”بھارت سے بہت اہم خبریں آئی ہیں میڈم!“

”تفصیل سے بتاؤ۔“ میڈم ایکس نے بے تاثر چہرے کے ساتھ حکم دیا۔

”گلو استاد نے اپنے جس آدمی کو حامد کے کہنے پر

رکھ دیا۔ انوپ کا خوشی سے کھل اٹھنے والا چہرہ لٹک گیا اور اس نے ریسیور اٹھا کر مری مری آواز میں ''ہیلو'' کہا۔ دوسری طرف سے جو بھی کہا گیا، اس نے اس کے چہرے پر حیرت بکھیر دی۔

''وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' اگلے ہی لمحے وہ ریسیور قریبی صوفے پر بیٹھی سونیا کی طرف بڑھا رہا تھا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟ تمہارے مالک کو کیسے پتا کہ سونیا یا کوئی اور یہاں موجود ہے؟'' معاذ نے پسٹل کی نال سے اس کی گردن پر دباؤ ڈالتے ہوئے سوال کیا۔ سونیا البتہ مہر بہ لب تھی اور ستے ہوئے چہرے کے ساتھ ریسیور تھام چکی تھی۔

''ہیلو!'' وہاں موجود ہر شخص اس کے لہجے کی لرزش محسوس کر چکا تھا۔ اس واحد لفظ کی ادائیگی کے بعد اس کی زبان سے کچھ نہ نکلا اور وہ لب بھینچے دوسری طرف کی گفتگو سنتی رہی۔ دوسری طرف سے جو کچھ کہا جا رہا تھا، وہ یقیناً اس کے لیے تکلیف دہ اور پریشان کن تھا جس کی وجہ سے اس کے ماتھے پر لحہ بہ لحہ شکنوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں سوچتی ہوں۔'' کافی دیر خاموشی سے دوسری طرف کی گفتگو سننے کے بعد اس نے ایک مختصر جملہ ادا کیا اور ریسیور رکھ دیا۔

''ارے سونیا تم؟ تم کب یہاں پہنچیں؟'' وہ خود پر جمی سوالیہ نظروں کے جواب میں کچھ بولتی، اس سے قبل ہی سجل، اعظم کو گود میں اٹھائے اپنے زیر استعمال کمرے سے باہر نکلی اور سونیا کو سامنے پا کر پُرجوش ہوگئی۔ سونیا عادت و فطرت میں اس سے مختلف سہی لیکن مسلسل غیر مردوں کے درمیان رہتے ہوئے ایک دوسری عورت کو سامنے پا کر اسے اچھا لگا تھا۔

''تھوڑی ہی دیر ہوئی ہے مجھے آئے اور میں اکیلی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ اور لوگ بھی ہیں۔'' سونیا نے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ سجا کر اسے جواب دیا اور اس کی گود میں موجود اعظم کو پیار کرنے لگی۔ نہا دھو کر صاف ستھرا لباس پہننے سے اس کے مزاج پر اچھا اثر پڑا تھا اور خوب تلقاریاں مار رہا تھا۔

''ادا سائیں...... ادا سائیں آئے ہیں تمہارے ساتھ؟'' سجل بے چین ہوئی۔

''بالکل، میری بہن!'' جواب میں سونیا کے بجائے بھاری مردانہ آواز سننے کو ملی تو وہ کرنٹ کھا کر پلٹی اور بے قراری سے جا کر عالم شاہ سے لپٹ گئی۔ معاذ نے اس منظر سے نظریں پھیریں اور سونیا کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

''اب بتاؤ، کیا بات ہے؟'' وہ سب سے الگ تھلگ دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھے تو اس نے سونیا کو کھوجتی نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے سوال کیا۔ فون کال سننے کے بعد اس میں عجیب تبدیلی آئی تھی۔ چند لمحے قبل وہ بے چین تھی کہ فوری طور پر اس جگہ سے نکلا جائے اور اب یوں ٹھس ہوگئی تھی جیسے کرنے کو کچھ باقی نہ بچا ہو۔

''کچھ بولو گی بھی یا نہیں؟'' اسے مسلسل خاموش پا کر وہ تھوڑا سا جھنجلایا۔

''مجھ سے میری زندگی کی کہانی سنو گے معاذ؟'' سوال کے جواب میں سوال آیا، وہ بھی ایسا جس نے معاذ کو اس کی ذہنی حالت کی طرف سے مشکوک کر دیا۔

''ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکلنا ہے اور اب قصے کہانیاں سنانے کی بات کر رہی ہو۔''

''یہ اختیار اب ہمارے پاس سے ختم ہوگیا ہے۔ اب ہمیں کوئی اور فیصلہ کرنا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں ویرانی سی تھی۔ وہ، وہ سونیا ہی دکھائی نہیں دے رہی تھی جسے مشکل سے مشکل حالات سے بھی لڑنا آتا تھا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں۔ کیا تم بتاؤ گی کہ تمہارے لیے یہاں کس کی کال آئی تھی؟'' معاذ کے لہجے میں ہلکا سا شک تھا۔ بے شک سونیا نے کئی بار ان کا ساتھ دیا تھا لیکن اسے بھولتا نہیں تھا کہ وہ دشمنوں کی صف میں سے ہے۔

''کال کرنے والے کی شخصیت اور کال کرنے کی وجہ کو سمجھنے کے لیے تمہیں میری کہانی سننا پڑے گی۔''

''اگر ایسا ہے تو پھر ضرور سناؤ۔'' آخر معاذ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

''میری کہانی، میرے باپ تیمور خان سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا تعلق افغانستان سے تھا۔ برسوں پہلے وہ اپنے والدین کے ساتھ امریکا گیا تھا اور وہاں کی تہذیب میں رچ بس کر خود کو تیمور کے بجائے ٹام کہلوانے لگا تھا۔ رنگ و روپ بھی ایسا تھا کہ کسی کو شک نہیں ہو پاتا تھا کہ ٹام کے پردے کے پیچھے کوئی تیمور خان بھی ہوسکتا ہے۔'' اس کی طرف سے اشارہ پا کر سونیا نے بلا توقف اپنی داستان سنانا شروع کر دی تھی اور ابتدائی جملوں نے ہی معاذ کی توجہ پوری طرح اپنی طرف مبذول کروالی تھی۔

''ٹام ذہین بھی تھا اور ہینڈسم بھی اس لیے لڑکیوں کے لیے مقناطیس جیسی کشش رکھتا تھا۔ وہ اپنی اس کشش سے فائدہ اٹھانے سے چوکتا نہیں تھا لیکن ابھی تک اس کی زندگی میں ایسی لڑکی نہیں آئی تھی جس کے لیے وہ خود کشش محسوس

رکھ دیا۔ انوپ کا خوشی سے کھل اٹھنے والا چہرہ لٹک گیا اور اس نے ریسیور اٹھا کر مری مری آواز میں ''ہیلو'' کہا۔ دوسری طرف سے جو بھی کہا گیا، اس نے اس کے چہرے پر حیرت بکھیر دی۔

''وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' اگلے ہی لمحے وہ ریسیور قریبی صوفے پر بیٹھی سونیا کی طرف بڑھا رہا تھا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟ تمہارے مالک کو کیسے پتا کہ سونیا یا کوئی اور یہاں موجود ہے؟'' معاذ نے پسٹل کی نال سے اس کی گردن پر دباؤ ڈالتے ہوئے سوال کیا۔ سونیا البتہ مہر بہ لب تھی اور ستے ہوئے چہرے کے ساتھ ریسیور تھام چکی تھی۔

''ہیلو!'' وہاں موجود ہر شخص اس کے لہجے کی لرزش محسوس کر چکا تھا۔ اس واحد لفظ کی ادائیگی کے بعد اس کی زبان سے کچھ نہ نکلا اور وہ لب بھینچے دوسری طرف کی گفتگو سنتی رہی۔ دوسری طرف سے جو کچھ کہا جا رہا تھا، وہ یقیناً اس کے لیے تکلیف دہ اور پریشان کن تھا جس کی وجہ سے اس کے ماتھے پر لحہ بہ لحہ شکنوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں سوچتی ہوں۔'' کافی دیر خاموشی سے دوسری طرف کی گفتگو سننے کے بعد اس نے ایک مختصر جملہ ادا کیا اور ریسیور رکھ دیا۔

''ارے سونیا تم؟ تم کب یہاں پہنچیں؟'' وہ خود پر جمی سوالیہ نظروں کے جواب میں کچھ بولتی، اس سے قبل ہی سجل، اعظم کو گود میں اٹھائے اپنے زیر استعمال کمرے سے باہر نکلی اور سونیا کو سامنے پا کر پُرجوش ہو گئی۔ سونیا عادت و فطرت میں اس سے مختلف سہی لیکن مسلسل غیر مردوں کے درمیان رہتے ہوئے ایک دوسری عورت کو سامنے پا کر اسے اچھا لگا تھا۔

''تھوڑی ہی دیر ہوئی ہے مجھے آئے اور میں اکیلی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ اور لوگ بھی ہیں۔'' سونیا نے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ سجا کر اسے جواب دیا اور اس کی گود میں موجود اعظم کو پیار کرنے لگی۔ نہا دھو کر صاف ستھرا لباس پہننے سے اس کے مزاج پر اچھا اثر پڑا تھا اور خوب تلقاریاں مار رہا تھا۔

''ادا سائیں...... ادا سائیں آئے ہیں تمہارے ساتھ؟'' سجل بے چین ہوئی۔

''بالکل، میری بہن!'' جواب میں سونیا کے بجائے بھاری مردانہ آواز سننے کو ملی تو وہ کرنٹ کھا کر پلٹی اور بے قراری سے جا کر عالم شاہ سے لپٹ گئی۔ معاذ نے اس منظر سے نظریں پھیریں اور سونیا کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

''اب بتاؤ، کیا بات ہے؟'' وہ سب سے الگ تھلگ دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھے تو اس نے سونیا کو کھوجتی نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے سوال کیا۔ فون کال سننے کے بعد اس میں عجیب تبدیلی آئی تھی۔ چند لمحے قبل وہ بے چین تھی کہ فوری طور پر اس جگہ سے نکلا جائے اور اب یوں ٹھس ہو گئی تھی جیسے کرنے کو کچھ باقی نہ بچا ہو۔

''کچھ بولو گی بھی یا نہیں؟'' اسے مسلسل خاموش پا کر وہ تھوڑا سا جھنجلایا۔

''مجھ سے میری زندگی کی کہانی سنو گے معاذ؟'' سوال کے جواب میں سوال آیا، وہ بھی ایسا جس نے معاذ کو اس کی ذہنی حالت کی طرف سے مشکوک کر دیا۔

''ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکلنا ہے اور اب قصے کہانیاں سنانے کی بات کر رہی ہو۔''

''یہ اختیار اب ہمارے پاس سے ختم ہو گیا ہے۔ اب ہمیں کوئی اور فیصلہ کرنا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں ویرانی سی تھی۔ وہ، وہ سونیا ہی دکھائی نہیں دے رہی تھی جسے مشکل سے مشکل حالات سے بھی لڑنا آتا تھا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں۔ کیا تم بتاؤ گی کہ تمہارے لیے یہاں کس کی کال آئی تھی؟'' معاذ کے لہجے میں ہلکا سا شک تھا۔ بے شک سونیا نے کئی بار ان کا ساتھ دیا تھا لیکن اسے بھولتا نہیں تھا کہ وہ دشمنوں کی صف میں سے ہے۔

''کال کرنے والے کی شخصیت اور کال کرنے کی وجہ کو سمجھنے کے لیے تمہیں میری کہانی سننا پڑے گی۔''

''اگر ایسا ہے تو پھر ضرور سناؤ۔'' آخر معاذ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

''میری کہانی، میرے باپ تیمور خان سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا تعلق افغانستان سے تھا۔ برسوں پہلے وہ اپنے والدین کے ساتھ امریکا گیا تھا اور وہاں کی تہذیب میں رچ بس کر خود کو تیمور کے بجائے ٹام کہلوانے لگا تھا۔ رنگ و روپ بھی ایسا تھا کہ کسی کو شک نہیں ہو پاتا تھا کہ ٹام کے پردے کے پیچھے کوئی تیمور خان بھی ہو سکتا ہے۔'' اس کی طرف سے اشارہ پا کر سونیا نے بلا توقف اپنی داستان سنانا شروع کر دی تھی اور ابتدائی جملوں نے ہی معاذ کی توجہ پوری طرح اپنی طرف مبذول کروالی تھی۔

''ٹام ذہین بھی تھا اور ہینڈسم بھی اس لیے لڑکیوں کے لیے مقناطیس جیسی کشش رکھتا تھا۔ وہ اپنی اس کشش سے فائدہ اٹھانے سے چوکتا نہیں تھا لیکن ابھی تک اس کی زندگی میں ایسی لڑکی نہیں آئی تھی جس کے لیے وہ خود کشش محسوس

کرتا۔ یونیورسٹی کے دور میں آخر کار ایسی لڑکی بھی اسے ٹکرا ہی گئی۔ اسرائیل سے تعلق رکھنے والی رابیل خوبصورتی اور ذہانت میں اس سے شاید ایک قدم آگے ہی تھی اور اس ایک قدم آگے ہونے نے ٹام کو رابیل کے پیچھے لگا دیا۔ رابیل بھی زیادہ دن اسے نظر انداز نہیں کرسکی۔ دونوں میں دوستی ہوئی اور دوستی بڑھتے بڑھتے محبت کا روپ دھار گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے مزاج کے رنگ پہچانے اور فیصلہ کرلیا کہ وہ ایک دوسرے ہی کے لیے بنے ہیں لیکن......'' اس ''لیکن'' سے آگے سونیا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''ٹام نے اسے تھوڑے دنوں کے ساتھ میں ہی جان لیا تھا کہ رابیل پکی یہودن ہے اور وہ ہرگز یہ قبول نہیں کرے گی کہ کسی مسلمان کو اپنی زندگی کے ساتھی کے طور پر چنے۔ رابیل کو کھونے کے ڈر سے اس نے اپنا تیمور ہونا چھپالیا اور ٹام بن کر اس کے ساتھ عشق کے وہ سارے مرحلے طے کرلیے جن پر آزاد معاشروں میں کوئی قدغن نہیں ہوتی۔''

''لیکن یہ تو دھوکا تھا اور محبت میں دھوکا دینے کی گنجائش نہیں ہوتی۔'' معاذ بے ساختہ ہی درمیان میں بول اٹھا۔

''تیمور خان عرف ٹام اس نکتے کو نہیں سمجھ سکا تھا جس کا نتیجہ ناقابلِ تلافی نقصان کی صورت نکلا اور میں آج بھی اس کے نتائج بھگت رہی ہوں۔'' اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی اداسی تھی۔

''یقیناً رابیل پر اس کا جھوٹ کھل گیا ہوگا؟''

''ہاں۔'' سونیا کی گردن اثبات میں ہلی۔

''محبت کی نشانی کوکھ میں آنے پر رابیل نے اس سے مطالبہ کیا کہ اب اس تعلق کو قانونی رشتے میں تبدیل کرلینا چاہیے۔ ٹام کو اعتراض نہیں تھا لیکن وہ بھول گیا تھا کہ قانونی رشتہ طے کرنے کے لیے قانونی دستاویزات بھی استعمال ہوں گی اور ان دستاویزات میں وہ ٹام نہیں، تیمور خان ولد شامل خان تھا۔''

''یعنی دھوکا پکڑا گیا اور رابیل نے تیمور خان کو چھوڑ دیا؟'' معاذ نے فوراً اندازہ لگایا۔

''چھوڑا ہی تو نہیں۔ رابیل کوئی عام لڑکی تھوڑی تھی جو اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے کو بریک اپ کا نام دیتی اور خاموشی سے تیمور کی زندگی سے نکل جاتی۔''

''پھر؟''

''پھر یہ کہ اس نے تیمور کو اس دھوکے کی سزا دینے کا فیصلہ کیا اور ایک روز وہ روڈ ایکسیڈنٹ میں مارا گیا۔'' اس کی خوبصورت آنکھوں میں اداسی جھلکی۔

''اوہ نو...... مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی کسی سے محبت کا دعویدار ہو اور اسے یوں بے دردی سے ہلاک کروادے۔'' معاذ کو سن کر دھچکا لگا۔

''انتہاپسندی انسان سے کچھ بھی کرواسکتی ہے۔ رابیل کی انتہاپسندی نے بھی محبت کو لمحوں میں نفرت میں بدل دیا۔''

''مگر کسی کو قتل کروادینا، وہ بھی امریکا جیسے ملک میں، کوئی معمولی کام تو نہیں ہے۔ رابیل نے یہ کام کیسے کیا؟''

''میں نے بتایا نا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ اس کا یہودی انتہاپسند باپ پہلے ہی ایک ایسی تنظیم سے وابستہ تھا جو دنیا بھر میں اسرائیل کے مفاد کے لیے کام کرتی تھی۔ رابیل بھی ہائی اسکول کے زمانے ہی سے اس تنظیم کی ممبر بن چکی تھی اور اس کے لیے بالکل بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ یوں کسی کو ہلاک کرادیتی۔''

''بہت ہی عجیب اور افسوسناک داستان ہے۔''

''اگر داستان وہیں ختم ہوجاتی تو پھر بھی کم افسوسناک ہوتی لیکن رابیل کے غم و غصے نے اسے اور بھی افسوسناک بنادیا۔ اس سے یہ ہتک سہی ہی نہیں جاتی تھی کہ وہ کسی مسلمان کے بچے کو جنم دینے جارہی ہے۔ اگر خود اس کی جان کو خطرہ نہیں ہوتا تو وہ اس بچے یعنی مجھے اس دنیا میں آنے سے قبل ہی ختم کروادیتی۔'' وہ اپنی ان چاہی زندگی پر ناخوش نظر آرہی تھی۔

''تمھیں یہ سب کچھ تمہاری ماں نے بتایا ہے؟'' معاذ نے پوچھا۔

''نہیں، شروع میں تو میں صرف اتنا جانتی تھی کہ میرا باپ میرے دنیا میں آنے سے قبل ایک حادثے میں مرچکا ہے لیکن آہستہ آہستہ مجھے پتا چل ہی گیا کہ حقیقت کیا ہے۔''

''کیا حقیقت معلوم ہونے کے بعد تم نے اپنے دل میں اپنی ماں کے لیے نفرت محسوس کی؟''

''جسے محبت سے شناسائی نہ ہو، وہ نفرت کرنے کی اہلیت بھی کہاں رکھتا ہے۔ میں تو بس ایک غلام تھی جسے خود سے کچھ سوچنے، سمجھنے اور کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے بچپن کو بچپن کی طرح نہیں جیا۔ مجھے کبھی ماں کی آغوش کی گرمی نصیب ہوئی نہ کبھی میں نے دوستوں کے ساتھ بے فکری سے کھیلنے کودنے کا لطف اٹھایا۔ میں ایک پالتو جانور کی طرح تھی جسے اس کی مرضی کے خلاف سدھایا جاتا رہا۔ جبلت نے کبھی مجھے اِدھر اُدھر بھٹکایا بھی تو سخت سزاؤں نے واپس اس ٹریک پر ڈال دیا جس پر وہ مجھے چلانا چاہتے تھے۔ کڑی مشقتوں سے گزر کر میں نے وہ سب سیکھا جو مجھے

سکھایا گیا اور وہ سب کیا جس کا مجھے حکم دیا گیا۔''

''یہ تو ظلم ہے۔''

''صرف تمہارے نزدیک...... جبکہ کرنے والے تو اپنے خیال میں اپنے ملک اور مذہب کی خدمت کر رہے تھے۔'' وہ پھیکا سا مسکرائی۔

''یعنی اپنی ماں کی طرح تم بھی اپنے نانا کی تنظیم کا حصہ بن گئیں؟''

''کہہ سکتے ہیں...... لیکن سچ یہ ہے کہ وہ تنظیم اب میرے نانا کے زمانے سے زیادہ خطرناک اور طاقتور ہو چکی ہے اور کچھ پالیسیوں میں تبدیلی کے بعد دنیا بھر میں اپنے پنجے گاڑ چکی ہے۔ دولت اور طاقت کے حصول کے لیے ہر طرح کا حربہ استعمال کیا جا رہا ہے اور پشت پناہی کے لیے وہ ساری عالمی طاقتیں موجود ہیں جن کے مفادات کی تنظیم حفاظت کرتی ہے۔'' سونیا اس پر انکشاف کر رہی تھی۔

''یقیناً تمہاری ماں کو تنظیم میں اہم مقام حاصل ہوگا؟''

''بالکل، وہ تنظیم کے ان بڑوں میں شامل ہے جو فیصلہ سازی کا اختیار رکھتے ہیں۔ کئی برسوں سے اس نے میڈم ایکس کے نام سے پاکستان میں قیام کر رکھا ہے اور منشیات واسلحے کی اسمگلنگ، خفیہ معلومات کی منتقلی اور دہشت گردی سمیت ہر اس معاملے کی سرپرستی کرتی ہے جس سے ایک طرف تمہارے لوگوں کو نقصان پہنچے تو دوسری طرف تنظیم کو مالی فوائد حاصل ہوں۔ بھارت کے لیے خصوصاً معاوضتاً ایسے کام کیے جاتے ہیں جن سے پاکستان کی معیشت اور ساکھ کو نقصان پہنچایا جا سکے۔''

''اور تم اس تنظیم کا ایک اہم پرزہ تھیں۔'' معاذ نے شکوہ کرنے والے انداز میں کہا۔

''مجھے ہونا ہی تھا۔ ایک ایسی بچی جس نے آنکھ ہی ان کے درمیان کھولی تھی، ان کی مرضی پر چلنے کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔ تم نے ان کی طاقت دیکھی ہے نا؟ میڈم ایکس نے جب تمہیں اپنی تنظیم کے لیے منتخب کیا تو تم ایک بالغ انسان ہو کر بھی ان کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئے تھے۔'' سونیا نے اسے جتایا۔

''اپنے پیاروں کی محبت نے میرے ہاتھ پیر ضرور باندھے تھے لیکن یہ تم بھی جانتی ہو کہ وہ کبھی مجھ سے میرے وطن کے مفاد کے خلاف کام کروانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہر بار میں نے انہیں ڈاج دے کر اپنا دامن صاف رکھا۔'' اس کے پاس بھی اپنی صفائی دینے کے لیے دلیل موجود تھی۔

''تم نے مزاحمت اس لیے کی کہ تم باشعور تھے لیکن ایک چھوٹی سی بچی ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ ان کے زیر تربیت پرورش پا کر میں اس قدر ان کی مطیع بن چکی تھی کہ جب داراب خان جیسے ناپسندیدہ شخص سے وابستہ کی گئی، تب بھی آواز نہیں اٹھا سکی۔'' اس کے لہجے میں وہی دکھ تھا جس سے کسی ناپسندیدہ بندھن میں بندھی عورت گزرتی ہے۔

''عجیب ہے تمہاری ماں۔ خود اپنے لیے تو اسے ایک مسلمان مرد قبول نہیں تھا اور تمہیں جانتے بوجھتے ایک مسلمان سے بیاہ دیا۔''

''مسلمان کے ہاتھوں پھنسنے اور اسے پھنسانے میں فرق تھا۔ داراب خان افغانستان سے اسلحے اور منشیات کی اسمگلنگ کا سب سے بڑا ڈیلر تھا۔ اسے اپنے قابو میں رکھنے کے لیے مجھے اس کے ساتھ نتھی کر دیا گیا۔ جب سے میں اس کی بیوی بنی تھی، ہر ڈیل میری مرضی کے مطابق ہوتی تھی اور داراب خان کی حیثیت بس ایک کٹھ پتلی کی رہ گئی تھی۔ ساتھ ہی مجھ پر پابندی بھی تھی کہ میں اس کے بچے کی ماں نہیں بنوں گی۔ ظاہر ہے مجھے بھی اس بن مانس سے کوئی انسیت نہیں تھی اس لیے داراب خان اس شادی میں سراسر خسارہ اٹھا کر ہی دنیا سے گیا۔'' اس نے اپنے مخصوص بے نیازانہ انداز میں کندھے جھٹک کر جواب دیا۔

''اب کیا ہوا تھا کہ تم سارے خوف بھلا کر تنظیم سے بغاوت پر اتر آئیں۔'' معاذ اس سے سوال کرنا چاہتا تھا لیکن پھر نہ کر سکا۔ اسے خود ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب جانتا ہے۔

''چلو ٹھیک ہے۔ یہاں تک تو مجھے ساری بات سمجھ آ گئی ہے اور مجھے تم سے ہمدردی بھی ہے کہ ایک عورت نے اپنی انا اور نظریات کی جنگ میں تمہاری ذات کو بھینٹ چڑھا دیا لیکن اس سب میں میرے اس سوال کا جواب کہاں ہے کہ تمہیں یہاں کال کرنے والا شخص کون تھا اور اس نے تم سے ایسا کیا کہا کہ تمہاری حالت ہی یکسر بدل گئی؟''

کسی نازک معاملے کو چھیڑنے سے گریز کرتے ہوئے وہ دوبارہ اس سوال پر آ گیا جس کے جواب کے حصول کے لیے سونیا کو سب سے الگ تھلگ لیے یہاں بیٹھا تھا۔ سونیا نے زبان سے جواب دینے کے بجائے ہاتھ میں دبی مخملی ڈبیا کا ڈھکن کھول کر اس کے سامنے کر دیا۔ سلور ہالے میں چھ کونوں والا سنہری ستارہ نوکوں پر نصب ہیروں کے باعث بے طرح جگمگا رہا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' معاذ بیک وقت حیران اور متاثر ہوا اور ڈبیا اس کے ہاتھ سے لے کر ستارے کو غور سے دیکھنے لگا۔

''یہ گولڈن اسٹار ہے جو تنظیم کے اعلیٰ عہدیداران کو دیا جاتا ہے۔ میری ماں، مطلب میڈم ایکس کے پاس بھی یہ گولڈن اسٹار موجود ہے۔''

''لیکن یہ تمہیں کہاں سے ملا؟'' سوال کرتے ہوئے بھی معاذ کی نظروں میں ڈبیا میں رکھے اس ستارے کے لیے ستائش تھی۔

''برابر والے بنگلے سے۔'' سونیا نے بم پھوڑا۔

''کیا مطلب؟ کیا تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ برابر والے بنگلے میں تنظیم کا کوئی اعلیٰ عہدیدار رہتا ہے؟'' معاذ چونکا۔

''ہاں، میں یہی کہہ رہی ہوں اور کچھ دیر قبل میرے لیے جو فون کال آئی تھی، وہ اسی ستارے کے مالک مسٹر ڈیوڈ کی تھی۔'' سونیا نے تصدیق کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اور انکشاف کیا۔

''اسے کیسے معلوم ہوا کہ تم یہاں ہو؟''

''بچوں جیسے سوال مت کرو معاذ! ہم جن لوگوں کی رہائش گاہوں میں گھسے ہوئے ہیں، وہ یہاں ملنے والے پتے کی کھڑکھڑاہٹ بھی سن سکتے ہیں۔''

''مطلب، دونوں بنگلوں کی......؟''

''ہاں، دونوں بنگلوں کی۔ تم اور میں جو اتنی آسانی سے ان بنگلوں میں گھس بیٹھے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہاں سیکیورٹی کا نظام کمزور ہے۔ وجہ صرف اتنی ہے کہ ہمیں چھوٹ دی گئی ہے اور اس وقت ہم ایک ایسے چوہے دان میں ہیں جہاں ہماری ہر حرکت دیکھنے کے ساتھ ساتھ ایک ایک لفظ سنا جا رہا ہے۔'' اس کی دی ہوئی ہر اطلاع پریشان کن تھی۔

''اگر ایسا ہے تو ہم اب تک یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ ہمیں تو فوراً سے بیشتر یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔'' وہ اضطراری طور پر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''میں نے بتایا تھا نا کہ یہ اختیار اب ہمارے پاس سے ختم ہو چکا ہے۔'' سونیا یونہی اپنی جگہ پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھی رہی۔

''کھل کر بتاؤ۔'' معاذ دوبارہ اپنی جگہ واپس بیٹھ گیا۔

''ڈیوڈ نے مجھ سے کہا ہے کہ تم اور معاذ ہمارے ساتھ غداری کے مرتکب ہوئے ہو۔ اصولاً اس جرم کی سزا موت ہے لیکن تمہیں، تمہاری ماں کی وجہ سے خاص رعایت دی جا رہی ہے۔ اب یہ تمہاری چوائس ہے کہ تم اس بنگلے سے فرار کی کوشش کر کے اپنے ساتھیوں سمیت ماری جاؤ یا وہ زندگی قبول کر لو جس کا ہم تمہارے لیے انتخاب کریں۔''

''یہ تو کچھ عجیب سی شرط ہے۔ کیا ڈیوڈ نے کچھ بتایا ہے کہ وہ کس قسم کی زندگی قبول کرنے کی پیشکش کر رہا ہے؟''

''تفصیل تو نہیں بتائی لیکن یہ صاف طور پر کہا ہے کہ وہ زندگی اتنی بری ہو سکتی ہے کہ تم اپنے لیے خود موت کی خواہش کرو۔'' وہ مایوس سی تھی۔

''ایسے میں تو ہمیں پھر فرار والے آپشن پر ہی غور کرنا چاہیے۔''

''یہ بھی تقریباً ناممکن ہے۔ دونوں بنگلوں میں اندر باہر ایسا نظام موجود ہے کہ وہ دور بیٹھے صرف ایک انگلی کے اشارے سے ہماری موت کا انتظام کر دیں گے۔ بالفرض کوئی بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو بھی گیا تو باہر ان کی پوری فورس اس کو بھوننے کے لیے تیار بیٹھی ہوگی۔'' سونیا نے اسے تفصیل بتائی۔

''تو پھر یوں کہو نا کہ آپشن ہے ہی نہیں۔ سو فیصد موت کے مقابلے میں تو آدمی بُری ہی سہی، زندگی کا ہی انتخاب کرے گا۔''

''دیکھا جائے تو یہی آپشن ہے۔ بُری ہی سہی، زندگی ملے گی تو یہ امید تو رکھی جا سکے گی کہ ہم کسی نہ کسی طور کوشش کر کے خود کو اس زندگی سے نکال لیں گے۔'' سونیا اب بھی تھوڑی سی پُرامید تھی۔

''کیا یہ پیشکش ہم اور ہمارے تمام ساتھیوں کے لیے ہے؟'' معاذ نے ایک اہم سوال کیا۔

''اس نے اس بات کی وضاحت نہیں کی۔ دوبارہ فون کرے گا تو میں پوچھ لوں گی۔''

''اس بار مجھے بھی گفتگو میں شامل کر لینا۔'' معاذ نے اسے ہدایت دی اور خود کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

''سونیا......!'' اس نے گن بردار عورت کو چھلاوے کی طرح دیوار پھاند کر ایک بنگلے سے دوسرے بنگلے میں کودتے دیکھا تو حیرت سے بے ساختہ اس کی زبان سے عورت کا نام پھسلا۔

''کدھر، کدھر ہے؟'' اس کے ساتھ موجود گل خان نے اس کی آواز سن لی اور اِدھر اُدھر سر گھماتے ہوئے بے قراری سے پوچھا۔

''وہ کالے گیٹ والا بنگلا دیکھ رہے ہو نا؟ ابھی ابھی اس کی دیوار پھاند کر برابر والے بنگلے میں کودی ہے۔''

''اس سفید گیٹ والے بنگلے میں؟'' گل خان نے آنکھیں چُندی کر کے اس جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں، اسی میں۔ وہ اپنے اصل حلیے میں تھی اس لیے میں نے ایک نظر میں ہی اسے پہچان لیا۔'' وہ خاصا پُرجوش تھا۔

''تم کو پکا یقین ہے یارا.....؟'' گل خان اب بھی مشکوک تھا۔

''بالکل، میں اسے قریب سے دیکھ چکا ہوں اس لیے مجھے یقین ہے کہ میں نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی۔''

''پھر اب کیا ارادہ ہے؟'' گل خان نے پوچھا۔

''سوچتے ہیں کچھ۔'' وہ غور سے دونوں بنگلوں کا جائزہ لینے لگا۔ ان دونوں نے یہاں تک پہنچنے میں لمبا سفر طے کیا تھا۔ پہلے وہ سونیا کے ان ساتھیوں سے ملے تھے جن کے پاس سونیا نے گل خان اور دیگر ساتھیوں کو پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ وہاں سے انہیں جیکی کا کلیو ملا تھا اور پھر جیکی کی مدد سے انہوں نے یہ جانا تھا کہ سونیا کھلونے بیچنے والی بن کر کس طرف گئی تھی۔ اس بستی سے سونیا کا سراغ لگانے کے لیے اس نے ایک چھوٹی سی ترکیب لڑائی تھی۔ بستی کے بچوں کو اکٹھا کر کے اس نے ٹوپی سے کبوتر اور رومال سے خرگوش نکالنے جیسے شعبدے دکھانا شروع کر دیے تھے۔ ان شعبدوں کو دکھاتے ہوئے ہی اس نے اعلان کیا تھا کہ جس بچے کے پاس سب سے اچھا کھلونا ہوگا، اسے ٹوپی سے نکلنے والا کبوتر تحفے میں دیا جائے گا۔ اس غربت زدہ بستی میں بچوں کے پاس مشکل ہی سے کوئی کھلونا موجود تھا چنانچہ جیکی نے ایک سانولے سے بچے کے ہاتھ میں موجود اس کھلونے کو فوراً شناخت کر لیا جو وہ خود ہی سونیا کے بہروپ میں رنگ بھرنے کے لیے دیگر کھلونوں کے ساتھ خرید کر لایا تھا۔

تماشا نمٹانے کے بعد انہوں نے شامو نامی اس بچے کو گھیر کر اس سے بہت سی باتیں اگلوالی تھیں۔ شامو نے انہیں بتایا تھا کہ سونیا نے اس کے گھر میں اچھا خاصا وقت گزارا تھا اور اس کی ماں سرسوتی کے ساتھ کھلونے بیچنے بنگلوں کی طرف گئی تھی۔ شامو سے حاصل شدہ معلومات میں اضافے کے لیے وہ سرسوتی سے ملے تھے اور لالچ و دھمکی، دونوں سے کام لے کر اس سے باقی کی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ سرسوتی کے مطابق سونیا کو اس کے پیچھے کچھ دیر میں اس بنگلے پر کھلونے بیچنے آنا تھا جہاں وہ کام کرنے گئی تھی لیکن اس کی وہاں سے واپسی تک وہ وہاں نہیں پہنچی تھی اور اس نے گمان کیا تھا کہ وہ مایوس ہو کر کہیں اور چلی گئی تھی کیونکہ اس بات کا امکان بہت کم تھا کہ امراء میں سے کوئی

انمول ہیرے

☆ دنیا کی ساری چیزیں ٹھوکر لگنے سے ٹوٹ جاتی ہیں مگر صرف انسان وہ چیز ہے جو ٹھوکر لگنے کے بعد بنتا ہے۔

☆ انسانی معاشرہ کسی بُرائی کو کبھی آسانی سے قبول نہیں کرتا اسی لیے بُرائی کو قبول و مقبول بنانے کے لیے فکری طور پر راہ ہموار کی جاتی ہے۔

☆ بہترین دنوں کے لیے بُرے دنوں سے لڑنا پڑتا ہے۔

☆ لوگ بدلتے نہیں، بس بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

☆ باطل کا انحصار ہمیشہ اسباب پر ہوتا ہے جبکہ حق کا انحصار ہمیشہ مسبب الاسباب پر ہوتا ہے۔

☆ یاد رکھیں، اگر آپ کبھی ناکام نہیں ہوئے تو اس کا مطلب ہے آپ نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔

☆ ساری عمر رشتے نبھاتے رہو، بس ایک بار چُوک جاؤ تو سارے رشتے روٹھ جائیں گے...... سارے تعلق حساب مانگیں گے، ساری محبتیں امتحان لینے لگیں گی۔

رشتے نبھانا

رشتے نبھانا کوئی آسان کام نہیں۔ کئی بار اپنا دل دکھانا پڑتا ہے۔ دوسروں کی خوشی کے لیے اپنے ظرف کا پیمانہ بلند کرنا پڑتا ہے، خطائیں معاف کرنا پڑتی ہیں، دل صاف کرنے پڑتے ہیں۔ زندگی گزر جاتی ہے اعتماد بنانے میں۔ ذرا سا تکبر نہ صرف نظروں سے گرا دیتا ہے بلکہ اللہ کی نظر میں بھی ناپسندیدہ بنا دیتا ہے۔

لوگوں کی بے اعتباری، غلط رویوں کا درد دل میں دفن کر کے ملنا پڑتا ہے تب کہیں جا کے رشتوں کی ڈوری مضبوط ہوتی ہے لیکن یہ بات صرف اور صرف اعلیٰ ظرف کے لوگ ہی سمجھ پاتے ہیں۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

اپنے بچوں کے لیے اس کے معمولی کھلونے خریدنے کی زحمت کرتا۔

انہوں نے سرسوتی سے حاصل شدہ معلومات کا تجزیہ کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ سونیا کو کوئی سراغ مل گیا تھا اور وہ وہیں کسی بنگلے میں موجود تھی۔ وہ سونیا کے نقش پا پر چلتے اس علاقے میں پہنچ گئے تھے اور دو گروپس میں تقسیم ہوکر تلاش کا کام کررہے تھے۔ ابتدا میں جیکی، سونیا کے غصے سے ڈر کر ان کا ساتھ دیتے ہوئے جھجک رہا تھا لیکن پھر اس نے جیکی کو اس بات پر قائل کرلیا تھا کہ سونیا مشکل میں ہے اور انہیں ہر حال میں اسے تلاش کرنا چاہیے۔ ان کی تلاش کا سلسلہ اس اتفاق کی صورت کامیاب ہوا تھا کہ اس نے سونیا کو بنگلے کی دیوار پھاندتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

''میری مانو تو جیکی کو بلا کر اس سے بھی مشورہ لے لو۔'' خان نے اسے سوچ میں پڑے دیکھ کر تجویز پیش کی۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ فوراً ہی اس سے رابطہ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں وہ تینوں ایک مقام پر کھڑے ایک دوسرے سے بات کررہے تھے۔

''میڈم کے اس طرح دیوار جمپ کرکے جانے کا مطلب ہے کہ وہ اس بنگلے میں چوری چھپے داخل ہوئی ہیں۔'' جیکی نے ساری تفصیل سن کر رائے دی۔

''شاید ایسا ہی ہو لیکن اس کے انداز میں، میں نے عجیب سی عجلت محسوس کی تھی۔ یوں جیسے دیکھ لیے جانے سے زیادہ، وہاں پہنچنے کی فکر ہو۔'' اس نے جواباً اپنے اندازے کا اظہار کیا۔

''اگر میڈم عجلت کا شکار ہوتیں تو اب تک کوئی ہلچل دکھائی دے جاتی۔'' سونیا کی فطرت سے واقف جیکی نے رائے دی۔

''ہوسکتا ہے معاملہ کچھ اور ہو۔''

''کچھ اور کیا؟''

''یہ تو معلوم کرنا پڑے گا۔'' اس نے دور سے ہی متعلقہ بنگلے پر نظریں دوڑائیں۔

''کیا تم وہاں داخل ہونے کا سوچ رہے ہو؟'' جیکی نے اندازہ لگایا۔

''یقیناً۔''

''کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے۔ اگر ہماری وجہ سے میڈم کا کوئی کام بگڑا تو وہ سخت خفا ہوں گی۔'' جیکی اس کی تجویز سے متفق نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے، تھوڑی دیر دور دور سے جائزہ لیتے رہتے ہیں پھر کوئی ایکشن لیں گے۔'' اس نے بھی عجلت دکھانا مناسب نہیں سمجھا۔ طے پایا کہ وہ مختلف سمتوں سے سفید اور کالے گیٹ والے دونوں بنگلوں کا جائزہ لیتے رہیں گے۔ اس نے خود اپنے لیے عقبی سمت منتخب کرلی۔ بذریعہ موبائل فون تینوں بہ وقتِ ضرورت ایک دوسرے سے رابطہ کرسکتے تھے۔

''ہوشیار رہنا خان اور خیال رکھنا کہ خود کو غیر ضروری طور پر مشکل میں نہ ڈالو۔'' اپنی پوزیشن پر جاتے جاتے اس نے گل خان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے نصیحت کی۔ وہ خان کو اپنے ساتھ یہاں تک لے تو آیا تھا لیکن اب احساس ہورہا تھا کہ وہ ایک گھربار والا بندہ ہے جس کے بیوی بچے اپنی ضروریات کے لیے اس پر انحصار کرتے ہیں۔ ٹانگ کا ہلکا سا لنگ بھی اس کا ایک کمزور پہلو تھا اور اپنی اس کمزوری کے باعث وہ کسی نازک موقع پر پھنس بھی سکتا تھا۔

''بے پھکر رہو یارا! ام کوئی پاگل خانہ تھوڑی اے کہ خود کو خاہ مخاہ مشکل میں ڈالے گا، پر یاد رکھنا کہ ام مشکل وقت پڑنے پر پیچھے ہٹنے والوں میں سے بھی نئی اے۔'' جواباً گل خان کی طرف سے جذباتی پن کا اظہار ہوا۔ اس بار اس نے کچھ کہنا غیر ضروری سمجھا اور اس کا شانہ تھپک کر خود ٹہلتا ہوا عقبی سمت میں بڑھ گیا۔ یہ عقبی حصہ دراصل بنگلوں کی دوطرفہ قطار کی وہ عقبی گلی تھی جہاں سیوریج کی لائنیں اور سیفٹی ٹینک وغیرہ موجود تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے مطلوبہ بنگلے کے عقب میں پہنچا اور کان کھڑے کرتے ہوئے کوئی سن گن لینے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔

''اے، کون ہو تم اور یہاں کیا کررہے ہو؟'' ابھی وہ اس بنگلے میں داخل ہونے کے امکانات کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ بالکل پیچھے والے بنگلے کا عقبی دروازہ کھلا اور کچرے سے بھری بالٹی لیے باہر نکلنے والے ایک شخص نے اسے ڈپٹا۔ شکل اور حلیے سے وہ شخص ملازم ہی دکھائی دیتا تھا جو یقیناً کچرا باہر رکھنے کے چکر میں وہاں آنکلا تھا۔

''پلمبر ہوں یار! ادھر کسی نے سیوریج لائن لیک ہونے کی کمپلین کی تھی، وہی دیکھنے آیا ہوں۔'' اس نے بروقت بہانہ بنایا۔

''لیکن تمہارے پاس سامان تو دکھائی نہیں دے رہا؟'' اس کی نظروں سے چھلکتا شک دور نہیں ہوا۔

''اپنا چھوٹا لے کر پہنچتا ہوگا۔ اپن ایک دعوت میں تھا، ادھر ہی سیٹھ صاحب کا فون آگیا تو اپن سیدھا یہاں پہنچ گیا اور چھوٹے کو سامان لے کر پہنچنے کو بول دیا۔ سالا ابھی تک آیا نہیں۔ اپن اس کا ہی ویٹ کرتا ہے۔'' اس نے اپنی

حد تک معقول بہانہ بنایا۔

''کون سے سیٹھ نے بلایا ہے تمہیں؟'' وہ شخص بھی مکمل معلومات حاصل کرنے پر تلا ہوا تھا۔

''وہ ہے نا گپتا سیٹھ!'' اس نے تکا لگایا۔

''ادھر کوئی گپتا سیٹھ نہیں رہتا۔'' ملازم نے اسے گھورا۔

''تم کاہے کو اتنی جھک جھک کرتا ہے یار! سیٹھ اپنے کو بلایا ہے تو ہی اپن آیا ہے نا ورنہ کس کو فرصت ہے ایسے اچ خوامخواہ ادھر آنے کی۔'' وہ اس شخص سے زچ آچکا تھا لیکن مجبوری تھی کہ اسے مطمئن بھی کرنا تھا۔

''چل دکھا مجھے، کون سا پائپ لیک کر رہا ہے؟'' اس شخص کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اس لیے اکڑ کر چلتا ہوا اس کی طرف آیا اور یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ گردن اور کنپٹی پر کیے جانے والے صرف دو واروں نے اسے کسی مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے گرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس بے ہوش شخص کو کھینچتا ہوا اس کھلے ہوئے دروازے تک لایا جہاں سے وہ برآمد ہوا تھا۔ ارادہ یہی تھا کہ اسے دروازے سے اندر دھکیل کر دروازہ بند کر دے گا لیکن اسے اندر منتقل کرتے ہوئے اندر کی بے تحاشا خاموشی نے اسے ایک اور راہ دکھا دی۔ عقبی جانب موجود ایک چھوٹے سے کمرے میں جو شاید اس ملازم کے استعمال میں ہی رہتا تھا، اسے منتقل کر کے دروازہ بند کیا اور بنگلے کے نچلے حصے کا ایک چکر لگایا۔

کچن کے چولہے پر دیگچی رکھی تھی جس میں ہلکی آنچ پر کچھ پک رہا تھا۔ سجے سجائے بنگلے کے صرف ایک کمرے میں اسے ایک بوڑھی خاتون سوتی ہوئی دکھائی دی۔ اوپری منزل پر بھی کوئی موجود نہیں تھا لیکن گھر کی ترتیب اور آرائش سے ظاہر تھا کہ وہاں کچھ اور لوگ بھی مقیم ہیں۔ یقیناً وہ جوان اور متحرک لوگ ہوں گے جو زندگی سے اپنا اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے گھر سے نکلے ہوئے تھے اور پیچھے زندگی کی دوڑ سے نکل جانے والی محض سانس کی ڈوری سے بندھی بڑھیا ایک ملازم کے رحم و کرم پر اپنے بستر پر پڑی رہ گئی تھی۔

وہ مکینوں کی طرف سے کسی مداخلت سے بے فکر سیدھا چھت تک پہنچا اور اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے مطلوبہ بنگلے میں بظاہر خاموشی تھی لیکن اندرونی حصے میں جلتی مدھم روشنیوں سے ظاہر تھا کہ اندر کچھ لوگ موجود ہیں۔ اس بنگلے تک رسائی کی تدابیر پر غور کرتا وہ اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ ذرا سی دیر کے جائزے نے ہی اسے چونکا دیا۔ پہلے شمالی حصے میں کھڑی ایک پولیس وین اس کی نظروں میں آئی اور

پھر معمولی وقفے سے اس نے دو مختلف سمتوں میں یکے بعد دیگرے مزید گاڑیاں رکتے اور ان میں سے پولیس والوں کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ ان کی حرکات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس علاقے کا گھیراؤ کر رہے ہیں۔ اس نے جلدی سے اپنے دونوں ساتھیوں کو کانفرنس کال ملائی اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''پھر اب کیا کرنا ہے؟'' جیکی نے پریشانی سے پوچھا۔

''ہمیں فوری طور پر اس علاقے سے نکلنا ہوگا۔ پولیس جس بھی چکر میں علاقے کو گھیر رہی ہے، ہم مشکوک افراد کی حیثیت سے ان کے ہتھے چڑھ کر مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔''

''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔'' جیکی نے اس کی تائید کی۔

''بس تو پھر تم لوگ نکلو۔ جنوب کا رخ کرنا۔ ابھی تک اس سمت کوئی پولیس وین نہیں ہے۔''

''اور تم......؟'' اب تک خاموش گل خان نے اس سے استفسار کیا تو اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

''میں محفوظ جگہ پر ہوں۔ موقع دیکھ کر نکل جاؤں گا۔ تم لوگ چل پڑو۔ میں تمہیں گائڈ کرتا رہوں گا۔ اپنے ہتھیار کہیں چھپا دو تاکہ اگر اتفاقاً پولیس سے سامنا ہو بھی جائے تو بہانہ بنا کر نکلنے میں آسانی رہے۔'' اپنی طرف سے اطمینان دلا کر اس نے انہیں ہدایات دیں۔

''یہ سب میں دیکھ لوں گا۔ تم بس اپنا خیال کرو۔'' جیکی نے اسے جواب دیا۔ وہ تجربہ کار بندہ تھا اور اسے اس قسم کے حالات سے نمٹنے کا تجربہ تھا۔ اصل فکر اسے گل خان کی طرف سے تھی۔

''خان کا خیال رکھنا یار!'' وہ فون بند کرتے کرتے جیکی سے کہے بغیر نہ رہ سکا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ان دونوں کو جنوب کی سمت جاتے ہوئے دیکھ بھی لیا۔ وہ سمت ہنوز صاف تھی اور ابھی تک وہاں کوئی پولیس کی گاڑی نہیں پہنچی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے اور بے پروا انداز میں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ بالکل اچانک ہی پولیس کی ایک گاڑی منظر میں داخل ہوئی۔ اس نے چونک کر انہیں کال کرنے کے لیے موبائل پر انگلیوں کو حرکت دی لیکن پھر رک گیا۔ فون کرنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ پولیس والے بالکل ان کے سروں پر پہنچ چکے تھے۔ وہ اپنی جگہ ساکت فکرمندی سے اس طرف دیکھتا رہا۔ پولیس والے گاڑی سے نکل کر ان دونوں سے سوال جواب کر رہے تھے۔ اتنی دور سے وہ کچھ سن تو نہیں سکتا تھا لیکن یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ زیادہ تر سوالات کے جواب جیکی ہی دے رہا

تھا۔ کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد ایک پولیس والے نے اپنی ڈائری میں کچھ نوٹ کیا اور ان دونوں کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں بہ خیریت پولیس سے بچ کر نکل گئے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ جیکی نے پتا نہیں کیا کہانی سنا کر پولیس کو مطمئن کیا تھا۔ اس کے لیے بس یہ اطمینان کافی تھا کہ وہ دونوں خیریت سے نکل گئے ہیں۔

ان دونوں کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد اس نے توجہ ایک بار پھر اس بنگلے کی طرف مبذول کی جہاں سونیا کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہاں اب بھی اسے کوئی دکھائی نہیں دیا لیکن وہ احساس بہرحال ابھر رہا تھا جو کسی جگہ انسانوں کی موجودگی کی نشاندہی کرتا ہے۔

''اس بنگلے کے اندر جائے بغیر بات نہیں بنے گی۔''

وہ زیر لب بڑبڑایا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا۔ نچلی منزل پر صورتِ حال ہنوز ویسی ہی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ کوئی بھی چھیڑ چھاڑ کیے بغیر وہ چپکے سے باہر نکل گیا۔ عقبی گلی حسب سابق سنسان تھی۔ وہ اپنے مطلوبہ بنگلے کی پشت پر پہنچا اور دیوار کا جائزہ لیا۔ دیوار خاصی بلند اور سپاٹ تھی لیکن بغور جائزہ لینے پر چند چھوٹے چھوٹے رخنے دکھائی دے گئے۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ دونوں جوتے اتار کر جیبوں میں ٹھونسے اور ہاتھ پیروں کی انگلیاں ان رخنوں میں پھنسا کر پھرتی سے اوپر چڑھنے لگا۔ اوپر سے جھانک کر وہ اس چیز کا پہلے ہی جائزہ لے چکا تھا کہ دیوار پر کانچ کے ٹکڑے یا بجلی کے تار وغیرہ موجود نہیں ہیں چنانچہ ذرا سا اوپر پہنچ کر کسی بندر کی طرح اچھلا اور دیوار کی منڈیر تھام لی۔ اگلے لمحے وہ دیوار کے اوپر موجود تھا۔ یہی لمحہ قیامت ڈھا دینے والا تھا۔ طاقتور کرنٹ نے اسے زور کا جھٹکا دیا تھا اور وہ کسی فٹ بال کی طرح اچھل کر دھم کی آواز کے ساتھ بنگلے کے پچھلے حصے میں جا گرا تھا۔

☆☆☆

''تم جانتے ہو کہ یہودی تعداد میں دیگر بڑے مذاہب کے پیروکاروں کے مقابلے میں بہت کم ہیں لیکن انہیں اپنی ذہانت اور چالاکی کے استعمال سے خود کو منوانا آتا ہے۔ وہ دنیا کے ہر میدان میں اپنے پنجے گاڑ رہے ہیں اور جہاں ضرورت ہو، اپنی عددی کمی کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کو استعمال میں لے آتے ہیں۔'' جب تک ڈیوڈ کی دوسری کال نہ آجاتی، ان کے پاس باتوں کے سوا کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا چنانچہ خاموشی کے ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد ایک بار پھر گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ گفتگو زیادہ تر سونیا ہی کر رہی تھی کہ اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا۔ وہ باتیں جو شاید آج تک اس نے کسی سے نہیں کی تھیں، اب معاذ کے گوش گزار کر رہی تھی اور معاذ ایک اچھے سامع کا کردار ادا کرتا، توجہ سے سب سن رہا تھا۔ ان کے الگ کمرے میں آ کر بیٹھنے کا لحاظ کرتے ہوئے ساتھیوں میں سے کسی نے اخلاقاً وہاں آنا مناسب نہیں سمجھا تھا البتہ وہ ان کی دھیمی دھیمی آوازیں اور اعظم کی قلقاریاں وہاں بیٹھے سن سکتے تھے۔

''میں اپنے تئیں انڈیا کے ایک امیر لیکن عام شہری کی رہائش گاہ میں داخل ہوئی تھی اور بظاہر سیکیورٹی کا جو جدید نظام نصب تھا، اسے بھی دولت مندی کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔ اگر میں تمہارے ساتھ بچے کے لیے سیٹ کیے گئے کمرے میں نہ جاتی اور وہاں ہر طرف مقدس ستارے کا عکس نہ دیکھتی تو مجھے احساس ہی نہیں ہوتا کہ میں انجانے میں کس شخص کے گھر میں آگئی ہوں۔ تم نے ڈیوڈ اور اس کی بیوی کی تصویریں دیکھی ہوں گی نا؟ سچ بتاؤ، کیا تمہیں یہ جان کر حیرت نہیں ہوئی تھی کہ اتنے عمر رسیدہ جوڑے کا ایک شیر خوار بے بی بھی ہے؟''

''ہاں، ہوئی تھی حیرت اور میں نے سوچا تھا کہ ہوسکتا ہے بے اولادی سے گھبرا کر انہوں نے کوئی بچہ ایڈاپٹ کر لیا ہو۔'' معاذ نے اس کی تائید کی۔

''مجھے یقین ہے کہ ڈیوڈ اور اس کی بیوی بے اولاد نہیں ہوں گے۔ ان کے اپنے بچے کسی ترقی یافتہ ملک میں پُرآسائش زندگی گزار رہے ہوں گے اور وہ یہاں ہندوستانی لاوارث بچوں کو ایڈاپٹ کر کے اپنے ڈھنگ سے ان کی تربیت کر رہے ہوں گے۔ ایسے بچے شروع ہی سے مذہبی جنون میں مبتلا ہوتے ہیں اور اس جنون کا فائدہ اٹھا کر انہیں کسی بھی مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس ترکیب کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا بچہ مر بھی جائے تو خود اپنا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ وہ جسے یہودی بناتے ہیں، اسے کاغذات میں اپنا نام تو دے دیتے ہیں لیکن کبھی یہودی تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا نسلی برتری کا غرور اس بچے کے سوا جس نے یہودی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے، کسی کو یہودی تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔'' اس نے خود یہودی ماں کی کوکھ سے جنم لیا تھا اور یہودیوں کے درمیان ہی پلی بڑھی تھی اس لیے ان کی رگ رگ سے واقف تھی۔

''تمہاری پرورش بھی یقیناً انہی خطوط پر ہوئی ہوگی؟'' معاذ نے دریافت کیا۔

''بالکل۔''

''پھر تم میں وہ مذہبی جنونیت کیوں نہیں ہے بلکہ اب تو تم بغاوت کی راہ پر چل نکلی ہو؟''

''میرا معاملہ باقی بچوں سے تھوڑا مختلف اس لیے ہے کہ مجھے ان کی طرح لگژری ماحول میں نہیں پالا گیا۔ میں ان مظلوم فلسطینی بچوں کے ساتھ پلی بڑھی جن کو یتیم کرنے کے بعد اپنی جنگ کا ایندھن بنانے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ مجھے ان میں سے ایک بچہ آج بھی یاد ہے۔ اسے چھوٹی سی عمر میں قرآن کا کافی حصہ یاد تھا اور وہ مجھے بتاتا رہتا تھا کہ جو کچھ ہمیں مسلمانوں کے خلاف پڑھایا اور بتایا جا رہا ہے، وہ سچ نہیں ہے۔ وہ مجھے محمد ﷺ کی سیرت کے متعلق بہت سے متاثر کن قصے سناتا تھا لیکن پھر ایک دن ہمارے اتالیق نے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی اور اس جرم میں اسے اتنی کڑی سزا دی گئی کہ وہ زخموں کی تاب نہ لا کر چند دن میں مر گیا۔ میں نے دفنائے جانے سے پہلے اس کی لاش دیکھی تھی اور میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ میں نے پوری زندگی میں کسی مرنے والے کے چہرے پر ایسی رونق اور روشنی نہیں دیکھی۔'' اس کی آنکھیں نم تھیں اور وہ دور کہیں کسی اور منظر میں پہنچی ہوئی تھی۔

''اس کی موت نے مجھے ڈرا دیا تھا اس لیے میں نے کبھی قاعدے قوانین سے ہٹ کر چلنے کی ہمت نہیں کی اور وہ سب کچھ سیکھتی رہی جو مجھے سکھایا جاتا رہا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اپنے بچپن کے دوست کی وہ باتیں ہمیشہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں موجود رہیں۔ پھر جب میری داراب سے شادی ہوئی تو اس کی ماں کی وجہ سے بچپن کی وہ باتیں ایک بار پھر تازہ ہو گئیں۔ داراب جتنا بڑا بدمعاش تھا، اس کی ماں اتنی ہی نیک اور عبادت گزار عورت تھی۔ وہ روز بلند آواز میں قرآن کی تلاوت کرتی تھی اور انجانے میں ان سارے نظریات پر ضرب لگاتی رہتی تھی جو مجھے ازبر کروائے گئے تھے۔ داراب کی ماں مری تو مجھے خود سے لڑنے کی اذیت سے نجات ملی اور میں اس راہ پر آسانی سے چلنے لگی جس پر چلنے کی مجھے تربیت دی گئی تھی لیکن اندر جو تقسیم تھی، وہ تو قائم ہی رہی اور جب ایسا ہو تو بندہ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی بہانے انقلاب سے گزرتا ہی ہے۔ میں بھی گزر گئی۔'' اس نے گویا اپنی داستان ختم کر کے چپ سادھ لی۔

''اس سب میں تم ماں بیٹی کے تعلق کا کیا ہوا؟ کچھ بھی سہی، وہ تمہاری ماں تھی اور ماں اپنی اولاد سے محبت کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔'' سونیا سے یہ سب کہتے ہوئے اس کے تصور میں اپنی ماں کی تصویر لہرا گئی۔ اس کی خوش ادا اور سلیقہ مند ماں اولاد کے آرام پر اپنا سکون وار دیتی تھی۔ اس کی زندگی کا محور و مرکز اپنی اولاد تھی اور جب اسے اس اولاد کی دوری کی اذیت سہنی پڑی تو پھر وہ زیادہ دن جی نہیں سکی۔ اپنی ماں کی موت اور کنبے کی جدائی کا داغ سینے میں لیے وہ ان ظالموں کے خلاف بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن ہر بار حالات ہاتھ پیر باندھ کر اسے بے بس کر ڈالتے تھے۔

''میری ماں بھی ایک تقسیم شدہ عورت ہے۔ فطرت اسے مجھ سے محبت کرنے پر مجبور تو کرتی ہے لیکن زخمی انا ایسا کرنے نہیں دیتی۔ اسے ہر بار یاد آجاتا ہے کہ میں اس شخص کی نشانی ہوں جو دھوکے سے اس کی زندگی میں شامل ہوا تھا۔ یوں بھی اس کے نزدیک اولاد کا نمبر ملک اور قوم کے بعد آتا ہے اور وہ اس جنون میں مبتلا ہے کہ اپنی قوم کی حکمرانی پوری دنیا پر قائم کر کے دم لے گی۔'' غداری کا الزام لگ چکا تھا اور سزا کا فیصلہ بھی ہو چکا تھا اس لیے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ جو بھی گفتگو کر رہی ہے، اسے کہیں اور سنا جا رہا ہوگا۔

''مذہبی جنون جہاں بھی ہو، وہ انسان کو نارمل نہیں رہنے دیتا۔ ایسا جنونی انسان بھول جاتا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی مذہب نہ تو انسانوں سے نفرت کرنا سکھاتا ہے اور نہ ہی انسانیت کی تذلیل کی اجازت دیتا ہے۔ یہ بس کچھ مخصوص لوگ ہوتے ہیں جو معصوم لوگوں کو اپنے پیچھے لگا کر ایسی انتہا پسندی پر لے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ظلم انسانیت کو شرمانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہمارے درمیان بھی ایسے جنونیوں کا ایک طبقہ موجود ہے۔ بس اللہ سے یہی دعا ہے کہ ایسے جنونیوں کو ہدایت دے اور اس دنیا میں امن قائم کرے۔'' معاذ کے الفاظ میں دکھ بھی تھا اور اس بدصورتی کا اعتراف بھی جو وطنِ عزیز کے لیے ایک ایسا داغ بن گئی تھی جو آہستہ آہستہ دنیا بھر میں پاکستانیوں کے لیے ناپسندیدگی اور نفرت کا باعث بن رہی تھی۔

''تمہارے ہاں اس جنونیت کو باقاعدہ پلانٹ کیا گیا ہے۔ تمہاری مخالف قوتوں نے سمجھ لیا تھا کہ مذہب تمہاری سب سے بڑی قوت ہے اس لیے انہوں نے اس شعبے پر کام کیا اور چالاکی سے ایسے لوگوں کو اس شعبے میں داخل کیا جنہوں نے سب کچھ الٹ کر رکھ دیا۔ اس عدم توازن نے تمہارے لوگوں کو ذہنی طور پر متوازن نہیں رہنے دیا ہے۔'' سونیا کا تبصرہ سچ پر مبنی تھا لیکن اسے اس پر رائے دینے کا موقع نہیں ملا کہ باہر سے سنائی دینے والی ایک زوردار آواز

نے توجہ کھینچ لی تھی۔
''یہ کیا ہوا؟'' سونیا پریشانی سے بولتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔
''ایسا لگتا ہے، باہر کوئی شے آکر گری ہے۔'' معاذ نے تبصرہ کیا اور وہ دونوں تیزی سے کمرے سے باہر نکلے۔ لاؤنج میں موجود ان کے ساتھیوں نے بھی وہ آواز سن لی تھی اور پریشان کھڑے تھے۔
''آواز عقبی حصے سے آئی ہے۔ ہم چل کر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوا ہے۔'' جارو، معاذ کی صورت دیکھتے ہی بولا تو معاذ اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑا۔ براہِ راست باہر نکلنے کے بجائے انہوں نے پہلے عقبی کمروں کی اس طرف کھلنے والی ایک کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر ایک جوان العمر آدمی زمین پر آڑھا ٹیڑھا پڑا ہوا تھا اور اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ بے ہوش ہے۔
''یہ کون ہے اور کہاں سے آیا؟'' ان کے پیچھے چلی آنے والی سونیا نے بھی اس شخص کو دیکھا اور حیرت سے بولی۔
''باہر نکل کر دیکھنا پڑے گا۔''
''یہ کوئی چال بھی ہو سکتی ہے۔'' معاذ کا ارادہ جان کر اس نے خدشے کا اظہار کیا۔
''ہم جس طرح پھنس چکے ہیں، اس کے بعد کسی چال کی گنجائش باقی تو نہیں رہتی۔'' معاذ کی بات میں وزن تھا۔
''پھنس چکے ہیں سے مطلب؟'' جارو نے تشویش سے پوچھا۔
''کیا تمہیں نہیں معلوم؟ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہارے لمبے کانوں نے سونیا اور میرے درمیان ہونے والی تمام گفتگو تم تک پہنچا دی ہوگی۔'' معاذ کو اس کے یوں سوال کرنے پر حیرت ہوئی۔
''میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا دوست کہ کسی دوسری جگہ ہونے والی گفتگو سننے کے لیے مجھے ارادتاً اپنی توجہ مرکوز کرنا پڑتی ہے اور میں اتنا بداخلاق انسان نہیں ہوں کہ دو دوستوں کی تنہائی میں جاری گفتگو پر کان لگا کر بیٹھ جاؤں۔''
''پھر تو تمہیں پوری تفصیل سنانا پڑے گی اور یہ کام میں باقی دوستوں کی موجودگی میں کروں گا۔ فی الحال جو مسئلہ درپیش ہے، اسے چل کر دیکھتے ہیں۔'' معاذ نے اس سے کہا اور لاؤنج میں واپس آیا جہاں باقی لوگ ان کے منتظر تھے۔
''پچھلی طرف ایک آدمی بے ہوش پڑا ہے۔ بظاہر کوئی زخم نظر نہیں آرہا لیکن اس کی بے ہوشی جینوئن لگتی ہے۔''
''اسے کرنٹ لگا ہوگا۔'' اس نے منتظر لوگوں کا تجسس دور کرنے کے لیے جو اطلاع دی تھی، اس پر سب سے پہلے اور بے ساختہ ردعمل انوپ نے دیا۔
''کرنٹ؟ کیا یہاں دیواروں میں کرنٹ دوڑ رہا ہے؟ لیکن میں نے تو کوئی الیکٹرک وائر وغیرہ نہیں دیکھا۔ ہم خود بھی پڑوس سے دیوار پھلانگ کر اندر آئے تھے۔'' انوپ کی دی اطلاع اس کے لیے حیران کن تھی۔
''الیکٹرک وائر نہیں بچھائے گئے ہیں۔ لوہے کی پتلی سی پتریاں منڈیروں پر ایک پٹی کی صورت موجود ہیں اور ان پر دیواروں کے جیسا ہی کلر کیا گیا ہے اس لیے ایسے دیکھنے میں نظر نہیں آتیں۔'' انوپ نے بتایا۔
''میرے خیال میں پہلے اس بندے کو اٹھا کر اندر لے آتے ہیں پھر باقی کی تفصیل کرتے رہیں گے۔'' جارو نے گفتگو میں دخل دیا اور سرمد کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ دونوں ذرا دیر میں اس شخص کو اٹھائے اندر لے آئے اور نیچے قالین پر لٹا دیا۔ فوراً ہی اسے ہوش میں لانے کی تدابیر کی جانے لگیں۔ جارو اور سونیا دونوں ہی ابتدائی طبی امداد کے اصولوں سے واقف تھے اس لیے ان کی تدابیر کامیاب ٹھہریں اور وہ شخص آنکھیں کھول کر پلکیں پٹپٹانے لگا۔ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ ہوش آجانے کے باوجود حواس پوری طرح بحال نہیں ہوئے ہیں اور وہ اردگرد کے ماحول کو سمجھنے سے قاصر ہے۔
''بڑا ظالمانہ طریقہ ہے سیکیورٹی کا۔ اس طرح تو کسی کی جان بھی جا سکتی ہے۔'' اس شخص کی حالت دیکھتے ہوئے سرمد نے غصے سے تبصرہ کیا۔
''صرف پچھلی دیوار کا سسٹم آن کیا جاتا ہے اور وہ بھی فوری ایکٹیو نہیں ہوتا۔ پہلی بار پتری پر پریشر پڑنے سے کچھ نہیں ہوتا لیکن دوبارہ بھی ایسا ہو تو کرنٹ آجاتا ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ یہ بندہ اتنی اونچی دیوار پر چڑھا کیسے؟ وہاں تو بلیاں وغیرہ بھی نہیں چڑھ سکتیں۔'' انوپ نے گویا وضاحت دی۔ اس کی ملازمت کے عرصے میں یہ پہلا واقعہ پیش آیا تھا کہ کسی نے عقبی دیوار پھاند کر اندر داخل ہونے کی کوشش کی تھی اور کرنٹ کا نشانہ بن گیا تھا۔
''یہ سب باتیں چھوڑو اور اس کے لیے ایک گلاس گرم دودھ لے کر آؤ۔'' معاذ نے ڈپٹ کر اس سے کہا تو وہ منہ بناتا ہوا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ پیچھے جارو اس کی نگرانی کے لیے موجود تھا۔ انوپ کے مزاج کی تیزی وطراری کی وجہ سے اس پر بالکل بھی بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا البتہ اس کا ساتھی ہاشو اس کے مقابلے میں قدرے بزدل اور بے ضرر تھا

بلکہ جب سے ان کی تعداد میں اضافہ ہوا تھا، وہ کچھ گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا اور مسلسل ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔

''تم کون ہو مسٹر؟ کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ تم نے دیوار پھاند کر اندر داخل ہونے کی کوشش کیوں کی؟'' سونیا اب اس شخص سے مخاطب تھی اور اسے بات کرنے پر اکسا رہی تھی لیکن وہ جواب دینے کے بجائے خاموشی سے اس کے چہرے کو گھور رہا تھا۔

''اسے سہارا دے کر بٹھاؤ سرمد! دودھ وغیرہ پی کر شاید اس کے حواس پوری طرح بحال ہو سکیں۔'' معاذ کو پتا نہیں کیوں اس جوان پر رحم آ گیا جو اسے سونیا کی فوری تفتیش سے بچانے کی کوشش کی۔ اس کی آواز سن کر جوان نے نظروں کا رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھا اور معاذ نے ان آنکھوں کا تاثر بدلتا دیکھا۔ یوں لگا کہ وہ اسے دیکھ کر خوش ہوا ہو لیکن بس یہ پل بھر کی بات تھی۔ اس نے نظروں کا زاویہ بدلا اور سرمد کے سہارے اٹھ کر بیٹھنے لگا۔ اسی اثنا میں انوپ، جارو کی نگرانی میں گرم دودھ کا گلاس لے کر آ گیا۔

نوجوان اطمینان سے دودھ کا گلاس خالی کرنے لگا۔

''مجھے یقین ہے کہ یہ شخص میک اپ میں ہے اور اس نے اپنے چہرے میں تبدیلیاں لانے کے لیے پلاسٹک اور کاسمیٹک سرجریز بھی کروا رکھی ہیں۔'' سونیا اس کے قریب سے اٹھ کر معاذ کے پاس آئی اور دھیمی آواز میں آگاہ کیا۔

''واقعی!'' معاذ چونکا اور غور سے نوجوان کے چہرے کو دیکھا۔ یقیناً جو بھی تبدیلیاں کی گئی تھیں، وہ بہت ماہر ہاتھوں نے کی تھیں اس لیے دور سے دیکھنے پر اسے کچھ محسوس نہیں ہو پا رہا تھا۔ سونیا البتہ اس کے بالکل قریب بیٹھی رہی تھی اس لیے اس کی تجربہ کار نظروں نے تبدیلیوں کو بھانپ لیا تھا۔

''پتا نہیں یہ کون مصیبت ہے۔ اب اس کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے اس کا بھی انٹرویو کرنا پڑے گا۔'' وہ پہلے ہی تناؤ کا شکار تھا۔ ڈیوڈ کے اب تک دوبارہ کال نہ کرنے سے اس تناؤ میں اضافہ ہوا تھا اور اوپر سے ایک اور مسئلہ نازل ہو گیا تھا تو جھنجلاہٹ محسوس کرنا فطری سی بات تھی۔ اس جھنجلاہٹ نے خود بخود اس کی نظروں میں تندی پیدا کر دی۔ نوجوان نے دودھ کا گلاس ختم کر کے نیچے رکھا اور اطمینان سے معاذ کی طرف دیکھنے لگا۔ معاذ کی تندی کے مقابلے میں اس کی نظروں میں بڑی نرمی تھی۔

''مجھے آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا ہیں۔'' بالکل اچانک ہی یہ فرمائش کر کے اس نے معاذ کو حیران کر دیا۔

''وہ کیوں؟'' لہجے میں سختی سمو کر دریافت کیا۔

''کیوں کا جواب تو آپ کو مجھ سے تنہائی میں بات کر کے ہی مل سکے گا۔'' اس پر گویا معاذ کے لہجے کا اثر ہی نہیں ہوا۔

''یہ بولتے ہوئے آواز بھی بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' سونیا نے معاذ کے کان میں سرگوشی کی۔

''میں نوٹ کر چکا ہوں۔'' معاذ نے اسے آہستہ سے جواب دیا اور نوجوان کی طرف متوجہ ہوا۔

''اگر میں تمہارا مطالبہ ماننے سے انکار کر دوں تو؟''

''تو میں آپ سے معذرت کر لوں گا کیونکہ جو کچھ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں، اس کے لیے تنہائی ہی مناسب ہو گی۔'' اس کے لہجے میں سنجیدگی اتر آئی۔ معاذ کچھ دیر اسے بغور دیکھتا رہا پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے، آؤ میرے ساتھ۔''

''بہت شکریہ۔'' وہ اس کا جواب سن کر خوش ہو گیا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں اس کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔

''کیا تم کوئی تکلیف محسوس کر رہے ہو؟'' معاذ نے فوراً محسوس کیا۔

''کرنٹ کھا کر جتنی بلندی سے میں گرا ہوں، اس کے بعد یہ سوال بنتا تو نہیں ہے۔'' اس نے مسمسی سی صورت بنا کر جواب دیا۔

''مشورہ کس نے دیا تھا یوں دوسروں کے گھروں کی دیواریں پھاندنے کا؟'' سونیا کو اس کی اداکاری پر غصہ آیا۔

''میں تو صرف آپ کی نقل کر رہا تھا جی۔ بس غلطی یہ کی کہ بازو سے پھلانگ کر آنے کے بجائے پیچھے سے آ گیا۔'' ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے اس کے انداز میں اس بلا کی معصومیت تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی معاذ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی البتہ سونیا کے ماتھے پر دو تین بل نمودار ہوئے۔

''خیال سے معاذ! مجھے یہ شخص خطرناک لگ رہا ہے۔'' اس نے معاذ کو نصیحت کرنا ضروری سمجھا۔ اگر وہ ذرا سا بھی اشارہ کر دیتا تو وہ اس کے ساتھ نگرانی کے لیے اندر چلی جاتی۔

''ڈونٹ وری۔ میں دیکھ لوں گا۔'' معاذ نے اسے تسلی دی اور نوجوان کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

''معاذ بھائی......! آپ کو یوں زندہ سلامت اپنے سامنے دیکھ کر مجھے کتنی خوشی محسوس ہو رہی ہے، میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔'' دروازہ بند ہوتے ہی نوجوان لپک کر اس کے

سینے سے لگا اور جذباتی انداز میں بولتا چلا گیا۔ اس کے انداز میں سچائی اور خلوص کی اتنی فراوانی تھی کہ معاذ کو خود اپنے اندر کوئی تبدیلی محسوس ہوئی۔ ساتھ ہی اس نے نوٹ کیا کہ نوجوان کا لب و لہجہ بدل چکا ہے۔ یہ لہجہ، یہ آواز اس کے لیے شناسا تھے۔

''وکی......! تم وکی ہو نا؟'' شناخت کا مرحلہ طے کرنے میں اسے چند سیکنڈز سے زیادہ کا وقت نہیں لگا۔

''شکر ہے آپ نے مجھے پہچانا تو۔'' وہ اس کے پہچاننے پر خوش ہو گیا۔

''شکر تو میں تمہیں زندہ دیکھ کر ادا کر رہا ہوں۔ میرے پاس تو تم لوگوں کے بارے میں بہت بُری اطلاعات پہنچی تھیں۔ اگر وہ اطلاعات جھوٹی تھیں تو میں امید رکھ سکتا ہوں کہ میرا خاندان سلامت ہے۔'' وہ وقاص عرف وکی کو اپنے سامنے پا کر بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔

''الحمد للہ! سب سلامت ہیں اور آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں۔'' اس نے وہ خوشخبری سنائی جس کی اسے امید بھی نہیں تھی۔ جذبات کی شدت سے معاذ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اس نے بے حد جذباتی انداز میں وکی کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''تم نے مجھے پھر سے زندہ کر دیا وکی! میرا بس نہیں چل رہا کہ اپنی اس خوشی کا اظہار کیسے کروں؟'' اس کی آواز بھی شدتِ جذبات سے بھرا گئی تھی۔ خوشی کی انتہا پر کھڑا وہ ان حالات کو بھی بھول گیا تھا جن میں ساتھیوں سمیت گھرا ہوا تھا۔

''خوش تو وہ پگلی بھی بہت ہو گی جب میں اسے آپ سے ملنے کی اطلاع دوں گا۔'' وکی، علینہ کا تصور کر کے مسکرایا۔

''علینہ کی بات کر رہے ہو نا تم؟ کیسی ہے میری گڑیا اور کہاں ہے؟'' اتنا جذباتی وہ شاید زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ سچ پوچھیں تو میں اسی کی خاطر آپ کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا یہاں پہنچا ہوں۔ آپ کو اپنے ساتھ لے کر اس سے ملوانے......'' وکی پتا نہیں کیا کہنے جا رہا تھا کہ اس کو یکدم ہوش آیا اور تیزی سے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں وکی......پلیز نہیں۔ آگے ایک لفظ بھی نہ بتانا۔''

''کیا بات ہے معاذ بھائی؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' وکی کو اس کے انداز نے تشویش میں مبتلا کیا۔

''اس سے بڑا مسئلہ اور کیا ہو گا کہ ہم اس وقت دشمنوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں اور ہمارا یہاں ادا کیا جانے والا ایک ایک لفظ سنا جا رہا ہے۔'' معاذ دکھی اور شکستہ لہجے میں بولتا ہوا ایک طرف بیٹھ گیا۔ اسے اب افسوس ہو رہا تھا کہ جذباتیت میں ایک ایسی اطلاع دشمنوں تک پہنچ گئی جسے ہرگز بھی نہیں پہنچنا چاہیے تھا۔

''کیا واقعی ہماری یہاں کی جانے والی گفتگو کہیں سنی جا رہی ہے؟'' وکی کو بھی اس اطلاع نے صدمہ پہنچایا تھا۔

''ہاں۔'' معاذ نے مرے مرے لہجے میں تصدیق کی۔

''اوہ میرے خدا!'' وکی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ وہ جانتا تھا جو کچھ ہوا ہے، اس کے نتیجے میں لالہ عیسیٰ کا خطیر سرمایہ اور بڑی قربانیاں رائگاں چلی گئی ہیں لیکن یہ وہ کمان سے نکلا تیر تھا جو لوٹ کر واپس نہیں آ سکتا تھا۔

''کیا یہاں رُک کے رہنا آپ کی مجبوری ہے؟ میرا مطلب ہے کیا ہم سب یہاں سے نکل نہیں سکتے؟'' کچھ دیر صدمے کی کیفیت میں بیٹھے رہنے کے بعد اس نے خود کو سنبھالا اور معاذ سے پوچھا۔

''سونیا کا خیال ہے کہ ایسی کوئی کوشش بے سود ثابت ہو گی۔ دشمن اتنا طاقتور ہے کہ اپنی مرضی کے ذرا بھی خلاف کچھ ہونے پر بیٹھے بیٹھے ہمیں دفن کر دے گا۔''

''کیا آپ سونیا پر اعتماد کر سکتے ہیں؟ وہ تو خود دشمن کی صف میں سے ہے۔''

''پہلے بالکل بھی اعتماد نہیں کرتا تھا لیکن اتنے عرصے سے جس طرح وہ قدم قدم پر میرا ساتھ دیتی رہی ہے، اعتبار قائم ہوتا جا رہا ہے۔'' معاذ کو اعتراف کرنا پڑا۔

''میں نے اس کی موجودگی کی وجہ سے ہی سب کے درمیان اپنا تعارف نہیں کروایا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں دیواروں کے بھی کان ہیں۔''

''جو ہوا، انجانے میں ہوا۔ امید ہے جس نے اب تک ہم سب کی حفاظت کی ہے، وہ آئندہ بھی اپنا کرم کرتا رہے گا۔'' معاذ نے اسے تسلی دی۔

''ان شاء اللہ!''

''یہ بتاؤ کہ تم ہم تک پہنچے کیسے؟ ہمارا کھوج لگانا، وہ بھی پاکستان سے یہاں آ کر کوئی آسان بات تو نہیں ہے۔''

''اس کے پیچھے بھی دشمنوں کی مہربانی ہے۔'' وکی نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جواب دیا اور اپنے یہاں تک پہنچنے کی ساری تفصیل کہہ سنائی۔

''اچھا تو جبلی اور گل خان بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ ایسا کرو کہ انہیں یہاں سے دور نکل جانے کا کہہ دو۔ کہیں ایسا

نہ ہو کہ تمہیں تلاشتے ہوئے وہ بھی اندر آکر پھنس جائیں۔“
ساری کہانی سن کر اس نے فکر مندی سے کہا۔
”ان دونوں کو تو میں نے پہلے ہی اس علاقے سے نکلنے کی ہدایت کر دی تھی۔ اصل میں مجھے لگا تھا کہ پولیس اس علاقے کا گھیراؤ کر رہی ہے۔“ اس نے عقبی بنگلے میں داخل ہونے اور چھت سے اطراف کا جائزہ لینے کی بات بتائی۔
”اللہ کرے کہ وہ دونوں صحیح سلامت نکل جانے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ ایسا کرو کہ ان سے رابطہ کر کے سختی سے تاکید کر دو کہ خود کو چھپانے اور بچانے کی کوشش کریں بلکہ اپنے موبائل فون بھی کہیں پھینک دیں تاکہ ان کے ذریعے انہیں ٹریس نہ کیا جا سکے۔“
”میں ابھی یہ کام کرتا ہوں۔“ وقاص اس کی بات سمجھ کر جلدی سے کال ملانے لگا جبکہ معاذ خود اٹھ کر باہر نکل گیا۔ باہر سونیا اس کی منتظر تھی۔
”وہ وقاص ہے، وقاص عرف وکی!“
”مائی گاڈ......! یہ تو ناقابل یقین ہے۔ میڈم ایکس نے خود مجھے اس کی باقی لوگوں کے ساتھ مرنے کی خبر دی تھی۔“ اسے سن کر یقین نہیں آرہا تھا۔
”یہ معجزہ کیسے ہوا، مجھے نہیں معلوم مگر اتنا جانتا ہوں کہ میرے رب نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔“ وہ رب کا شکر گزار تھا۔
”تمہیں بہت مبارک ہو معاذ! یقین جانو، میں خود ان سب کو بچانا چاہتی تھی لیکن میرے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔“ سونیا کے لہجے میں محسوس کی جانے والی سچائی تھی۔
”اللہ نے اتنی بڑی مہربانی کر دی ہے کہ اب تم سے کوئی شکوہ نہیں رہا۔“ معاذ کی خوشی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ اتنی پریشانی میں بھی اس خوشخبری کو پا کر اس کے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی تھی۔
”وکی یہاں تک پہنچا کیسے؟“ سونیا بہرحال تشویش میں مبتلا تھی۔ معاذ نے وقاص کے یہاں تک پہنچنے کی ساری تفصیل کہہ سنائی۔
”مجھے یقین ہے کہ یہ ساری کارروائی تمہیں تلاش کرنے کے لیے کی گئی ہوگی اور ایسے میں ممکن نہیں کہ وکی پر نظر رکھنے کا کوئی انتظام نہ کیا گیا ہو۔ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی ایسی ڈیوائس نتھی کی گئی ہوگی کہ اس کی لوکیشن سے باخبر رہا جا سکے۔“ سنتے ہی اس نے تبصرہ کیا۔
”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو لیکن اب ایسی کسی ڈیوائس کی اہمیت ہی کیا رہ گئی ہے۔ وکی کے خود تک پہنچنے سے قبل ہم ویسے ہی ان کے چنگل میں پھنس گئے ہیں۔“ معاذ کی بیان کردہ حقیقت نے سونیا کو شانے جھکانے پر مجبور کر دیا۔ واقعی اب ایسی باتیں غیر اہم ہو چکی تھیں۔
”ڈیوڈ کال کیوں نہیں کرتا؟ کال کرے تو ہم انتظار کی اس اذیت سے نکلیں۔“ وہ عجیب سی صورت حال میں گھرے تھے اس لیے معاذ اب اعصابی کشیدگی کا شکار ہونے لگا تھا۔
”خود کو کمپوز رکھو۔ اگر تم خود کو نہیں سنبھال سکے تو باقیوں کو کون حوصلہ دے گا؟“ سونیا نے اس کے بازو کو نرمی سے دباتے ہوئے سمجھایا تو اس نے ایک طویل سانس لیا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے لاؤنج میں آیا۔ وہاں سب چہروں پر سوالیہ نشان لیے منتظر بیٹھے تھے۔
”میرے پاس آپ لوگوں کے لیے ایک خوشخبری ہے۔“ اس نے ان سے گفتگو کا آغاز اچھی خبر سے کرنے کا فیصلہ کیا اور انہیں وقاص کے بارے میں آگاہ کیا۔ اس دوران وقاص بھی ان کے درمیان واپس آ گیا تھا۔ سب معاذ اور اسے نئی زندگی کی مبارک باد دینے لگے۔ کچھ متجسس سوالات بھی ہوئے لیکن معاذ نے ٹوک دیا۔

دانش کے موتی

☆ معافی مانگنے سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ ہم غلط اور وہ صحیح ہے۔ معافی کا اصل مطلب یہ ہے کہ ہم میں رشتہ نبھانے کی قابلیت ان سے زیادہ ہے۔
☆ جب ہماری ”تمنا“ کے پاؤں ”حاصل“ کی چادر سے باہر نکل جائیں تو ہمیں سکون نہیں ملتا۔
☆ الفاظ، چابیوں کے مانند ہیں۔ ان کا صحیح استعمال کر کے لوگوں کے منہ بند اور دل کھولے جا سکتے ہیں۔
☆ انسان کے غصے میں عجیب منافقت ہے۔ وہ اپنے سے طاقتور کے سامنے تو غصہ کنٹرول کر لیتا ہے لیکن اپنے سے چھوٹے اور کمزور پر غصہ کرنے میں دیر نہیں کرتا۔
☆ اپنی شخصیت کو سنوارنے اور زندگی کو بہتر بنانے میں اتنا مصروف ہو جاؤ کہ دوسروں پر تنقید کرنے کا وقت ہی نہ ملے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

''ابھی موقع نہیں ہے کہ وقاص سے یہ تفصیلات معلوم کی جائیں۔ ابھی کچھ اور مسائل درپیش ہیں اور میں مکمل صورت حال آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ انہیں ڈیوڈ کی گفتگو سے آگاہ کرنے لگا۔ پہلے یہ سوچ کر کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ لوگ پریشان ہو جائیں گے لیکن پھر سوچا کہ ان کی زندگیوں کے فیصلے میں ان کی رائے شامل ہونا ضروری ہے۔

''ہمیں یہاں سے نکلنے کی ایک کوشش تو کر کے دیکھنی چاہیے۔ ہوسکتا ہے ڈیوڈ ہمارے ساتھ بلف کر رہا ہو تاکہ ہمارے گرد دائرہ تنگ کرنے تک ہمیں یہاں روک سکے۔'' سب سے پہلے عالم شاہ نے اپنی رائے دی۔

''وکی کو کرنٹ لگنے والا واقعہ ثبوت ہے کہ ان بنگلوں میں کچھ خصوصی انتظامات کیے گئے ہیں اور یہاں سے نکلنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔''

''لیکن کوشش کر کے دیکھنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔''

''بالکل، لیکن خیال رہے کہ اس کوشش میں اپنا کوئی نقصان نہ ہو۔'' اس نے تائید کی۔

''ہم احتیاطی تدابیر کا خیال رکھیں گے۔'' عالم شاہ نے یقین دلایا۔

''ایک بات اور...... وکی کی اطلاع کے مطابق علاقے کو پولیس اپنے گھیرے میں لے چکی ہے اس لیے ایک امکان یہ بھی ہے کہ اگر ہم یہاں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو باہر پولیس والے ہمارے استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔'' اس نے انہیں دوسری بُری اطلاع دی۔

''پہلے اس لعنتی بنگلے سے تو باہر نکلیں پھر پولیس کو بھی دیکھ لیں گے۔'' عالم شاہ نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ سرمد کو تو لازماً اس کی پیروی کرنا تھی۔

''ادا سائیں!'' اب تک خاموش بیٹھی سجل نے اضطراری طور پر عالم شاہ کو پکارا۔ وہ اعظم کو اندر کمرے میں سلا آئی تھی اور سب کے درمیان بیٹھی ہونے والی گفتگو کو سنتی رہی تھی۔

''پریشان مت ہو سجل! ہم جو کچھ بھی کریں گے، دیکھ بھال کر کریں گے۔'' عالم شاہ نے قریب آ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور تسلی دی تو وہ سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی لیکن جس طرح وہ بیٹھے بیٹھے اپنی انگلیوں کو مروڑ رہی تھی، اس سے ظاہر تھا کہ وہ مکمل طور پر مطمئن نہیں ہے۔ اس منظر کو دیکھتے ہوئے معاذ نے اپنے دل میں تکلیف محسوس کی اور پہلی بار ایسا ہوا کہ اسے سجل کی موجودگی اچھی نہیں لگی۔ وہ، وہ تھی جس کی موجودگی سے اسے زندگی میں رنگ، سانسوں میں تازگی اور دل میں سرور محسوس ہوتا تھا لیکن اس وقت وہ سوچ رہا تھا کہ سجل کو وہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اسے ایسی جگہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا جس کے آگے ایک اندھی کھائی تھی اور وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اسے اس کھائی میں گرنے سے بچانے کے لیے کچھ کر بھی پائے گا یا نہیں۔

''تمہیں ان لوگوں کو روکنا چاہیے معاذ! یقین کرو، ڈیوڈ نے بہت سنگین لہجے میں دھمکی دی تھی اور مجھے ڈر ہے کہ اس کے حکم کی خلاف ورزی ہمیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔''

عالم شاہ، سرمد اور جارو کو اپنے ساتھ ملا کر انوپ کی مدد سے کچھ ضروری سامان اکٹھا کر رہا تھا جب سونیا نے معاذ سے کہا۔

''وہ احتیاطی تدابیر اختیار کر رہے ہیں اس لیے مجھے امید ہے کہ کسی بڑے نقصان کا شکار نہیں ہوں گے البتہ میں نے انہیں زبردستی روک لیا تو ان کے دل میں ہمیشہ یہ خلش رہے گی کہ انہیں کوشش نہیں کرنے دی گئی۔ ہوسکتا ہے ان کی کوششوں کا کوئی اچھا نتیجہ نکل ہی آئے۔'' اس نے اپنے ساتھیوں کے حق میں دلیل دی تو سونیا کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔

''کیا کرنے کا ارادہ ہے، مجھے بتاؤ۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔'' وہ اپنے ساتھیوں کے قریب چلا آیا۔

''تم صرف دیکھو۔ رسک لینے کا فیصلہ میرا ہے اس لیے جو کچھ کروں گا، میں خود کروں گا۔'' عالم شاہ نے اسے دوٹوک جواب دیا۔ اس وقت وہ اپنے سامنے کہیں سے اکٹھا کیا گیا سامان رکھے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس سامان میں ایک عدد ٹیسٹر، ہیلمٹ، ربر کے دستانوں کی جوڑی اور اسلحہ شامل تھا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ میں کوئی تم لوگوں سے الگ تو نہیں ہوں۔'' معاذ نے اس دوٹوک جواب پر احتجاج کیا۔

''الگ نہیں ہو مگر میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے متفق بھی نہیں ہو۔ ایسے میں، میں تمہیں کسی خطرے میں کیسے ڈال سکتا ہوں۔ ویسے بھی کوئی تم فلمی ہیرو نہیں ہو جو ہر خطرے میں کودنے کے لیے تمہارا ہی انتخاب ہو۔'' عالم شاہ سخت بے مروتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کے اس انداز پر معاذ مسکرا دیا کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ عالم اسے خطرے سے دور رکھنے کے لیے ایسا رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔

''میں فلمی ہیرو نہیں ہوں تو تم کس خوشی میں ہیرو بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہاں کون سا تمہارے کمالات دیکھنے کے لیے تمہاری ہیروئین بیٹھی ہوئی ہے۔'' معاذ نے

ازراہِ مذاق ایک بات کہی تھی لیکن عالم شاہ کی نظروں میں چھم سے ایک تصویر اتر آئی۔ بات بات پر اپنی چھوٹی سی ناک سکوڑ کر، نخرے سے شولڈر کٹ بالوں کو جھٹکا دیتی، وہ اجلی رنگت والی لڑکی جس کا نام اجالا تھا، اپنی تمام تر بے مروتی اور کج ادائیوں کے باوجود اس کے دل و دماغ سے نہیں نکلی تھی۔ ''را'' والوں کی قید میں، ان کی سختیاں جھیلتے ہوئے بھی اس کا خیال ذہن میں چکراتا تھا اور نواب بدر الدین کے قید خانے میں بھی اس کے روپ کے چراغ جلتے تھے۔ ایسے میں اگر وہ یہاں اس مقام اور موقع پر یاد آگئی تھی تو یہ کچھ انوکھا نہیں تھا۔

''کس سوچ میں ڈوب گئے؟'' معاذ نے اس کے سامنے چٹکی بجائی۔

''شاید ہیروئین کی عدم دستیابی پر غور ہو رہا ہے۔'' جارو نے بھی چھیڑ چھاڑ میں حصہ لیا۔ یہاں اعصاب کو کشیدہ کرنے والی صورتِ حال تھی اس لیے وہ لوگ شعوری طور پر ماحول کو ہلکا پھلکا رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''اگر مجھے کچھ ہو جائے تو سنجل کا بہت خیال رکھنا معاذ!'' عالم شاہ نے اس التجا کو کرتے ہوئے آواز اتنی دھیمی رکھی کہ اس کے سوا کوئی نہ سن سکے۔

''کچھ نہیں ہونے والا تمہیں۔ اگر ایسا کوئی وہم ہے تو رک جاؤ اپنے ارادے سے۔'' وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس گفتگو کو سنجل سن پائے اس لیے اس نے بھی اپنی آواز کو بلند نہ ہونے دیا۔

''نہیں۔'' عالم شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''جب طے کر لیا ہے کہ کوشش کرنی ہے تو کر کے رہوں گا۔'' اس نے ربر کے دستانوں کی جوڑی کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن ایک ہاتھ نے اس سے پہلے ہی وہ دستانے اچک لیے۔

''یہ کیا کر رہے ہو سرمد؟'' اس نے دستانے اچکنے والے کو گھورا۔

''وہی جو ایک غلام کو نمک حلالی کا ثبوت پیش کرنے کے لیے کرنا چاہیے۔'' دستانے ہاتھوں میں چڑھاتے ہوئے اس نے بے نیازی سے جواب دیا لیکن اس بے نیازی میں بھی اگلے کے لیے احترام میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

''خود کو غلام مت کہو۔'' عالم شاہ ناراض ہوا۔

''نمک حلال یا نمک خوار تو کہہ سکتا ہوں نا اور نمک حلالی کی پہلی شرط یہی ہے کہ میں آپ کی جان کو اپنی جان سے قیمتی سمجھوں۔'' اب وہ اپنے جوتوں کے تسمے کھینچ کر دوبارہ باندھ رہا تھا۔

''حکم کی تعمیل بھی نمک حلالی میں شامل ہے۔'' عالم شاہ نے اسے باور کرایا۔

''نیت اچھی ہو اور مالک کی بھلائی کی چاہ ہو تو حکم عدولی معاف بھی کی جا سکتی ہے۔'' اس نے ہیلمٹ اٹھا کر اپنے سر پر پہنا۔

''پاکستان واپس پہنچنے دو، دیکھنا بابا سائیں سے تمہاری اس نافرمانی کی کیسی شکایت لگاتا ہوں۔'' وہ بظاہر خفا تھا لیکن اس کے لہجے میں سرمد کے لیے خصوصی پیار تھا۔ برسوں کے ساتھ میں اس شخص نے سیکڑوں بار اس کا دل جیتا تھا۔

''جیسی آپ کی خوشی سائیں! ابھی تو آپ مجھے اجازت دیجیے۔'' سرمد نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔

''نہ کر یار!'' عالم شاہ نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھ کھولے اور جذباتی انداز میں اسے گلے سے لگا لیا۔ بُرے وقتوں کا ساتھی، ایثار و وفا کی مٹی سے گندھا وہ شخص کب کا ملازم کی حیثیت سے نکل کر اس کے لیے ایک دوست کا روپ دھار چکا تھا اور دوستوں کو تو گلے سے ہی لگایا جاتا ہے۔

''اب اجازت دیں۔'' کچھ دیر بعد سرمد نے ہی نم آلود لہجے میں کہتے ہوئے اسے خود سے الگ کیا اور باہر کی طرف بڑھا۔ باقی لوگ اس کے پیچھے تھے۔ جارو نے ایک لوڈڈ گن اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی۔ سرمد مضبوط قدموں سے چلتا ہوا مین گیٹ کی طرف گیا۔ امراء کے علاقوں کے رواج کے مطابق اطراف میں خاموشی چھائی ہوئی تھی لیکن وہ سب ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے کوئی طوفان آنے کو ہے۔

سرمد نے گیٹ کے قریب پہنچ کر سب سے پہلے ٹیسٹر سے اسے چیک کیا۔ فوراً ہی سرخ روشنی جل اٹھی۔ خدشات کے عین مطابق گیٹ میں کرنٹ دوڑ رہا تھا۔ وہ ربر کے موٹے دستانے اور پیروں میں مضبوط جوتے پہنا ہوا تھا اس لیے کرنٹ کی موجودگی کی تصدیق ہونے کے باوجود گیٹ کا لاک کھولنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا اور لاک کی ناب گھمانے کی کوشش کی لیکن کوشش ناکام رہی۔ اس نے تھوڑا ساز ور مزید لگایا لیکن لاک تو گویا مکمل جام ہو چکا تھا۔

''کیا ہوا، لاک نہیں کھل رہا؟'' اس کے عین پیچھے آ کھڑے ہونے والے جارو نے صورتِ حال کو محسوس کر کے سوال کیا۔

''بالکل جام ہے۔ ٹس سے مس بھی نہیں ہو رہا۔''

''پھر، اب کیا کرو گے؟''

''گیٹ پر چڑھ کر باہر کودنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''اس میں خطرہ ہے۔ تمہارے صرف ہاتھ اور پاؤں کرنٹ سے محفوظ ہیں۔ گیٹ پر چڑھنے میں اگر جسم کا کوئی دوسرا حصہ گیٹ سے چھو گیا تو غضب ہو جائے گا۔'' جارو نے اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

''کچھ نہیں ہوگا، میں احتیاط کروں گا۔'' سرمد نے اس کے روکنے کو خاطر میں لائے بغیر دونوں ہاتھ گیٹ کے اوپری حصے پر جما کر خود کو اوپر کی طرف اٹھایا۔ باقی لوگ فاصلے فاصلے پر کھڑے تھے اس لیے انہیں اس کے اور جارو کے درمیان ہونے والی گفتگو سنائی نہیں دی تھی۔

سرمد نے احتیاط کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنا جسم بلند کیا اور سر نکال کر باہر جھانکا۔ ابھی وہ اطراف کا جائزہ نہیں لے سکا تھا کہ ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور ہیلمٹ سے ٹکرائی۔ بائیکرز کے استعمال میں رہنے والا وہ عام سا ہیلمٹ گولی کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ گولی نے ہیلمٹ کے پرخچے اڑائے اور سب نے سرمد کو الٹ کر نیچے گرتے دیکھا۔ بے ساختہ ہی کئی قدم اس کی طرف دوڑے۔ معاذ قریب پہنچنے سے قبل ہی خون کی سرخی دیکھ چکا تھا۔ وہ سرمد تک پہنچتا، اس سے قبل ہی فون کی تیز گھنٹی کی آواز اس کی سماعت تک پہنچی۔ اتنی دیر سے جس کال کا انتظار ہو رہا تھا، وہ آچکی تھی۔

☆☆☆

''یہ تو نے کیا، کیا گلو! تو نے اسے کیوں جانے دیا؟''

''میں کیا کرتا لالہ! یہاں باذل پاگل کتے کی طرح اس کی جان کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ حامد کی آفر پر اس نے خود انڈیا جانے کا فیصلہ کیا تو مجھے لگا ایسا ہی ٹھیک ہے۔'' گلو نے اپنی صفائی پیش کی۔

''پاگل کتے کو گولی مار کر اس سے جان چھڑائی جا سکتی تھی لیکن اب تو وہ بھیڑیوں کے غول کے پیچھے چلا گیا ہے۔ تجھے پتا ہے وہ کیوں گیا ہے؟ وہ اس لیے گیا ہے کہ اسے معاذ کے ملنے کی امید دکھائی دی ہوگی۔''

''تو پھر تو وہ بالکل ٹھیک گیا ہے لالہ! وہ اسی کام کے لیے تو تم لوگوں کو چھوڑ کر یہاں خوار ہو رہا تھا۔ اب جب اسے راہ مل گئی ہے تو تم اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟'' گلو کو حیرت ہوئی۔

''وہ میرے اکلوتے بھائی کی نشانی اور میرے خاندان کا آخری چراغ ہے گلو! میں اسے جیتا دیکھنا چاہتا ہوں لیکن وہ جن کی راہ پر لگ گیا ہے، وہ بہت ظالم ہیں۔ انسان کو کبھی سے بھی کم اہمیت دیتے ہیں۔''

''تو اسے وہیں روک لیتے نا، کیوں آنے دیا یہاں اس جہنم میں؟'' گلو، لالہ کا پرانا وفادار تھا چنانچہ لالہ کے دکھ نے اسے بھی دکھی کر دیا تھا۔

''روکنا چاہتا تھا، بتانا چاہتا تھا کہ اتنا پیسا لٹا کر، اتنے چکر چلا کر اور سب کچھ تیاگ کر دنیا کے اس الگ تھلگ گوشے میں آکر بیٹھا ہوں تو صرف اس لیے کہ اپنے بھائی کی نسل کو بچا سکوں۔ دنیا کے ہنگاموں سے دور اپنی زندگی کے آخری دن اپنے خاندان کے ساتھ گزار سکوں۔ وہ زندگی جی سکوں جسے دولت اور طاقت کی ہوس میں، میں نے خود چھوڑ دیا تھا لیکن نہیں کہہ سکا، کہہ ہی نہیں پایا۔''

''کیوں نہیں کہا لالہ! کہنا تو چاہیے تھا۔'' گلو تڑپا۔

''میں ڈر گیا تھا کہ وہ میری بات نہیں مانے گا۔ اس کے باپ نے بھی اپنی محبت کی خاطر مجھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھی نہیں رکتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ علینہ کو اس کا بھائی واپس لوٹائے گا، تب ہی محبت کے امتحان میں سرخرو ہو سکے گا۔'' لالہ نے سچائی بیان کی۔

''تو بس، دینے دو اسے یہ امتحان۔ وہ اپنی دھن کا جتنا پکا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس امتحان میں ضرور پورا اترے گا۔'' گلو نے اسے حوصلہ دلایا۔ دوسری طرف سے لالہ نے کچھ بھی کہے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

''اسلم! گاڑی نکال۔ مجھے لیاقت سومرو کو دیکھنے اسپتال جانا ہے۔'' گلو کچھ دیر اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھا رہا پھر ایک بندے کو آواز لگا کر حکم دیا۔ لیاقت سومرو سے ان کی جو جھڑپ ہوئی تھی، اس میں وہ زندہ تو بچ گیا تھا لیکن سنا یہی تھا کہ مُردوں سے بدتر حالت میں ہے۔

شہر کے ایک بڑے اسپتال کے پرائیویٹ روم میں پہنچ کر اس بات کی تصدیق بھی ہوگئی۔ دونوں ٹانگوں اور ایک ہاتھ سے محروم ہو جانے والا لیاقت سومرو بستر پر بے بسی کی تصویر بنا پڑا تھا۔ اس کی دوسری بیوی اور اس کا بیٹا بھی اس سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ گلو کو ایسا لگا کہ اس کی آمد نے لیاقت سومرو کی بیوی کو تھوڑا بدمزہ کر دیا ہے چنانچہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔

''آپ کو میرا آنا برا لگا ہو تو معافی چاہتا ہوں پر میں زیادہ دیر رکوں گا نہیں۔''

''زیادہ دیر رکنے کا میں بھی ارادہ نہیں رکھتی۔ بس اتنا کہنے کے لیے آئی ہوں کہ یہ جو ایک ہاتھ سلامت رہ گیا ہے، اس سے طلاق نامے پر سائن کرے اور میری جان چھوڑ

دے۔ میں ساری زندگی اس زندہ لاش کے نام پر نہیں بیٹھی رہ سکتی۔'' اس نے نخوت سے اپنی بات مکمل کی اور بیٹے کی انگلی تھام کر کھٹ کھٹ کرتی وہاں سے چلی گئی۔

''دیکھا سومرو تم نے؟ یہ ہوتی ہے زندگی۔ انسان جن چیزوں کے پیچھے بھاگتا ہے اور جن کی خاطر ظلم کماتا ہے، وہ ایک ایک کر کے اسے چھوڑ کر جانے لگتے ہیں۔ کیا ہے آج تمہارے پاس؟ اولاد، صحت اور جوانی تم گنوا چکے ہو۔ جو دولت جمع کی تھی، وہ بھی بندر بانٹ میں ہاتھ سے نکل جائے گی اور تم یونہی بستر پر بے بس پڑے سب دیکھتے رہو گے۔''

''کیوں...... کیوں آئے ہو تم یہاں؟'' لیاقت سومرو غصے سے چیخ کر بولا لیکن اس کے غصے کے اظہار میں بھی ایک بے بسی تھی۔

''عبرت حاصل کرنے آیا ہوں۔ یہ سیکھنے آیا ہوں کہ جو ہمیشہ دوسروں سے چھینتے ہیں، آخر میں ان کے ہاتھ بھی کچھ نہیں آتا۔''

''تم خوش ہو رہے ہو میری تباہی سے؟'' سومرو نے شکوہ کیا۔

''ہاں، ہو رہا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی ہے بلکہ اس لیے کہ تمہاری صورت قدرت کے انصاف کی ایک مثال قائم ہوگئی ہے۔ ہوسکتا ہے تمہارا یہ حال دیکھ کر تمہارے نقشِ قدم پر چلنے والا کوئی ایک اس راہ سے واپس پلٹ جائے۔'' گلو اپنی بات کہہ کر رکا نہیں۔ حقیقت میں اسے لیاقت سومرو کی حالت نے متاثر کیا تھا اور دل میں یہ خواہش ابھری تھی کہ جرم کی دنیا سے تائب ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرلے۔

''قبرستان چلو۔'' وہ گاڑی میں واپس آ کر بیٹھا تو ڈرائیونگ سیٹ پر موجود اسلم کو حکم دیا۔ اسلم جانتا تھا کہ اسے کون سے قبرستان جانا ہے چنانچہ گاڑی اسی سمت موڑ لی۔ گلو نے اپنے ماں باپ کی قبروں پر حاضری دی۔ قبروں پر پانی چھڑک کر کچھ دیر کے لیے وہیں پنجوں کے بل بیٹھا رہا۔

''کاش، تم دونوں مجھ پر ذمے داریوں کا پہاڑ لاد کر اتنی جلدی اس دنیا سے نہ جاتے تو میں جرم کی دنیا میں گلو استاد بن کر جینے کے بجائے ایک عام آدمی کی زندگی جی رہا ہوتا۔'' آج پہلی بار ایسا ہوا کہ ماں باپ کی قبروں کے پاس بیٹھ کر ان کی مغفرت کی دعا کرنے کے ساتھ اس نے زبان سے کوئی شکوہ کیا۔ اس کے جرم کی دنیا میں داخل ہونے کے پیچھے بھی مجبوریوں اور مسائل کی وہی داستان تھی جو عموماً اس جیسے بہت سے اپنے سینوں میں لیے پھر رہے ہوتے ہیں

لیکن کسی کسی کو آخر کار یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ فیصلہ درست نہیں تھا۔ لالہ عیسیٰ کو یہ احساس ہوگیا تھا، لیاقت سومرو کو قدرت نے یہ حقیقت باور کروادی تھی اور اب اسے اس سچائی کا ادراک ہونے لگا تھا۔ ماں باپ کی موت کے برسوں بعد اس نے ان کی قبروں کے پاس بیٹھ کر ویسے ہی آنسو بہائے جیسے ان کی میت پر رویا تھا۔ فضا میں فائرنگ کی آواز گونجی تو وہ چونک کر پلٹا اور پھرتی سے اپنا ریوالور نکالا لیکن کہیں سے ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

''بھاگنے کی کوشش مت کرنا گلو ورنہ بھون کر رکھ دیں گے۔'' اس سے قبل کہ وہ خود کو کسی آڑ میں لیتا، ایک چیختی ہوئی آواز نے حکم دیا۔ وہ محسوس کر چکا تھا کہ فائرنگ کا سلسلہ رک گیا ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ اسلم زیر کرلیا گیا ہو یا جان کی بازی ہار گیا ہو۔

''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟'' اس نے بلند آواز میں دریافت کیا۔ جواب میں دو نقاب پوش جدید ساخت کی گنیں لیے اس کے سر پر آ کھڑے ہوئے۔

''شرافت سے ہمارے ساتھ چلو ورنہ تمہاری لاش بھی تمہارے ڈرائیور کے ساتھ دریافت ہوگی۔'' ایک نقاب پوش کے الفاظ نے اسلم کی موت کی تصدیق کردی۔

''شرافت نہیں ہے اپنے پاس۔ تو گولی مار دے۔'' اس نے بے خوفی سے جواب دیا۔ اسی وقت اس نے اپنے عقب میں آہٹ سنی۔ بھڑک کر پلٹا ہی تھا کہ سر پر کسی بھاری شے سے وار ہوا۔ پہلے وار سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ دوسرا بھی کردیا گیا۔ کتنا ہی جی دار سہی، تھا تو گوشت پوست کا بنا آدمی۔ تیورا کر زمین پر گرا اور ہوش وخرد سے بیگانہ ہوگیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو رسیوں سے بندھا بے دست و پا زمین پر پڑا تھا۔ نظریں گھما کر دیکھنے پر آس پاس کوئی شخص نظر آیا، نہ ساز وسامان۔ سپاٹ فرش اور سپاٹ دیواروں والے کمرے میں کچھ نہ ہوتے ہوئے کچھ ایسا تھا جو دل میں خوف پیدا کر رہا تھا۔ سر کی تکلیف علیحدہ تھی۔ وہ بندھا ہوا ہونے کی وجہ سے اپنا ہاتھ سر تک نہیں لے جاسکتا تھا لیکن درد کی شدت سے اتنا اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ سر پھٹا نہ بھی ہو تو چوٹ کی جگہ پر گومڑ ضرور نمودار ہو چکا ہوگا۔ تکلیف کو سہنے کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی غور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کو اس طرح اغوا کروانے کے پیچھے کس کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ وہ جس دنیا کا بندہ تھا، وہاں دشمنیاں عام تھیں لیکن اس وقت اسے زیادہ شبہ باذل پر تھا۔ وہ اس وقت چوٹ کھایا

ہوا سانپ تھا اور کچھ بعید نہیں تھا کہ وکی کے ہاتھ نہ آنے کی صورت اسی پر ہاتھ ڈال بیٹھا ہو۔

''خوش آمدید گلو استاد!'' ابھی وہ اپنے صیاد کے متعلق غور و خوض ہی کر رہا تھا کہ ایک نسوانی آواز سن کر اچھل پڑا۔ یہ اچھلنا صرف محاورتاً تھا کیونکہ اسے جس انداز میں باندھ کر ڈالا گیا تھا اس کے لیے اپنی جگہ سے حرکت کرنا ہی ممکن نہیں تھا۔

''میں تم جیسے چھوٹے موٹے غنڈوں کو منہ نہیں لگایا کرتی لیکن تم نے ہمارے منہ کو آنے کی کوشش کر کے خود اپنے لیے مصیبت کھڑی کی ہے۔''

''آپ کون ہو میڈم اور مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' گلو نے تھوک نگل کر اَن دیکھی عورت سے سوال کیا۔ ویسے وہ کہے گئے الفاظ سے ہی سمجھ گیا تھا کہ اس وقت وہ کس کی قید میں ہے اور بہر حال یہ ایک خوفناک صورتِ حال تھی۔

''سیدھا سوال کرتی ہوں۔ وقاص عرف وکی کے بارے میں جو کچھ جانتے ہو صاف صاف بتادو۔'' حکم صادر ہوا۔

''میں اس کے بارے میں کیا بتاؤں۔ وہ تو ایک عرصے سے غائب ہے۔ اڑتی پڑتی خبر ملی تھی کہ کسی حادثے میں مارا گیا ہے لیکن اس کا بھی ثبوت نہیں ملا۔''

''بہت خوب۔'' اس کا جواب سن کر وہ زہریلے انداز میں ہنسی۔

''وہ جسے اپنا گونگا بہرہ گارڈ بنائے اتنے دنوں گلے سے لگائے گھومتے رہے، وہ کیا تمہاری بہن کا یار تھا؟''

''زبان سنبھال کر بات کرو میڈم! گلو استاد نے کبھی کسی کی ماں بہن کو ٹیڑھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ اس لیے اپنی ماں بہن کے خلاف بھی کچھ نہیں سن سکتا۔'' گلو کو اس کے جملے پر طیش آگیا۔

''نہیں سن سکتے تو جو بگاڑ سکتے ہو، بگاڑ لو۔'' اس نے تیر چلایا۔

''شیر کو پنجرے میں بند کر کے اس پر کوئی بھی پتھر پھینک سکتا ہے۔'' گلو کو بھی اس بات کا احساس ہوا کہ بھلا وہ ایک آواز کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔

''پتھر مارنا معمولی کام ہے۔ ہم تم جیسے شیروں کو چوہا بلکہ اس سے بھی کمتر مخلوق بنا کر اپنے پیروں تلے کچل سکتے ہیں۔ اگر تم نے میرے سوالوں کے درست جوابات نہ دیے تو تمہیں اس کا تجربہ بھی کروادوں گی۔'' عورت کا لہجہ سخت سے سخت ہوتا جا رہا تھا۔ گلو کو اس کے لہجے کی سختی سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ اسے وکی کے بارے میں کیسے علم ہوا۔ اس بات کی تو قریبی ساتھیوں کو بھی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔

''جس سوال کا جواب میں جانتا ہی نہیں، وہ آپ کو کیسے دوں۔ جو جواب مجھے معلوم تھا، اسے آپ قبول نہیں کروگی۔''

''اچھا لطیفہ ہے لیکن میں تمہیں بتادوں کہ اس بات کا اعتراف وکی نے خود اپنی زبان سے کیا ہے۔''

''کیا؟'' گلو کی سماعتوں پر بم پھوٹا تو وہ ردِعمل دیے بغیر نہیں رہ سکا۔ جواب میں میڈم نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تمہیں کوئی خبر نہیں اور اب مجھ سے وکی کا ذکر سن کر کرنٹ لگ گیا ہے۔'' وہ یقیناً کسی کیمرے کی مدد سے اسے دیکھ رہی تھی جب ہی اس کے چونکنے پر چوٹ کی۔ گلو اس کے طنز پر لب بھینچ کر رہ گیا۔

''وکی کا کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ تو ہمارے ہی قبضے میں ہے اور بہت جلد معاذ کے ساتھ ساتھ اس کا بھی کریا کرم ہوجائے گا۔ ہمیں تو تم وکی اور معاذ کی فیملی کا پتا ٹھکانا بتاؤ۔''

وہ اس کی حالت سے حظ اٹھاتے ہوئے نئی اطلاعات دینے کے ساتھ ساتھ فرمائش بھی کر رہی تھی۔ گلو، وکی کے ان کی گرفت میں ہونے کی اطلاع سن کر پریشان ہوگیا لیکن زبان سے کچھ کہنے کے بجائے لبوں کو بھینچ لیا۔

''یاد رکھنا گلو استاد! یہ ہماری انا اور وقار کی جنگ ہے۔ ہم برداشت نہیں کرسکتے کہ ہمارا شکار ہم سے بچ کر کہیں کسی بل میں گھس جائے۔ تمہیں میرے سوال کا جواب ہر صورت دینا ہوگا۔ اب یہ تم پر ڈیپینڈ کرتا ہے کہ سمجھداری سے کام لیتے ہوئے ایسے ہی زبان کھول دیتے ہو یا ہمیں زبان کھلوانے کی زحمت دیتے ہو۔ ہمیں زحمت دوگے تو تمہاری روح بھی بلبلا اٹھے گی۔'' اب وہ نہایت سرد اور سنگین لہجے میں دھمکیاں دے رہی تھی۔

''سوچنے کے لیے ایک گھنٹے کی مہلت دے رہی ہوں۔ مان جاؤ گے تو خود پر ہی رحم کروگے۔ ہوسکتا ہے ہم تمہاری پچھلی ساری غلطیوں کو معاف کر کے دوبارہ سے بزنس میں بھی شامل کرلیں۔'' دھمکی کے ساتھ لالچ کا اچھا امتزاج پیش کیا گیا تھا لیکن گلو نے اپنی خاموشی نہیں توڑی۔ دوسری طرف سے بھی خاموشی اختیار کرلی گئی۔

گلو کو سوچنے کے لیے ایک گھنٹے کی مہلت دی گئی تھی لیکن اس دی گئی مہلت میں وہ، وہ نہیں سوچ رہا تھا جو سوچنے کا اسے حکم دیا گیا تھا۔ وہ خود پر لالہ کے احسانات سوچ رہا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ لالہ جرم کی دنیا کا بندہ تھا لیکن اس دنیا میں رہنے کے بھی اس نے کچھ اصول بنائے ہوئے تھے۔ وہ اپنے آدمیوں پر بہت مہربان رہتا تھا۔ خود گلو کو اس نے کئی

مواقع پر سہارا دیا تھا۔ بہنوں کی شادی سے لے کر بھائی کی پڑھائی تک ہر معاملہ اس نے لالہ کے تعاون سے نمٹایا تھا۔ چند برس قبل جب اس کا چھوٹا بھائی طلبہ سیاست کا نشانہ بن کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا تھا اور اس کا کیریئر اور زندگی دونوں تباہ ہونے کی نوبت آگئی تھی، یہ لالہ ہی تھا جس نے اپنے اثر رسوخ سے کام لے کر اس کے بھائی کو اس جنجال سے نکالا تھا۔ آج اس کا بھائی ایک عزت دار اور خوشحال زندگی گزار رہا تھا تو یہ لالہ کا احسان تھا۔ لالہ کے اتنے احسانات کے جواب میں وہ خود کو بچانے کے لیے بھلا ایسا کیونکر کرسکتا تھا کہ وکی اور معاذ کا خاندان داؤ پر لگتا سو لگتا، خود لالہ کا راز بھی کھل جاتا۔

انسان کتنی ہی طاقت، اختیار اور دولت حاصل کیوں نہ حاصل کرلے، اس کے اندر ایک گھر، ایک پُرسکون زندگی اور خاندان کی آرزو کبھی نہیں مرتی۔ خود پر خول چڑھا کر جینے والے لالہ عیسٰی کے دل میں بھی یہ آرزو چھپی ہوئی تھی۔ وکی نے علینہ کی خاطر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنا گھر بسانے کا فیصلہ کیا تو لالہ کے اندر دبی آرزو بھی دھیرے دھیرے سر اٹھاتی چلی گئی۔ جب وہ بڑی جدوجہد کے بعد وکی اور معاذ کے خاندان کو دشمنوں کے پنجے سے نکال کر ایک الگ تھلگ گوشے میں بسانے میں کامیاب ہوگیا تو اس آرزو نے شدت اختیار کرلی۔ اس نے ایک بار گلو کے سامنے اپنی اس آرزو کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

''یار گلو......! بہت گزار لی اس مارا ماری اور چھینا جھپٹی میں۔ اپنے تئیں دنیا بھر کی عیاشیاں بھی کرلیں پر اب جی چاہتا ہے کہ رشتوں کے بیچ رہ کر جیوں اور جتنی زندگی باقی رہ گئی ہے، اس سے حقیقی خوشی کشید کروں۔ تو جانتا ہے کہ میں وکی کو بہت چاہتا ہوں لیکن اس چاہت کا اتنا کھل کر اظہار نہیں کرسکا جیسا کہ کرنا چاہیے تھا۔ اب میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے بھائی اور وکی کے حصے کی چاہتیں بھی وکی کی اولاد پر لٹادوں۔ میں سب کچھ چھوڑ کر وکی اور وکی کے بچوں کے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔''

اور یہ اس آرزو کی شدت ہی تھی کہ لالہ نے اپنا راج پاٹ چھوڑ کر گوشہ نشین ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے جیتے جی خود کو دنیا کے لیے مار دیا۔ اس کے اس ناٹک میں رنگ بھرنے کے لیے اس کے ایک پرانے وفادار نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ شخص لالہ سے حیرت انگیز مشابہت رکھتا تھا اور اس مشابہت کی بنیاد پر ہی گروہ میں شامل کیا گیا تھا۔ قدرتی مشابہت کو مزید بہتر کرنے کے لیے اس کی کچھ سرجریز بھی کروائی گئی تھیں اور تربیت بھی دی گئی تھی۔ یوں وہ مکمل طور پر لالہ کا روپ دھارنے کا اہل ہوگیا تھا۔ لالہ جب ضرورت محسوس کرتا تھا، اپنے اس ہم شکل کو اپنی جگہ استعمال کرلیتا تھا۔ اس سارے معاملے کی گنتی کے چند ایک وفاداروں کے سوا کسی کو خبر نہیں تھی۔ اس ہم شکل نے بھی ہمیشہ اپنا منہ بند رکھا تھا اور بدلے میں لالہ سے خطیر معاوضہ پاتا تھا.... وہ ہم شکل پھیپھڑوں کے کینسر میں مبتلا ہوا تو بھی لالہ نے اس کا ہر ممکن علاج کروایا لیکن اس کا مرض قابو میں نہ آیا اور اس اسٹیج پر پہنچ گیا کہ وہ خود اپنے منہ سے اپنی موت کی آرزو کرنے لگا۔

پہلے لالہ کے غیاب اور پھر منظر پر لا کر زمان اور ظہور کے ذریعے باذل کو مخبری کی ساری منصوبہ بندی گلو ہی نے کی تھی اور نہایت خوبصورتی سے مخالفین کو باور کروانے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ فارم ہاؤس پر باذل کے حملے والے روز اپنے مرض سے تنگ آکر خودکشی کرلینے والا لالہ عیسٰی ہی تھا۔ لالہ کے گوشہ نشین ہونے کے بعد بظاہر وہ باس بن گیا تھا لیکن اب بھی دل سے لالہ کا وفادار تھا اور اس وفادار کو گوارا نہیں تھا کہ اس کی ذات سے لالہ یا لالہ کے پیاروں کو کوئی نقصان پہنچے۔

''تو پھر تم نے کیا سوچا گلو استاد؟'' مہلت میں ملا گھنٹا یادوں کی یلغار میں کیسے بیتا، اسے پتا ہی نہیں چلا اور اس پہلے والی نسوانی آواز کو دوبارہ سن کر اپنے خیالات سے چونک کر نکلا۔

''میں تمہارا فیصلہ سننا چاہتی ہوں۔'' لہجے کی سرد مہری پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔

''میں کچھ نہیں جانتا۔'' گلو نے بالآخر سپاٹ لہجے میں اپنا جواب سنا دیا۔

''اور ہم جانے بغیر رہیں گے نہیں۔ افسوس کہ تم نے خود کو ملی مہلت ضائع کر کے اپنے لیے ایک مشکل اور تکلیف دہ فیصلہ کیا ہے۔'' بولنے والی کے لہجے میں بھڑکتے شعلوں کی تپش عود آئی اور یہ تپش گلو کو نہ جھلساتی، یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ جس فرش پر رسیوں سے بندھا بے بس پڑا تھا، وہ فرش اس کے لیے جہنم بن گیا۔ جلتے توے پر لیٹنے جیسی تکلیف نے اس کے حلق سے دردناک چیخیں نکلوادیں۔ وفا کا امتحان دینا کبھی بھی آسان نہیں ہوا کرتا۔

توے کی طرح تپتا فرش اس کی کھال کو جھلسائے دے رہا تھا۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ بندھا ہوا ہونے کے باوجود وہ زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس کے حلق سے

نکلنے والی چیخیں کسی ذبح ہوتے جانور کے درد کی عکاسی کر رہی تھیں۔ جسم کے ہر مسام سے پسینا پھوٹ کر فرش پر گرتا تھا اور گرتے ہی بھاپ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ درد سہتے سہتے وہ بے ہوش ہوا تو کچھ دیر کے لیے اس اذیت سے نجات ملی۔ دوبارہ ہوش آیا تو احساس ہوا کہ فرش پہلے کی طرح تپا ہوا نہیں ہے لیکن آگ تو گویا اس کے ہر خلیے میں بھر گئی تھی۔ ایسی تکلیف اور جلن محسوس ہو رہی تھی کہ کوشش کرنے سے بھی سسکی نہیں جا رہی تھی اور بے اختیار ہی حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں۔

''کیسے ہو گلو استاد! دیکھو تمہاری خاطر مدارت کے لیے میں اپنے سارے اہم کام چھوڑ کر تمہارے ساتھ مصروف ہوں۔ تم دیکھنا میں تمہاری تواضع میں بالکل بھی کوئی کمی نہیں آنے دوں گی۔'' ابھی اس کی آنکھیں کھلی ہی تھیں کہ کانوں میں وہی جانی پہچانی آواز گونجی جو اب تک اس سے مخاطب ہوتی رہی تھی لیکن اب وہ اس آواز میں ایک واضح سفاکی کو محسوس کرسکتا تھا۔

''جانوروں سے بھی بدتر ہو تم لوگ۔'' تکلیف سے بلبلاتے ہوئے اس نے نفرت سے جواب دیا۔

''ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ میرا تم سے وعدہ ہے کہ تمہیں اذیت کے اس لیول پر لے جاؤں گی جہاں تم خود کو جانوروں سے بھی کم تر محسوس کرو گے۔'' گلو کے اظہارِ نفرت نے دوسری طرف سفاکی کو مزید بڑھا دیا تھا۔ گلو نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے فرش پر تھوک دیا۔ اگلا لمحہ قیامت کا تھا۔ اس کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ فرش سے چند انچ اٹھ کر دوبارہ نیچے گرا۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے پے در پے کئی جھٹکے لگتے چلے گئے۔ جھٹکے اتنی مہارت سے دیے جا رہے تھے کہ وہ بے پناہ اذیت سے تو گزر رہا تھا لیکن جسم و جان کا رشتہ برقرار تھا۔

''دیکھو کیسے ہانپتے ہوئے کتے کی طرح تمہاری زبان باہر نکلی پڑی ہے۔ تم دیکھنا کہ جلد تم کتوں کی طرح ہمارے جوتے چاٹنے کے لیے بھی تیار ہو جاؤ گے۔'' وہ زخمی ناگن تھی جس نے ایک نہیں کئی چوٹیں کھائی تھیں۔ معاذ کو ہزار کوشش کے باوجود وہ اپنی مرضی پر نہیں چلا سکی تھی۔ سونیا نے بغاوت کردی تھی اور اس سب کے ساتھ اسے یہ ہزیمت بھی اٹھانی پڑی تھی کہ وکی اور معاذ کی فیملی جن کی موت کا وہ اعلان کرچکی تھی، ان کے زندہ ہونے کی اطلاع ڈیوڈ کے ذریعے ملی تھی۔ کہنے کو وہ اور ڈیوڈ ایک تنظیم کا حصہ تھے اور ایک ہی ایجنڈے پر کام کرتے تھے لیکن پیشہ ورانہ مخاصمت جیسی شے تو ان کے درمیان بھی موجود تھی۔ اسے اپنی ناکامی کی داستانیں ڈیوڈ کے ذریعے تنظیم کے بڑوں تک پہنچنے کی بے عزتی نے بے حد مشتعل کر دیا تھا اور یہ گلو کی قسمت تھی کہ اس اشتعال کے اخراج کے لیے وہ ذریعہ بن گیا تھا۔

''اے اللہ میری روح نکال لے۔'' گلو کا جسم کہیں سے جھلس گیا تھا تو کہیں آبلے پڑے ہوئے تھے۔ رنگت جھلس کر سیاہ پڑ چکی تھی، ایسے میں اپنا بھرم وفا قائم رکھنے کے لیے اس نے سرگوشی میں اپنے رب سے التجا کی لیکن وہاں نصب جدید اور حساس آلات نے اس سرگوشی کو بھی ظالم کی سماعتوں تک پہنچا دیا اور اس نے ایک جنونی قہقہہ لگایا۔

''مانگو مانگو، موت کی دعا مانگو لیکن یاد رکھو کہ میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے موت بھی تم پر مہربان نہیں ہوگی۔''

''تو میرے اور میرے رب کے درمیان نہ آ اے عورت! مانا کہ میں بہت گناہ گار ہوں لیکن ہوں اپنے رب کا بندہ اور جب کوئی بندہ اپنے رب کو دل سے پکارے تو وہ اپنے بندے سے منہ نہیں پھیرتا۔ تیرے جیسے زمینی خداؤں اور فرعونوں کی میرے رب کے آگے ایک نہیں چل سکتی۔''

گلو کی رگوں سے خون نچڑ چکا تھا اور جسم کے ریشے ریشے میں درد کی سوئیاں پیوست تھیں اس لیے اس وقت اس کے لیے بولنا بھی ایک کارِ دشوار تھا پھر بھی وہ سرگوشی نما آواز میں، اکھڑتی سانسوں کے ساتھ اپنے دل کی بات کہہ گیا۔ ناکامی کی ہتک اور طاقت کے زعم میں مبتلا میڈم ایکس کو اس کے یہ الفاظ تیر کی طرح لگے۔ دماغ میں غصے کی چنگاریاں بھڑکیں اور نفرت نے اپنے اظہار کے لیے عقل کو سلب کرلیا۔ اب تک زبان کھلوانے کے لیے نپے تلے برقی جھٹکے لگائے جا رہے تھے۔ ان کی جگہ شدید ترین جھٹکے نے لے لی۔ گلو کے تکلیف سے تڑپتے جسم نے ایک آخری جھٹکا لیا اور وہ ہمیشہ کے لیے اذیت سے نجات پا گیا۔ جنون کی لہر گزر جانے کے بعد میڈم ایکس نے گلو کا بے روح جسم دیکھا تو ششدر رہ گئی۔ اس کا قیدی اس کی نظروں کے سامنے قید سے فرار ہوگیا تھا اور وہ ایک اور ناکامی کے داغ کے ساتھ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی لاش کو دیکھ رہی تھی۔ وفا نبھانے کا عزم رکھنے والے کے جذبے کی اس کے رب نے لاج رکھ لی تھی۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا، باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

رونگ نمبر

عاطر شاہین

بعض اوقات رونگ نمبر سے بھی لوگ درست اور مطلوبہ نتائج حاصل کر لیتے ہیں لیکن... یہ اور بات کہ دو میں سے کسی ایک کو تو نقصان اٹھانا پڑتا ہے... اسی لیے "رونگ نمبر" کو "رائٹ نمبر" سمجھ لینا سوائے حماقت کے اور کچھ نہیں ہوتا... مگر وہ تو یہ حماقت کر چکا تھا پھر نقصان کیسے نہ ہوتا۔

جدید دور کی ایجادات اور استعمال کے بارے میں ایک پُرفکر تحریر

دن چڑھ چکا تھا لیکن نک اپنی خواب گاہ میں سکون کی نیند سو رہا تھا۔ اس کے دوست جوناتھن نے اسے پہلے ایک ٹیکسٹ کیا تھا اور پوچھا تھا کہ کیا وہ آج رات اس جگہ جا رہا ہے جہاں وہ ہر ہفتے کے آخر میں ملتے ہیں لیکن نک سوئے ہونے کی وجہ سے کوئی جواب نہ دے سکا تھا۔ وہ اور جوناتھن سرکل کیمپس کے قریب ایک اسپورٹس بار میں جاتے تھے جہاں وہ کافی وقت گزارتے تھے۔

اکتوبر کے سرد دن اور راتیں تھیں۔ پوری دوپہر اور شام

کا ابتدائی حصہ سو جانے کے بعد بھی نک کا باہر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے پہلے اپنی نوکری چھوڑ دی تھی، بطور سیکنڈ شفٹ فورک لفٹ آپریٹر کے طور پر شمال مغربی مضافات میں ایک گودام میں وہ جاب کرتا تھا۔ جب وہ نیند سے بیدار ہوا تو سب سے پہلے اس نے اپنا فون اٹھا کر دیکھا۔ جوناتھن کا میسج آیا ہوا تھا۔ اس نے میسج پڑھ کر جوناتھن کو کال کرنے کی غرض سے کال لسٹ کھولی تاہم فہرست خالی تھی۔

'اوہو...... مجھے اپنا فون صاف کرنا یاد نہیں رہا۔' اس نے بیزاریت سے سوچا۔ اس کے بعد اس نے لسٹ میں تمام نمبر چیک کیے اور دیکھا کہ اس کے تمام رابطے بھی حذف ہو چکے ہیں۔

''کیا بات ہے!'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''کیا میں اتنا نشے میں تھا کہ میں نے اپنی پوری رابطہ فہرست حذف کر دی۔''

نک نے اپنے آئی فون کے ہر پہلو کی جانچ کی تھی اور اسے احساس ہوا کہ اس نے غلطی سے تمام مواد مٹا دیا ہے۔

اس کے بعد اس نے جوناتھن کا نمبر ٹائپ کیا اور ٹیکسٹ کیا۔

''جوناتھن! میں آج رات نہیں آرہا ہوں کیونکہ میں ٹھیک نہیں ہوں۔ میں تم سے کل ملوں گا۔''

ایک منٹ یا اس کے بعد میسج آیا۔ 'یہ جوناتھن کون ہے؟''

''لعنت ہو مجھ پر، میں نے غلط نمبر پر ٹیکسٹ کیا۔'' اس نے خود کو ملامت کی۔ اس نے واپس ٹیکسٹ کیا۔

''معاف کیجیے، غلط نمبر مل گیا تھا۔'' یہ میسج سینڈ کرنے کے بعد اس نے اپنا فون میز پر رکھا اور چند منٹ کے لیے باتھ روم گیا۔ جب وہ اپنے بیڈ روم میں واپس آیا تو اسے ابھی ایک اور ٹیکسٹ موصول ہوا تھا۔

''تم کون ہو؟''

نک نے بھویں سکیڑیں اور جواباً ٹیکسٹ کیا۔ ''تم کون ہو؟''

چند سیکنڈز کے بعد جواب آیا۔ ''پہلے میں نے تم سے پوچھا تھا...... بتاؤ، تم کون ہو؟''

نک نے اپنے ہونٹ چبائے اور سوچنے لگا کہ وہ اسے کیا جواب دے پھر کچھ سوچ کر اس نے ٹیکسٹ کیا۔ ''تم لڑکی ہو یا لڑکا؟''

فوراً ہی جواب آ گیا۔ ''میں ایک لڑکی ہوں۔''

نک نے ایک بار پھر بھویں سکیڑیں، ساتھ ہی اس کے دل کو کچھ ہوا۔ اسے لڑکیوں میں دلچسپی نہیں رہی تھی اور نہ ہی اس نے کبھی کسی لڑکی کو دوست بنایا تھا۔ نہ جانے یہ میسج پڑھ کر نک کو کیا ہوا کہ اس نے جوابی ٹیکسٹ کیا۔

''ٹھیک ہے، میں لڑکا ہوں۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' لڑکی نے میسج کر کے پوچھا۔ اب تو دونوں کے درمیان ٹیکسٹ کا تبادلہ ہونے لگا۔ نک بھی اس لڑکی میں دلچسپی لینے لگا تھا جو اس کے لیے خود باعثِ حیرت تھا۔

''نک...... اور تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام کارلا ہے۔''

''اچھا نام ہے۔''

''کیا تم مجھے اپنی تصویر بھیج سکتے ہو؟''

''تم میری تصویر دیکھ کر کیا کرو گی؟'' نک نے استفسار کیا۔ ویسے اسے کارلا کا تصویر مانگنا کچھ عجیب سا لگا تھا۔ اب وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں فون کی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔

چند لمحوں کے بعد جواب آ گیا۔ ''ویسے ہی، تمہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اگر تمہیں اچھا نہیں لگ رہا تو نہ بھیجو، میں اصرار نہیں کروں گی۔''

''او کے۔ میں بھیجتا ہوں۔'' اس نے لکھ کر میسج سینڈ کر دیا۔ فوراً ہی دوسری طرف سے شکریہ کا میسج بھی آ گیا۔ نک نے فوٹو گیلری اوپن کر کے اپنی تصویریں اسکرول کرنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی اسے محسوس ہوا کہ اس نے انہیں گزشتہ رات حذف کر دیا تھا۔ اس پر جھنجلاہٹ طاری ہوئی۔ بعدازاں اس نے ایک سیلفی لی اور چند لمحوں کے بعد کارلا کو بھیج دی۔ اسے چند سیکنڈ بعد میسج موصول ہوا۔

''ارے واہ...... تم تو بہت خوبصورت اور ہینڈسم ہو۔''

نک کے دل میں بھی اس لڑکی کو دیکھنے کی خواہش نے انگڑائی لی اور اس نے کارلا کو میسج کیا۔ ''تم بھی اپنی تصویر بھیجو۔''

''ضرور۔'' چند سیکنڈ کے بعد جواب موصول ہوا۔ نک بے چینی سے کارلا کی تصویر کا انتظار کرنے لگا۔ ایک ایک لمحہ اسے بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ کافی دیر گزر گئی اور کارلا نے اپنی تصویر نہ بھیجی تو اس نے دوبارہ میسج سینڈ کر کے اسے تصویر بھیجنے کا کہا۔

''ہاں ہاں بھیجتی ہوں۔ میں ذرا تیار ہو جاؤں۔'' جوابی میسج موصول ہوا تو نک کو اپنے دل میں عجیب سے احساسات پیدا ہوتے ہوئے محسوس ہوئے جو آج سے پہلے اسے کبھی محسوس نہیں ہوئے تھے۔ اس کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ کیا وہ کارلا کے ساتھ بات چیت کر کے اچھا کر رہا ہے؟ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب وہ کسی لڑکی میں دلچسپی لے رہا تھا۔

اسے جوناتھن کی باتیں بھی یاد تھیں۔ وہ اکثر اسے کہتا تھا

کہ جس کی زندگی میں لڑکی نہیں اس کی زندگی بے کیف اور بیکار ہے لیکن نک نے اس کی باتوں پر توجہ نہیں دی تھی۔ جوناتھن کی بھی ایک گرل فرینڈ تھی اور اکثر وہ دونوں اکٹھے ہی پائے جاتے تھے۔

کچھ دیر بعد کارلا نے اسے اپنی ایک تصویر بھیجی تھی جس میں وہ آدھی برہنہ تھی۔ سر کے بال چوٹیوں کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ سڈول جسم تھا، سرخ ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ تھی۔ بلاشبہ وہ بہت پُرکشش تھی۔ نک اس کی خوب صورتی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے کارلا کو میسیج کیا۔

''تم بہت خوب صورت ہو۔ کیا ہم مل سکتے ہیں؟''

''بالکل مل سکتے ہیں نک۔''

''کب؟'' نک کو بے چینی ہوئی۔

''اگر تم بہت زیادہ مصروف نہیں ہو تو ہم آج رات مل سکتے ہیں۔'' کارلا نے جواب دیا۔

''کہاں ملیں گے؟''

''تم کہاں رہتے ہو نک؟''

''میں کے ٹاؤن میں رہتا ہوں۔ اور تم......؟'' نک نے میسیج کر کے پوچھا۔

''میں کالمیٹ پارک کے جنوب میں رہتی ہوں۔'' کارلا نے بتایا۔

''پھر ہم کہاں مل سکتے ہیں......تم جگہ بتاؤ؟'' نک نے پوچھا۔

دو منٹ کے بعد کارلا کا میسیج آیا۔ ''ہم ساؤتھ لوپ ہوٹل میں مل سکتے ہیں۔ میں آدھے گھنٹے بعد وہاں پہنچ رہی ہوں۔ تم پارکنگ میں میرا انتظار کرنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' نک نے ہامی بھرتے ہوئے جواب دیا۔ کارلا نے اسے سرخ ہونٹوں کی ایموجی بھیجی تو نک کو اپنے جسم میں گدگدی سی ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ جلدی سے اس خوبصورت اجنبی لڑکی سے ملاقات کرنے کی خاطر نہانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔

نک جلدی سے تیار ہو کر اپنے اپارٹمنٹ سے نکل کر ساؤتھ لوپ ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔ تقریباً بیس منٹ میں ساؤتھ لوپ ہوٹل میں تھا۔ اسے ہوٹل کے عقب میں پارکنگ ملی اور کارلا کے انتظار میں وہ وہیں کھڑا ہو گیا۔ ابھی رات کے نو بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ دس منٹ، بیس منٹ میں اور بیس منٹ تیس منٹ میں بدل گئے۔ نک کو کوفت ہونے لگی۔ اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں کارلا نے اس کے ساتھ مذاق تو نہیں کیا تھا؟ ظاہر ہے اس کا

دھنک رنگ

☆ بیماریوں میں سب سے بڑی بیماری دل کی ہے اور دل کی بیماریوں میں سب سے بڑی بیماری دل آزاری ہے۔

☆ دشمنی کو اگر درجۂ عداوت کے حساب سے دیکھا جائے تو تین صورتیں نکلتی ہیں۔ دشمن، جانی دشمن اور رشتے دار۔

☆ اگر پانی کے اوپر لہر نہیں تو یہ مت سمجھو کہ اس کی تہ میں مگرمچھ نہیں۔

☆ ضرورت سے زیادہ صبر کرنے سے میٹھا پھل بھی خراب ہو سکتا ہے۔

☆ ہارتے وہی ہیں جو ہارنے سے ڈرتے ہیں اور جیتتے وہی ہیں جنہیں اپنی جیت کا یقین ہوتا ہے۔

☆ محبت اور خدمت نہ ہو تو کوئی ایسی چیز ایجاد نہیں ہوئی جو کسی رشتے کو جوڑ سکے۔

☆ بخیل دولت کا مالک نہیں ہوتا بلکہ دولت اس کی مالک ہوتی ہے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم۔ حویلی لکھا، اوکاڑہ)

رابطہ اچانک ہی کارلا سے ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کارلا نے اسے بے وقوف بنانے کے لیے ساؤتھ لوپ ہوٹل میں ملنے کا کہا ہو۔ جب گھڑی کی سوئی نے پچاس منٹ کا ہندسہ عبور کیا تو نک سمجھ گیا کہ کارلا نے اسے بے وقوف بنایا ہے۔ وہ واپس جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے کارلا دکھائی دی۔ وہ ایک سیاہ منی اسکرٹ میں ملبوس تھی۔

جب کارلا، نک کے قریب آئی تو وہ اس کے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لڑکیوں سے دور بھاگنے والا نک آج کارلا کو بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ کارلا کے بھی سرخ لبوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ نک اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔

''ہائے نک۔''

''ہائے کارلا۔'' نک نے مبہوت ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم تو تصویر سے بھی زیادہ خوبصورت ہو۔''

کارلا مترنم ہنسی ہنس دی۔ ''شکریہ نک! ویسے تمہارے دیکھنے کے انداز سے لگتا ہے تم نے پہلے بھی کسی لڑکی میں دلچسپی

نہیں لی...... ہے نا؟'' آخر میں اس نے تصدیق چاہی۔

''تمہارا اندازہ سو فیصد درست ہے۔'' نک نے صاف گوئی سے کہا۔ ''تم پہلی لڑکی ہو جس سے میں ملا ہوں اور اسے دیکھا ہے۔''

''پھر تو میں خوش قسمت ہوئی۔'' کارلا ہنسی۔ جواباً نک بھی ہنس دیا۔

''کیا تم نے کمرا بک کرالیا ہے؟'' کارلا نے پوچھا تو نک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''وہ کس لیے؟'' نک کو حیرت ہوئی۔

''میں چاہتی ہوں آج رات ہم اکٹھے ہی گزاریں۔'' کارلا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھیں، پرکھیں اور پھر مستقبل کا فیصلہ کریں۔ دراصل میری زندگی میں آنے والے تم بھی پہلے ہی مرد ہو۔ میں اب شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں۔ کیا کہتے ہو تم اس بارے میں؟''

''ٹھیک ہے۔'' جواباً نک نے کہا۔ ''آؤ میں ابھی کمرا بک کرالیتا ہوں۔''

وہ ہوٹل کے اندر گئے اور نک نے اپنے ڈیبٹ کارڈ سے کمرا بک کرا کے ادائیگی کی۔ ان کا کمرا پہلی منزل پر تھا اور وہ کمرے میں آ گئے۔ کمرے میں شراب کی بوتلیں موجود تھیں۔ کارلا نے ایک بوتل کھولی۔

''کیا تم میرے ساتھ ڈرنک کرو گے؟'' کارلا نے پوچھا۔

''ہاں، کیوں نہیں۔'' نک نے کہا کیونکہ اسے شراب بہت پسند تھی۔ کارلا نے دو گلاس بنائے اور ایک نک کو دے دیا اور دوسرے گلاس سے خود چسکیاں لینے لگی۔ اب وہ دونوں ایک ہی صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''نک! تم مجھے اپنے بارے میں تھوڑا سا بتاؤ۔'' کارلا نے نک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔''

''میں الیکٹرک کمپنی کے ایک گودام کا منیجر ہوں۔'' نک نے جھوٹ بولا۔

''تم وہاں کتنے عرصے سے کام کر رہے ہو؟'' کارلا نے دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

''تقریباً پانچ سال سے۔'' نک نے کہا اور پھر کارلا سے پوچھا۔ ''تم کیا کرتی ہو؟''

کارلا نے جواب دیا۔ ''میں ہاروے کلب میں ڈانس کرتی تھی۔''

''تھی...... یعنی تم نے وہ کلب چھوڑ دیا؟'' نک نے پوچھا۔

''ہاں۔ دراصل ہاروے کلب کا مالک اوٹن جیک مجھے اپنی گرل فرینڈ بنانا چاہتا تھا۔'' کارلا نے شراب کا گھونٹ لینے کے بعد کہا۔ ''وہ بڈھا کھوسٹ مجھے پسند نہیں تھا اس لیے میں نے مجبوراً کلب چھوڑ دیا۔ اب میں اپنی ویب سائٹ سے آن لائن لیڈیز گارمنٹس بیچتی ہوں۔''

''ہوں......'' نک نے ہنکاری بھری۔ ''یہ بھی اچھا بزنس ہے۔''

جواباً کارلا نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ اچانک نک کو محسوس ہوا جیسے اس کے سر نے چکرانا شروع کر دیا ہو۔ یکدم آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیلنے لگا۔ اس نے کارلا کی طرف دیکھا تو اسے وہ ایک کے بجائے دو دو دکھائی دیں۔ عین اسی لمحے نک کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر قالین پر گر گیا۔ اچانک اسے ایک زور کا چکر آیا اور وہ صوفے پر ہی لڑھکا اور بے ہوشی کی وادی میں پہنچ گیا۔

وہ تین گھنٹے بعد بیدار ہوا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اسی صوفے پر اسی انداز میں پڑا تھا جس طرح وہ شراب پیتے ہوئے لڑھکا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے کمرے میں نظریں دوڑائیں لیکن اسے کارلا کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ وہ جلدی سے واش روم کی طرف بڑھا۔ واش روم بھی خالی تھا۔ اچانک اسے اپنے پرس کا خیال آیا تو اس نے پتلون کی جیب سے پرس نکالا۔ اس کے اندر جھانکا اور دیکھا کہ اس کے پانچ سو ڈالرز غائب ہیں۔ بے اختیار اس نے اپنے گلے پر ہاتھ پھیرا تو اس کے منہ سے سانس خارج ہو گیا کیونکہ اس کے گلے میں سے سونے کی چین بھی غائب تھی۔

''لعنت ہو مجھ پر۔'' نک ایک دیوار پر مٹھی مارتے ہوئے چیخا۔ ''میں یقین نہیں کر سکتا کہ اس لڑکی نے مجھے بے وقوف بنا کر لوٹ لیا ہے۔ مجھے اس پر یقین نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے شراب میں بے ہوشی کی دوا ملا دی اور مجھے پتا ہی نہیں چل سکا۔''

وہ خود کو کوس رہا تھا۔ اس نے اپنا فون نکالا اور کارلا کو کال کرنے کے لیے لسٹ اوپن کی تو حیرت اور غصے کی شدت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا کیونکہ کارلا جاتے جاتے فون کی کال لسٹ بھی کلیئر کر گئی تھی۔ وہ ہوٹل سے باہر آ گیا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ اسے خود بھی غصہ آ رہا تھا کہ اس نے کیوں اس لڑکی پر اعتماد کیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاش اس سے غلط نمبر ڈائل ہی نہ ہوا ہوتا اور نہ ہی وہ پانچ سو ڈالرز اور سونے کی چین سے محروم ہوتا۔

✽✽✽

جانباز

شاہ سنان

دور کوئی بھی ہو... مخلص اور بہادر لوگ ہر دور میں اور ہر روپ میں اپنا کردار بہترین طریقے سے ادا کرتے چلے آئے ہیں... اس کا شمار بھی ان ہیرو میں ہو گیا تھا جو اپنے وطن، اپنی مٹی اور اپنے لوگوں کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے آئے ہیں... اگرچہ وہ ایک معمولی ذرہ تھا مگر اس کے حسنِ سلوک نے اسے آفتاب بنا دیا۔

ماہ ستمبر کے حوالے سے ایک دل گداز اور یادگار تحریر

اس کا جسم لہولہو ہو رہا تھا۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں لیکن اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی جو اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالنے والوں کو حیران کر رہی تھی۔ ''بہت خون بہہ چکا ہے۔ اسے فوری اسپتال لے جانا ہوگا۔ شاید ہی بچ سکے۔'' مختلف جملے بولتے ہوئے اسے اسپتال لے جایا جا رہا تھا۔

''میں نے اپنوں کے لیے لہو بہایا ہے...... میں...... میں وہ خوش نصیب ہوں جس کا خون دھرتی کی خاطر دھرتی پر

گرا ہے...... عزیز بھٹی صاحب! میں...... میں آپ کی طرح تو نہیں لیکن...... ' ' زبان تو بولنے لائق نہیں رہی تھی البتہ دل ہی دل میں بولتے ہوئے وہ خوش ہو رہا تھا اور پھر اسے ہوش نہ رہا۔

عام سے ذہن والا خلیل احمد نجی اسکول میں چوکیدار کی نوکری کرتا تھا۔ غریب آدمی تھا۔ تین بچوں اور بیوی کی ذمے داری نبھانا اس مہنگائی کے دور میں دشوار ہو گیا تھا لیکن اچھی بیوی اور اس کی قناعت پسندی نے زندگی قدرے آسان کردی تھی۔ اس کی زندگی بہت سادہ اور عام سی تھی۔ غریب گھر میں پیدا ہوا، گزارے لائق تعلیم حاصل کی اور اب چوکیدار بن کر شب و روز گزار رہا تھا۔ تنخواہ کافی کم تھی۔ اس نے گھر کے صحن میں ایک جگہ بنا کر چند بکریاں پالی ہوئی تھیں۔ وہ اور اس کی بیوی انہیں سنبھالتے اور کبھی کبھار ان کے لیے یہ بہت خوشی کا موقع ہوتا جب ایک آدھ جانور بک جاتا اور گھر کے رکے دو چار کام ہو جاتے۔

اس کی زندگی میں کچھ بھی خاص نہ تھا کہ وہ دن آ گیا جس نے اس عام سے، سادہ سے، کم تعلیم یافتہ آدمی کو بدل کر رکھ دیا۔ جس اسکول میں وہ ملازمت کرتا تھا، وہاں کوئی تقریری مقابلہ ہو رہا تھا۔ جہاں تقریب کا انعقاد ہونا تھا وہاں اس نے کرسیاں میز سجائے تھے، ڈائس وغیرہ رکھوانے، اسٹیج بنانے میں مدد کی تھی۔ وہ کافی تھک چکا تھا۔ تقریب شروع ہوئی تو وہ آرام کرنے کی غرض سے اس بینچ پر لیٹ گیا جو گیٹ کے اندرونی سائڈ پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں مختلف کلاسز کے بچے بچیوں کی آوازیں پڑ رہی تھیں جو مختلف موضوعات پر اپنے اپنے انداز میں تقریر کر رہے تھے۔ وہ کسی پر بھی ہرگز غور نہیں کر رہا تھا۔ اسے پیاس محسوس ہوئی۔ پانی پینے کے لیے وہ اٹھا اور کولر تک پہنچا تو تقریر کرتی ایک جوشیلی اور جذبے سے بھری آواز اس کے کان میں پڑی۔ شہداء کے متعلق بولا جا رہا تھا۔

''جانتے ہو پاکستانیو! ہمارا ''آج'' کیسے محفوظ ہوا ہے......؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے شہیدوں نے اپنا ''آج'' ہمارے ''کل'' کے لیے قربان کر دیا تھا۔'' پانی پی کر گلاس رکھتے ہوئے وہ رک گیا۔ جملے بہت اچھے لگے۔ وہ سننے لگا۔ تقریر جاری تھی۔

''پاکستانیو! جس وقت میجر عزیز بھٹی نے دشمن کے ارادوں کو خاک میں ملا کر اسے دھول چٹائی تو دھرتی خوش ہوئی کہ اس کا بیٹا کیسے بہادری دکھا رہا ہے اور...... جب دھرتی نے پکارا کہ عزیز بھٹی! ان سرحدوں کو تمہارے پاک لہو کی ضرورت ہے تو میجر صاحب نے جواں مردی دکھاتے ہوئے اپنا سینہ گولیوں کے سامنے کر کے دھرتی ماں کی آواز پر سر جھکا کر لبیک کہا...... اس وقت دھرتی تو فخر سے مسکرائی ہی تھی، آسمان بھی ششدر رہ گیا تھا کہ یہ ماں ایسے بیٹے پیدا کرتی ہے۔ عزیز بھٹی کے لہو کے قطرے ارضِ پاک کی سرحدوں پر گر رہے تھے اور وطن کا چپا چپا گواہی دے رہا تھا کہ اب سرحدیں بالکل محفوظ ہو گئی ہیں۔''

خلیل احمد برآمدے کے فرش پر بیٹھ گیا۔ اپنے محسنوں کا ذکر اس کو بھا رہا تھا۔ شہیدوں کا ذکر اب بھی ہو رہا تھا۔

''سوار محمد حسین نے جب سینے سے خون بہا کر اس پاک گلشن کی آبیاری کی تو اس وقت ضرور کسی نے کہا ہوگا...... دھرتی ماں! جب تجھ پر بہاریں اتریں تو گواہی دینا کہ یہ بہاریں تیرے بیٹوں کے خون کی بدولت آئی ہیں۔ گواہی دینا کہ بیٹوں نے بیٹے ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ پاکستانیو! 65ء میں ہمارے پاس وسائل کم تھے۔ اسلحہ، ٹینک ناکافی تھے لیکن ایک چیز بہت زیادہ تھی جو دشمن کے پاس بالکل نہیں تھی۔ وہ تھا...... جذبہ، وطن سے پیار اور ہم وطنو! پھر چشم فلک نے وہ نظارہ دیکھا جو پہلے کبھی کسی نے نہ دیکھا...... ٹینک نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ میں تو ہوں نا اپنی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی چادر کی حفاظت کے لیے۔ کچھ شیر دل جوانوں نے سینے پر بم باندھے اور نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے دشمن کے ٹینک سے ٹکرا گئے۔ وہ امر ہو گئے اور دشمن مر گیا۔ میری بہنو! جب بھی اپنا آنچل اوڑھو، اس کو دل کی آنکھ سے دیکھنا۔ تمہیں ضرور وہ انمٹ بیل بوٹے نظر آئیں گے جو اس سرخ رنگ سے بنے ہیں جو ہمارے عظیم شہداء نے ہمارے لیے، ہماری خاطر، ہمیں دے دیا تھا...... وطن کی ماؤ، بہنو! ان شاء اللہ تمہاری ناموس ہمیشہ سلامت رہے گی کیونکہ تمہاری ناموس کے لیے اس مٹی کے بیٹوں نے اپنی پاک جانوں کا صدقہ دے دیا ہے۔''

خلیل احمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے ایک بار پھر پانی پیا اور دل گرماتے لفظوں کو کانوں کے بجائے دل میں اتارنے لگا۔

''جب ملکی راز دشمن کے حوالے ہرگز نہ کرنے کا عزم کیا تو راشد منہاس اپنے اُس غدار ساتھی کے خلاف مزاحمت کرنے لگے جو پاکستانی طیارہ دشمن ملک لے جا رہا تھا۔ جب دیکھا کہ حالات قابو میں نہیں رہے تو دھرتی کے بیٹے نے انوکھا فیصلہ کرتے ہوئے جہاز کا رخ زمین کی طرف کر دیا تا کہ اہم دستاویزات زمین سے ٹکرا کر پاش پاش

ہو جائیں لیکن غلط ہاتھوں میں نہ پہنچیں۔ زمین و آسمان دنگ تھے۔ راشد منہاس ہر گزرتے پل کے ساتھ زمین کی طرف، موت کی طرف جا رہے تھے لیکن ان کے عزم میں کمی نہیں آ رہی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اہم ملکی راز، طیارہ اور غدار کے ساتھ ساتھ وہ بھی ٹکڑوں میں بٹ جائیں گے لیکن وطن کی خاطر بیٹے نے یہ تو کرنا ہی تھا...... دراصل منہاس صاحب موت نہیں، ابدی زندگی کی طرف جا رہے تھے اور شوقِ شہادت ان کے حوصلے کو جوان کرتا جا رہا تھا...... طیارہ زمین سے ٹکرایا اور...... راشد منہاس نور بن کر وطن کی فضاؤں میں بکھر گئے...... غدار مر گیا...... منہاس شہید امر ہو گیا۔‘‘

پاکستان کے بیٹوں کی بہادری و عظمت سن کر خلیل احمد کی آنکھیں بار بار نم ہو رہی تھیں۔ تقریر اختتام پر پہنچ رہی تھی۔

’’آزاد وطن، محفوظ پاکستان میں سانس لینے والو! غور کرو۔ تمہیں پتا چلے گا کہ راشد منہاس آج بھی، اب بھی زندہ ہے۔ یہیں ہے...... کیونکہ جہاں امن ہے، سکون ہے، بہار ہے، جہاں پاکستان ہے وہاں...... راشد منہاس ہے...... جہاں زندگی ہے وہاں لالک جان، کرنل شیر خان ہے...... ہر نئی طلوع ہوتی خوب صورت صبح میں محفوظ شہید ہے، شبیر شریف ہے...... پاکستان میں جہاں جہاں مسکراہٹیں ہیں، وہاں اکرم شہید ہے...... سوار محمد حسین ہے۔ اس وطن کے چپے چپے میں طفیل شہید، سرور شہید کھڑے نظر آتے ہیں...... ہمیں فخر کرنا چاہیے کہ ہمیں ایسے شیر دل جوان ملے جو ہماری خاطر...... اپنوں کی خاطر اپنا خون بہا گئے۔ اس مٹی پر قربان ہو گئے۔ رسمِ شبیری ادا کر کے حق کے لیے جان دے کر سرخرو ہو گئے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم عظیم شہداء کے وارث ہیں۔ ان عظیم شہداء کے جنہوں نے ہماری طرف آنے والے شعلے اپنے خون سے بجھائے۔ وطن کی سہاگنوں کی چوڑیاں سلامت رہیں، اس کے لیے اپنی بیویوں کو تنہا کر گئے۔ قوم کے بچے یتیم نہ ہوں اس لیے اپنے بچوں کی پروا نہ کی۔ بیٹیوں کے سروں پر ردائیں سلامت رہیں، اس کے لیے خون سے حفاظتی حصار کھینچ دیا۔ شکریہ ہمارے محسنو...... ! شکریہ ہمارے مستقبل کو محفوظ کرنے والو! پوری قوم سر جھکا کر آپ کی قربانیوں کو خراج تحسین پیش کرتی ہے۔ اقبالؒ و قائدؒ کے پاکستان کو بچانے والو! بقا دینے والو! تمہارا شکریہ۔ ہم وعدہ کرتے ہیں آپ کے پاک لہو کی لاج رکھیں گے۔‘‘

تالیوں کی گونج میں تقریر ختم ہو گئی اور خلیل احمد کی ایک نئی زندگی شروع ہو گئی۔

’ہم اتنے بڑے لوگوں کے وارث ہیں؟ ہمارے شہیدوں نے اتنی بڑی قربانیاں دیں؟ میجر عزیز بھٹی شہید کی امانت کا میں امین ہوں؟ یہ وطن اتنا مہنگا ہے کہ اس قیمت میں ماؤں نے اپنے قیمتی ’’ہیرے لعل‘‘ دے دیے؟ اقبالؒ و قائدؒ کا پاکستان یہ ہے؟ مجھے تو آج تک پتا ہی نہ تھا کہ اپنوں کے لیے خون بہانا اتنا قابلِ فخر ہے اور دھرتی کے بیٹوں نے کیا کچھ کر ڈالا ہے۔‘ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے خلیل احمد سوچے جا رہا تھا۔ اس کا دل جذبے سے بھر گیا تھا۔ ’ارے میں کیسا بیٹا ہوں جس نے اپنی دھرتی ماں اور قوم کے لیے کچھ کیا ہی نہیں۔ مجھ سے تو کبھی یہ بھی نہ ہو سکا کہ اپنا محلہ اور خالی پلاٹ ہی کچرے سے صاف کر دوں کہ وطن پیارا لگنے لگے۔‘ وہ کام کے لیے بلایا جا چکا تھا۔ سامان اٹھاتے رکھتے وہ سوچے جا رہا تھا۔ اسے ایک فخر سا محسوس ہونے لگا کہ وہ شہیدوں کے دیس میں رہتا ہے۔ پاکستان میں رہتا ہے۔ اس پاکستان میں جس کے بیٹے قابلِ فخر سپوت بن کر ہمیشہ دھرتی کا مان بڑھاتے رہے۔ خلیل احمد اٹھتے بیٹھتے ان جملوں کی گونج اپنے کانوں میں سنتا۔

’’ہمارے شہیدوں نے اپنا ’’آج‘‘ ہمارے ’’کل‘‘ پر قربان کر دیا۔‘‘

’’عزیز بھٹی شہید نے دھرتی ماں کی آواز پر لبیک کہا۔‘‘

’’راشد منہاس نور بن کر وطن کی فضاؤں میں بکھر گئے۔‘‘

’’غدار مر گیا، منہاس شہید ہو گیا۔‘‘

’’جہاں جہاں پاکستان ہے، امن ہے، مسکراہٹ ہے، وہاں راشد منہاس ہے...... لالک جان ہے...... سرور شہید ہے۔‘‘

’’ہمیں فخر ہے کہ ہم عظیم شہداء کے وارث ہیں۔‘‘

’’بیٹیوں کے سروں پر ردائیں سلامت رہیں اس لیے اپنے خون سے حفاظتی حصار کھینچ دیا۔‘‘

وہ کبھی فخر سے مسکرا دیتا، کبھی اس کی آنکھوں میں نمی آ جاتی اور کبھی ’’میں نے وطن کے لیے کچھ نہیں کیا‘‘ کا احساس تنگ کرنے لگتا۔

اتوار کا دن تھا۔ خلیل احمد بہت جلدی اٹھا اور نماز پڑھنے کے بعد بیوی سے کہا کہ ناشتا نو ساڑھے نو بجے کرے گا۔ تب تک ایک کام کرے گا۔ یہ کہہ کر خلیل احمد اپنے دونوں بیٹوں کو بھی ساتھ لے کر باہر آ گیا۔ بیوی حیران تھی کہ چھٹی والے دن دیر تک آرام کرنے والے کو کیا ہوا کہ بچوں کو بھی ساتھ لے کر نکل گیا۔

''ساری گلی کے شاپر تم اکٹھے کر کے اس خالی پلاٹ پر رکھو اور سارے کاغذ، چھلکے تم اکٹھے کرو۔'' اس نے دونوں بچوں کے ذمے کام لگایا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں حیرت اور سوال دیکھ کر خلیل احمد نے نہایت نرمی سے انہیں بتایا کہ آج اس نے اپنا محلہ صاف کرنے کی ٹھانی ہے۔ صفائی اللہ کو پسند ہے۔ کتنا اچھا ہوگا جب ہم اپنی گلی صاف کریں گے۔ سب ہم کو شاباش کہیں گے اور اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوگا۔ وہ تینوں اپنے کام پر لگ گئے اور ناشتے سے پہلے پہلے سارا کچرا اکٹھا کر کے جمع کر لیا۔ انہیں دیکھ کر اور بچے بھی گھروں سے نکل آئے۔ کچھ مرد بھی آگئے تھے۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے انہوں نے ساری گلی میں جھاڑو لگا دی، کچرا جلا دیا اور جلی راکھ کو خالی پلاٹ میں دبا دیا، نالیاں صاف کیں۔

''بھئی خلیل! یہ تم نے بڑا اچھا کام کیا۔'' ساتھ والا ہمسایہ بولا۔ گلی صاف کر کے سب جائزہ لے رہے تھے۔ خلیل احمد ہنس پڑا۔

''میں نے اکیلے نے تھوڑی اچھا کیا۔ تم سب بھی تو ساتھ لگ گئے تھے۔ میں تو کہتا ہوں ہمیشہ ایسا ہی کیا کریں۔ گلی بھی تو ہمارا گھر ہے۔''

''بھئی آغاز تو تم نے کیا تھا۔ ہم تو دیکھا دیکھی نکل آئے۔ دیکھو کیسا اچھا کام ہوگیا۔ صفائی بھی ہوگئی اور ہلکی پھلکی ورزش بھی ہوگئی۔'' ہمسایہ بڑا خوش نظر آرہا تھا۔

سب نے مل کر طے کیا کہ ہفتہ بھر دھیان سے کوڑا ایک سائڈ پر جمع کیا کریں گے اور اپنے اپنے گھر کے آگے سے گلی صاف کریں گے اور پھر ہر اتوار کچرا جلانے اور راکھ دبا کر کچرا وہیں کا وہیں ختم کرنے کے ساتھ ساتھ پوری گلی کی بڑی صفائی کیا کریں گے۔ ٹائم بھی اچھا گزرے گا۔ ذرا ہاتھ پاؤں بھی ہل جائیں گے اور صفائی تو ہے ہی۔ دوسری گلیوں والے جو صبح سے یہ سب دیکھ رہے تھے، انہوں نے بھی ان لوگوں کی باتیں سنیں تو انہوں نے بھی اسی طرح اپنے اپنے محلے صاف ستھرا کرنے کا پلان بنالیا۔

''آپ نے کل جو کام کیا تھا، آج تک نظر آرہا ہے اور مجھے لگ رہا ہے اتوار تک لوگ زیادہ کچرا پھیلائیں گے بھی نہیں کیونکہ سب نے ہی تو مل کر محلہ صاف کیا ہے۔ اپنی کی ہوئی صفائی کون خراب کرتا ہے۔'' خلیل کی بیوی چولہے کے پاس بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔ شوہر کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر اس نے ہنس کر کہا۔

''ہاں، ایسا ہی ہے۔ میں نے سوچا اپنے ملک کے لیے کچھ اچھا کروں۔ میرے بس میں اتنا ہی تھا۔ ایک چوکیدار اور کر بھی کیا سکتا ہے۔'' آہستہ آہستہ بولتا وہ چولہے سے کچھ فاصلے پر صحن میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ سادہ سی سلیمہ نے کچھ سمجھا، کچھ نہ سمجھا اور سبزی مسالے میں ڈال کر بھوننے لگی۔

دن گزرتے جارہے تھے۔ ہر گزرتے دن خلیل احمد ضرور ایسا کوئی چھوٹا موٹا کام کرتا جس سے اسے لگتا کہ ملک اور قوم کے لیے اچھا ہوا ہے۔ کبھی چھٹی کے وقت بچوں کو سمجھانے لگ جاتا۔ ''بیٹے! سیدھے گھر جانا، راستے میں رکنا نہیں۔ کسی دکان یا دوست کے گھر رکنے کی ضرورت نہیں۔'' کبھی چھوٹی عمر کے ننھے بچیوں کو کہتا۔ ''کبھی کسی اجنبی سے کھانے کی چیز یا کھلونا نہیں پکڑنا، کوئی اجنبی بلائے تو اس کے پاس ہرگز نہیں جانا بلکہ کوئی محلے دار اور رشتے دار بھی تمہیں بلائے تو امی ابو کو بتائے بغیر نہ جاؤ۔'' میٹرک کی لڑکیوں کو رکشے والے لینے آتے تو رکشا ڈرائیور کو روک کر ہدایات دینے لگتا۔ ''یہ بیٹیاں ہماری ہی ہیں۔ دھیان سے گھروں تک پہنچانا اور احتیاط سے رکشا چلانا۔''

وہ بہت بدل گیا تھا۔ پہلے فارغ وقت اِدھر اُدھر گھوم کر یا گھر کا کام وغیرہ کر کے اور رات کو ٹی وی دیکھ کر گزارتا، اب وہ کتابیں پڑھنے لگا تھا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ کتابیں اکٹھی کیں جو تحریک پاکستان، قیام پاکستان، 47ء کی ہجرت، 65ء کی بہادری، 71ء کا سانحہ بتاتی تھیں۔ شہیدوں کے بارے میں کتابیں لیں، سیاچن کی مشکلات اور بیٹوں کی دلیری کے بارے میں پڑھنا شروع کیا۔ وہ رات کو دیر تک پڑھتا۔ چھٹی والے دن بھی کوئی نہ کوئی کتاب اس کے ہاتھ میں رہتی۔ اس پر یکدم کئی راز افشا ہوگئے تھے۔ اسے اپنی فوج سے پیار اور ان پر بہت فخر محسوس ہوا۔

''واقعی ہم چین سے سوتے اسی لیے ہیں کہ ہمارے محافظ جاگ رہے ہوتے ہیں۔'' اس کی زندگی اس سے قبل کچھ اور تھی۔ اس احساس کو ساتھ لے کر جینا کتنا خوب صورت ہے کہ میں جس جگہ رہتا ہوں، اس کی بنیادوں میں شہیدوں کا لہو ہے۔ ''پاکستان بنانے کے لیے کتنے عظیم لوگوں نے لازوال قربانیاں دیں اور اسے بچانے کے لیے ہمارے بے شمار محسنوں نے خون کے نذرانے دیے۔ کتنے عظیم، اونچے درجے والے، بہادر لوگ تھے وہ۔'' وہ نم آنکھوں سے تحریر پڑھتے ہوئے سوچنے لگ جاتا۔

''یقیناً اللہ ایسے لوگوں کو چن کر بھیجتا ہے جن کے ذمے صرف اپنی زندگی نہیں بلکہ سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں لوگوں کی بقا کا کام ہوتا ہے۔ ایک شہید، ایک لہو بہانے والا

پوری قوم کو بچالیتا ہے۔ کیسے خوش نصیب ہیں وہ جن کے ذریعے خدا بہت سوں کی جانیں، عزتیں اور شہر بچاتا ہے۔''

☆☆☆

''کل صبح یہ کام ہو جانا چاہیے۔ میں تمہیں منہ مانگی رقم دے چکا ہوں۔ اب تم جلدی سے مجھے خوشخبری سناؤ۔'' شکل سے ہی گنوار اور ظالم نظر آنے والا اپنے سامنے بیٹھے دو نوجوان لڑکوں سے مخاطب تھا۔

''ہو جائے گا سر! ہم نے اسکول اور اردگرد کا جائزہ لے لیا ہے۔ چھٹی کا ٹائم بھی معلوم ہے۔ ہم کل اسکول کی چھٹی سے کچھ دیر پہلے چلے جائیں گے۔ ہم میں سے ایک گاڑی میں رہ کر گاڑی اسٹارٹ رکھے گا اور دوسرا چھٹی کے بعد نکلنے والے بچوں پر فائرنگ کرے گا اور پھر بھگدڑ کا فائدہ اٹھا کر گاڑی میں آجائے گا اور ہم دونوں وہاں سے فوراً دوسرے شہر چلے جائیں گے اور جب آپ کہیں گے پھر ہی واپس آئیں گے۔''

چند ٹکوں کے عوض انسان جیسے منصب سے گرنے والے ایک لڑکے نے تیز تیز بولتے ہوئے مکمل پلان بتایا۔

''یعنی کوئی مسئلہ نہیں بنے گا تمہیں حملہ کرنے میں؟'' ظالم شخص نے کہا۔

''بالکل نہیں۔ اس اسکول کا سیکیورٹی گارڈ کچھ عرصے سے ملازمت چھوڑ گیا ہے اور دوسرا ابھی انہوں نے رکھا نہیں۔ یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے۔ ایک سادہ سا چوکیدار اندر باہر آتا جاتا دکھائی دیتا ہے۔ اس سے.... خطرہ پیدا ہونے کا کوئی خدشہ نہیں۔'' دوسرے لڑکے نے یقین دہانی کروائی۔

''ٹھیک ہے، جاؤ اور کل اس اسکول پرنسپل و مالک کو مزہ چکھادو جس نے مجھ سے دشمنی رکھی ہے۔''

''دشمنی؟ کیا مطلب سر؟'' دونوں لڑکوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کچھ نہیں...... بس تم جاؤ اور اپنا کام کر کے فوراً غائب ہو جاؤ۔'' گنوار، جاہل، ظالم اور بچوں کو دشمنی میں گھسیٹنے والا فیاض احمد رکھائی سے بولا۔ لڑکے اٹھے اور چلے گئے۔

جس اسکول پر حملے کا کہا گیا تھا، اس کے پرنسپل اور مالک کے باپ اور فیاض احمد کے باپ کے درمیان گاؤں میں زمین کے معاملے پر کچھ تنازعات تھے۔ لڑائی بڑھی تو پرنسپل کا باپ زمین اونے پونے بیچ کر خاندان کو شہر میں لے آیا اور بچوں کو بڑھایا لکھایا۔ ادھر فیاض احمد کے باپ نے

قابلِ غور

☆ اپنے ماضی کو اپنا مستقبل متعین کرنے کی طاقت نہ دیں۔

☆ جو قدم اٹھانے سے آپ ڈر رہے ہیں، ہوسکتا ہے وہی قدم سب کچھ بدل دے۔

☆ آپ کی زندگی اپنی نہیں اگر آپ ہمیشہ دوسروں کی باتوں کی پروا کرتے ہیں۔

☆ اگر آپ ایک خوشحال زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو اسے ایک مقصد کے ساتھ جوڑیئے نہ کہ لوگوں اور چیزوں سے۔

☆ آپ کے خوابوں اور حقیقت کے درمیان فاصلے کو عمل کہتے ہیں۔

☆ انسان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنے دل اور زبان کو قابو میں رکھے۔

☆ امید، تمنا اور خواہش نہ رہیں تو انسان موت سے ہی گزر رہا ہوتا ہے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

بچوں کو صرف دشمنی کرنا سکھایا۔ سب معاملہ ختم ہو جانے کے باوجود وہ لوگ پڑھے لکھے شہری خاندان کو دشمن ہی کہتے تھے اور جب انہیں پتا چلا کہ ان لوگوں کا نجی اسکول ہے اور کامیابی و عزت سے چل رہا ہے تو فیاض احمد نے شیطانی، گھناؤنا منصوبہ بنایا کہ اس اسکول کے بچوں پر فائرنگ کر کے دہشت پھیلائی جائے تاکہ لوگ اس اسکول سے ڈر جائیں اور بچوں کے ماں باپ کے خوف کی وجہ سے تعداد کم ہوتے ہوتے اسکول ہی بند ہو جائے۔

☆☆☆

خلیل! یہ چند ضروری کاغذات ہیں۔ ان کی فوٹو کاپیاں کروا کے انہیں پورے اسٹاف میں جلدی تقسیم کرو۔ آئندہ تعلیمی سیشن کے بارے میں ضروری ہدایات ہیں۔''

پرنسپل عبداللہ نے خلیل احمد کو کاغذات تھمائے۔

''چھٹی ہونے والی ہے۔ میں اسٹاف کو روکے رکھوں گا، تم جلدی کرو۔''

''سر! آپ بڑا اچھا کام کر رہے ہیں بچوں کو تعلیم دے کر۔ کئی شعبے ایسے ہیں جو ملک و قوم کی خوب خدمت کرتے ہیں جیسے ٹیچر، ڈاکٹر، پولیس والے اور سب سے بڑھ

کرفوجی۔‘‘ خلیل احمد نے کاغذات پکڑتے ہوئے کہا۔
سرعبداللہ مسکرادیے۔ ’’خلیل احمد! تم سے کس نے کہا کہ صرف چند شعبوں کے لوگ ہی قوم کی خدمت کرسکتے ہیں۔ بھئی ہر کوئی اپنے اپنے عہدے، اپنی ملازمت کا فرض اور تقاضا نبھا کر ملک کے اور قوم کے لیے خدمات سرانجام دے سکتا ہے۔ اس کے لیے پولیس والا، فوجی ہونا ضروری نہیں۔ جو بندہ جس کام پر ہے بس اسے ایمانداری سے کرے۔ وہ قوم کی فلاح کا کام کررہا ہے جیسے تم اس اسکول کے چوکیدار ہو تو تم اپنی ملازمت ایمانداری، تندہی سے کرکے اپنا فرض نبھا سکتے ہو۔ آج تمہارے ذمے یہ کاغذات ہیں۔ یہ قوم کے بچوں کی فلاح کے لیے ہیں۔ ان کا کام مکمل کرو۔ سمجھنا تم نے اپنے حصے کی شمع جلادی۔‘‘ بڑے اچھے طریقے سے سرعبداللہ نے خلیل احمد کو سمجھایا تو وہ اچھی طرح سمجھتے ہوئے گیٹ کی جانب چل دیا۔

اسکول کی دیوار کے ساتھ گھنے درختوں کے پاس ایک کار اور اس کے ساتھ کھڑے لڑکے کو دیکھ کر خلیل رک گیا۔ ’’کیا بات ہے، اسکول میں کوئی کام ہے تم لوگوں کو؟‘‘ اس نے عام سے انداز میں سوال کیا لیکن جواب میں وہ لڑکا انتہائی بدتمیزی سے بولا۔

’’تم چوکیدار ہو۔ اپنی اوقات میں رہو۔ ہمیں جو کام ہوگا کرلیں گے۔‘‘

خلیل کو غصہ تو بہت آیا لیکن برداشت کرتے ہوئے تھوڑی دور فوٹو اسٹیٹ کی دکان پر چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اسے وہ کار، اس میں موجود لڑکا اور کار کے باہر والا پھر نظر آئے۔ خلیل احمد نے نوٹ کیا کہ کار کے اندر والے کی شکل تو شیشے میں بند ہونے اور اس کے کافی نیچے کو جھکنے کی وجہ سے نظر نہیں آرہی تھی اور جو دوسرا تھا، اس نے بھی اپنا کیپ کافی آگے جھکا کر اور ایک رومال ٹھوڑی پر لپیٹ کر کافی حد تک چہرہ چھپا رکھا تھا۔

’یہ بات میں نے جاتے ہوئے نوٹ کیوں نہیں کی اور یہ ایک انداز میں کیوں کھڑے ہیں؟ ایک سر جھکا کر شیشے بند کرکے کار کے اندر اور دوسرا منہ کافی حد تک چھپا کر اسکول کے گیٹ کو دیکھے جارہا ہے۔‘ وہ ایک سائڈ پر رک کر سوچنے لگا۔ اس کی چھٹی حس اسے خطرے کا احساس دلانے لگی۔ تبھی اسکول میں چھٹی کی گھنٹی بجی۔ شور مچاتے بچے باہر نکلنے لگے تبھی کار کے پاس کھڑا لڑکا تیزی سے آگے بڑھا اور گن نکالی۔ خلیل احمد کو لمحہ لگا سب سمجھنے میں۔ اس نے تیزی سے اس لڑکے کی جانب بھاگنا شروع کیا اور اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، اس نے گن والے لڑکے کو جھپٹ کر پکڑ لیا اور اسے پیچھے کی طرف دھکیلا۔ وہ بوکھلا گیا۔

’’کیا کررہے ہو تم درندے؟ معصوم بچوں پر گولی چلانے لگے ہو۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔‘‘ خلیل احمد اس کا بازو پیچھے کی طرف کررہا تھا۔ اس کو گن یا گولی کا کوئی ڈر محسوس نہیں ہورہا تھا۔ بس ایک ہی جذبہ تھا کہ بچوں کو کچھ نہیں ہونے دینا۔ بچے بھاگ بھاگ کر گھروں کو جارہے تھے جن کو لینے والے آئے، وہ ادھر جارہے تھے کہ گن والے نے خلیل کو دھکا مار کر گرایا لیکن وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

’’تمہاری یہ جرأت کہ میرے اسکول پر حملہ کرو، میرے بچوں کو مارو۔ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔‘‘ خلیل پاس پڑی اینٹ اٹھا کر اس کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے چیخا۔ وہ حملہ آور جھک گیا لیکن اینٹ کندھے پر لگ ہی گئی۔ یہ آوازیں سن کر لوگ چونک گئے۔ ادھر دیکھا اور بھگدڑ مچ گئی۔ کار کے اندر بیٹھے ہوئے لڑکے نے ایک دو فائر کیے جو خوش قسمتی سے کسی کو لگے تو نہیں لیکن چیخ و پکار شروع ہوگئی۔ خلیل نے اس کے کندھے کے زخمی ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اینٹ اس کے سر پر ماردی تھی اور جھکائی دے کر خود کو بچانے والے کا سر پھر بھی زخمی ہوگیا۔ کار میں بیٹھے لڑکے نے جب حالات ہاتھ سے نکلتے دیکھے تو جھنجلا کر خلیل احمد پر فائر کھول دیا۔ کئی گولیاں خلیل کے جسم کی جانب داغ کر وہ اپنے زخمی ساتھی کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ خلیل زمین پر گر گیا۔ اس کا لہو زمین پر بہنے لگا۔ اس نے کھلتی، بند ہوتی آنکھوں سے اسکول کی جانب دیکھا۔ ایک بھی بچہ یا ٹیچر زخمی نہیں ہوئے تھے۔ اس کے اسکول کی سرحد محفوظ تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ آگئی۔ پرنسپل صاحب باہر آچکے تھے۔ انہوں نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی سے خلیل کے زخمی جسم کے پاس آگئے۔ لوگ اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈال رہے تھے اور پریشان ہورہے تھے کہ شاید ہی بچ سکے اور خلیل بڑبڑا رہا تھا۔

’’میں نے...... اپنوں...... کے لیے لہو بہایا ہے...... میں وہ...... خوش نصیب ہوں...... جس...... جس کا...... خون دھرتی کی خاطر دھرتی پر گرا ہے...... عزیز بھٹی صاحب...... میں آپ کی طرح تو بن...... نہ سکا لیکن میں نے......‘‘ وہ ہوش میں نہ رہا۔

اسے اسپتال لے جایا گیا اور ڈاکٹرز نے زیادہ امید دلانے سے معذرت کرلی۔ پرنسپل عبداللہ سر پکڑے بینچ پر بیٹھے تھے کہ ان کے اسکول کے ساتھ یہ کیا ہوگیا۔ خلیل احمد کا

آپریشن ہو رہا تھا۔ اس کے بیوی بچے اور دیگر لوگ رو رو کر اس کی زندگی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے بچوں کو لگنے والی گولیاں خلیل احمد نے اپنے وجود پر کھائی تھیں۔

زخمی حملہ آور نے سب کچھ اگل دیا تھا اور اب مجرم بھیانک انجام کو پہنچنے والے تھے۔ سر عبداللہ کو سب پتا چل گیا تھا اور وہ تعلیم اور جہالت کے فرق پر ماتم کناں تھے۔ آپریشن ہو گیا۔ اگلے 48 گھنٹے اہم قرار دیے گئے۔ پورے اسکول کے بچوں کے معصوم ہاتھ خلیل احمد کی زندگی کے لیے اٹھ گئے۔ نہم دہم کی لڑکیاں اپنے آنچل پھیلا کر رب سے اپنے محافظ کی سلامتی مانگنے لگیں اور پھر...... رب نے عرش سے دعاؤں کی منظوری بھیج دی۔ خلیل احمد نے آنکھیں کھول دیں۔

عبداللہ صاحب اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کھڑے تھے۔ چہرے پر پریشانی کی جگہ فخر و اطمینان تھا۔

''خلیل احمد! کیسی طبیعت ہے؟'' پرنسپل صاحب نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''میں...... ٹھیک ہوں...... سر! میں نے اپنے عہدے یعنی چوکیداری کی لاج رکھی ہے نا؟'' وہ سب بھول کر پوچھ رہا تھا۔ سر عبداللہ حیران ہو گئے۔

''سر! میں نے شیر خان...... لالک جان...... سرور شہید کا وارث...... ہونے کا مظاہرہ کیا ہے نا؟ میں راشد منہاس...... کبھی نہیں بن سکتا...... لیکن میں نے منہاس صاحب کی طرح اپنے کام کی حفاظت کی...... ہے۔ وہ ضروری کاغذات...... وہ تعلیمی سیشن والے...... میں نے شاپ والے کو دے...... کر کہا تھا کہ سنبھال کر رکھے۔ میرے بچوں کے...... مستقبل کے بارے میں ہیں۔ اس نے دیے...... آپ کو؟ سر! میں...... چوکیدار خلیل...... بس اتنا ہی کر سکتا تھا...... میں نے کر دیا...... سچ سچ بتائیں...... میرا خون...... میرا خون میری دھرتی پر...... گرا تھا نا؟'' خلیل احمد بولے جا رہا تھا اور سر عبداللہ کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔

''خلیل احمد! تم نے...... جانبازوں کے وارث...... اس دھرتی کے بیٹے ہونے کا حق...... خدا کی قسم...... ادا کر دیا۔'' خلیل احمد نقاہت سے رک رک کر بول رہا تھا اور سر عبداللہ کی آواز فرطِ جذبات سے بہ مشکل نکل رہی تھی۔

''خلیل! آرام کرو۔ تمہیں زیادہ بولنے سے منع کیا گیا ہے۔'' پرنسپل صاحب نے نرمی سے تھپکی دی اور بولے۔ ''وہ کاغذات مجھے مل گئے ہیں۔''

''سر! یہ دھرتی...... میری دھرتی بھی...... گواہی دے گی کہ خلیل...... خلیل چوکیدار اس کا اچھا...... بیٹا ہے؟'' سر عبداللہ کچھ نہیں بولے۔ بس اس کی جانب دیکھتے رہے اور ایک جملہ بول کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

''خلیل! جلدی ٹھیک ہو کر باہر آؤ۔ تم سے گلے ملنا ہے۔''

خلیل احمد کو اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد گھر کے بجائے اسکول لے جایا گیا۔ اسکول والی گلی کے دونوں جانب بچوں کے والدین پھولوں کی ٹوکریاں اٹھائے اس کی گاڑی پر پھول نچھاور کر رہے تھے۔ ''خلیل احمد زندہ باد...... خلیل تم نے ہماری اولاد کو بچا کر ہمیں اپنا مقروض کر دیا۔''

''خلیل احمد! تم ہیرو ہو۔'' جملے سن سن کر خلیل دنگ ہو رہا تھا۔

کیا میں اتنی عزت کے قابل تھا؟ چوکیدار کا اتنا احترام؟

اسکول کا گیٹ کھولا گیا۔ سب بچے پھول لیے، سب ٹیچرز پھولوں کی مالا لیے منتظر تھے۔ خلیل ان پھولوں کو پہنتے ہوئے بہت خوشی و اطمینان محسوس کر رہا تھا۔

''خلیل احمد اس دھرتی کا بہادر بیٹا اور بہادر ہیرو ہے۔ اس نے جان کی پروا نہ کرتے ہوئے بچوں کو بچایا، تعلیمی عمل کو رکنے سے بچایا اور اپنا لہو ہماری خوشیوں کے لیے بہایا۔ ہم سب اپنے اس ہیرو کے شکر گزار ہیں۔'' پرنسپل صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا اور خلیل احمد کو پاس بلا کر گلے لگاتے ہوئے بولے۔ ''ایک عظیم شخص کے گلے ملنے سے میں معزز ہو گیا ہوں۔''

خلیل کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ انعامی رقم کا چیک، تنخواہ میں اضافہ، بچوں کی پڑھائی کا خرچہ اٹھانے کا وعدہ، سب کچھ مل گیا تھا اسے...... سب تالیاں بجا رہے تھے اور وہ خود کو پہنائے گئے میڈل کو تھامے ایک جانب دیکھ رہا تھا۔ اسے واضح طور پر سوار حسین شہید، محفوظ شہید، شبیر شریف شہید اور دیگر شہداء کی روحیں مسکراتی نظر آئیں۔ ہوا کا پاک جھونکا اس سے ٹکرایا اور اسے ایک سرگوشی سنائی دی۔ ''خلیل احمد! تم بھی ایک طرح کے جانباز ہو۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم نے امانت تم جیسوں کو سونپی ہے۔'' خلیل احمد نے اس سرگوشی کو سنا اور مسکراتے ہوئے اسٹیج سے اتر کر ان بچوں میں گھل مل گیا جنہوں نے اس کی سلامتی کے لیے رو رو کر دعائیں کی تھیں۔

دھرتی مسکرا رہی تھی کہ میں نے ہر دور میں سپوت پیدا کیے ہیں۔

⌘⌘⌘

گمشدہ

ملک صفدر حیات

عشق اور جنون کے نام پر اکثر لوگ ایسا شیطانی کھیل کھیلتے ہیں کہ سن کر دل کانپ جائے مگر ان کھلاڑیوں کا ضمیر اتنے سکون سے سویا ہوتا ہے جیسے وہ کسی جنت میں وقت گزار رہے ہوں... البتہ جب انجام سر پر سوار ہوتا ہے تو سمجھو جہنم سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جیسے کہ یہ لوگ... جہاں محض ظاہری حسن کے تعاقب میں خون ہی خون کا دشمن ہو گیا... یہ اور بات کہ بغیر کسی خطا کے بہنے والا لہو کبھی اپنے مجرم کو معاف نہیں کرتا۔

دفن شدہ رشتوں کی قبر پر خوشیوں کا تاج محل بنانے والوں کی کم ظرفی کا احوال

رپورٹ درج کرانے گمشدہ شخص کی بیوی اور چھوٹا بھائی میرے پاس آئے تھے۔ وہ موسم برسات کی ایک ابر آلود شام تھی۔ آج دن بھر وقفے وقفے سے بارش کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ اگر کچھ دیر کے لیے بارش تھم بھی جاتی تو بوندا باندی کا عمل رکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس وقت بھی ماحول میں ایسی ہی کیفیت طاری تھی۔

میں نے ان دیور، بھابی کو اپنے کمرے میں بلایا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب وہ دونوں میرے سامنے بیٹھ چکے تو میں نے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں اور اس قدر پریشان کیوں ہیں؟''

''تھانیدار صاحب! میرا نام عظیم ہے۔ ہم موضع مومن آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ میری بھابی شاداں ہے۔'' اس نے اپنے برابر میں بیٹھی ہوئی عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے دکھی لہجے میں بتایا۔ ''حنیف بھائی کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ وہ کل سے غائب ہیں۔''

''غائب...... کا کیا مطلب ہوا؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

موضع مومن آباد میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا اور یہ گاؤں تھانے سے محض دو میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع تھا۔ میں اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظر سے باری باری ان دونوں کو تکنے لگا۔

''وہ کل صبح جمال پور گیا تھا۔'' شاداں نے گلوگیر آواز میں بتانا شروع کیا۔ ''حنیف نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ شام سے پہلے لوٹ آئے گا۔ جب وہ پچھلی رات تک واپس نہیں آیا تو میں نے خود ہی یہ سمجھ لیا کہ وہ وہیں جمال پور میں رک گیا ہے اور صبح آجائے گا مگر...... صبح سے شام ہو گئی تھانیدار صاحب اور حنیف کی کوئی خیر خبر ہی نہیں ہے۔''

جمال پور نامی وہ گاؤں میرے تھانے سے پانچ میل کے فاصلے پر مغربی سمت میں واقع تھا، یعنی مومن آباد سے

سات میل کی دوری پر۔ ان دنوں میں ضلع ساہیوال کے ایک دور افتادہ تھانے میں تعینات تھا۔ شاداں کے بیان کے جواب میں، میں نے پوچھا۔

''تمہارا خاوند، جمال پور کیا لینے گیا تھا؟''

''لینے نہیں، حنیف دینے گیا تھا۔'' شاداں نے جلدی سے کہا۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کیا دینے...... کس کو دینے؟''

''وہ بات یہ ہے تھانیدار صاحب......!'' شاداں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اُدھر جمال پور میں حنیف کا ایک دوست رہتا ہے جس کا نام اسحاق ڈوگر ہے۔ اسحاق ایک چھوٹا کاشتکار ہے۔ پچھلے سال حنیف نے اسحاق سے کچھ رقم ادھار لی تھی۔ اس سال ہماری گندم کی فصل بہت اچھی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہم نے خوب پیسا کمایا ہے۔ حنیف ادھار والی وہ رقم ہی اسحاق ڈوگر کو واپس کرنے گیا تھا۔''

شاداں پچیس چھبیس سال کی بھرے بھرے بدن کی مالک ایک دلکش عورت تھی۔ اس کی خوبصورتی کو بیان کرنے کے لیے موزوں اور مناسب الفاظ کا سہارا لینا لازم ٹھہرتا تھا۔ اس کا پُرکشش سراپا صنفِ مخالف کے دل کو زیر و زبر کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔ مختصر الفاظ میں اسے موضع مومن آباد کی بیوٹی کوئین المعروف بہ ''الھڑ مٹیار'' کہا جا سکتا تھا۔

میں چند لمحات کے لیے اس کے حسن کے جادو میں جیسے کھو سا گیا تھا لیکن جلد ہی میں نے خود کو اس کے ٹرانس سے نکالا اور معتدل انداز میں سوال کیا۔

''تمہارا خاوند اپنے ساتھ کتنی رقم لے کر گیا تھا؟''

''پورے ڈیڑھ ہزار روپے تھانیدار صاحب!'' وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔

شاداں کے چہرے کے تاثرات سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے ایک خطیر رقم کا ذکر کیا ہو اور یہ ایک کھلی حقیقت بھی تھی۔ آج کل ڈیڑھ ہزار روپے میں ایک ریگولر پیزا ہی خریدا جا سکتا ہے لیکن یہ کئی سال پہلے کے، اچھے اور بھلے زمانے کا واقعہ ہے جب پندرہ سو روپے کی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ اس رقم کو دورِ حاضر کے کم از کم پانچ لاکھ روپے سمجھ لیں۔

''بھائی جان کسی کی سنتے بھی تو نہیں ہیں۔'' عظیم بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ ''میں نے ان سے کہا بھی تھا کہ میں جمال پور جا کر اسحاق ڈوگر کی رقم دے آتا ہوں لیکن انہوں نے میری بات نہیں مانی اور کل صبح گھوڑے پر سوار ہو کر وہ جمال پور روانہ ہو گئے۔ میں ان کے ساتھ زور زبردستی تو کر نہیں سکتا تھا اس لیے مجھے خاموش ہونا پڑا۔''

گمشدہ حنیف کے چھوٹے بھائی عظیم نے ہلکی پھلکی ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی اور وہ ایک پستہ قامت شخص تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق عظیم اپنی بھابی شاداں کا ہم عمر یا ایک آدھ سال بڑا دکھائی دیتا تھا۔ بعدازاں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ اس کی عمر ستائیس سال تھی اور وہ حنیف سے لگ بھگ تین سال چھوٹا تھا۔

''کیا حنیف پہلے بھی کبھی اس طرح لاپتا ہوا ہے؟'' میں نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں جی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔'' شاداں نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''حنیف جب بھی گاؤں سے باہر جاتا ہے تو اپنے بتائے ہوئے وقت پر واپس بھی آ جاتا ہے۔ یہ پہلی بار ہوا ہے کہ ہم اس کی راہ تک رہے ہیں اور اس کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔''

جمال پور، مومن آباد سے محض سات میل کی مسافت پر تھا۔ حنیف ایک ہی دن میں اپنا کام نمٹا کر سورج غروب ہونے سے پہلے واپس گھر آ سکتا تھا اور اس کا پروگرام بھی یہی تھا لیکن اس کے پُراسرار غیاب نے ایک سیدھے سادے معاملے میں یکایک سنگینی بھر دی تھی۔

''فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''حنیف اس وقت جہاں بھی ہے، مجھے یقین ہے وہ عافیت سے ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ وہ کل کسی بھی وقت لوٹ آئے گا۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے تھانیدار صاحب!'' عظیم نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔ ''میں بھابی کو یہی سمجھا رہا تھا کہ بارش کا موسم ہے۔ ہم نہیں جانتے وہاں جمال پور میں اسحاق ڈوگر کا کیا حال ہوگا۔ عین ممکن ہے اس نے بھائی جان کو ایک دن کے لیے اپنے پاس روک لیا ہو لیکن یہ بہت زیادہ پریشان ہو رہی تھی اسی لیے ہم لوگ بھائی جان کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آپ کے پاس آئے ہیں۔''

''آپ نے یہاں آ کر کوئی غلطی نہیں کی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سمجھ لو کہ میں نے حنیف کی گمشدگی کی رپورٹ درج کر لی ہے لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔''

ان دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر شاداں نے الجھن زدہ انداز میں مجھ سے پوچھا۔ ''مثلاً کیا

کچھ تھانیدار صاحب؟''

''حنیف کی بازیابی کے لیے ہم تینوں کو مل کر کام کرنا ہوگا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''جب تک تم دونوں تھانے سے یعنی مجھ سے تعاون نہیں کرو گے، میں صحیح معنوں میں کچھ نہیں کر پاؤں گا۔''

''آپ ہم سے کس طرح کا تعاون چاہتے ہیں تھانیدار صاحب؟'' عظیم نے فکر بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میرے ذہن نے ابھی سے حنیف کی تلاش کا کام شروع کر دیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے عظیم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کام کل صبح شروع ہوگا۔ اگر حنیف کل صبح تک واپس گھر نہیں آیا تو تم جمال پور روانہ ہو جاؤ گے۔ وہاں تم اسحاق ڈوگر سے تفصیلی ملاقات کرو گے۔ اس سے پوچھو گے کہ تمہارا بھائی چار جولائی بروز بدھ کتنے بجے اس کے پاس پہنچا تھا۔ وہ کب تک وہاں ٹھہرا اور کیا اس کی واپسی بدھ ہی کے روز ہوئی تھی یا وہ اس سے اگلے دن یعنی پانچ جولائی جمعرات کو وہاں سے روانہ ہوا تھا......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''یہ ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد تم سیدھے میرے پاس تھانے آؤ گے۔ میری بات تمہارے بھیجے میں اتری کہ نہیں؟''

''جی...... میں سمجھ گیا تھانیدار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے پاس ایک ہی گھوڑا ہے جو بھائی جان لے گئے ہیں۔ خیر، میں کوئی نہ کوئی بندوبست کر لوں گا۔'' لمحے بھر کے تذبذب کے بعد اس نے کہا۔ ''یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں کل بھائی جان کی تلاش میں جمال پور ضرور جاؤں گا۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''اور مجھے کیا کرنا ہوگا تھانیدار صاحب؟'' شاداں اپنی غزالی آنکھوں سے مجھے تکتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''تم جائے نماز بچھا کر بیٹھ جاؤ اور حنیف کی سلامتی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔'' میں نے اس کی جاذب آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''میرا یہ مشاہدہ ہے کہ خوبصورت بیویوں کی دعائیں، ان کے شوہروں کے حق میں کھٹ سے قبول ہوتی ہیں۔''

وہ میرے منہ سے اپنے حسن کی تعریف سن کر لمحے بھر کو جھینپی پھر جواباً میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاصے اعتماد سے بولی۔ ''میں تو حنیف کی بہ حفاظت واپسی کے لیے مسلسل دعا کر رہی ہوں تھانیدار صاحب لیکن......''

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی تو میں نے پوچھا۔ ''لیکن کیا شاداں؟''

''میرے دل میں بُرے بُرے خیال آتے ہیں جی......'' وہ جز بز ہو کر بولی۔

''کس قسم کے بُرے خیال؟''

''مجھے لگتا ہے کہ حنیف کو کوئی خطرناک حادثہ پیش آ گیا ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''اور...... اور وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔''

''ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے بھابی!'' عظیم نے جلدی سے کہا۔ ''بھائی جان کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ صحیح سلامت واپس آئیں گے۔''

''حد سے زیادہ جذباتی اور حساس ہونا بھی نقصان دہ ہے۔'' میں نے شاداں کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں تمہارے ذہن کی اس کیفیت کے ذمے دار وہ خدشات اور اندیشے ہیں جو مسلسل تمہاری سوچ میں جنم لے رہے ہیں۔ اللہ پر بھروسا اور اچھے کی امید رکھو پھر جیسا کہ تمہارے دیور نے کہا...... حنیف کو کچھ نہیں ہوگا اور وہ صحیح سلامت واپس آ جائے گا۔''

میری اس تسلی کے بعد وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ میں نے انہیں اس یقین کے ساتھ رخصت کر دیا کہ حنیف کی تلاش کے لیے میں اپنی سی محکمہ جاتی کوشش ضرور کروں گا۔

بعد ازاں حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق مجھے یہ جاننے میں آسانی ہوگئی کہ کئی سال پہلے حنیف اور عظیم کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ حنیف، عظیم سے تین سال بڑا تھا اور اس نے عظیم کو اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ دونوں بھائی ایک ساتھ، ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ دس مرلے (تین سو مربع گز) کا وہ مکان ان کی رہائش کے لیے کافی تھا جس کے پچھلے حصے میں پہلو بہ پہلو دو بڑے سائز کے کمرے بنے ہوئے تھے جن کے آگے دس فٹ ....کا ایک برآمدہ تھا۔ برآمدے کے بعد صحن تھا۔ صحن کی ایک دیوار کے ساتھ باورچی خانہ و غسل خانہ وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ مکان کے سامنے والے حصے میں، داخلی دروازے کے بائیں جانب ان لوگوں نے ایک نیچی چھت ڈال کر سامنے سے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ یہ چھپر سخت گرمی اور برسات کے موسم میں جانوروں

کے استعمال میں رہتا تھا۔ ان کے پاس ایک بھینس، ایک گھوڑا اور دو بکریاں تھیں۔ ان کے باپ حفیظ کے زمانے سے ان کے پاس آٹھ ایکڑ زرعی اراضی چلی آرہی تھی۔ وہ دونوں بھائی مل کر اس زمین میں کاشتکاری کیا کرتے تھے۔ یہی ان کا رزق روزگار تھا جو ان کی گزر بسر کے لیے کافی سے بھی زیادہ تھا۔

میری معلومات کے مطابق حنیف نے تین سال پہلے شاداں سے شادی کرلی تھی۔ مکان کا ایک کمرا ان میاں بیوی کے استعمال میں تھا اور برابر والے دوسرے کمرے میں عظیم رہتا تھا۔ بدقسمتی کہہ لیں یا قدرت کی مصلحت کہ حنیف اور شاداں ابھی تک ایک بے اولاد جوڑا ہی تھے۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ حنیف اچانک لاپتا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شاداں کے بیان کے مطابق حنیف چار جولائی بروز بدھ صبح یہ کہہ کر گھر سے روانہ ہوا تھا کہ وہ اپنے دوست اسحاق ڈوگر کا قرض واپس کرنے جمال پور جا رہا ہے۔ اس نے شام سے پہلے واپس آنے کا بھی کہا تھا لیکن اس کا کہا پورا نہ ہوسکا۔ چنانچہ پانچ جولائی بروز جمعرات کی شام شاداں اور اس کے دیور عظیم نے تھانے آکر حنیف کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی تھی اور آج جمعہ، چھ جولائی کا دن تھا اور حسبِ سابق ہلکی پھوار کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

گزشتہ شام میں نے عظیم کو جو ہدایات دی تھیں، ان کی تعمیل میں وہ آج صبح جمال پور روانہ ہو گیا تھا۔ اس کی واپسی جمعے کی نماز کے بعد ہوئی۔ میں نے اسے تاکید کررکھی تھی کہ واپس آنے کے بعد سب سے پہلے مجھے رپورٹ کرنا ہے، اس کے بعد گھر یا کہیں اور کا رخ کرنا ہے۔ میرے حکم کے عین مطابق وہ اس وقت میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور وہ جمال پور سے سنسنی خیز کہانی کے ساتھ لوٹا تھا۔

''تھانیدار صاحب!'' اس نے تشویش بھرے لہجے میں بتایا۔ ''بھائی جان تو جمال پور گئے ہی نہیں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''اسحاق ڈوگر نے مجھے جو کچھ بتایا ہے، میں وہی آپ سے عرض کررہا ہوں جناب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اسحاق ڈوگر کا کہنا ہے کہ بھائی جان نے قرض کی واپسی کے لیے گندم کی کٹائی کے بعد کا وعدہ کیا تھا لیکن اسحاق نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اسے کوئی جلدی نہیں ہے لہٰذا بھائی جان اپنی آسانی کو دیکھتے ہوئے جب چاہیں، قرض کی رقم لوٹا سکتے ہیں۔ اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ ان دنوں بھائی جان اس سے ملنے جائیں گے۔ بہرکیف......''

وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اسحاق نے واضح الفاظ میں مجھے بتایا ہے کہ بھائی جان پرسوں یا کل اس کے پاس نہیں گئے تھے بلکہ اس نے تو یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ پچھلے دو دنوں میں جمال پور کے کسی وسنیک نے بھائی جان کو کہیں بھی نہیں دیکھا۔''

جمال پور، مومن آباد کی بہ نسبت ایک بڑا بلکہ مومن آباد سے دوگنا بڑا گاؤں تھا جس کی آبادی کم و بیش ایک ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق جمال پور میں ڈھائی سو کے قریب مکان موجود تھے۔ اس تناظر میں اسحاق ڈوگر کا دعویٰ خاصی اہمیت کا حامل تھا۔

''یہ بہت ہی عجیب بلکہ ناقابلِ یقین سی بات ہے۔'' میں نے عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ میں ڈوبے لہجے میں کہا۔ ''تمہارا بھائی جمال پور جانے کے لیے گھر سے نکلا مگر وہاں نہیں پہنچا۔ ان دو گاؤں کے درمیان صرف یہ تھانہ ہی پڑتا ہے۔ مطلب باقاعدہ کوئی آبادی نہیں ہے۔ کچے راستے کی دونوں جانب کھیتوں کا سلسلہ ہے۔ اگر حنیف واقعی مومن آباد سے جمال پور کی طرف گیا تھا اور اسحاق ڈوگر کے مطابق وہ جمال پور نہیں پہنچا تو اس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ دورانِ سفر میں کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔''

''یہ...... یہ آپ کیا...... کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب؟'' وہ پریشان نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''میں ایک منطقی بات کررہا ہوں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''یہ سوچنا بے وقوفی ہوگی کہ تمہارے بھائی کو زمین نے نگل لیا ہوگا یا آسمان کھا گیا ہوگا۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اپنی بات جاری رکھی۔ ''یہ مت بھولو کہ حنیف کے پاس ایک تگڑی رقم تھی۔ ہوسکتا ہے کسی منفی ذہن والے شخص کو یہ پتا ہو کہ وہ ڈیڑھ ہزار روپے کے ساتھ گھوڑے پر سفر کررہا ہے۔ مومن آباد اور جمال پور کے بیچ سات میل کی مسافت ہے۔ عین ممکن ہے کہ کسی بُرے انسان نے اس رقم کے حصول کی خاطر تمہارے بھائی کو کوئی نقصان پہنچا دیا ہو۔''

میں نے دانستہ محتاط اور نرم الفاظ کا چناؤ کیا تھا۔ ان لمحات میں میرا ذہن ان خطوط پر سوچ رہا تھا کہ کسی جانکار راہزن نے حنیف کو ٹھکانے لگا دیا ہوگا اور اس کے گھوڑے

اور رقم کو لے کر کہیں فرار ہو گیا ہوگا۔ اگر اس علاقے کی اچھی طرح تلاشی لی جائے تو حنیف کی لاش کا سراغ ہاتھ لگ سکتا ہے۔ یہ ایک تھیوری تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ حنیف نے چار جولائی کی صبح جمال پور کا رخ ہی نہ کیا ہو۔

''آپ تو ڈرانے والی باتیں کررہے ہیں تھانیدار صاحب!'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

''تمہیں کسی بھی سفاک سچائی کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے عظیم!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''تمہارے بھائی کو لاپتا ہوئے دو دن گزر چکے ہیں اور یہ کوئی تسلی بخش صورتِ حال نہیں ہے۔ اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، تمہارے اور شاداں کے علاوہ اور کس کس کو یہ بات معلوم تھی کہ حنیف ایک تگڑی رقم کے ساتھ جمال پور جانے والا ہے؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات میرے اور بھابی کے علاوہ کسی کے علم میں نہیں تھی۔'' عظیم نے متذبذب لہجے میں جواب دیا۔ ''بھائی جان نے خود کسی کو بتایا ہو تو میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر استفسار کیا۔ ''تمہارے بھائی جان کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ تو نہیں تھی؟''

''بھائی جان بہت غصے والے اور لڑاکا طبیعت کے مالک تھے۔'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ''اسے باقاعدہ دشمنی تو نہیں کہا جا سکتا لیکن پچھلے چند ماہ میں ان کا کئی ایک افراد سے اچھا خاصا جھگڑا ہوا تھا۔''

میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا ان کئی ایک افراد کا تعلق مومن آباد ہی سے ہے؟''

''جی، تھانیدار صاحب!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ؟''

''مولوی رشید، ادریس گھمن اور گوگا شیر۔'' اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا ان میں سے کسی نے تمہارے بھائی کو خطرناک نتائج کی دھمکی وغیرہ بھی دی تھی؟''

''اس کا مجھے پتا نہیں جناب!'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''ان میں سے کسی سے بھی جھگڑے کے وقت میں وقوعہ پر موجود نہیں تھا۔ مجھے بعد میں دوسرے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ خاصی گرما گرمی اور گالم گلوچ بھی ہوئی تھی۔''

''کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ ان تین افراد اور حنیف کے بیچ جھگڑے کا سبب کیا تھا؟''

''پہلی بات تو یہ ہے جناب کہ بھائی جان کا ان لوگوں سے ایک ہی دن اور ایک ہی جگہ پر جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ یہ تین ناخوشگوار واقعات پچھلے پانچ چھ ماہ پر محیط ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور دوسری بات یہ کہ میں واقعی اس کے اسباب سے واقف نہیں ہوں۔ بھائی جان کے اندر برداشت کا مادہ بہت کم ہے۔ کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی ناپسندیدہ بات پر وہ بھڑک اٹھتے ہیں۔ اگر سامنے والا بھی گرم طبیعت کا مالک ہو تو پھر لڑائی لازمی ہے۔ ہم تو گھر کے لوگ ہیں اور وہ ہم سے بڑے بھی ہیں اس لیے ہم ان کی ہر کڑوی اور زہریلی بات کو پی جاتے تھے لیکن غیر تو اتنا لحاظ نہیں کرتے نا تھانیدار صاحب......!''

''میں اس نکتے کو سمجھ سکتا ہوں۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''میں تمہارے بھائی جان کے تنازعات کی وجوہات خود ہی معلوم کرلوں گا۔ تم مجھے بتاؤ کہ یہ تینوں افراد کرتے کیا ہیں؟''

''مولوی رشید تو مومن آباد کی مسجد کے پیش امام ہیں۔'' عظیم نے جواب دیا۔ ''ادریس گھمن زمیندار ہے اور گوگا شیر...... اس کا اصل نام طفیل ہے۔ وہ ذات کا موچی ہے۔ کام کاج کوئی نہیں۔ گوگا شیر پہلوانی اور آوارہ گردی کرتا ہے۔ وہ دو سال کی جیل بھی کاٹ چکا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ طفیل عرف گوگا ہوا کرتا تھا۔ جیل سے باہر آنے کے بعد اس نے اپنے نام کے ساتھ ''شیر'' کا اضافہ کرلیا ہے جیسے یہ کوئی خاص ڈگری ہو جو اسے جیل میں دو سال گزارنے پر ملی ہو۔'' بات کے اختتام پر عظیم کے لہجے میں تلخی گھل گئی تھی۔

مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ عظیم، گوگا شیر کے لیے اپنے دل و دماغ میں نفرت کے جذبات رکھتا تھا۔ میں نے رسان بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''گوگا شیر کو کس سلسلے میں دو سال کی جیل ہوئی تھی؟''

''گوگا نے اپنے ایک ساتھی خوشیا (خوشی محمد) کے ساتھ مل کر صوفی نگر کے ایک زمیندار کے گھر میں ڈکیتی مارنے کی کوشش کی تھی۔'' عظیم نے برا سا منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس واردات کے دوران میں صاحبِ خانہ یعقوب جٹ نے مزاحمت کی کوشش کی تو خوشیا نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ یہ تین سال پہلے کا واقعہ ہے تھانیدار صاحب! گوگا شیر تو دو سال کی سزا کاٹ کر رہا ہو گیا تھا لیکن خوشیا ابھی تک جیل میں سڑ رہا ہے۔''

''مجھے اس تھانے میں تعینات ہوئے کم و بیش ایک

سال ہونے کو آرہا ہے۔ یہ واقعہ مجھ سے پہلے کا ہے۔ میں آج رات ہی اس کیس کی فائل کا معائنہ کروں گا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''تم گھر جا کر اپنی بھابی کا خیال رکھو۔ میں تمہارے بھائی کا کھوج لگانے کے لیے ایک پولیس پارٹی کو ترتیب دے کر تفتیش کا آغاز کرتا ہوں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جلد یا بہ دیر، میں تمہارے بھائی کو ڈھونڈ ہی نکالوں گا۔''

عظیم نے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

عظیم کے جانے کے بعد میں نے حوالدار عثمان خان کو اپنے پاس بلالیا۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح تھانے میں بھاری نفری دیکھنے کو نہیں ملتی تھی۔ میرے تھانے میں مجھے ملا کر کل پانچ افراد کا عملہ تعینات تھا یعنی میں، حوالدار عثمان خان اور تین کانسٹیبل جن کے نام عمر کے لحاظ سے علی الترتیب منظور حسین، امداد علی اور نصیر احمد تھے۔ میرے تھانے کا نظام اتنے افراد سے بہ خوبی چل رہا تھا۔

''حکم ملک صاحب!'' حوالدار نے میرے کمرے میں آکر مجھے تعظیم بھرا سلام کیا اور اٹینشن کھڑا ہو گیا۔

''تمہیں پتا ہے نا، کل شام شاداں اپنے دیور عظیم کے ساتھ اپنے خاوند کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آئی تھی؟'' میں نے کہا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ میرے سامنے میز کی دوسری جانب ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''جی ملک صاحب! شاداں کا گھر والا حنیف بدھ کی صبح اپنے کسی دوست سے ملنے جمال پور گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔''

''یہ خبر تو پرانی ہو گئی خان صاحب!''

''کیا مطلب ہے جناب؟'' حوالدار نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''تازہ ترین یہ ہے کہ......'' میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے بتایا۔ ''حنیف، جمال پور نہیں پہنچا۔ یعنی وہ مومن آباد اور جمال پور کے درمیان کہیں غائب ہو گیا ہے اور اس کے پاس مبلغ ڈیڑھ ہزار روپے بھی تھے جو اس نے جمال پور کے ایک وسنیک اسحاق ڈوگر کو دینا تھے۔ میں نے آج حنیف کے چھوٹے بھائی عظیم کو جمال پور بھیجا تھا۔ وہ جا کر اسحاق ڈوگر سے ملا ہے اور اسی نے عظیم کو بتایا ہے کہ حنیف تو وہاں گیا ہی نہیں۔''

''دو باتیں ہو سکتی ہیں ملک صاحب!'' حوالدار نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''نمبر ایک...... حنیف جمال پور کے بجائے کسی اور طرف نکل گیا ہو اور کسی وجہ سے وہ وہاں پھنس کر رہ گیا ہو۔ نمبر دو...... وہ جمال پور جا کر اسحاق ڈوگر سے ملا ہو لیکن کسی خاص وجہ سے ڈوگر غلط بیانی سے کام لے رہا ہو۔''

حوالدار عثمان خان کی عمر پینتیس سال تھی۔ وہ ایک سمجھ دار اور زیرک پولیس اہلکار تھا۔ وہ کافی عرصے سے اس تھانے میں اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے لگ بھگ ایک سال ہو گیا تھا۔ میں نے اسے ایک ذمے دار اور قابلِ بھروسا کولیگ پایا تھا۔

''عثمان خان! تمہاری بات میں اچھا خاصا وزن ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''لیکن ان خطوط پر ذہن کو دوڑاتے ہوئے بہت سارے نئے راستے کھل جاتے ہیں۔''

''مثلاً کون سے راستے ملک صاحب؟'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''مثلاً ہم اس نکتے کو کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اس کے پاس ڈیڑھ ہزار کی رقم موجود تھی۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''حنیف جمال پور کے لیے گھر سے روانہ ہوا تھا یا اس کا ارادہ کہیں اور جانے کا تھا۔ اگر کوئی منفی ذہنیت کا مالک شخص اس کے پاس رقم کی موجودگی سے آگاہ تھا تو وہ اسے لوٹنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ باقی جہاں تک اسحاق ڈوگر کی بات ہے تو......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میری معلومات کے مطابق حنیف اور اسحاق میں خاصی پرانی دوستی ہے اور وہ ڈیڑھ ہزار روپے اسحاق ہی کا دیا ہوا قرض تھا جو حنیف اسے لوٹانے جمال پور گیا تھا۔ میں نہیں سمجھتا، اس سلسلے میں اسحاق ڈوگر کو دروغ گوئی سے کام لینے کی ضرورت ہو۔''

''آپ بھی صحیح کہہ رہے ہیں اور غلط میں نے بھی نہیں کہا ملک صاحب!'' اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''لیکن فی الحال مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں کسی بھی طرح حنیف یا اس کے گھوڑے کو تلاش کرنا ہے...... زندہ یا مُردہ!''

''میں تم سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور اسی سلسلے میں، میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ حنیف کی تلاش کا کام ابھی اور اسی وقت شروع کر دیا جائے اور ہماری پہلی کوشش مومن آباد سے جمال پور کے درمیان ہوگی۔ مسلسل برستی بارش نے کھرے اور کھوج کی راہیں تو مسدود کر رکھی ہیں چنانچہ اپنے مقصد کو پانے کے لیے ہم کسی

تجربہ کار کھوجی کی مدد نہیں لے سکتے۔ آج کی تاریخ میں ہمارے پاس صرف تین گھنٹے ہیں۔ اس کے بعد سورج غروب ہو جائے گا۔ تم ایسا کرو کہ دو کانسٹیبلز کو اچھی طرح سمجھا کر مومن آباد روانہ کر دو۔ وہ مومن آباد سے تھانے تک کے دو میل کے ٹکڑے کو پوری طرح کھنگال ڈالیں۔ کچے راستے سے ہٹ کر کھیتوں کے اندر جا کر بھی چیک کریں۔ ہوسکتا ہے کہیں حنیف یا اس کے گھوڑے کا کوئی سراغ مل جائے۔ باقی تھانے سے جمال پور تک کی تلاش کا کام کل دیکھ لیں گے۔ اگر حنیف واقعتاً کسی حادثے کا شکار ہوا ہے تو اس کی لاش کہیں نہ کہیں ضرور پڑی ملے گی اور ممکن ہے کہ اس کے اریب قریب ہی گھوڑے کا مردہ جسم بھی موجود ہو۔''

''سمجھ گیا ملک صاحب!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں ابھی دس منٹ میں آپ کے احکامات کی تعمیل کرواتا ہوں۔''

''تمہیں ایک اور کام بھی کرنا ہوگا۔'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''تم کافی عرصے سے اس تھانے کی خدمت کر رہے ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کم و بیش تین سال پہلے مومن آباد کے وسنیک دو افراد خوشیا اور گوگا نے موضع صوفی نگر کے ایک زمیندار یعقوب جٹ کے گھر میں ڈکیتی کی واردات کی تھی جس میں خوشیا کے ہاتھ سے یعقوب جٹ کی موت واقع ہوگئی تھی۔ جلد ہی پولیس نے خوشیا اور گوگا کو گرفتار کرلیا تھا۔ گوگا تو دو سال کی سزا کاٹ کر واپس آچکا ہے لیکن خوشیا ابھی تک جیل ہی میں ہے۔ گمشدہ حنیف کے چھوٹے بھائی عظیم نے مجھے بتایا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے گوگا شیرا اور حنیف کے بیچ جھگڑا ہوگیا تھا۔ مجھے صوفی نگر والی ڈکیتی کی فائل چاہیے۔ آج رات سونے سے پہلے میں اس فائل کا مطالعہ کروں گا۔ کیا پتا گوگا شیرا اور حنیف کی پراسرار گمشدگی میں کوئی کنکشن مل جائے۔''

''جی ضرور۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔ ''مذکورہ فائل ریکارڈ روم کی ایک الماری میں محفوظ ہے۔ میں تھوڑی دیر میں نکال کر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جناب!''

میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

ہفتہ سات جولائی کا دن نہایت ہی سنسنی خیز اور ہنگامہ پرور تھا۔ گزشتہ شام کانسٹیبل امداد علی اور منظور حسین ناکام و نامراد واپس لوٹ آئے تھے۔ میری ہدایت پر حوالدار عثمان خان نے انہیں مومن آباد اور تھانے کے درمیان گمشدہ حنیف کی تلاش کا کام سونپا تھا۔ ان دونوں نے کچے راستے کے علاوہ دائیں بائیں کے کھیتوں میں بھی کافی اندر جا کر دیکھا تھا مگر انہیں حنیف کہیں ملا تھا اور نہ ہی اس کے گھوڑے کا کوئی نام ونشان پکڑ میں آیا تھا۔ میں نے آج صبح تھانے آتے ہی ان دونوں کو جمال پور کی جانب روانہ کر دیا تھا۔ امید تھی کہ آج شام تک حنیف کی پراسرار گمشدگی کا کوئی چھوٹا یا بڑا سراغ ضرور ہاتھ لگ جائے گا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا مگر بہ اندازِ دگر......!

اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا اسی کیس پر غور وفکر کر رہا تھا کہ کانسٹیبل نصیر احمد نے میرے پاس آکر بتایا۔

''ملک صاحب! دو بندے آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

نصیر احمد میرے تھانے کا سب سے کم عمر اہلکار تھا۔ وہ چوبیس سال کا تھا اور وہ مقامی تھا یعنی وہ موضع مومن آباد کا رہنے والا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''وہ بندے کون ہیں اور کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟''

''وہ دونوں مسافر ہیں جناب!'' کانسٹیبل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ آج علی الصباح نظام کوٹ سے مومن آباد کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ راستے میں انہوں نے ایک تالاب کے اندر کسی گھوڑے کی لاش دیکھی ہے۔ پتا نہیں ان کے جی میں کیا آئی کہ وہ مومن آباد کی طرف بڑھنے کے بجائے یہاں آگئے ہیں۔''

''انہیں فوراً میرے پاس بھیجو۔'' نصیر کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے اضطراری انداز میں کہا۔

''اوکے سر!'' نصیر یہ کہتے ہوئے واپس چلا گیا۔

مومن آباد سے صوفی نگر شمال مغرب میں دس میل کے فاصلے پر واقع تھا جبکہ میرے تھانے سے صوفی نگر نوّے ڈگری پر آٹھ میل دور عین شمال میں تھا۔ کانسٹیبل نصیر نے ابھی جس نظام کوٹ کا ذکر کیا تھا، وہ ایک مختصر سا گاؤں تھا اور صوفی نگر سے مومن آباد آتے ہوئے تین میل کے فاصلے پر پڑتا تھا یعنی نظام کوٹ اور مومن آباد میں سات میل کی مسافت تھی۔ میری معلومات کے مطابق نظام کوٹ کی آبادی دو سو افراد سے زیادہ نہیں تھی۔

ان دو مسافروں کے نام شفیق اور اعجاز تھے اور وہ نظام کوٹ ہی کے رہنے والے تھے۔ مومن آباد وہ کسی ذاتی کام سے جا رہے تھے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

''عام طور پر لوگ ایسی چھوٹی موٹی چیزوں پر دھیان

نہیں دیتے۔ آپ لوگوں نے بڑی ذمے داری کا ثبوت دیا ہے۔''

''تھانیدار صاحب! اس گھوڑے کی لاش کو دیکھ کر مجھے عجیب سا محسوس ہوا ہے۔'' شفیق نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کے بدن پر مجھے کسی تیز دھار آلے کے زخموں کے نشان نظر آئے ہیں اور اس کی لاش پھول کر تالاب کے پانی پر تیر رہی ہے اور...... اور بدبو کا تو کچھ نہ پوچھیں۔'' بات کے اختتام پر اس نے ایک جھرجھری لی۔

اعجاز نے کہا۔ ''کسی درندہ صفت انسان نے اس معصوم بے زبان کو بڑی اذیت دینے کے بعد موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ پتا نہیں ایک جانور کے ساتھ اس بدبخت کی کیا دشمنی تھی۔''

''اس نامعلوم دشمن کی دشمنی کا سراغ میں خود لگا لوں گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''آپ لوگ مجھ سے تھوڑا سا تعاون اور کریں اور مجھے اس تالاب کے محلِ وقوع کے بارے میں تفصیلاً بتائیں؟''

''جناب! ایسا سمجھیں کہ......'' اعجاز نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''وہ تالاب نظام کوٹ سے لگ بھگ تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ وہ تالاب خاصا وسیع و عریض ہے اور گزرگاہ سے تھوڑا ہٹ کر ہے۔ ہمیں تو اس لاش سے اٹھنے والی بدبو نے اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا اس لیے ہم اپنے راستے سے ہٹ کر ادھر چلے گئے تھے۔ بہرحال، اگر تھانے سے کم و بیش ڈیڑھ میل شمال مشرق کی سمت سفر کریں تو مذکورہ تالاب تک پہنچا جا سکتا ہے۔''

اعجاز کی بتائی ہوئی لوکیشن کو میں نے اپنی یادداشت میں محفوظ کیا اور پوچھا۔ ''اس تالاب کے اندر یا اس کے آس پاس آپ کو کسی انسان کی لاش یا اس کی موجودگی کے آثار دکھائی دیے؟''

میں نے یہ سوال دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر انداز میں کیا تھا۔ اعجاز نے نفی میں گردن ہلا دی۔ شفیق نے ٹٹولنے والی نظر سے مجھے پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب! اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ اس مردہ گھوڑے اور اس کے سوار میں کسی خاص حوالے سے دلچسپی رکھتے ہیں؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ دونوں مثبت سوچ رکھنے والے بھلے انسان ہیں اس لیے میں آپ لوگوں سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔'' میں نے چند سیکنڈ کا توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''تین روز قبل مومن آباد کا ایک وسنیک اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جمال پور کی جانب روانہ ہوا تھا مگر ہماری معلومات کے مطابق وہ بندہ جمال پور نہیں پہنچا۔ دو دن پہلے گمشدہ شخص کی بیوی اور چھوٹے بھائی نے میرے پاس رپورٹ درج کرائی تھی۔ مجھے اسی بندے کی تلاش ہے۔''

''اوہ......!'' اعجاز نے ایک بوجھل سانس خارج کرنے کے بعد پوچھا۔ ''اس لاپتا بندے کا نام کیا ہے؟''

''حنیف......!'' میں نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''اس کی بیوی کا نام شاداں اور چھوٹے بھائی کا نام عظیم ہے۔ کیا آپ لوگ انہیں جانتے ہیں؟''

''نہیں تھانیدار صاحب!'' شفیق نے کہا۔ ''مومن آباد تو کبھی کبھار ہی ہمارا آنا ہوتا ہے اس لیے ہم ہر کسی سے واقف نہیں ہیں۔''

''ویسے آپ لوگ مومن آباد میں کس سے ملنے جا رہے تھے؟'' ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھ لیا۔

''ادریس گھمن!'' اعجاز نے جواب دیا۔ ''یہ مومن آباد کا ایک چھوٹا زمیندار ہے۔''

عظیم کی زبان سے میں نے ادریس گھمن کا نام سنا تھا۔ گزشتہ چھ ماہ میں گمشدہ حنیف کا جن تین افراد سے شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا تھا، ان میں ادریس گھمن بھی شامل تھا۔

''میں ادریس گھمن کو جانتا ہوں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''آپ لوگ اپنی منزل کی جانب روانہ ہو جاؤ اور گھمن صاحب کو میرا اسلام کہنا۔''

''جی ضرور......'' وہ بیک زبان ہو کر بولے پھر میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے حوالدار عثمان خان کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اعجاز اور شفیق کی آمد کے مقصد سے واقف ہو چکا تھا لہٰذا اسے سمجھانے میں مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔

''میں کانسٹیبل نصیر کے ساتھ اس تالاب کی طرف جا رہا ہوں جہاں کسی مردہ گھوڑے کی زخم خوردہ لاش دیکھی گئی ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میری واپسی تک یہ تھانہ تمہارے حوالے ہے۔ امداد علی اور منظور حسین جمال پور گئے ہوئے ہیں۔ سمجھ لو تم تھانے میں اکیلے ہی ہو۔''

''آپ بے فکر ہو کر جائیں ملک صاحب!'' عثمان نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''میں یہاں کے معاملات کو بہ خوبی سنبھال لوں گا۔''

پندرہ منٹ کے بعد میں ضروری تیاری کے ساتھ تھانے سے روانہ ہونے ہی والا تھا کہ عظیم وہاں پہنچ گیا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔ ان لوگوں کے پاس صرف ایک ہی گھوڑا تھا جو حنیف اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ عظیم اس وقت جس گھوڑے پر سوار تھا، وہ یقیناً اس نے مستعار لے رکھا تھا۔ اسی گھوڑے پر وہ گزشتہ روز جمال پور بھی گیا تھا۔

''تھانے دار صاحب! لگتا ہے آپ کہیں جانے کی تیاری میں ہیں۔'' اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''بھائی جان کی تلاش کا کام کہاں تک پہنچا؟''

''عظیم! تم بڑے اچھے وقت پر آئے ہو۔'' میں نے جواباً کہا۔ ''مجھے حنیف کے حوالے سے ایک اہم سراغ ملا ہے۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے تو تفتیش میں آسانی ہوجائے گی۔''

''جانا کہاں ہے؟'' اس نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''نظام کوٹ کی طرف......!''

''مگر بھائی جان تو مومن آباد سے جمال پور گئے تھے؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور نظام کوٹ تو بالکل دوسری طرف ہے؟''

''پہلی بات تو یہ کہ میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ نظام کوٹ میں حنیف کو دریافت کرلیا گیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دوسری بات یہ کہ میں نے نظام کوٹ جانے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا بلکہ اس طرف جانے کا ذکر کیا ہے۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ کی منزل تھانے اور نظام کوٹ کے درمیان کسی جگہ پر واقع ہے۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

''تمہارا اندازہ درست ہے۔'' میں نے رسان بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''میری منزل ایک تالاب ہے جو اس تھانے سے لگ بھگ ڈیڑھ میل شمال مشرق میں اور مومن آباد سے چار میل شمال مغرب میں کھیتوں کے درمیان واقع ہے۔''

''تا......لاب......؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

''ہاں، میں نے تالاب ہی کا نام لیا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اور اس تالاب میں ایک مُردہ گھوڑا پڑا دیکھا گیا ہے جس کے بدن پر جابجا گہرے زخموں کے نشانات ہیں۔ کسی شقی القلب شخص نے اس بے زبان جانور کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ

تعاقب

انسپکٹر کرم داد ایک روز ڈیوٹی پر روانہ ہونے کے لیے تھانے سے نکلے تو ان کے سامنے سے ایک ٹیکسی سست رفتاری سے گزر رہی تھی۔ وہ اچھل کر اس کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور سے بولے۔ ''یہ جو تمہارے آگے آگے دوسری ٹیکسی جارہی ہے، اس کا پیچھا کرو۔ یہ مجھے مشکوک لگتی ہے۔''

''مجھے تو ہر حال میں اس کا پیچھا ہی کرنا ہے صاحب جی!'' ڈرائیور نے عاجزی سے کہا۔ ''وہی ٹیکسی تو میری ٹیکسی کو ٹو کر کے لے جارہی ہے۔''

(مرسلہ: ایم اخلاق، سکھر)

ماہرِ نفسیات

ایک بڑے ہوٹل میں کنونشن کے دوران میں ایک روز دو ماہرین نفسیات ایک راہداری میں ایک دوسرے کے پاس سے گزرے۔ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ایک نے مسکرا کر دوسرے کو ''ہیلو'' کہا۔ دوسرے نے کوئی جواب نہیں دیا اور کافی آگے جا کر ایک ستون کی آڑ میں کھڑے ہو کر سر کھجاتے ہوئے زیرِ لب بڑبڑایا۔ ''آخر اس کا ہیلو کہنے کا مقصد کیا تھا؟''

دو گھنٹے وہ وہیں کھڑا اس سوال پر غور کرتا رہا تب جا کر اس کی سمجھ میں آیا کہ دوسرے نفسیات داں کے ''ہیلو'' کہنے کا مقصد صرف ہیلو کہنا ہی تھا۔

(مرسلہ: شاہد خان، راولپنڈی)

نقصان

شریف صاحب محلے کی کریانے کی دکان پر چیزوں کی قیمتوں کے سلسلے میں بحث و تکرار کر رہے تھے۔ مجید صاحب پاس ہی کھڑے تھے، وہ بولے۔ ''شریف بھائی! سب دکانوں سے آپ سودا ادھار لیتے ہیں اور ادھار آپ نے آج تک چکایا نہیں تو پھر قیمتوں پر بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''اصل میں یہ دکاندار بہت اچھا آدمی ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کا نقصان کم سے کم ہو اس لیے چیزوں کی قیمتیں کم کرا رہا ہوں۔'' شریف صاحب نے جواب دیا۔

(مرسلہ: شاہ زیب علی، ملتان)

اتارنے کے بعد اس تالاب میں پھینکا ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارا ہمارے ساتھ جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس مُردہ گھوڑے کی شناخت کے سلسلے میں تم اہم کردار ادا کر سکتے ہو۔ اگر وہ گھوڑا تمہارے بھائی حنیف کا ہے تو پھر ہمیں گمشدہ حنیف کو اسی علاقے میں تلاش کرنا ہوگا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''آپ کی بات میری سمجھ میں چنگی طراں بیٹھ گئی ہے تھانیدار صاحب!'' وہ وحشت بھری نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''اور میری دلی دعا ہے کہ وہ مُردہ گھوڑا بھائی جان کا نہ ہو۔''

میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔ ''آخر تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''تمہاری اس دعا کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا عظیم؟''

''تھانیدار صاحب! جس کسی ظالم انسان نے اس گھوڑے کا عبرتناک حشر کیا ہے، اس نے گھوڑے کے سوار کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کیا ہوگا، اس کے تصور سے ہی مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے اسی لیے میں دل ہی دل میں یہ دعا کر رہا ہوں کہ اس تالاب میں پڑا ہوا مُردہ گھوڑا ہمارا نہ ہو۔''

''عظیم!'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہاری ذہنی کیفیت کو سمجھ سکتا ہوں۔ اس صورتِ حال میں تمہیں صبر اور ہمت سے کام لینا ہوگا۔''

''جی...... تھانیدار...... صاحب!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ کی باتوں سے حوصلہ ملتا ہے۔ میں آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''شاباش!'' میں نے ہمت بڑھانے والے انداز میں کہا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تو چلیں؟''

وہ فرمانبرداری سے بولا۔ ''جی چلیں۔''

آج فجر کی نماز کے بعد بارش کا سلسلہ تھم گیا تھا تاہم آسمان سیاہ اور گھنے بادلوں سے پوری طرح ڈھکا ہوا تھا اور ہوا بھی بند تھی۔ یہ تمام علامات ایک ہی جانب اشارہ کر رہی تھیں کہ اس حبس زدہ ماحول میں کسی بھی لمحے بارش شروع ہو سکتی تھی۔

تھانے سے مذکورہ تالاب تک محض ڈیڑھ میل کا فاصلہ تھا لیکن زمین گیلی ہونے کے باعث ہم نے اپنے گھوڑوں کی رفتار دھیمی ہی رکھی تھی، مبادا کوئی حادثہ ہو جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔

ہماری محتاط روی فائدہ مند ثابت ہوئی اور کم و بیش دن کے بارہ بجے ہم لوگ اس تالاب کے کنارے پہنچ گئے جس کے بارے میں دو گھنٹے پہلے شفیق اور اعجاز نامی دو مسافروں نے مجھے بتایا تھا۔ ہم جیسے ہی جائے وقوعہ پر پہنچے، آسمان نے اپنے بند کھول دیے۔

ہمارے پاس بارش سے بچاؤ کے نام پر دو چھتریاں تھیں لیکن عظیم کو ایسی کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔ صبح سے رکی ہوئی بارش سے اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ آج برسات کا ناغہ ہے مگر قدرت کے اپنے معاملات ہیں جن کے بارے میں درست اندازہ لگانا انسان کے بس کی بات نہیں۔

بہرحال، کانسٹیبل نصیر نے اپنی چھتری رضاکارانہ طور پر عظیم کی طرف بڑھا دی جو تھوڑے تردد کے بعد اس نے لے لی۔ غنیمت تھا کہ وہ ایک دھیمی بارش تھی۔ ہم سے پہلے نصف درجن دیہاتی بھی اس تالاب کے قریب پہنچ چکے تھے۔ وہ سب کھیت مزدور تھے اور مردہ گھوڑے کے گھائل بدن سے اٹھنے والی بدبو نے انہیں اس طرف آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پولیس پر نگاہ پڑتے ہی وہ لوگ ایک جانب ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

تالاب کی سطح پر تیرنے والی مُردہ گھوڑے کی تعفن زدہ پھولی ہوئی لاش کو دیکھتے ہی عظیم کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ کپکپاتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ زمین پر گرنے ہی والا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔ اس کی کیفیت نے مجھے سب کچھ بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھا دیا تھا پھر بھی اتمامِ حجت کے طور پر میں نے پوچھ لیا۔

''عظیم......!'' میں نے اسے دھیمے لہجے میں مخاطب کیا۔ ''کیا تم اس مردہ گھوڑے سے کسی قسم کی واقفیت رکھتے ہو؟''

اس نے میرے حسبِ توقع جواب دیا۔ ''یہ...... یہ ہمارا...... گھوڑا ہے...... بھائی جان اسی...... گھوڑے پر سوار ہو کر...... جمال پور گئے تھے...... پتا نہیں وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوں گے۔'' بات کو مکمل کرتے ہی وہ باقاعدہ ہچکیاں لینے لگا تھا۔

''حوصلہ رکھو عظیم!'' میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''گھوڑا مل گیا ہے تو میں بہت جلد تمہارے گمشدہ بھائی کو بھی تلاش کرلوں گا۔''

''اس گھوڑے کی حالت کو دیکھ کر تو یہی لگتا ہے کہ کسی سفاک اور بے رحم شخص نے بھائی جان کا بھی کچھ ایسا ہی حشر کیا ہوگا۔'' وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ''پتا نہیں کس نامراد نے میرے بھائی سے دشمنی نکالی ہے۔''

میں نے تسلی دلاسا دینے کے بعد عظیم کو ایک کھیت کی مینڈھ پر بٹھایا اور جائے وقوعہ کی کارروائی میں مصروف ہوگیا۔

سب سے پہلے میں نے کھیت مزدوروں کی مدد سے مردہ گھوڑے کو کھینچ کر تالاب سے باہر نکلوایا اور بغور اس کی زخم زخم لاش کا معائنہ کیا۔ اس پھولی ہوئی لاش کو دیکھ کر میرے ذہن کے کسی دور دراز حصے میں جیسے ایک ننھی سی بتی جلنے بجھنے لگی لیکن فوری طور پر میں سمجھ نہ پایا کہ میرا ذہن کس جانب اشارہ کررہا تھا۔ میں نے ذہن کو مصروفِ کار چھوڑا اور اپنے کام میں جت گیا۔

حنیف کے گھوڑے کو بُری طرح زخمی کرنے کے بعد اس تالاب میں پھینکا گیا تھا جس سے ایک بات سمجھ میں آتی تھی کہ حنیف کی تلاش کا آغاز بھی اسی تالاب سے کرنا چاہیے۔ جب وہ دیہاتی مردہ گھوڑے کو باہر نکالنے کے لیے اس تالاب میں اترے تھے تو میں نے تالاب کی گہرائی کا اندازہ لگالیا تھا۔ تالاب کا پانی ان لوگوں کی کمر سے اوپر نہیں گیا تھا، یعنی اس تالاب کی گہرائی زیادہ سے زیادہ تین فٹ تھی۔ میں نے خصوصی ہدایات کے بعد ان دیہاتیوں کو دوبارہ تالاب میں اترنے اور ایک تیس سالہ بندے کی لاش کو ڈھونڈنے کا حکم دیا۔ وہ متعاون اور بے لوث لوگ ناگوار بدبو کی پروا کیے بغیر میرے حکم کی تعمیل میں رضاکارانہ طور پر مصروف ہوگئے۔

وہ تالاب لگ بھگ ایک ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس زرعی علاقے میں کوئی باقاعدہ گاؤں دیہات آباد نہیں تھا تاہم تھوڑے فاصلے پر چند کچے مکان موجود تھے جن میں کھیت مزدور اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے اور یہی لوگ اس وقت میرے حکم پر اس تالاب میں اتر کر حنیف کی لاش کو تلاش کرنے میں مصروف تھے اور میں مذکورہ تالاب کے اردگرد کھیتوں میں گھوم پھر کر اپنی عقابی نگاہ سے کوئی بھی ایسا سراغ ڈھونڈنے کی کوشش کررہا تھا جس سے حنیف کے غیاب اور بازیابی پر کچھ روشنی پڑ سکے۔

بارش نے بھی عجیب ڈراما لگا رکھا تھا۔ کبھی وہ موسلا دھار برسنے لگتی اور کبھی بوندا باندی کی شکل اختیار کرلیتی۔ خیر، اسی صورتِ حال میں کم و بیش ایک گھنٹے کی تلاشِ بسیار کے بعد اس تالاب اور اس کے گردونواح میں حنیف کی بازیابی کا نتیجہ صفر کے برابر برآمد ہوا۔ میں نے ان کھیت مزدوروں سے بھی گھما پھرا کر مختلف سوالات کیے لیکن ان میں سے کسی نے بھی حنیف یا کسی دوسرے گھڑسوار کو اس طرف آتے نہیں دیکھا تھا۔ گویا حنیف کی تلاش کا سلسلہ جہاں سے شروع ہوا تھا، اس سے ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکا تھا تاہم اس حوالے سے ایک پیشرفت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا اور وہ تھا گمشدہ حنیف کا گھوڑا......!

''تھانیدار صاحب......!'' ایک دیہاتی نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کہیں تو ہم اس مردہ گھوڑے کو بیل گاڑی سے باندھ کر کہیں دور پھینک آتے ہیں۔ اس طرح فضا میں پھیلی ہوئی بدبو سے بھی نجات مل جائے گی اور چیل کوؤں کی بھی عید ہوجائے گی۔''

میرے کان اس دیہاتی کی بات کو سن رہے تھے لیکن آنکھیں حنیف کے مردہ گھوڑے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے بدن میں موجود متعدد زخم مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کررہے تھے۔ پھر مجھے روشنی کی ایک کرن دکھائی دے گئی۔ تھوڑی دیر پہلے میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں جو بتی جلی بجھی تھی، اب وہ اشارہ بالکل واضح ہوگیا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے تجویز پیش کرنے والے اس دیہاتی سے پوچھا۔

''اللہ رکھا، سرکار......!'' اس نے جواب دیا۔

''اللہ رکھا! اللہ تمہیں حفاظت سے رکھے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''فی الحال اس مردہ گھوڑے کو چیل کوؤں اور کتوں کی خوراک بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کام ایک آدھ روز کے بعد بھی کیا جاسکتا ہے۔ تم جلدی سے جاکر بیل گاڑی لے آؤ۔ میں اس مردہ گھوڑے کو سردست کہیں اور بھیجنے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔''

''جو حکم تھانیدار صاحب!'' مذکورہ دیہاتی فرمانبرداری سے بولا۔ ''میں ہے گیا تے ہے آیا۔''

اس دیہاتی کے جانے کے بعد کانسٹیبل نصیر احمد نے مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! آخر آپ نے سوچ کیا رکھا ہے۔ آپ حنیف کے گھوڑے کی لاش کو کہاں بھجوانا چاہتے ہیں؟''

اس وقت ہم دونوں دوسرے لوگوں سے ہٹ کر ایک طرف کھڑے تھے۔ میں نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ ''سرکاری اسپتال...... اور تم اس مردہ گھوڑے کے ساتھ جاؤ گے۔''

''مطلب...... یہ کہ...... آپ اس گھوڑے کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرانا چاہتے ہیں؟''

''ہاں...... کیوں نہیں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جب ایک انسان کی موت کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے اس کے مردہ جسم کی چیر پھاڑ کی جاسکتی ہے تو پھر ایک

بے زبان جانور کی لاش کا پوسٹ مارٹم کیوں نہیں......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر سرسراتی ہوئی آواز میں اضافہ کر دیا۔

''مجھے شک ہے کہ اس گھوڑے کی موت ان زخموں کے باعث نہیں ہوئی۔''

''اوہ......تو پھر اس کی ہلاکت کا سبب کیا ہے؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''گھوڑا ایک پھرتیلا اور طاقتور جانور ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر کوئی شخص یا اشخاص تیز دھار آلات کی مدد سے اسے ہلاک کرنے کے درپے ہوجاتے تو یہ اپنی جان بچانے کے لیے کسی بھی سمت دوڑ لگا سکتا تھا۔ اس طرح بے بسی سے موت کو گلے لگا لینا کم از کم گھوڑے ایسے عقلمند اور مستعد جانور کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اس کی وفاداری کے ذیل میں تو ایسی درجنوں مثالیں مشہور ہیں کہ جب اس جانور نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر اپنے مالک کو موت کے منہ میں جانے سے بچالیا تھا پھر اس گھوڑے کا خود کو بچا نہ پانا میری سمجھ سے تو باہر ہے۔''

''تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ......'' وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''حنیف کے گھوڑے کو پہلے کسی اور طریقے سے فنا کے گھاٹ اتارا گیا ہے اور پھر اس کے بدن کو شدید زخمی کرنے کے بعد تالاب میں پھینک دیا گیا ہے تاکہ ایسا محسوس ہو کہ انہی زخموں کے باعث اس کی موت واقع ہوئی ہے۔''

''تم نے میری سوچ تک رسائی حاصل کرلی ہے نصیر!'' میں نے اسے ستائشی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے میں اس مردہ گھوڑے کا پوسٹ مارٹم کرانا چاہتا ہوں تاکہ اس کی موت کا معما حل کیا جاسکے۔''

''ہوں......!'' اس نے ایک گہری سانس لی پھر عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''یہ سب حنیف کا کیا دھرا بھی تو ہوسکتا ہے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''دیکھیں ملک صاحب!'' وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ایسا بھی تو ممکن ہے نا کہ حنیف کا جمال پور جانے کا کوئی ارادہ ہی نہ ہو۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر یہاں آیا، اس نے کوئی زہریلی شے کھلا کر گھوڑے کو ہلاک کیا پھر اس کے بدن پر گہرے زخم لگا کر اسے تالاب میں دھکیلا۔ اس کے بعد وہ کسی نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہوگیا ہو۔''

''اگرچہ تمہاری بیان کردہ تھیوری کی موجودہ حالات میں کوئی گنجائش نکلتی دکھائی نہیں دیتی لیکن میں پھر بھی اسے یکسر نظرانداز نہیں کرسکتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''وہ بندہ بیل گاڑی لے کر آگیا ہے۔ تم اس کے ساتھ فوراً ضلعی اسپتال روانہ ہوجاؤ۔ تم نے ابھی مجھے جو راہ سجھائی ہے، اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔

آئندہ آدھے گھنٹے میں، میں نے ان دیہاتیوں کی مدد سے حنیف کے زخم خوردہ مردہ گھوڑے کو بیل گاڑی میں لدوانے کے بعد کانسٹیبل نصیر احمد کی زیرِ نگرانی ڈسٹرکٹ اسپتال روانہ کردیا جو وہاں سے کافی فاصلے پر تھا لیکن فرض کی راہ میں فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ میرے ذہن میں بجھنے جلنے والی بتی نے جو اشارہ دیا تھا، اس کی تہ تک پہنچے بغیر میں سکون سے بیٹھ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے تھانے کے عملے کو چین کی سانس لینے کی اجازت دے سکتا تھا۔ بس، میں اسی ٹائپ کا تھانیدار تھا۔

واپسی کے سفر میں عظیم بالکل خاموش رہا۔ اگرچہ اس کے چہرے کے تاثرات اور جسم کی اضطرابی حرکات وسکنات سے صاف جھلکتا تھا کہ وہ مجھ سے کئی ایک سوالات پوچھنا چاہتا ہے لیکن جب اس نے اپنی زبان کو زحمت نہیں دی تو میں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہ جانا۔

☆☆☆

اتوار آٹھ جولائی کی صبح مطلع جزوی طور پر ابر آلود تھا جس کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا تھا کہ آج بارش کا ملا جلا رجحان رہے گا۔ پچھلی شام کانسٹیبلز امداد علی اور منظور حسین جمال پور سے بے نیل مرام واپس آگئے اور میں ایسی ہی توقع بھی کررہا تھا۔ حنیف کے گھوڑے کی، اس تالاب میں سے بازیابی کے بعد حنیف کے جمال پور جانے کے امکانات صفر کے برابر رہ گئے تھے لہٰذا حنیف کی تلاش کے لیے اب اس تالاب سے آگے سوچنا ضروری ہوگیا تھا۔

گزشتہ رات سونے سے پہلے میں نے کانسٹیبل نصیر کی تھیوری پر بھی سنجیدگی سے غور کیا تھا۔ اس کی بات میں دم تو تھا لیکن اگر حنیف نے واقعتاً ایسا کوئی ڈراما رچایا تھا تو پھر اس فعل کی ٹھوس وجوہات کا ہونا ضروری تھا۔ اس ذیل میں غوروفکر کرتے ہوئے ذہن میں یہ سوال ابھرتا تھا......کیا حنیف اپنے گھریلو حالات سے اس قدر مایوس اور دلبرداشتہ ہوچکا

تھا کہ وہ سب کچھ چپ چاپ چھوڑ کر کسی نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہوگیا تھا؟
اس سوال کا بالکل درست جواب حاصل کرنے کے لیے شاداں کو کریدنا بہت ضروری تھا۔ میں نے آج کسی وقت اسے اپنے سوالات کا تختۂ مشق بنانے کا فیصلہ کیا اور کانسٹیبل نصیر کو ساتھ لے کر مومن آباد کی جانب روانہ ہوگیا۔ شاداں سے ایک بھرپور ملاقات تو ضروری تھی۔ اس کے علاوہ میں ان تین افراد کی ''خبر'' بھی لینا چاہتا تھا جن سے پچھلے چھ ماہ میں حنیف کا جھگڑا ہوا تھا۔ نصیر احمد مومن آباد کا ہی رہنے والا تھا چنانچہ ان لوگوں تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ میرا پہلا ٹارگٹ مولوی رشید تھا۔
مولوی صاحب کے بارے میں مجھے پتا چلا تھا کہ وہ مومن آباد کی مسجد کا پیش امام تھا اور اس کی رہائش مسجد کے احاطے کے آخری حصے میں بنے ہوئے ایک حجرہ نما کوارٹر میں تھی جہاں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے مولوی رشید کے حجرے میں جا کر اس کی فیملی کے سامنے بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسے باہر بلا لیا۔
وہ صبح کا وقت تھا اس لیے وہ مسجد کی ذمے داریوں سے فارغ ہی تھا۔ ہم دونوں مسجد کے اندرونی حصے میں ایک صف (چٹائی) پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ مولوی رشید مجھے وہاں دیکھ کر خاصا الجھن کا شکار نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے ایک بے نام سی پریشانی جھلکتی تھی۔
رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے تشفی آمیز انداز میں کہا۔ ''مولوی صاحب! فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک کیس کے حوالے سے آپ سے چند سوالات کرنے آیا ہوں۔ امید ہے آپ مجھ سے تعاون کریں گے۔''
''کیس......؟'' وہ بدکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کیسا کیس......؟''
''میں مومن آباد کے ایک وسنیک حنیف کی پراسرار گمشدگی کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ بندہ پچھلے چار دن سے لاپتا ہے۔''
''اوہ اچھا......!'' وہ ایک گہری اور اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے سنا ہے حنیف کا مردہ گھوڑا نظام کوٹ کے نزدیک کسی بڑے تالاب سے ملا ہے۔''
''آپ نے غلط نہیں سنا مولوی صاحب!'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس زخمی مردہ گھوڑے کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال

بھجوا دیا ہے اور اب مجھے حنیف کی تلاش ہے اور اسی تلاش نے مجھے آپ کے پاس پہنچا دیا ہے۔''
اس وقت ہم دونوں کے قریب کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا۔ میں نے کانسٹیبل نصیر کو گھوڑوں کے پاس مسجد کی بیرونی دیوار کے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ میں دراصل ان تینوں افراد سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا جن میں مولوی رشید پہلا بندہ تھا۔
''لل...... لیکن......'' میری بات پوری ہونے پر مولوی رشید عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''میرا اس پاگل انسان کی گمشدگی سے کیا لینا دینا؟''
''آپ نے 'پاگل انسان' کے الفاظ حنیف کے لیے استعمال کیے ہیں نا؟'' میں نے تصدیق طلب نظر سے اسے دیکھا۔
''جی تھانیدار صاحب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ بات تو سارا مومن آباد جانتا ہے۔''
عظیم اور شاداں نے مجھے یہ تو بتایا تھا کہ حنیف غصے کا تیز اور جھگڑالو طبیعت کا مالک تھا لیکن اس کا پاگل ہونا، چار ہاتھ آگے کی بات تھی۔ میں نے مولوی رشید کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں کہا۔
''پورا مومن آباد یقیناً جانتا ہوگا لیکن یہ اتنی اہم بات میرے علم میں نہیں تھی اسی لیے مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا۔ باقی جہاں تک آپ کا، حنیف کی گمشدگی سے تعلق ہے تو......'' میں نے دانستہ توقف کر کے اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
''میں سمجھتا ہوں اس سلسلے میں آپ کافی مفید ثابت ہوسکتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ میں کچھ غلط نہیں سمجھ رہا۔''
مولوی رشید کی عمر پینتالیس سال کے اریب قریب تھی اور اپنے جثے سے وہ خاصا خوش خوراک نظر آتا تھا۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تھا تو مولوی رشید ایک دن میں جتنا کھانا اپنے معدے میں اتارتا ہوگا، وہ ایک نارمل صحت مند انسان کے لیے تین روز کا کوٹا تھا۔ یہ میرا محتاط اندازہ تھا۔ اس میں کمی نہیں البتہ بیشی کی گنجائش موجود تھی۔
میری گول مول بات نے اس کی پیشانی کو شکن آلود کر دیا۔ وہ عجیب سی نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔
''تھانیدار صاحب! آپ کی بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔ آپ بتائیں، حنیف کی تلاش کے سلسلے میں، میں کس طرح آپ کی مدد کرسکتا ہوں؟''

''چند ماہ پہلے آپ کا حنیف سے جھگڑا ہوا تھا اور معاملہ خاصی گرما گرمی تک پہنچ گیا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس لڑائی کا سبب کیا تھا؟''

''اوہ...... تو آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس جھگڑے کی وجہ سے میں نے اس خبطی جھکی کو کہیں غائب کر دیا ہوگا؟'' وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولا۔

''ایسا سمجھنا میری یعنی پولیس کی مجبوری ہے مولوی صاحب کیونکہ ہماری تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے آگے بڑھتی ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی اس فیصلے تک نہیں پہنچا ہوں کہ حنیف کی گمشدگی میں کس کا ہاتھ ہے۔ میں ہر بندے کو چیک کرنا چاہتا ہوں جس کا پچھلے دنوں حنیف کے ساتھ کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہو۔ میرے خیال میں بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ہوگی؟''

''جی بالکل!'' وہ اپنی چربیلی گردن کو اثبات میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہیں لیکن جب آپ اس تنازعے کے سبب سے آگاہ ہو جائیں گے تو مجھے یقین ہے آپ یہی سوچیں گے، کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا اور وہ بھی مرا ہوا۔''

''آپ پہاڑ کی کھدائی کو فرہاد تک محدود رہنے دیں اور چوہے کو بلی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے دیں۔'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''میں آپ کی کس بات کا کیا مطلب نکالتا ہوں، اس فکر میں آپ کو دبلا ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ آپ بس سیدھا سیدھا میرے سوال کا جواب دیں۔''

میرے بدلتے ہوئے تیور کے نتیجے میں مولوی رشید کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا پھر اس نے بیزاری سے کہا۔ ''اس فتنے کی دو جڑیں تھیں یعنی دو عورتیں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ کن دو عورتوں کا ذکر کر رہے ہیں؟''

''شاداں اور سلمیٰ کا جناب!''

''شاداں کو تو میں جانتا ہوں۔'' میں نے اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''وہ گمشدہ حنیف کی بیوی ہے مگر یہ دوسری عورت سلمیٰ کون ہے؟''

''سلمیٰ میری بیوی اور میرے چھ بچوں کی ماں ہے تھانیدار صاحب!'' اس نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔

''ٹھیک ہو گیا۔'' میں نے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''اب جلدی سے یہ بھی بتا دیں کہ ان عورتوں نے ایسا کون سا فتنہ جگا دیا تھا کہ آپ اور حنیف کو دست و گریبان ہونا پڑا؟''

''ہماری لڑائی میں سلمیٰ اور شاداں کے فتنے کے علاوہ حنیف کی گرم مزاجی اور بد دماغی کا بھی ہاتھ ہے جناب والا۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''اب بات چل ہی نکلی ہے تو میں آپ کو کھل کر بتاتا ہوں۔''

آئندہ پندرہ منٹ میں مولوی رشید نے مجھے جو کہانی سنائی، اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

شاداں کی طبیعت اکثر خراب رہتی تھی اور وہ مولوی رشید کے پاس دم کرانے آتی تھی۔ مولوی رشید کی تشخیص کے مطابق شاداں کسی ہوائی مخلوق کے لپیٹے میں تھی اور اس جکڑ سے آزاد ہونے کے لیے شاداں کو گیارہ جمعرات تک مغرب اور عشا کی نماز کے بیچ کسی وقت مولوی رشید سے دم کرانا تھا۔ شاداں ہر جمعرات کو دم کرانے مسجد پہنچ جاتی تھی اور مولوی صاحب اس پر دم کرنے کے لیے اسے کسی تاریک گوشے میں لے جاتے تھے۔ جب مولوی رشید کی بیوی سلمیٰ کو اس ''پراسرار دم'' کی خبر ہوئی تو اس نے گھر میں فساد ڈال دیا اور مولوی سے کہا کہ وہ شاداں کے دم سے باز آجائے۔ مولوی بھی ضد پر آ گیا کہ وہ گیارہ جمعرات تک شاداں کا علاج مکمل کرنے کے بعد ہی دم کا سلسلہ ختم کرے گا۔ سلمیٰ کو شک تھا کہ شاداں اور اس کے خاوند کے بیچ دم کی آڑ میں کچھ اور ہی چل رہا ہے۔ جب مولوی رشید ''دم کاری'' سے باز نہ آیا تو سلمیٰ نے جا کر حنیف کے کان میں کچھ پھونکا۔ حنیف کے اندر تو پہلے ہی برداشت کا مادہ بہت کم تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ دم کے بہانے مولوی رشید اس کی خوبصورت بیوی کے ساتھ عیش کر رہا ہے تو وہ لڑنے مرنے کے لیے مولوی کے پاس پہنچ گیا۔ اپنے بیان کے اختتام پر اس نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا۔

''تھانیدار صاحب! جو سچ تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔ آپ کی مرضی ہے، میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں۔''

''یہ ادھورا سچ ہے مولوی صاحب!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دباؤ ڈالتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ''اس لیے میرے یقین کو بھی آپ نامکمل ہی سمجھیں۔''

اس نے آنکھیں پھیلا کر مجھے عجیب سی نظر سے گھورا اور مستفسر ہوا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں تھانیدار صاحب! آپ کی اس بجھارتی بات کا مطلب کیا ہے؟''

''فکر نہ کریں، سب سمجھ میں آ جائے گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''بس، آپ شرافت سے میرے

سوالات کا جواب دیتے جائیں۔''
وہ ایسی نظر سے مجھے تکنے لگا جیسے ابھی بھی کچھ اس کے پلّے نہ پڑا ہو۔ میں نے اس کی ذہنی کیفیت کو نظرانداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔
''کیا آپ کو اس بات کا یقین تھا کہ شاداں کی طبیعت کی خرابی اس نوعیت کی تھی کہ اس کے علاج کے لیے دوا دارو کے بجائے جھاڑ پھونک اور دم وغیرہ کی ضرورت تھی؟''
میرے اس سوال میں اتنی توانائی تھی کہ مولوی رشید اندر باہر سے لرز کر رہ گیا لیکن جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور تھوک نگلنے کے بعد قدرے کمزور آواز میں بولا۔
''جی..... میرے حساب میں یہی آیا تھا۔''
''کون سا حساب؟'' میں نے خشک لہجے میں دریافت کیا۔ ''علمِ ہندسہ، فال نامۂ جہانگیری، علمِ رمل، علمِ جفر، علمِ نجوم، عملِ حاضرات یا ان کے علاوہ کوئی اور.....؟''
''آپ.....'' اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
''آپ اتنا کچھ جانتے ہیں؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا کہ کوئی پولیس والا.....''
''میں آپ کی سوچ سے بھی زیادہ جانتا ہوں مولوی صاحب!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''لہٰذا میرے سامنے کوئی چکر بازی نہیں۔ میں اگر ابھی تک ''آپ جناب'' سے بات کر رہا ہوں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ مجھے آسانی سے بے وقوف بنا کر یہاں سے رخصت کر دیں گے۔ کسی غلط فہمی میں نہیں رہنا۔ اگر گھی سیدھی انگلی سے نہ نکل رہا ہو تو میں.....!''
میں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی اور تیز چبھنے والی نظر سے اسے گھورنے لگا۔ میرے خطرناک انداز نے فوراً سے پیشتر مولوی رشید کو اس کی اوقات میں آنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اسے بند گلی میں گھیر لیا تھا۔
''وہ بات دراصل یہ ہے جی.....'' وہ ندامت بھرے لہجے میں بولا۔ ''پہلے پہل شاداں کی غزالی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے یہی لگا تھا کہ وہ کسی سحر میں جکڑی ہوئی ہے اسی لیے میں نے گیارہ جمعرات تک دم کرانے والی بات کی تھی۔''
''اور دوجے دوج.....؟'' میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔
''جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ سحرزدہ نہیں ہے۔'' وہ شرمسار سا ہو کر بولا۔ ''شاداں کی آنکھیں پیدائشی طور پر خمار آلود اور نشیلی ہیں اور اس کا حسن بے مثال!''
''اسی لیے تم نے سوچا..... چل سو چل!'' میں نے ''آپ'' سے ''تم'' پر آتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''دم دمادم مست..... ہیں نا؟''
''تھانیدار صاحب! آپ کو سچ بتاؤں، شاداں پر میرا دل آ گیا تھا۔'' اس نے ڈھٹائی نما ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے اپنے نکاح میں لانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ویسے بھی اسلام میں مرد کے لیے چار بیویوں کی گنجائش ہے۔''
''اس گنجائش سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن شرط نکاح مسنونہ ہے۔'' میں نے غصیلی نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
''یہ مسنونہ کیا ہوتا ہے؟'' وہ ہونقوں کے مانند مستفسر ہوا۔
''مسنونہ، مسنون سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے..... کسی کام کو بالکل ویسے ہی کرنا جیسے نبی پاک ﷺ نے خود کیا ہو۔'' میں نے خفگی آمیز نظر سے مولوی رشید کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم جو کچھ کر رہے تھے، وہ سراسر ہوس پرستی تھی۔ کسی منکوحہ عورت پر اپنے دانت تیز کرنا شرعی، قانونی اور اخلاقی جرم ہے۔ اگر یہی گناہ کسی عام آدمی سے سرزد ہوا ہوتا تو وہ اتنا زیادہ قابلِ مذمت بلکہ قابلِ تعزیر نہیں تھا جتنا کہ تم کیونکہ..... تم ایک عالمِ دین ہو، منبرِ رسول پر بیٹھتے ہو۔ تمہیں تو ایسے نازک معاملات میں ایک ایک قدم پھونک کر اٹھانا چاہیے اور تم دین کا مذاق اڑانے میں پیش پیش نظر آ رہے ہو۔ یہ کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے۔''
''عالمِ دین میں نہیں، آپ ہیں تھانیدار صاحب!'' وہ میرے قدموں پر ماتھا ٹیکتے ہوئے خوشامد آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں اللہ کے گھر میں بیٹھ کر آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ اپنے حیوانی جذبات کو قابو میں رکھوں گا اور کسی بھی نامحرم عورت کو بری نگاہ سے نہیں دیکھوں گا۔''
''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!'' میں نے اپنے پاؤں کو... بہ مشکل اس کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کرایا اور اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''ابھی تو میں جا رہا ہوں۔ میں جب بھی پوچھ تاچھ کے لیے تمہیں تھانے بلاؤں، فوراً چلے آنا۔''
''آپ جیسا کہیں گے، میں بالکل ویسا ہی کروں گا۔'' وہ فدویانہ انداز میں بولا۔
میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''اور جب تک گمشدہ حنیف کا معاملہ کسی کنارے پر نہیں لگ جاتا، تم مومن آباد سے باہر قدم نہیں نکالو گے۔''
''جو حکم سرکار.....!'' وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور

منت ریز لہجے میں بولا۔ ''تھانیدار صاحب! اس گاؤں میں میری بڑی عزت ہے۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ میں نے آپ کے سامنے جو سچائی بیان کی ہے، اس کا ذکر آپ کسی سے نہ کریں اور...... اور آپ مجھے دل سے معاف بھی کر دیں تو یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔''

''مولوی رشید......!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جس مالک نے تمہیں عزت دے رکھی ہے، وہ اسے چھیننا بھی جانتا ہے کیونکہ عزت اور ذلت صرف اور صرف اسی ذاتِ پاک کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ تمہیں اس خالق کائنات کے سامنے سر بہ سجود ہو کر اپنی خطاؤں کے لیے معافی کی درخواست کرنا چاہیے۔ جو اس کی طرف خلوصِ نیت سے رجوع کرتے ہیں، وہ انہیں مایوس نہیں کرتا۔''

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے مسجد سے باہر آ گیا۔ وہاں کانسٹیبل نصیر میرا منتظر تھا۔ میں اس کی معیت میں اپنے دوسرے ٹارگٹ ادریس گھمن کے گھر کی جانب بڑھ گیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، ادریس گھمن ایک چھوٹا زمیندار تھا۔ اس کے پاس اٹھارہ ایکڑ زرعی اراضی تھی اور مومن آباد میں اس کی کافی عزت تھی۔ وہ گندمی رنگت والا ایک میانہ قد تیس سالہ شخص تھا۔ اس کی ٹھوڑی اور دونوں کلائیاں خاصی مضبوط اور چوڑی تھیں۔ ادریس کی صحت کو قابلِ رشک کہا جا سکتا تھا۔ جب اس سے ملاقات ہوئی تو پتا چلا وہ ہنس مکھ اور بذلہ سنج بھی ہے۔

ادریس نے ہمیں اپنے گھر کی بیٹھک میں بٹھایا اور ہماری خاطر داری کا بندوبست کرنے کے بعد وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔ رسمی علیک سلیک تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اب باقاعدہ گفتگو کا آغاز ہو گیا۔

''ملک صاحب! آپ کو ہمارے علاقے کے تھانے میں تعینات ہوئے ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے۔'' اس نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اور اتفاق دیکھیں کہ آج پہلی مرتبہ ہماری ملاقات ہو رہی ہے۔ کل آپ کا سلام مجھ تک پہنچا اور آج آپ خود تشریف لے آئے۔ امید ہے سب خیریت ہی ہوگی۔''

''گھمن صاحب! ڈاکٹر اور پولیس خیریت سے کہیں بھی نہیں جاتے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''رہا سوال پہلی بار ملنے کا تو میں بلاضرورت کہیں آتا جاتا نہیں ہوں۔''

''اوہ......!'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولا۔ ''تو فرمائیں جناب، کون سی ضرورت آپ کو یہاں لے آئی ہے؟ میں تو آج کی ملاقات کو اپنی خوش نصیبی سمجھ رہا تھا اور...... آپ نے ڈرانے والی باتیں شروع کر دی ہیں۔''

''اگر آپ نے کچھ بھی الٹا سیدھا نہیں کیا تو پھر آپ کو ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کل آپ کے جن مہمانوں نے میرا اسلام آپ تک پہنچایا تھا، انہی کی زبانی ملنے والی اطلاع کی روشنی میں فوری کارروائی کر کے میں نے گمشدہ حنیف کا زخمی اور مردہ گھوڑا ایک تالاب سے برآمد کر لیا ہے اور اب مجھے حنیف کی تلاش ہے۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر ادریس گھمن کا گھریلو ملازم لدی پھندی ایک بڑے سائز کی ٹرے اٹھائے بیٹھک میں داخل ہوا اور ایک منٹ کے اندر اس اللہ کے پھرتیلے بندے نے کٹے ہوئے چونسا آموں کی ایک بڑی طشتری، نمک لگے جامن کا ایک کٹورا، کچی لسّی سے بھرا ہوا جگ مع گلاس اور دیسی گھی سے تیار کردہ پراٹھوں والی ٹوکری ہمارے سامنے میز پر سجا دیے اور وہ جس مستعدی سے بیٹھک میں داخل ہوا تھا، اسی رفتار سے رخصت بھی ہو گیا۔

''ملک صاحب! بسم اللہ کریں۔'' ادریس گھمن نے میزبانی کا حق ادا کرتے ہوئے خوش اخلاقی سے کہا۔ ''باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ یہ سب موسم برسات کی سوغاتیں ہیں۔ اللہ کی یہ نعمتیں سامنے آ گئی ہیں تو ان سے پورا پورا انصاف ہونا چاہیے۔''

''آپ نے کچھ زیادہ ہی اہتمام نہیں کر ڈالا گھمن صاحب!'' میں نے اپنے سامنے میز پر سجی انواع و اقسام کی لذتوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تو آپ سے دو باتیں کرنے آیا تھا، کوئی ضیافت اور دعوت اڑانے نہیں۔''

''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے ملک صاحب!'' وہ توانا لہجے میں بولا۔ ''اس کے بعد تو آپ کو کھانا بھی کھانا ہوگا۔''

''یہ سب بھی کسی کھانے سے کم نہیں ہے گھمن صاحب!'' میں نے راست گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''مزید کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے اب ہمیں بات چیت کی طرف آنا چاہیے۔''

''جیسی آپ کی خوشی ملک صاحب!'' وہ بے پروائی سے بولا پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تو آپ حنیف کو ڈھونڈتے ہوئے میرے پاس آئے ہیں جیسے میں نے اس سنکی کو اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے۔''

مولوی رشید نے حنیف کے لیے پاگل، جھکی اور خبطی جیسے الفاظ استعمال کیے تھے اور ادریس گھمن اسے سنکی کہہ رہا تھا۔ بہرحال، میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں نے ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے یہ مطلب اخذ کیا جاسکتا ہو کہ گمشدہ حنیف کو آپ کے گھر سے برآمد کیا جاسکتا ہے۔ میں دراصل ہر اس بندے سے پوچھ تاچھ کررہا ہوں جس کا پچھلے چند ماہ میں حنیف سے جھگڑا ہوا تھا اور اتفاق سے آپ کا شمار بھی انہی افراد میں ہوتا ہے۔''

''اوہ...... تو آپ شاداں والے واقعے کی بات کررہے ہیں؟'' اس نے سرسری انداز میں کہا۔

''شاداں بیچ میں کہاں سے آگئی؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

میں مولوی رشید کے پاس حنیف کے موضوع پر بات کرنے گیا تھا تو وہاں بھی شاداں درمیان میں آگئی تھی اور یہاں بھی کچھ ویسا ہی معاملہ دیکھنے کو مل رہا تھا اسی لیے میں نے اضطراری انداز میں گھمن سے وہ سوال کیا تھا۔

''شاداں کو بیچ سے کیسے نکال سکتے ہیں ملک صاحب؟'' وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ جھگڑا اسی کی وجہ سے تو ہوا تھا۔''

''میں اس واقعے کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

''کیا آپ نے حنیف کو دیکھا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

اس نے استفسار کیا۔ ''اور شاداں کو؟''

''ہاں۔ وہ اپنے شوہر کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے میرے پاس آئی تھی۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اس کے ساتھ حنیف کا چھوٹا بھائی عظیم بھی تھا۔''

''شاداں میں آپ کو کوئی کمی دکھائی دی؟'' اس نے معتدل انداز میں پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، حسن اور جوانی کے حوالے سے؟''

''نہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''شاداں تو مثلِ حور ہے۔''

''آپ نے تو بات ہی مکا دی ملک صاحب!'' وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر شاداں مثلِ حور ہے تو حنیف کو مثلِ لنگور سمجھ لیں جناب والا۔ اس حوالے سے ایک مشہور محاورہ بھی ہے جو اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا۔''

''پہلوئے حور میں لنگور، خدا کی قدرت......!'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔

''جی بالکل۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کو یہی بات سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں۔ ان دونوں کی جوڑی کسی بھی لحاظ سے موزوں نظر نہیں آتی۔ اچھی چیز کو دیکھ کر اس کی تعریف کرنا اس چیز کا حق ہوتا ہے اور اگر وہ چیز کوئی دلکش و دل نشین عورت ہو تو مرد کا دل اس کی توصیف و تعریف کے لیے کچھ زیادہ ہی مچلتا ہے۔ آپ نے جس واقعے کا ذکر کیا، اس کا سبب بھی یہی تھا۔ شاداں جب بھی راستے میں مجھے نظر آتی تو ہم رک کر دو چار باتیں کرلیا کرتے تھے اور اس مختصر سی گفتگو کے دوران میں، میں شاداں کے حسن کو خراجِ تحسین پیش کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر حنیف نے ہمیں بات چیت کرتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔ وہ غصے کا تیز اور عقل سے پیدل تو ہے ہی۔ جب وہ بدتمیزی پر اترا تو مجھے بھی طیش آگیا۔ اس کے بعد جھگڑا اور ہاتھا پائی تو لازمی سی بات ہے۔''

تو پتا یہ چلا کہ احساسِ کمتری نے حنیف کو جھگڑالو اور غصیلا بنا دیا تھا۔ میں نے بھی شاداں کو بھرپور نظر سے دیکھا تھا۔ وہ واقعتاً حسن و خوبصورتی کا مرقع تھی۔ حنیف کو ہر لمحے یہ دھڑکا لگا رہتا ہوگا کہ کوئی مرد اس کی بیوی کو چھین نہ لے۔ یہی احساسِ عدم تحفظ اس کے حسد کو بہت زیادہ بڑھا دیتا ہوگا۔ حنیف کا نفسیاتی مسئلہ تو میری سمجھ میں آگیا تھا لیکن اس وقت جو مجھے مشکل درپیش تھی، اس کا تعلق حنیف کی بازیابی سے تھا اور اس سلسلے میں ادریس گھمن فی الوقت میری کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے ادریس گھمن کی میزبانی کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا اور کانسٹیبل کے ساتھ اس کے گھر سے نکل آیا۔ نصیر احمد نے مجھ سے پوچھا۔

''ملک صاحب! اب کدھر کا رخ کیا جائے؟''

''اپنے تیسرے ٹارگٹ گوگا شیر کو چیک کرتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس کے بعد واپسی کا سفر اختیار کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ تو آجائیں پھر......!'' وہ بڑے جوش سے بولا۔

چند منٹ کے بعد ہم گوگا شیر والی گلی میں تھے لیکن اس سے میری ملاقات نہ ہوسکی۔ وہ اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔ اس کے گھر والوں نے بتایا کہ گوگا گاؤں سے باہر گیا ہوا ہے اور اس کی واپسی اگلی صبح ہوگی۔ اب تھانے لوٹنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔

ہم لوگ گوگا شیر کے مکان سے آگے بڑھے تو گلی کے نکڑ پر واقع ایک الگ تھلگ مکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نصیر نے کہا۔ ''وہ حنیف کا گھر ہے ملک صاحب!''

''ہوں......!'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

دراصل اس وقت میرا ذہن حنیف کی پراسرار گمشدگی کی گتھی کو سلجھانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس حوالے سے آج کی تاریخ میں ہم نے جتنی بھی محنت کی تھی، فی الحال اسے نتیجہ خیز نہیں کہا جا سکتا تھا۔

''ملک صاحب......!'' ہم تھوڑا آگے آئے تو نصیر نے دھیمے لہجے میں مجھ سے کہا۔ ''اگر آپ کی اجازت ہو تو آج کی رات میں ادھر ہی رک جاتا ہوں۔''

نصیر احمد مومن آباد ہی کا رہنے والا تھا تاہم میں نے پوچھنا ضروری جانا۔ ''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''میری ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''اور یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''جب آپ مسجد میں مولوی رشید سے ملاقات کر رہے تھے تو میرا چھوٹا بھائی بصیر ادھر آ نکلا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اسی کی زبانی ماں کی بیماری کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔''

''کیا تمہاری والدہ کو کوئی خطرناک بیماری ہے؟'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

''نہیں جناب! بس، برساتی موسم کے اثرات ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''اگر میں کچھ وقت ماں کے ساتھ گزار لوں گا تو اسے اچھا لگے گا۔''

''ٹھیک ہے، تم اپنے گھر جا سکتے ہو۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''مگر میری ایک شرط ہے۔''

میرے پُراسرار انداز کے جواب میں وہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''کون سی شرط ملک صاحب؟''

''کل جب تم تھانے واپس آؤ تو......'' میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''تو گوگا شیر تمہارے ساتھ ہونا چاہیے۔ سمجھ گئے نا؟''

''سمجھ گیا ملک صاحب!'' وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''آپ بے فکر ہو جائیں۔ گوگا کو تھانے پہنچانا میری ذمے داری ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''تم اپنے گھر جاؤ اور میں تھانے کا رخ کرتا ہوں۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور گھوڑے کو مومن آباد کے اندرونی حصے کی جانب بڑھا دیا۔

نصیر کے جانے کے بعد مجھے اس کی ایک بات یاد آ گئی۔ گزشتہ روز اس نے تالاب کے کنارے کھڑے ہو کر کہا تھا۔ ''یہ سب حنیف کا کیا دھرا بھی تو ہو سکتا ہے۔ ایسا بھی تو ممکن ہے کہ حنیف کا جمال پور جانے کا کوئی ارادہ ہی نہ ہو۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر یہاں آیا۔ اس نے کوئی زہریلی شے کھلا کر گھوڑے کو ہلاک کیا اور پھر اس کے بدن پر گہرے زخم لگا کر اسے تالاب میں دھکیلا۔ اس کے بعد وہ کسی نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔''

اس رات میں نے نصیر کی اس بات پر سنجیدگی سے غور کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اگر حنیف واقعتاً اپنے گھریلو حالات سے اس قدر دلبرداشتہ اور تنگ تھا کہ چپ چاپ اسے کسی نامعلوم منزل کا رخ کرنا پڑا تو اس کی مایوسی اور دل شکستگی کی وجوہات یقیناً شاداں کو معلوم ہوں گی۔

شاداں کا خیال آتے ہی میں نے اپنے گھوڑے کا رخ گمشدہ حنیف کے گھر کی طرف موڑ لیا تاکہ شاداں سے اس سلسلے میں بات کی جائے۔

☆☆☆

سوموار 9 جولائی کی دوپہر کانسٹیبل نصیر، گوگا شیر کو اپنے ساتھ لے کر تھانے پہنچ گیا۔ میں نے مطلوبہ شخص کو فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا۔

طفیل موچی عرف گوگا شیر کی عمر پچیس کے آس پاس نظر آتی تھی۔ اس کی رنگت سانولی اور قد مناسب تھا۔ کسرتی بدن کے ساتھ وہ کوئی تن ساز یا پہلوان ہی لگتا تھا۔ آوارہ گردی اس کی اضافی ''خوبی'' تھی۔ وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہوا تو میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''گھوم جاؤ......!''

اس نے چپ چاپ میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

میں نے اس کی پشت خصوصاً مقامِ تشریف کا بغور جائزہ لیا اور ایک بار پھر حکم دیا۔ ''گھوم جاؤ۔''

اس نے میکانکی انداز میں خود کو پہلے والی پوزیشن میں سنبھالا اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ......یہ سب......کیا ہے جناب......؟''

''تھانیدار تم ہو یا میں؟'' میں نے غراہٹ آمیز لہجے میں پوچھا۔

''آپ ہیں جی۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''تو پھر سوال کرنے کا حق بھی مجھ کو ہی حاصل ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم صرف جواب دو گے۔ سمجھ گئے......؟''

''سمجھ گیا جی۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے

بولا۔ ’’آپ جو بھی پوچھیں گے، میں اس کا سولہ آنے درست جواب دوں گا۔‘‘

’’شاباش! اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔‘‘ میں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ’’میں نے چیک کیا ہے، تمہارے پیچھے دُم نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے لہٰذا تم اصلی نہیں بلکہ صرف نام کے شیر ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تمہارا جگر شیر والا ہے یا نہیں...... اور اس کام کے لیے مجھے تم پر تشدد کرنا پڑے گا۔ تبھی پتا چلے گا کہ تمہارے اندر کتنی ہمت اور کتنا حوصلہ ہے...... اگر تم میری تفتیش کے سامنے ٹک نہ سکے تو آج کے بعد تم ’’گوگا شیر‘‘ نہیں بلکہ ’’گوگا گیدڑ‘‘ کہلاؤ گے۔‘‘

’’لیکن......!‘‘ میرے الفاظ کی سنگینی نے اسے گہری تشویش میں ڈال دیا۔ ’’آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کریں گے؟‘‘ اس نے پریشانی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ’’آخر میرا قصور کیا ہے؟‘‘

’’تمہارے جرائم کی فہرست صوفی نگر والی ڈکیتی سے شروع ہو کر حنیف کی گمشدگی تک دراز ہے۔‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کڑک دار لہجے میں کہا۔ ’’اگر تم مجھ سے تعاون کرو گے تو میں تمہارے ساتھ رعایت برتنے کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔‘‘

’’آج سے تین سال پہلے صوفی نگر میں جو کچھ ہوا تھا، وہ میری نادانی اور غلطی تھی۔‘‘ وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ’’اور میں اپنے اس جرم کی سزا بھگت چکا ہوں۔ ایک سال پہلے جب میں دو سال کی جیل کاٹ رہا تھا تو میں نے شرافت کے راستے پر چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور آج تک میں اپنے اسی فیصلے پر ڈٹا ہوا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ نے کس سلسلے میں تفتیش کرنے کے لیے مجھے تھانے بلایا ہے؟‘‘

میں فوری طور پر اندازہ قائم نہ کر سکا کہ وہ سچ بول رہا تھا یا غلط بیانی سے کام لے کر مجھے چکما دینے کی کوشش میں تھا۔ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔

’’انسان کا ماضی کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ یہ کسی نہ کسی روپ میں اس کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے لیکن اس وقت میں نے تمہیں حنیف کی گمشدگی کے سلسلے میں یہاں بلایا ہے۔ میں نے سنا ہے تم اس کی بیوی پر بُری نگاہ رکھتے تھے۔ اسی حوالے سے کچھ عرصہ پہلے تم دونوں کا جھگڑا بھی ہوا تھا؟‘‘

شاداں کو بُری نظر سے دیکھنے والی بات میں نے اپنی

حکایات شیخ سعدی

☆ آدمی کے علم کا اندازہ تو ایک دن ہو جاتا ہے لیکن نفس کی خباثت کا پتا برسوں میں بھی نہیں چلتا۔

☆ میرے پاس وقت نہیں ہے ان لوگوں سے نفرت کرنے کا جو مجھ سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ میں مصروف رہتا ہوں ان لوگوں میں جو مجھ سے محبت کرتے ہیں۔

☆ میں پوری زندگی دو بندوں کو تلاش کرنے پر بھی تلاش نہ کر سکا۔ ایک وہ جس نے اللہ کے نام پر دیا ہو اور غریب ہو گیا ہو۔ دوسرا وہ جس نے ظلم کیا ہو اور اللہ کی پکڑ سے بچ گیا ہو۔

انسان چار طرح کے ہوتے ہیں

1- ایک شخص...... جانتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ جانتا ہے۔ وہ عالم ہے، اس سے سیکھو۔

2- ایک شخص...... نہیں جانتا لیکن وہ جانتا ہے کہ وہ نہیں جانتا۔ وہ طالب علم ہے، اسے سکھاؤ۔

3- ایک شخص...... جانتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ وہ جانتا ہے۔ وہ سویا ہوا (غافل) ہے، اسے جگاؤ۔

4- ایک شخص...... نہیں جانتا اور یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ نہیں جانتا۔ وہ جاہل ہے، اس سے بچو۔

درست طریقہ

بندے اور اللہ کے درمیان گناہوں کی ایک حد مقرر ہوتی ہے۔ جب بندہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے اور پھر اسے کسی بھی نیکی کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے جھوٹ، نسیاں، خیانت اور بہتان جیسے گناہ پے در پے سرزد ہونے لگتے ہیں چنانچہ نفس کو قابو رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی گزشتہ رات کا محاسبہ کرے اور اگر کوئی آفت دیکھے تو استغفار کرے، اگر نعمت دیکھے تو شکر کرے۔ اگر اپنے اندر اہلِ ایمان کے اوصاف دیکھے تو اللہ کی رحمت کا امیدوار ہو کر خوشی محسوس کرے۔ اگر اپنے اندر گمراہی دیکھے تو غمگین ہو جائے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

طرف سے کی تھی تاکہ اس کے اندر کا حال جان سکوں اور میرا یہ تیر کسی غلط نشانے کی طرف بھی نہیں گیا تھا۔ مولوی رشید اور ادریس گھسن سے حنیف کے جھگڑے کا سبب شاداں کی خوبصورتی سامنے آئی تھی اور طفیل موچی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا مگر بہ اندازِ دگر......!

''آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے تھانیدار صاحب!'' وہ برہمی بھرے انداز میں بولا۔ ''میں نے شاداں پر کبھی بری نگاہ نہیں ڈالی۔ وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ میں اس سے شادی کا خواہش مند تھا کہ مجھے جیل ہو گئی۔ میرے خواب چکنا چور ہو گئے۔ جب میں قید سے رہا ہوا تو شاداں، حنیف کی بیوی بن چکی تھی۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر صبر کر لیا تھا۔ اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر میں نے شاداں کی طرف سے اپنے ذہن کو ہٹا لیا تھا۔ آپ پورے مومن آباد سے پوچھ لیں جو جیل سے آنے کے بعد میں نے کبھی شاداں سے ملنے کی کوشش کی ہو۔''

''اگر میں تمہاری اس کہانی کو سچ بھی مان لوں تو بھی مجھے ایک سوال کا کھرا اور سیدھا جواب چاہیے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''تمہارے اور حنیف کے بیچ کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟''

''میں اس بددماغ کو ایک باریک بات سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔'' اس نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ ''پھر ہمارے بیچ ہونے والی تکرار نے جھگڑے کی شکل اختیار کر لی تھی۔''

''تم کہاں کے مصلح اور ناصح لگے ہوئے ہو؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے بتاؤ، تم حنیف کو کون سی باریک بات سمجھانا چاہتے تھے؟''

''یہی کہ اگر اللہ پاک نے شاداں جیسی پری اس کی قسمت میں لکھ دی ہے تو وہ اس نعمت کو سنبھال کر رکھے۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''اس کا کیا مطلب ہوا؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

''شاداں، حنیف کے قابو میں نہیں ہے تھانیدار صاحب!'' وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''کبھی وہ مولوی رشید سے دم کرانے پہنچ جاتی ہے اور کبھی ادریس گھسن سے سرِراہ گپیں لڑاتی ہے اور......اور......!''

''اس کا مطلب ہے تم نے شاداں کو اپنے دماغ سے نکالا ہے، دل سے نہیں؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ ''اسی لیے تم نے اس کی سرگرمیوں پر گہری نگاہ رکھی ہوئی ہے۔''

وہ عجیب سے فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ ''تھانیدار صاحب! کسی کو دل میں بٹھانا یا دل سے نکالنا انسان کے اختیار کا معاملہ نہیں ہے۔''

اس کے الفاظ کی گہرائی سے محبت کی مخصوص خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں چند لمحات تک اسے گہری نظر سے تکتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''محبت کو حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ اگر نصیب میں ہو تو یہ سوغات خود ہی مل جاتی ہے۔ جس شے کے حصول کے لیے کوئی چال چلنا پڑے، وہ محبت نہیں، ہوس ہے......دھوکا اور ریاکاری ہے۔''

''میں نے شاداں کی محبت کو پانے کے لیے کوئی چال نہیں چلی تھانیدار صاحب!'' وہ بےباکی سے بولا۔ ''بس، میں نے حنیف کو یہ سمجھانا چاہا تھا کہ وہ شاداں کی حفاظت کرے، اس کے معاملات اور مصروفیات پر نظر رکھے ورنہ......ورنہ......!''

''تم نے پہلے ''اور، اور'' پر بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور اب یہ ''ورنہ، ورنہ......'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''آخر تم بجھارتیں کیوں ڈال رہے ہو؟ جو بھی کہنا ہے، کھل کر کہو۔''

''تھانیدار صاحب!'' وہ گھائل آواز میں بولا۔ ''باہر والوں کا کیا رونا؟ جب گھر کو گھر کے چراغ سے آگ لگ جائے تو دوسروں سے کیا گلہ شکوہ۔ مجھے شک نہیں بلکہ پکا یقین ہے کہ شاداں، حنیف سے زیادہ اس کے چھوٹے بھائی عظیم کے قریب ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے غصیلی نظر سے اسے گھورا۔ ''وہ دیور، بھابی ہیں۔ شاداں عظیم کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتی ہے۔ یہ سب خرافات تمہارے گندے ذہن کی پیداوار ہے۔''

میں نے طفیل موچی کو بری طرح جھڑک تو دیا تھا لیکن اپنے الفاظ کا کھوکھلا پن مجھے واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا۔ ان لمحات میں گزشتہ شام کا منظر میرے دماغ میں گھوم گیا تھا۔ میں کانسٹیبل نصیر کو رخصت کرنے کے بعد شاداں سے ملاقات کرنے اس کے گھر کی جانب بڑھ گیا تھا لیکن میرے کئی بار دستک دینے کے باوجود بھی شاداں یا عظیم نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔ دروازے پر تالا نظر آ رہا تھا اور نہ ہی کنڈی لگی دکھائی دیتی تھی جو میں یہ سمجھ لیتا کہ وہ دیور، بھابی اس وقت گھر میں موجود نہیں ہیں۔

''ابھی آپ کو میری بات کا یقین نہیں آئے گا تھانیدار

صاحب!'' میں اپنی سوچ میں گم تھا کہ طفیل کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''لیکن جب چاند چڑھے گا تو پورا مومن آباد دیکھے گا اور اس کی میلی چاندنی آپ کے تھانے تک بھی پہنچے گی۔''

طفیل موچی کے الفاظ میں اتنی گیرائی اور گہرائی تھی کہ میں نے اسے مزید انویسٹی گیٹ کرنے کے بجائے اس ہدایت کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔

''جب تک میں شاداں کے خاوند کو زندہ یا مردہ بازیاب نہیں کرلیتا، تم مومن آباد سے باہر قدم نہیں رکھو گے۔ اگر گاؤں سے نکلنا مجبوری ٹھہرے تو تمہیں بھی جانے سے پہلے اور واپس آنے کے بعد تم تھانے میں رپورٹ کرو گے۔''

''سمجھ گیا سرکار۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

طفیل موچی کے بیان نے میرے دماغ میں سوچ کا ایک نیا اور انوکھا دروازہ کھول دیا تھا۔ یہ اتنا وسیع و عریض دروازہ تھا کہ اس میں داخل ہونے کے بعد جتنا بھی سوچا جاتا، وہ کم تھا۔ خانگی معاملات میں دو رشتوں کو نہایت ہی خطرناک اور تباہ کن تصور کیا جاتا ہے۔ اول...... سالی اور بہنوئی کا رشتہ۔ دوم...... بھابی اور دیور کا رشتہ۔

طفیل موچی نے جس حساس معاملے پر اپنے یقین کا اظہار کیا تھا، اس نے مجھے بھی شاداں اور عظیم کے تعلقات پر شک میں مبتلا کردیا تھا۔ شام سے کچھ دیر پہلے، سرکاری اسپتال سے آنے والی مردہ گھوڑے کی ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ نے میرے شک کو یقین میں بدلتے ہوئے طفیل موچی کے بیان پر مہر تصدیق ثبت کردی تھی۔

مذکورہ رپورٹ کے مطابق، حنیف کے گھوڑے کی موت تین جولائی بروز منگل رات آٹھ اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور اس موت کا سبب زہرخورانی تھا۔ کیمیکل ایگزامر کے مطابق گھوڑے کو چارے کے ساتھ کوئی زہریلا پودا یا کوئی جڑی بوٹی کھلائی گئی تھی جس کے اثرات نے اسے پہلے گہری بے ہوشی میں پہنچایا اور بعد ازاں موت سے ہمکنار کردیا تھا۔ گھوڑے کے بدن پر پائے جانے والے مہلک چرکے اس کے مرنے کے بعد لگائے گئے تھے۔

شاداں اور عظیم کی گرفتاری کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ حنیف کے گھوڑے کی موت تین جولائی کی رات دس بجے سے پہلے واقع ہوچکی تھی جبکہ ان دونوں نے میرے پاس رپورٹ درج کراتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ حنیف چار جولائی کی صبح اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر جہال پور گیا تھا۔ جو گھوڑا تین جولائی کی رات اپنی زندگی کی بازی ہار چکا تھا، وہ چار جولائی کی صبح کیونکر کسی سواری کے قابل ہوسکتا تھا۔

☆☆☆

رات کے گیارہ بجے تھے اور بوندا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ میں اور حوالدار عثمان خان اس وقت گمشدہ حنیف کے گھر کے صحن میں موجود تھے۔ وہ مکان گلی کے آخری سرے پر، دوسرے گھروں سے کافی ہٹ کر بنا ہوا تھا اور ہم دروازہ کھٹکھٹا کر نہیں بلکہ گھر کی عقبی دیوار پھلانگ کر اندر پہنچے تھے۔ قانون کی سربلندی کو قائم رکھنے کے لیے بعض اوقات اس نوعیت کے چھوٹے موٹے غیرقانونی کام جائز ہوجاتے ہیں۔

اس مکان کے پچھلے حصے میں پہلو بہ پہلو دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ اس وقت ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا نظر آرہا تھا جبکہ دوسرے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ہم صحن سے برآمدے میں پہنچے پھر بند دروازے کے سامنے جم کر کھڑے ہوگئے۔ حوالدار کو میں نے چوکنا رہنے کے لیے کہا اور خود بند دروازے سے کان لگا کر اندر کا احوال جاننے کی کوشش کرنے لگا۔

جلد ہی میری سماعت نے اندر کے سگنلز پکڑ لیے۔ شاداں اور عظیم دھیمی آوازوں میں باتیں کررہے تھے۔ وہ ہماری دبے قدموں آمد سے واقف نہیں تھے۔ میں نے اپنی توجہ کو ایک نقطے پر مرکوز کردیا اور وہ نقطہ تھا، ان دونوں کی گفتگو......!

''اب تک تو سب ٹھیک جارہا ہے۔'' شاداں نے کہا۔ ''لیکن میرے دل کو ابھی پوری طرح اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ ہروقت بُرے بُرے خیالات مجھے گھیرے رہتے ہیں۔''

''تم اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کرو میری جان!'' عظیم نے مخمور لہجے میں کہا۔ ''اب تک سب ٹھیک ہے تو آگے بھی ٹھیک ہی رہے گا۔ ہمارے راستے کا سب سے بڑا کانٹا حنیف تھا۔ اسے ہم نے صاف کرکے گھوڑے کو ایسی حالت میں پہنچادیا ہے کہ پولیس ساری زندگی اس کیس کو حل نہیں کرسکے گی اور ہم یونہی عیش کرتے رہیں گے۔''

''مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا کہ وہ بن مانس اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا اور ہم نے اس کی لاش کو ایک گہرا گڑھا کھود کر صحن میں دبادیا ہے۔'' شاداں نے کہا۔ ''کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ گھٹیا انسان اچانک میرے سامنے آکر کھڑا ہوجائے گا۔''

''میں سمجھتا ہوں، تم اس فضول شخص کا قصہ چھیڑ کر اس رات کی لذت بھری تنہائی کا بیڑا غرق کررہی ہو۔'' عظیم نے شاکی لہجے میں کہا۔ ''ایسی مرادوں بھری برساتی راتیں

خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہیں۔ آج ہم پچھلی راتوں کا ریکارڈ توڑ ڈالیں گے۔''

حنیف کے قتل کی سازش بے نقاب ہو چکی تھی اور سازشی عناصر بھی اس وقت میری گرفت میں تھے۔ بس، ان پر ہاتھ ڈالنے کے لیے ایک آخری چھوٹا سا ڈراما ضروری تھا۔

میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر سرگوشیانہ انداز میں حوالدار سے کہا۔ ''عثمان! تم دوسرے کمرے کے دروازے پر وقفے وقفے سے دستک کا عمل جاری رکھو۔ میں اس ناگ اور ناگن کو بل سے باہر نکالنے کے لیے بین بجاتا ہوں۔''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے دوسرے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے دوبارہ اپنی سماعت کو بند دروازے پر مرکوز کیا اور اندر کی باتوں کو باہر سننے کی کوشش کرنے لگا۔

''یہ کون آدھی رات کو آ گیا؟'' شاداں کی بیزاری بھری آواز ابھری۔ پہلی ہی دستک نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ ''کل شام میں بھی کوئی گدھا کافی دیر تک ہمارا دروازہ بجاتا رہا تھا۔ یہ ظالم لوگ ہمیں مزے کیوں نہیں کرنے دیتے؟''

اس بدذات شاداں نے میرے لیے ''گدھا'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ یہ کیس چونکہ ڈراپ سین کے قریب پہنچ چکا تھا اس لیے میں صبر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

''ان لوگوں کو پتا نہیں ہے کہ ہمارے بیچ کی ساری دیواریں اٹھ چکی ہیں۔'' دوسری دستک کے جواب میں عظیم نے کہا۔ ''ٹھہرو، میں باہر جا کر دیکھتا ہوں ورنہ وہ کم بخت دروازہ ہی توڑ ڈالے گا۔''

عظیم اور شاداں لذتِ اجسام کے نشے میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ انہیں یہ اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ دستک بیرونی دروازے پر نہیں بلکہ برابر والے کمرے کے دروازے پر ہو رہی ہے۔ میں بند دروازہ کھلنے کے انتظار میں ریڈ الرٹ ہو گیا۔ اسی لمحے شاداں کی ہنسی بھری آواز مجھے سنائی دی۔

''کم از کم دھوتی (تہ بند) تو پہن لو۔'' اس نے شرارت آمیز لہجے میں عظیم سے کہا تھا۔ ''کیا یونہی الف ننگے باہر نکل جاؤ گے؟''

میرے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ ان دونوں بدکار قاتلوں کے لیے میرے دل و دماغ میں نفرت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات کو قابو کیا اور جیسے ہی عظیم نے بند دروازے کی اندرونی کنڈی گرائی، میں نے ایک طوفانی لات چلا دی۔

میرا نشانہ دروازے کا وسط تھا لیکن چونکہ اس دوران میں دروازہ کھل چکا تھا لہٰذا میری وہ خوفناک لات عظیم کے سینے پر پڑی۔ وہ کسی توپ کے دہانے میں سے نکلنے والے گولے کے مانند ریورس گیئر میں پیچھے پرواز کرتے ہوئے پیچھے کو گیا اور اس نے چارپائی کے اوپر برہنہ پڑی شاداں پر ہنگامی لینڈنگ کی۔ اگلے ہی لمحے شاداں کے حلق سے ایک وحشیانہ نسوانی چیخ خارج ہوئی۔

''گرفتار کر لو ان دونوں بدبختوں کو۔'' میں نے دہاڑ سے مشابہ لہجے میں حوالدار سے کہا۔ ''یہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہیں۔ اب انہیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ حنیف کے خون کا حساب ہو کر رہے گا اور معصوم، بے زبان جانور کی حسرت ناک موت کا حساب بھی۔''

عثمان خان برق رفتار سے میرے حکم کی تعمیل میں جت گیا۔

ان دونوں کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے حنیف کے قتل کے حوالے سے ان کی حالیہ گفتگو کا حوالہ بھی دیا اور بتایا کہ ان کا اقبالِ جرم ریکارڈ پر آ چکا ہے۔ اس کے باوجود بھی کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاداں نے کہا۔

''تھانیدار صاحب! ہم نے عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ سب کیا ہے۔ ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔''

میں کسی بھی حالت میں عورت پر ہاتھ اٹھانے کے حق میں نہیں ہوں مگر شاداں کی بے ہودہ باتوں نے میرے تن بدن میں آگ بھڑکا دی تھی۔ مجھے خود پر قابو نہ رہا اور بے ساختہ میرا ہاتھ گھوم گیا۔

''یہ عشق نہیں، شیطانیت اور حیوانیت ہے۔'' میں نے خونخوار لہجے میں کہا۔ ''تم لوگ اپنی بدنیتی اور بدکرداری کو عشق کا نام دے کر اس پاکیزہ آفاقی جذبے کی توہین کر رہے ہو۔ میں تمہیں عبرتناک سزا دلوائے بغیر سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔''

میرا ہاتھ کچھ زیادہ ہی زور کا پڑ گیا تھا۔ شاداں اپنے مجروح گال کو تھامے سسک رہی تھی۔ عظیم بھی ہاتھ باندھے معافی طلب انداز میں کھڑا مجھے امید بھری نظر سے دیکھ رہا تھا۔

مجھے شاداں پر ترس آیا اور نہ عظیم پر رحم۔ ان لمحات میں، میں نے صرف ایک ہی پکار پر لبیک کہا...... گمشدہ، بے گناہ حنیف کے لہو کی پکار......!

تحریر: حسام بٹ

ایسا لگتا ہے جیسے کچھ احساسات مجسم ہو کر سامنے آکھڑے ہوئے ہوں... وہ بھی شاید کچھ ایسی ہی کیفیت سے گزرتے رہنے کا عادی تھا... اسے چلتے پھرتے ایسے وجود نظر آتے تھے جو باقی تمام لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتے تھے... اور بالآخر ایک دن اس کا یہ بھید کھل گیا۔

ماورائی مخلوق کے پوشیدہ وجود کی حرکات وسکنات کا ماجرا

سرنگ میں

جاوید بسام

اس شام میرے عزیز دوست انتھونی نے سب دوستوں کے لیے ایک پُرلطف عشائیہ کا اہتمام کیا تھا۔ ہم نے مزیدار کھانے کھائے تھے اور بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ جلد ہی ہماری چھوٹی سی محفل برخاست ہوگئی۔ سب دوست اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور ہم دونوں مطالعہ گاہ میں آتش دان میں جلتی آگ کے پاس تنہا رہ گئے۔ باہر برف گرنے لگی تھی اور تیز ہوا کھڑکی پر دستک دے رہی تھی۔ بسا اوقات وہ چمنی کے ذریعے آتش دان میں چلی آتی اور اس میں جلتی آگ کو

بھڑکا دیتی تھی۔ مجھے بار بار ان مہمانوں کا خیال آرہا تھا جو باہر برومٹن اسکوائر میں ٹیکسی کی تلاش میں نکلے تھے جہاں جسم کو چھیدنے والی ہوا چل رہی تھی اور سڑک برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ بہرحال میں گھر میں گرمی اور راحت محسوس کر رہا تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ مجھے ایک ذہین اور دانشور دوست کی رفاقت حاصل تھی۔ ہم آرام سے مصروفِ گفتگو تھے۔ انتھونی کہہ رہا تھا۔

''یہ صرف بات چیت ہے اور میں آپ کو قائل کرنا بھی نہیں چاہ رہا۔ ذرا سوچیے، وقت حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کا کوئی مادی وجود نہیں ہے۔ وقت ابدیت میں ایک نقطے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ وہ ایک سرنگ کے مانند ہے جس میں سے ہم گزر رہے ہیں۔ ہمارے کانوں میں سرنگ کی گڑگڑاہٹ ہے اور ہماری آنکھوں میں تاریکی۔ سرنگ میں سے گزرنے کے بعد ہم دوبارہ روشنی میں موجود ہوں گے تو ہم خود کو اس الجھن، شور اور اندھیرے سے کیوں پریشان کریں جو صرف کچھ لمحوں کے لیے ہمیں گھیرے ہوئے ہے۔''

انتھونی نے اپنے دلائل میں کچھ توقف کیا اور آتش دان میں لکڑی کا کندہ ڈال کر کھرچے سے کریدا۔ چنگاریاں اڑیں اور شعلے بھڑک اٹھے۔ وہ اس طرح کے ناقابلِ تصور نظریات وقتاً فوقتاً بیان کرتا رہتا تھا۔

جب انتھونی اس طرح سے بات کرتا ہے تو کچھ باتیں واضح اور حقیقت معلوم ہوتی ہیں لیکن بعض اوقات میرا دماغ تجریدی تصورات کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ مجھے لگتا ہے کہ اس نے مجھے کسی پہاڑ کے کنارے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اس صورتِ حال میں میرا ذہن بے تابی سے ٹھوس یا قابلِ فہم نکتہ ڈھونڈتا ہے۔ اب بھی ایسا ہی معاملہ تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں آپ کی بات سمجھ نہیں پا رہا۔''

وہ ہنسا اور بولا۔ ''آپ یوں نہیں سمجھیں گے۔ چلیں میں آپ کو ایک ایسی کہانی سناتا ہوں جو یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ حقائق کتنے غیر حقیقی ہیں یا کم از کم ہم کتنا غلط محسوس کرتے ہیں۔''

''کوئی بھوتوں کی کہانی؟'' میرے کان کھڑے ہوئے کیونکہ انتھونی کا دعویٰ تھا کہ وہ بھی کبھی ایسی چیزوں کو دیکھتا ہے جو عام آنکھوں سے پوشیدہ ہوتی ہیں۔

''ہاں، اس کو ماورائی کہا جا سکتا ہے اگرچہ اس میں کافی حد تک تاریک حقیقت بھی موجود ہے۔''

''زبردست امتزاج، میں ضرور سننا چاہوں گا۔'' میں نے کہا۔

اس نے ایک اور کندے کو آگ میں پھینک دیا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اگر آپ تھک جائیں تو مجھے روک دیجیے گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک نکتے پر خاص توجہ دیں کہ آپ اپنے ''پہلے'' اور ''بعد'' سے کتنی مضبوطی سے جکڑے ہوئے ہیں اور کسی خاص واقعے کا وقوع پذیر ہونا اور اس کے وقت کا تعین کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ کوئی شخص مجرمانہ تشدد کا مرتکب ہوا ہے مگر کب؟ کیا جب اس نے یہ جرم کیا یا جب اس نے اس کی منصوبہ بندی کی یا جب وہ فیصلہ کر رہا تھا؟ میری کہانی میں غور کرنے کے لیے ایک اور نکتہ بھی ہے۔ یہ بات مجھ پر عیاں ہے کہ کسی ایسے شخص کے جسمانی خول کی موت کے بعد اس کی روح توبہ کرنے اور اپنے گناہ کا کفارہ دینے کی نیت سے دنیا میں آتی ہے۔ ماورائی عناصر دیکھنے کے دعویداروں نے بار بار ایسے جرائم دیکھے ہیں۔ میں تجریدی باتیں کرتا ہوں۔ لہٰذا میرا استدلال آپ کو مشکل لگے گا لیکن اگر آپ میری کہانی سنیں گے تو، میرا مطلب سمجھ لیں گے۔ چلیں پھر شروع کرتے ہیں۔''

☆☆☆

وہ اپنی کرسی پر جھکا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''اس بات کا آغاز ایک ماہ قبل آپ کے سوئٹزرلینڈ روانگی کے بعد ہوا تھا۔ ایک رات جب بارش ہو رہی تھی۔ میں ایک ریستوران میں کھانے کے بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ مجھے ٹیکسی نہیں ملی تھی لہٰذا میں نے بارش سے بچتے ہوئے قریبی پکاڈلی میٹرو اسٹیشن کا رخ کیا۔ خوش قسمتی سے مجھے اپنی طرف جانے والی آخری ٹرین مل گئی۔ میں جس ڈبے میں داخل ہوا، اس میں میرے علاوہ صرف ایک مسافر تھا۔ وہ میرے سامنے دروازے کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن کسی وجہ سے میں اس میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ عمدہ لباس میں درمیانی عمر کا آدمی تھا اور اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نظر آ رہے تھے جیسے وہ کسی سنجیدہ مسئلے پر غور کر رہا ہو۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے گھٹنے پر تھا اور وہ غیر ارادی طور پر اسے پکڑا ہوا تھا۔ اچانک اس نے نظریں اٹھائیں اور میری طرف دیکھا۔ مجھے ان آنکھوں میں گھبراہٹ نظر آئی۔ گویا میں اس کا کوئی راز جان گیا ہوں۔ اس وقت ٹرین ڈوور اسٹریٹ پر رک گئی۔ دروازے کھلے، اسٹیشن کا اعلان ہوا اور بتایا گیا کہ ٹرین ہائیڈ پارک کارنر اور گلوسٹر روڈ پر منتقل ہو رہی ہے۔ یہ میرے لیے اور بہتر تھا کیونکہ اب ٹرین برومٹن روڈ یعنی میرے اسٹیشن پر بھی رکتی۔ بظاہر یہ میرے ساتھی مسافر کے لیے بھی موزوں تھا کیونکہ وہ ڈبے سے نہیں نکلا تھا اور ٹرین رکنے کے بعد ڈبے میں کوئی داخل بھی نہیں ہوا تھا۔ ٹرین پھر چل دی۔ مجھے یقین

ہے کہ دروازے بند ہونے اور ٹرین کے دوبارہ چلنے کے بعد میں نے اسے دیکھا تھا، لیکن جب میں نے کچھ دیر بعد اس سمت نظر ڈالی تو وہاں کوئی نہیں تھا...... میں اکیلا ہی گاڑی میں سوار تھا۔ آپ کو شاید لگتا ہو کہ یہ نظر کا دھوکا تھا یا پھر وہ کوئی بھوت تھا لیکن میں اس پر یقین نہیں کرتا۔ یہ ایک حقیقی نظارہ تھا۔ ایک مخصوص شخص مجسم حالت میں کچھ دیر پہلے میرے سامنے موجود تھا، لیکن اب وہ غائب ہو چکا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ایک دن وہ اسی طرح میرے مقابل نشست پر بیٹھا ہوگا اور سوچ میں گم کوئی منصوبہ بنا رہا ہوگا۔"

"لیکن کیوں؟ آپ نے یہ فیصلہ کیوں کیا کہ آپ نے کسی زندہ شخص کو دیکھا ہے، بھوت کو نہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اپنے احساسات کی وجہ سے۔ ایک مُردہ شخص کی روح کا نظارہ میں نے اپنی زندگی میں کئی بار کیا ہے۔ وہ ہمیشہ خوف میں مبتلا خود کو چھپانے کی خواہش لیے ہوئے ہوتی ہے اور اس کے ساتھ سردی اور تنہائی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں نے کسی زندہ شخص کو دیکھا ہے اور جلد ہی اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ اگلے دن میں خود اس سے مل لیا۔ کس طرح یہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ اگلے دن میں نے اپنی پڑوسن مسز اسٹینلے کے ساتھ کھانا کھایا۔ انہوں نے ایک چھوٹا سا لنچ دیا تھا اور میرے وہاں پہنچنے کے بعد آخری مہمان کا انتظار ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت اندر آیا جب میں اپنے کسی واقف کار سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے پیچھے سے مسز اسٹینلے کی آواز آئی۔ آئیں میں آپ کو سرہنری پیلے سے ملواؤں۔"

میں نے مڑ کر دیکھا اور کل والے اپنے ساتھی مسافر کو پایا۔ وہ یقینی طور پر وہی تھا اور جب ہم نے مصافحہ کیا تو اس نے بھی میری طرف حیرت سے دیکھا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"مسٹر کارلنگ! کیا ہم پہلے بھی ملے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

ایک لمحے کے لیے میں ٹرین میں اس کی پراسرار گمشدگی کے بارے میں بھول گیا اور بولا۔ "یقیناً اور حال ہی میں۔ گزشتہ رات ہم پکاڈلی سے آخری میٹرو ٹرین پر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے۔"

اس نے پریشانی سے میری طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ "ناممکن، میں آج صبح ہی گاؤں سے واپس آیا ہوں۔"

تب میں نے سنجیدگی سے اس میں دلچسپی لینا شروع کی۔ وہ بھی مجھ پر توجہ دے رہا تھا۔ کھانے کے دوران میں نے کئی بار اس کی حیرت زدہ نظروں کو اپنا طواف کرتے دیکھا اور جب میں واپس جانے والا تھا تو وہ میرے پاس آیا اور بولا۔ "مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ ہم پہلے کہیں ملے ہیں؟"

"آپ کو جلد یاد آجائے گا کہ ہم پہلے کہاں ملے تھے۔" میں نے کہا۔

"نہیں، مجھے ایسا نہیں لگتا۔" وہ بولا۔

انتھونی نے جو کندہ آگ میں پھینکا تھا، اس نے اب آگ پکڑ لی تھی اور اوپر کی طرف لپکتے شعلوں نے اس کا چہرہ روشن کر دیا تھا۔

"اسی شام میں نے آخری میٹرو ٹرین پکڑنے کے لیے دوبارہ اسٹیشن کا رخ کیا۔ اس بار پلیٹ فارم پر بہت ہجوم تھا اور جب سرنگ سے آنے والی ٹرین کی وسل سنائی دی تو میں نے سرہنری پیلے کو دیکھا۔ وہ بھیڑ سے بالکل الگ آخر میں پلیٹ فارم پر کھڑا تھا جہاں جلد ہی ٹرین پہنچنے والی تھی۔

"میں نے سوچا...... یہ کتنی عجیب بات ہے کہ پچھلی رات اسی وقت میں ایک بھوت سے ملا تھا اور اب میں اس آدمی کو مجسم حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اس کے پاس جا کر یہ کہنے کا ارادہ کیا کہ ہماری ملاقات پہلے یہاں ہوئی تھی مگر اسی وقت ایک خوفناک حادثہ ہوا۔ جیسے ہی ٹرین سرنگ سے نکلی، وہ نیچے کود گیا اور ٹرین اسے کچلتے ہوئے پلیٹ فارم پر رک گئی۔ میں وحشت کا شکار ہو گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے آنکھیں بند کرلی تھیں تاکہ وہ خوفناک منظر نہ دیکھ سکوں لیکن پھر مجھ پر ایک عجیب حقیقت کا انکشاف ہوا۔ اگرچہ وہ حادثہ پلیٹ فارم پر انتظار کرنے والے سب لوگوں کے سامنے ہوا تھا لیکن میرے سوا کسی کو کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ کھڑکی سے باہر دیکھنے والے ڈرائیور نے بریک نہیں لگائی تھی، نہ ٹرین کو کوئی جھٹکا لگا تھا اور نہ وہاں موجود لوگوں کی خوف میں ڈوبی کوئی چیخ و پکار سنائی دی تھی۔ سب مسافر خاموشی سے ٹرین میں داخل ہو رہے تھے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ سیڑھی چڑھتے ہوئے غالباً میں لڑکھڑا گیا تھا۔ کسی مہربان آدمی نے مجھے کندھوں سے پکڑا اور نشست پر بیٹھنے میں مدد کی۔ اس نے اپنا تعارف ڈاکٹر کے طور پر کروایا اور پوچھا کہ میں ٹھیک ہوں۔ میں نے اسے وہی بتایا جو میں نے دیکھا تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تب یہ بات مجھ پر واضح ہوئی کہ میں اس نفسیاتی ڈرامے کے دوسرے منظر کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ اگلی صبح میں اس بارے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے پہلے صبح کے اخبارات دیکھے، ان میں کل کے واقعے کا کوئی تذکرہ نہیں تھا جیسا کہ اتفاق سے میں نے توقع کی تھی۔ واقعتاً کچھ

نہیں ہوا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ یہ ہونے والا ہے۔ وقت کا غیر مستحکم پردہ میری آنکھوں سے ہٹ گیا تھا اور میں نے مستقبل کو دیکھا تھا۔ وقت کے نقطۂ نظر سے یہ یقینی طور پر مستقبل تھا، لیکن میرے نزدیک یہ واقعہ ماضی اور مستقبل سے یکساں طور پر وابستہ تھا۔ یہ پہلے سے موجود تھا اور صرف اپنے مادی وجود کا انتظار کر رہا تھا۔ جتنا میں نے اس کے بارے میں سوچا، اتنا ہی میں نے محسوس کیا کہ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتا۔"

"اوہ......مگر کیوں؟" میں نے اس کے بیان میں خلل ڈالتے ہوئے کہا۔ "آپ کو اس حادثے کو روکنے کے لیے کوشش کرنی چاہیے تھی۔"

"میں کیا کرتا؟ سرہنری کے پاس جا کر ان سے کہتا کہ میں سب وے پر ان سے ملا تھا اور انہیں خودکشی کرتے دیکھا ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو دیکھیں۔ فرض کریں جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ میرا وہم یا تخیل تھا تو اسے یہ خیال دینا کیا اچھا ہوتا؟ یا وہ کسی مشکل میں پھنسا ہے اور خودکشی کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اس صورت میں کیا اسے یہ بتانا خطرناک نہیں ہوگا؟ وہ اس کے بارے میں مزید سوچنا شروع کردے گا اور اگر یہ سوچ اس کے دماغ میں پہلے ہی گھر کر چکی ہے تو میری بات اس کے فیصلے کو تقویت بخشے گی۔"

"لیکن مداخلت نہ کرنا، میری رائے میں یہ غیر انسانی رویہ ہے۔" میں نے ناراضی سے کہا۔

"آپ نے شاید میری بات پر غور نہیں کیا؟" اس نے کہا۔

میں نے ذہن میں اس کی بات کو دہرایا تو مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ انھونی کے استدلال میں عقل و فراست موجود تھی۔ اس نے اپنی کہانی جاری رکھی۔

"میں نے آغاز میں آپ سے کہا تھا کہ کسی واقعے کے وقت کا تعین کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ کے نزدیک یہ واقعہ سرہنری کی خودکشی ابھی تک نہیں ہوا کیونکہ اس نے ابھی تک خود کو ٹرین کے نیچے نہیں پھینکا۔ میری رائے میں یہ مادیت پسندانہ پہلو ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔"

☆☆☆

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات ختم کرتا اچانک یخ بستہ ہوا کا ایک تیز جھونکا روشن کمرے میں چلا آیا۔ آتش دان میں سے چنگاریاں اڑیں اور آگ بجھنے لگی۔ ہوا نے میرے بالوں کو بھی چھوا تھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا کہ کیا دروازہ کھل گیا ہے لیکن وہ بند تھا اور کھڑکی پر بھی مضبوطی سے پردہ ڈھکا ہوا تھا۔ انھونی بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی نظریں کمرے میں گردش کر رہی تھیں۔

"کیا آپ کو کچھ محسوس ہوا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، اچانک برفانی ہوا آئی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کچھ اور؟ کوئی سنسنی خیز چیز؟" اس نے پوچھا۔

میں نے جواب دینے سے پہلے اس پر غور کیا۔ اس لمحے مجھے مُردہ شخص پر پائے جانے والے وہ اثرات یاد آگئے جو انھونی نے کچھ دیر پہلے بتائے تھے۔ یعنی خوف، چھپنے کی خواہش اور تنہائی۔ میں ان احساسات کو محسوس کر رہا تھا۔

"ہاں، میں خوف محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

یہ کہہ کر میں آگ کے قریب ہوگیا اور چمکتے روشن کمرے کا محتاط انداز میں جائزہ لیا۔ اسی دوران میں نے دیکھا کہ انھونی کی نظریں آتش دان کے اوپر گھڑی پر جمی ہیں۔ اس وقت اس کی سوئیاں گیارہ بج کر پینتیس منٹ کا اشارہ کر رہی تھیں۔

"آپ کو کچھ نظر آیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔

اس کے سوال نے مجھے خوفزدہ کردیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کے ساتھ پیدا ہونے والے عجیب و غریب احساس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ تیز تر ہوگیا تھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ آپ نے ضرور کچھ دیکھا ہے؟" میں نے کہا۔

"یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس کو صبح تک روک دوں۔ اب آپ آرام کریں۔"

"آپ مجھے یہاں سے کیوں بھیجنا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے روشن دیواروں کا دوبارہ جائزہ لیا اور بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ کوئی ابھی کمرے میں داخل ہوا ہے اور وہ خود کو ظاہر کرسکتا ہے۔ اگرچہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائے گا لیکن وہ وقت قریب آرہا ہے جسے میں دو لگاتار راتوں سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ عام طور پر ایک ہی وقت میں ظاہر ہوتا ہے۔ زمین سے جڑی روح غالباً بعض اصولوں کے تابع ہوتی ہے جیسے وقت کا اصول۔ مجھے لگتا ہے کہ میں جلد ہی کچھ دیکھوں گا لیکن آپ، میرے برعکس اسے برداشت

نہیں کر پائیں گے۔''

میں اس کی بات سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھے بزدل سمجھ رہا تھا۔ میں نے شرمندگی محسوس کی لیکن پھر میں نے خود کو سنبھالا کیونکہ میں اپنا تجسس دور کرنا چاہتا تھا اور کہا۔ ''میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔''

''ٹھیک ہے۔ تو میں کہاں تک پہنچا تھا......؟ ہاں، آپ نے پوچھا تھا کہ میں نے اس حادثے کو روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ جب میں نے اسے ٹرین کے آگے کودتے دیکھا اور میں نے کہا تھا کہ میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ یوں ہی دو دن گزر گئے اور تیسرے دن کی صبح میں نے اخبار میں پڑھا کہ میرا تخیل مادی شکل اختیار کر گیا ہے۔ سر ہنری پیلے، ڈوور اسٹریٹ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑے ٹرین کا انتظار کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گئے تھے جو اسی وقت سرنگ سے نکلی تھی۔ ٹرین فوری طور پر رک گئی تھی لیکن پھر بھی اس کا ایک پہیہ ہنری پر چڑھ گیا جس سے اس کا سینہ کچل گیا اور وہ فوراً مر گیا۔

''تفتیش کے دوران ایک عجیب کہانی منظرِ عام پر آئی۔ بظاہر مثالی اور مطمئن زندگی گزارنے والا وہ خاندان ان دنوں سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے الگ رہتا تھا اور کسی دوسری عورت کی محبت میں پاگل ہو رہا تھا۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ خودکشی سے ایک رات پہلے وہ اپنی بیوی کے پاس گیا اور اس سے طلاق کا مطالبہ کیا جس سے ان کے درمیان جھگڑا شروع ہو گیا۔ ہنری نے دھمکی دی کہ اگر اس نے انکار کیا تو وہ اس کی زندگی جہنم بنا دے گا۔ اس نے پھر بھی انکار کیا۔ آخر اس نے غصے میں بیوی کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ ان کے درمیان زور آزمائی شروع ہو گئی۔ اس کا نوکر شور سن کر دوڑا آیا اور اسے روکا۔ لیڈی پیلے نے کہا کہ وہ اس پر اقدامِ قتل کا مقدمہ دائر کریں گی۔ اس پر وہ بہت رنجیدہ اور دل گرفتہ تھا اور اگلی رات جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا اس نے خودکشی کر لی۔''

یہ کہہ کر اس نے دوبارہ اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ آتش دان میں لگی آگ بجھنے لگی تھی اور کمرا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اس نے اچانک اپنی نظریں اٹھا کر میری کرسی کے پیچھے کسی چیز کو دیکھا۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور محسوس کیا کہ کوئی سایہ میرے اور دیوار کے درمیان حرکت کر رہا ہے لیکن جب میں نے غور سے دیکھنے کی کوشش کی تو وہ غائب ہو گیا۔

''کیا آپ نے کچھ دیکھا ہے؟'' انتھونی نے پوچھا۔

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا...... اور آپ نے؟'' میں نے جواباً پوچھا۔

''ہاں، میں نے کچھ دیکھا ہے۔'' اس نے کہا۔

اب اس کی نظریں کسی ایسی چیز پر جمی ہوئی تھیں جو میری آنکھوں سے پوشیدہ تھی۔ وہ اپنے اور آتش دان کے درمیان کسی نقطے کو دیکھ رہا تھا پھر وہ بولا۔ ''یہ سب کچھ ایک ہفتے پہلے ہوا پھر درمیان میں وقفہ آ گیا لیکن میں اس تسلسل کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ ابھی میرے لیے ختم نہیں ہوا اور دوسری دنیا سے خبریں ملنے کی ابھی امید ہے۔ میں نے واقعات کو تھوڑا آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ کل تقریباً ایک بجے میں ڈوور اسٹریٹ اسٹیشن چلا گیا۔ حملہ اور خودکشی دونوں اسی وقت ہوئی تھیں۔ پلیٹ فارم پر کوئی نہیں تھا لیکن چند منٹ بعد جب میں نے قریب آنے والی ٹرین کی آواز سنی تو بیس میٹر کے فاصلے پر میں نے ہنری کو دیکھا۔ وہ سرنگ میں دیکھ رہا تھا۔ وہ نہ میرے ساتھ سیڑھیوں سے اترا تھا اور نہ ایک لمحہ پہلے وہاں موجود تھا۔ پھر وہ میری طرف آنے لگا۔ جوں ہی وہ قریب آیا، میں نے برفیلی ہوا کا جھونکا محسوس کیا۔ مجھے پہچان کر اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے چمک آ گئی۔ اس نے اپنا سر اٹھایا اور اس کے ہونٹ ہلے لیکن سرنگ میں بڑھتی ہوئی گڑگڑاہٹ کی وجہ سے میں نے کچھ نہیں سنا۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا گویا مجھ سے کسی چیز کی بھیک مانگ رہا ہو۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس بزدلی پر میں اپنے آپ کو معاف نہیں کرسکتا مگر اس میں وہ تمام نشانیاں موجود تھیں جو ایک بھوت میں ہوتی ہیں۔ میرا پورا وجود خوف سے لرز اٹھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اس پر ترس بھی آیا اور میں نے اس کی مدد کی خواہش کی لیکن پھر میں اس سے باز آ گیا۔ اب ٹرین سرنگ سے نکل رہی تھی اور اگلے ہی لمحے اس نے مایوسی سے ٹرین کے آگے چھلانگ لگا دی۔''

☆☆☆

انتھونی یہ کہہ کر اپنی کرسی سے اٹھ گیا۔ وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس کی پتلیاں پھیل گئی تھیں اور ہونٹ ہل رہے تھے۔

''وہ آ رہا ہے۔'' اس نے سرگوشی کی۔

مجھے اپنی بزدلی ختم کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ مجھے بس یہ یاد رکھنا تھا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

اچانک آتش دان کے پیچھے خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی اور ٹھنڈی ہوا کا جھونکا پھر میرے سر سے ٹکرایا۔ میں کرسی پر جھک گیا اور مضبوطی سے اسے پکڑ لیا جیسے کسی چیز سے بچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ آ گیا ہے حالانکہ وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا مگر میرے جسم کا ہر ریشہ مجھے بتا رہا تھا کہ میرے اور انتھونی کے علاوہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود

ہے۔ یہ بہت ہولناک بات تھی۔ کوئی بھی بھوت چاہے وہ کتنا ہی دہشت ناک کیوں نہ ہو، آدمی کو اس احساس سے کم خوفزدہ کرے گا کہ اس کے قریب کوئی پوشیدہ وجود موجود ہے۔ اگرچہ مُردہ چہرے اور ٹوٹے ہوئے سینے کو دیکھنا بھی کم خوفناک نہیں ہے مگر کسی اَن دیکھے وجود کا احساس بہت ہولناک ہوتا ہے۔ انھونی کی نظریں کسی چیز پر جمی ہوئی تھیں اور اس کا چہرہ عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ بولا۔

''ہاں، میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''

کمرے میں مکمل خاموشی تھی لیکن صرف میرے لیے۔ انھونی نے واضح طور پر کچھ سنا کیونکہ اس نے دو بار سر ہلایا اور کہا۔ ''ہاں یہ واضح ہے۔ میں یہ ضرور کروں گا۔''

اچانک مجھے خوف اور دہشت کی ہولناکی نے جکڑ لیا۔ یہ خوف، بےبسی اور حرکت نہ کرنے کے احساس کے ساتھ تھا۔ جیسا کہ اکثر ڈراؤنے خوابوں میں ہوتا ہے۔ جب آپ نہ حرکت کر پاتے ہیں اور نہ کچھ بول سکتے ہیں۔

پھر اچانک کمرے کا ماحول بدل گیا۔ انھونی خاموش ہو گیا تھا۔ اب وہ سامنے نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اس کی نظریں میری سمت گھوم گئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ پوشیدہ بھوت نے اس کی توجہ میری طرف دلائی ہے۔ اچانک میں نے آتش دان کے اوپر ایک خاکے کو ابھرتے دیکھا۔ آہستہ آہستہ کچھ حصوں میں اس کی شکل میری آنکھوں کے سامنے ظاہر ہونے لگی۔ گویا گہرے کہر میں سے کوئی چہرہ نمودار ہو رہا ہو۔ اس چہرے پر غم کا اندوہناک سایہ تھا۔ ایسا سایہ جو زندہ انسانی چہرے پر کبھی نظر نہیں آتا۔ چند لمحوں بعد کندھوں کی شکل بن گئی جس کے نیچے ایک سرخ رنگ کا داغ پھیل گیا اور اچانک میں نے پورے بھوت کو مکمل طور پر دیکھا۔ وہ ایک مجروح خون میں بھیگا ہوا سینہ لے کر میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے سینے کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں کسی تباہ شدہ جہاز کے ملبے کی طرح نظر آرہی تھیں۔ اس کی کشادہ، خوفناک اور غمزدہ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ برفیلی ہوائیں براہِ راست اس کے پاس سے آرہی ہیں۔

پھر دفعتاً اندھیرا چھا گیا۔ سب کچھ غائب ہو گیا۔ جیسے کسی نے بجلی کا سوئچ بند کر دیا ہو۔ آوازیں آنی بند ہو گئی تھیں اور ہوا بھی رک گئی تھی۔ شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے ہوش آیا۔ انھونی میرے سامنے کھڑا تھا۔ کمرا روشن اور پُرسکون تھا۔ میں نے اب اس اَن دیکھے وجود کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا۔ ہم اکیلے رہ گئے تھے۔

مگر ہماری ادھوری گفتگو کا احساس ابھی تک موجود تھا۔ مجھے سب کچھ مبہم اور غیر حقیقی لگ رہا تھا۔

''وہ کون تھا؟ آپ کس سے بات کر رہے تھے؟'' میں نے خاموشی توڑی۔

انھونی نے اپنے ہاتھ کی پشت سے پیشانی صاف کی جس پر پسینا چمک رہا تھا اور بولا۔ ''روح جہنم میں ہے۔''

وقت گزرنے کے بعد ہم اپنے جسم پر ہونے والے احساس کو بھول جاتے ہیں۔ اگر پہلے سردی میں تھے تو گرمی میں آنے کے بعد یہ یاد رکھنا مشکل ہوتا ہے کہ سردی سے کیسے کانپتے تھے۔ اگر گرمی میں تھے اور پھر ٹھنڈ میں چلے آئے ہیں تو یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ گرمی نے کتنا ظلم کیا تھا۔ اسی طرح بھوت کے غائب ہونے کے بعد میں بھول گیا کہ اس نے کچھ لمحے پہلے مجھے کتنا دہشت زدہ کیا تھا۔

''جہنم میں روح؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ کمرے میں دو قدم چلا پھر میرے پاس آکر رک گیا اور وہ میری کرسی کے بازو پر بیٹھ گیا۔

''میں نہیں جانتا کہ آپ نے کیا دیکھا اور کیا محسوس کیا ہے لیکن میرے لیے گزشتہ چند لمحوں میں ہونے والے واقعات میری زندگی میں سب سے زیادہ عجیب تھے۔ میں نے پچھتاوے کی آگ میں جلتی ہوئی ایک روح کے ساتھ بات کی ہے۔ کل جو ہوا، اس کے بعد وہ جانتا تھا کہ میرے ذریعے وہ اس دنیا سے رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ اس نے میری تلاش کی اور مجھے ڈھونڈ لیا۔ اس نے مجھے ایک کام سونپا ہے۔ مجھے ایک ایسی عورت کو تلاش کرنا اور اس سے رابطہ کرنا ہے جسے میں نہیں جانتا اور اس تک معافی کا پیغام پہنچانا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہم کس کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔''

وہ تیزی سے کھڑا ہو گیا۔

''آیئے، اسے دیکھتے ہیں۔''

اس نے مجھے گلی اور مکان کا نمبر بتایا اور بولا۔

''یہ رہی فون ڈائریکٹری۔ کیا یہ محض اتفاق ہوگا اگر ہمیں یہ پتا چلے کہ لیڈی پیلے، بیسویں چیسمور اسٹریٹ، ساؤتھ کیلسنگٹن میں رہ رہی ہیں۔''

اس نے فون ڈائریکٹری کے صفحات پلٹے۔

''ہاں، یہ یہاں موجود ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔ گویا اب اس تک پیغام پہنچانا آسان ہو جائے گا۔

⌘⌘⌘

محفلِ شعروسخن

❄ محمد حسین......کراچی
بے زمینی کا کوئی دیتا ہے طعنہ جب ہمیں
اپنی وسعت کی قسم اس وقت کھاتی ہے زمین

❄ اسلم خان......کوئٹہ
لکھے ہیں قصیدے سمندر کے تم نے
کوئی مرثیہ بھی ہے سوکھی ندی کا
وہ آواز ہو چاہے دل ٹوٹنے کی
کسی طور ٹوٹے فسوں خامشی کا

❄ ناہید یوسف......اسلام آباد
بالآخر تھک ہار کے یارو ہم نے بھی یہ تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں

❄ محمد شہباز اکرم نوئیؔ......پاکپتن
اب وہ کسی اور سے کہتے ہوں گے
تم سے بچھڑیں گے تو مرجائیں گے

❄ مہناز نجم......لانڈھی
دوستو، تم پہ بھی گزرا ہے کبھی یہ عالم؟
نیند آتی نہیں اور خواب نظر آتے ہیں

❄ رانا ادیب......رحیم یار خان
عجیب کیف سا ترکِ شعورِ ذات میں تھا
کہ اپنے ساتھ بھی رہ کر خود اپنی بات نہ کی

❄ کاشف شاہ......کوہاٹ
پختہ ہوتی ہے، اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش، تو ہے خام ابھی

❄ نور خان......اوستہ محمد
جہاں میں صدق و وفا کا کہیں بھی نام نہیں
فریب دیتے رہے میرے مہربان مجھے

❄ راجہ عتیق......راولپنڈی
وہ خار خار ہے شاخِ گلاب کی مانند
میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اسے

❄ محمد شہزاد......اٹک
موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

❄ صدف شیخ......ساہیوال
خاک بھی، سر پہ ڈالنے کو نہیں
کس خرابے میں ہم ہوئے آباد

❄ صدف خالد......حیدرآباد
گزشتہ عہد گزرنے ہی میں نہیں آتا
یہ حادثہ بھی لکھو معجزوں کے خانے میں
جو رد ہوئے تھے جہاں میں کئی صدی پہلے
وہ لوگ ہم پہ مسلط ہیں اس زمانے میں

❄ عامر خلیل......خانیوال
تاروں بھرے آنچل میں وہ پُرنور سا چہرہ
آکاش کی وسعت میں کوئی چاند ہو جیسے

❄ مہتاب احمد......حیدرآباد
اب اپنے تکلم کا سلیقہ ہی بدل لے
الفاظ پرانے ہیں تو لہجہ ہی بدل لے

❁ عبدالرب خان......صوابی

مصرف نہ تھا کوئی تو ملیں صرف ٹھوکریں
تھے قیمتی تو رکھے گئے پتھروں کے نام

❁ خرم شیرازی......گوجرانوالہ

بات وہ آدھی رات کی، رات وہ پورے چاند کی
چاند بھی عین چیت کا، اس پر ترا جمال بھی

❁ حاجی مختار......پنڈی

بستی میں جتنے آب گزیدہ تھے سب کے سب
دریا کا رخ بدلتے ہی تیراک ہو گئے

❁ سعدیہ خان......فیصل آباد

زندگی بھر کی مسافت کاٹ کر بھی کیا ملا
اجنبی دیوار و در، سنسان گھر، تنہائیاں

❁ کاشف نصیر......لیہ

تُو بزم سے اٹھا تو ہوئی تلخ مے کشی
میں سچ کہوں شراب کو سمجھا حرام آج

❁ عتیق ناز......جہلم

جستجو ہو تو سفر ختم کہاں ہوتا ہے
یوں تو ہر موڑ پہ منزل کا گماں ہوتا ہے

❁ بابر زمان......پھالیہ

میں برگِ صحرا سہی سائباں تھا سب کے لیے
نہ جانے بھول گئی کس لیے بہار مجھے

❁ جنید ملک......کراچی

یادیں اداس آنکھیں اور اک دل بجھا بجھا
جاتے ہوئے وہ کتنے انعامات دے گیا

❁ اقبال احمد......کراچی

تیری آنکھیں میری آنکھیں لگتی ہیں
سوچ رہا ہوں کون یہ تجھ سا مجھ میں ہے

❁ حمیرہ اقبال......کراچی

غمِ جہاں ہو رخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

❁ فقیر انصاری......میانوالی

چاندنی راتوں کے خاموش ستاروں کی قسم
دل میں اب تیرے سوا کوئی بھی آباد نہیں

❁ داؤد خان......پشاور

خوشی ملی تو کئی درد مجھ سے روٹھ گئے
خدا کرے کہ میں پھر سے اداس ہو جاؤں

❁ احسان کھوکھر......بدین

تُو بدلتا ہے تو بے ساختہ میری آنکھیں
میرے ہاتھوں کی لکیروں سے الجھ جاتی ہیں

❁ امتیاز جٹھہ......ٹنڈوالہیار

ہم ملے بھی تو کیا ملے وہی دوریاں وہی فاصلے
نہ کبھی ہماری جھجک گئی نہ کبھی تمہارے قدم بڑھے

❁ پروین......سکھر

بہت ہی عام سا اک شخص تھا وہ
ہمارا رازداں بننے سے پہلے

❁ ثاقب نواز......بھکر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

❁ اکبر تیموری......کراچی

اس کی نفرت بھی محبت ہوگی
میرے بارے میں وہ سوچے تو سہی

❁ محمد نادر......میاں چنوں

نہ پوچھ کیسے اسے زندگی گزارتی ہے
میری طرح جو مکمل بھی ہو، ادھورا بھی

❁ جعفر علی......ملتان

جنگل کے غزالوں پہ عجب خوف ہے طاری
طوفان کوئی شہر کی جانب سے اٹھا ہے

❁ انس خان......مری

خواہشوں کے سفر میں ہوں شاید
میں اذیت نگر میں ہوں شاید

❁ ناصر محمود......سیالکوٹ

ہاں تیرے جبر کی شہرت بھی بہت تھی لیکن
اب تو بستی میں مرے صبر کا آوازہ ہے

❁ بدر الدین......اوکاڑہ

فرصت ملے تو پوچھ کبھی ان کا حال بھی
جو لوگ جی رہے ہیں ترے پیار کے بغیر

❁ رخسانہ کنول......شیخوپورہ

چارہ سازوں سے الگ ہے میرا معیار کہ میں
زخم کھاؤں گا تو کچھ اور نکھر جاؤں گا

❁ کائنات حیدر......چنیوٹ

ترکِ محبت کر بیٹھے ہم، ضبطِ محبت اور بھی ہے
ایک قیامت بیت چکی ہے ایک قیامت اور بھی ہے

❁ عظیم احمد......جھنگ سٹی

تیرے بغیر ہر اک آرزو ادھوری ہے
جو تو ملے تو مجھے کوئی آرزو نہ رہے

❁ این اے بزمی......خانپور

حسرت بھری نگاہ کا کوئی سبب تو ہے
تو حالِ دل تو پوچھ کہیں مر نہ جاؤں میں

❋ شاہد ندیم......پشاور

بٹ گئے ہیں یوں کسی کو الوداع کہتے ہوئے
لوٹ آیا ہے بدن اور روح دروازے میں ہے

❋ شبیر احمد......پنڈ دادن خان

وہی تو سب سے زیادہ ہے نکتہ چیں
جو مسکرا کے ہمیشہ گلے لگائے مجھے

❋ آمنہ افضل......پنوعاقل

مجھ سے کرتا تھا نہ ملنے کے بہانے کتنے
اب گزارے گا میرے ساتھ زمانے کتنے

❋ اشعر احمد......ڈیرہ غازی خان

قفس میں رہتے ہوئے ہوگئی صیاد سے الفت
میں خود ہی نوچ لیتا ہوں میرے جب پر نکلتے ہیں

❋ رفیق الدین......کراچی

گر زندگی میں مل گیا تو اتفاق سے
پوچھیں گے اپنا حال تیری بے بسی سے ہم

❋ غلام نصیر......نواب شاہ

رشتوں میں وفا، لفظوں میں چاہت نہیں رہی
جذبوں میں اب خلوص کی حدت نہیں رہی

❋ علی اصغر......پنوعاقل

چاٹ لی کرنوں نے میرے جسم کی ساری مٹھاس
میں سمندر تھا وہ سورج مجھ کو صحرا کرگیا

❋ فائزہ نقوی......اسلام آباد

یہ اور بات ہے کہ تقدیر لپٹ کر روئی
ورنہ بازو تو تمہیں دیکھ کر پھیلائے تھے

❋ فرخ حبیب......لاڑکانہ

میرے لفظوں سے نکل جائے اثر
کوئی خواہش جو تیرے بعد کروں

❋ آصفہ ملک......ٹوبہ ٹیک سنگھ

آئے گی میرے جسم سے اخلاص کی خوشبو
میں پھول ہوں اور پیار کی ٹہنی پہ سجا ہوں

❋ عالیہ جہانگیر......سکھر

جانے اس شخص کو یہ کیسا ہنر آتا ہے
رات ہوتے ہی وہ آنکھوں میں اتر آتا ہے

❋ عمران شیروانی......لاہور

تنہائیاں کچھ اس طرح ڈسنے لگیں مجھے
میں آج اپنے پاؤں کی آہٹ سے ڈر گیا

❋ سائرہ خان......کراچی

چاہت بھرے وہ لفظ اور ہر لفظ میں دعا
مقروض کردیا ہے تمہارے خلوص نے

❋ اویس خان......مری

تم مجھے چھوڑ کے جاؤ گے تو مرجاؤں گا
یوں کرو جانے سے پہلے مجھے پاگل کردو

❋ حرا اظہر......کراچی

ہوتی ہیں محبت میں بھی کچھ راز کی باتیں
ایسے ہی تو اس کھیل میں ہارا نہیں جاتا

❋ حافظ عمیر......مانسہرہ

تا حدِ نظر شعلے ہی شعلے ہیں چمن میں
پھولوں کے نگہبان سے کچھ بھول ہوئی ہے

❋ عنایت علی......خیر پور

بکھر نہ جائے کہیں کرچیوں کی شکل میں وہ
جو خوش خصال ابھی آئینے کی صورت ہے

❋ انصار حسین......صادق آباد

ضروری تو نہیں ہر شخص ہو اخلاص کا پیکر
کڑکتی دھوپ میں ہر پیڑ تو سایہ نہیں کرتا

❋ عادل شاہ......منڈی بہاالدین

کتنی کلیاں شاخ سے ٹوٹیں یہ تو مجھے معلوم نہیں
وصل کی شب تو آ نہ سکی اور پیار کے چرچے عام ہوئے

❋ گل تسنیم......لاہور

دوڑتی پھرتی ہیں ہر سُو میری بے کل آنکھیں
تجھ کو پھر ڈھونڈنے نکلی ہیں یہ پاگل آنکھیں

❋ سرور شیخ......فتح جنگ

میں بعد مرگ بھی بزمِ وفا میں زندہ ہوں
تلاش کر میری محفل، میرا مزار نہ پوچھ

❋ فریدہ اعوان......شکار پور

اپنے سینے میں سمیٹے ہوئے لاکھوں طوفاں
میں ہوں خاموش زمانے میں سمندر کی طرح

کوپن برائے شمارہ اکتوبر 2022

محفلِ شعر و سخن

نام : --

پتا : --
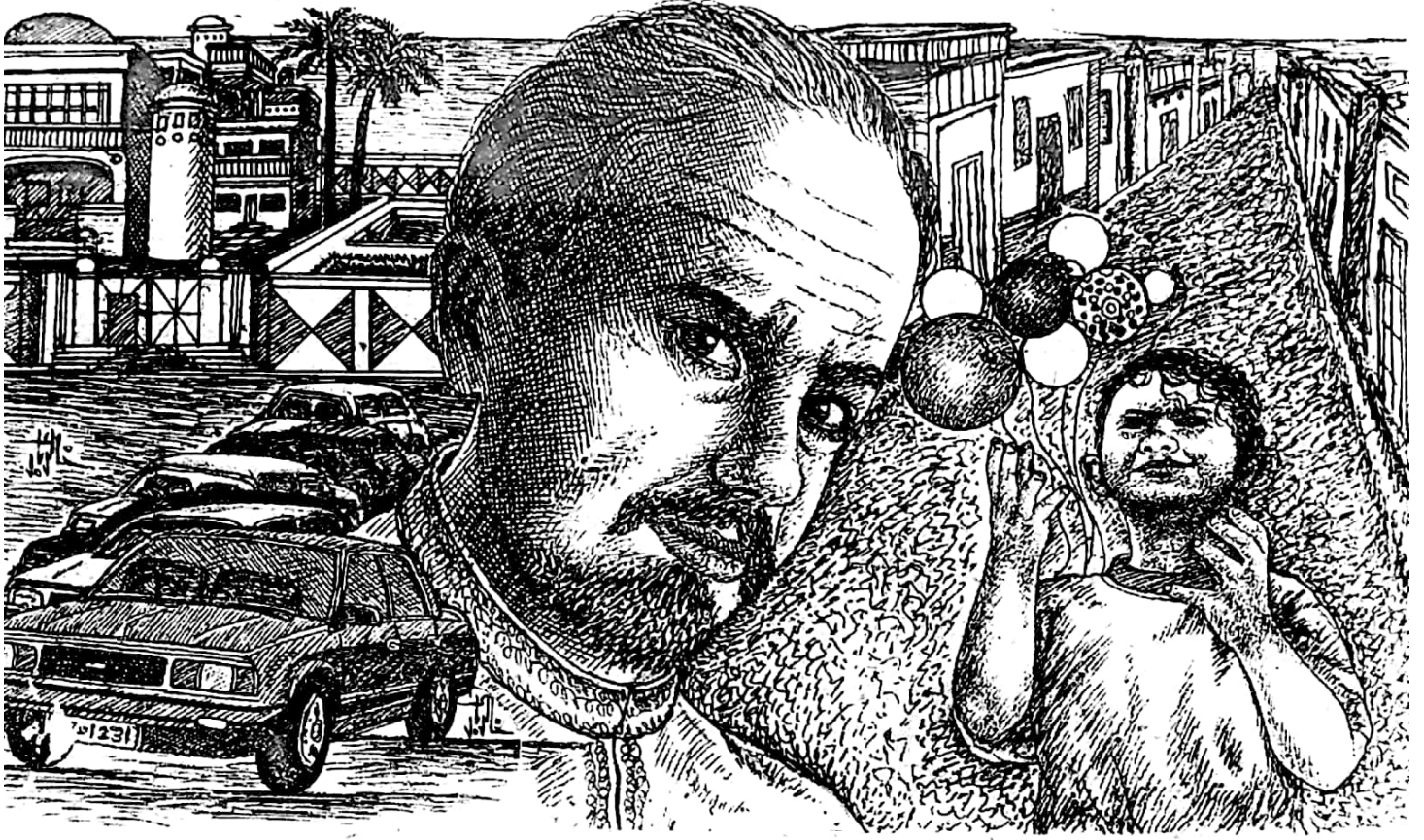
تماشا گاہ عالم

ناہید سلطانہ اختر

امیری اور غریبی کا کبھی کوئی جوڑ نہیں رہا... اس کے باوجود دونوں ندی کے کناروں کے مانند ساتھ ساتھ رہتے ہیں کیونکہ... یہ تو اللہ کا نظام ہے کہ امیروں کی آنکھوں کے سامنے غربت کی کتاب کھول کر رکھ دیتا ہے اور غریب کے سامنے امیروں کے سکون پر صبر کے دروازے کھول دیتا ہے... اور صبر کرنا کوئی آسان نہیں ہوتا جو صرف کمزور اور بے بس کے حصے میں آیا ہے۔

شیخ وارث نے شہر شاہاں کے مضافات میں پہاڑوں سے گھری اس کالونی میں دس کنال کا پلاٹ کوڑیوں کے دام خرید کر اس کے گرد چہار دیواری تعمیر کرا دی تھی۔ خریداری تو بس فارمیلٹی تھی، درحقیقت یہ پلاٹ شیخ صاحب کی بین السطور اعانت کی ممنونیت کے طور پر کالونی کے ان آبادکاروں کی جانب سے نہایت قلیل داموں کے عوض دیا جانے والا نذرانہ تھا جو وطن عزیز کے ایک معروف رئیل اسٹیٹ ٹائیکون کی حیرت انگیز ترقی سے متاثر ہو کر چیچہ

وطنی میں اپنا پراپرٹی آفس لپیٹ کر اسلام آباد آئے تھے اور شہر کے مضافات میں نئی بستیاں بسا کر اپنا اور اپنی اگلی نسلوں کا مستقبل درخشاں کرنے کی تمنا رکھتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے چیچہ وطنی سے اسلام آباد آنے سے قبل باقاعدہ ریکی کی تھی اور اس ریکی کے نتیجے میں دارالخلافہ میں بیٹھنے کے بجائے مضافات میں کاروبار جمانے کی حکمتِ عملی اپنائی تھی۔ ریکی کے دوران مضافات کے چھوٹے چھوٹے گاؤں دیہاتوں سے لے کر پہاڑوں، جنگلات اور برساتی نالوں تک میں انہیں اپنے درخشاں مستقبل کے مواقع نظر آئے تھے۔ دارالخلافہ کی حدود دن رات پھیل رہی تھی۔ دوسرے شہروں سے آنے والے سرکاری ملازمین اور ان کے اہلِ خانہ ایک بار یہاں آنے کے بعد یہاں سے واپس جانا نہ چاہتے تھے۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے والے ملازمین اور ان کے اہلِ خانہ بھی اسی شہرِ طلسم کی قربت میں رہنا چاہتے تھے۔ سیکٹرز میں نہ سہی، اسلام آباد کے آس پاس ہی سہی۔

چیچہ وطنی سے آنے والے پراپرٹی ڈیلر خانوادے نے دارالخلافہ کے ایک پوش سیکٹر میں جہاں پانی، بجلی، گیس، نکاسی آب اور زندگی کی دیگر سہولیات موجود تھیں، قیام کیا اور اپنا دفتر مضافات میں کھولا۔ اپنے کاروبار کا آغاز انہوں نے مضافات میں پہاڑوں سے گھری اور فطری حسن کی بانہوں میں جھولتی غریب دیہاتیوں کی ایک بستی سے کیا۔ بستی کے باسیوں سے کوڑیوں کے مول ان کی زمینیں خریدیں اور انہیں چلتا کیا۔ بستی کے بیشتر باسی جو نسل در نسل سنگلاخ پہاڑیوں کے بیچ رہنے اور صبح و شام ایک ہی طرح کے مناظر دیکھنے سے اکتائے ہوئے تھے، جیبوں میں پیسے ڈال کر آگے نکل گئے۔ زیادہ مزاحمت دکھانے والوں کے لیے تنومند غنڈے مشٹنڈے بھی تھے جنہیں غریبوں کو بندوق کی نال پر زیر کرنے کا خاصا تجربہ تھا۔ گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو ٹیڑھی کر لینا پڑتی ہیں۔ اوروں کی طرح مزاحمت کاروں نے بھی بالآخر گھٹنے ٹیک دیے۔ علاقہ خالی ہو جانے کے بعد نئے آبادکاروں نے زور و شور سے کام شروع کر دیا۔ ساتھ ہی اس علاقے میں نئے رہائشی منصوبے کی تشہیر بھی شروع ہو گئی۔ مین روڈ، چوراہوں اور شاہراہوں پر سائن بورڈز لگ گئے۔ پلاٹس کی نقشہ بندی کی گئی اور بکنگ شروع ہو گئی۔ اداروں کی جانب سے کسی مزاحمت اور رخنہ بندی سے بچنے کے لیے چیچہ وطنی سے آئے کاروباری گروپ نے چیچہ وطنی ہی سے تعلق رکھنے والی بااثر شخصیت شیخ وارث کی حمایت حاصل کر رکھی تھی جو عرصہ ہوا اسلام آبادی بن چکے تھے اور ایوانوں میں بیٹھے طاقتور اور بااثر افراد تک رسائی رکھتے تھے۔ کالونی میں دس کنال کا ایک قطعہ شیخ وارث کے لیے مختص کر دیا گیا جس کی قیمت برائے نام لی گئی اور وہ بھی شیخ صاحب کے اصرار پر۔ تشہیری مہم نے کام دکھایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام پلاٹ فروخت ہو گئے اور چیچہ وطنی گروپ نہال ہو گیا۔

چیچہ وطنی گروپ ہی کیا، دارالخلافہ کے مضافات میں مفاد پرست آبادکاروں نے نت نئے رہائشی منصوبوں کا بازار گرم کر دیا۔ آئے دن کوئی نیا منصوبہ...... ان منصوبوں کے آبادکار مضافات میں رہتے بستے غریب اور پسماندہ لوگوں سے کوڑیوں کے مول زمین خریدتے، ان کے خالی گھروں کو مسمار کراتے، زمین ہموار کرتے، پلاٹوں کی نقشہ بندی کرتے اور گھر بنانے کے آرزومندوں سے اپنی من مانی قیمت وصول کر کے اپنے بینک کھاتوں میں موجود رقم کہیں سے کہیں پہنچا دیتے۔ اپنا گھر بنانے اور سر چھپانے کے آرزومند قلیل الوسائل افراد ان رہائشی منصوبوں میں اپنے پلاٹ کی فائل لے کر یوں خوش ہوتے جیسے جنت میں داخلے کا پروانہ مل گیا ہو۔ یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ان نوآباد بستیوں میں ... گھر بنانے پر انہیں پانی، بجلی، گیس اور نکاسی آب جیسی بنیادی سہولتوں کے حصول میں کن کن مشکلات کا سامنا ہوگا۔ ان علاقوں کے سابقہ رہائشی تو نسل در نسل زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محرومی کے عادی تھے۔ نئے آنے والوں کو مشکلات کا عادی بننا پڑا۔

نئی بستیاں بسانے والے آبادکاروں کا اپنا اور اہل و عیال کا مستقبل تو روشن سے روشن تر ہوتا چلا گیا۔ ان کے آباد کردہ رہائشی منصوبوں کے باسی بنیادی سہولیات زندگی سے محرومی کے حصار میں الجھ کر گھن چکر بن گئے۔ بجلی کا میٹر تو لگ جاتا مگر دارالخلافہ کے برعکس ان نوآباد مضافاتی سوسائٹیوں میں بجلی دن رات آنکھ مچولی کھیلتی۔ پانی بھی تھوڑا یا بہت بورنگ کروا کے مل ہی جاتا اور اگر نہ بھی ملتا تو آس پڑوس سے لے کر گزارہ ہو جاتا۔ قیمتاً واٹر ٹینکر سے بھی پانی مل جاتا مگر نہ گیس کی فراہمی تھی نہ سیوریج کا کوئی مناسب نظام۔ اب تو وہ پہاڑوں کو مٹی کر کے اور برساتی نالوں کی بھرائی کر کے ان کے دام بھی کھرے کرنے لگے تھے۔ انہیں اس سے چنداں غرض نہ تھی کہ قدرت کے نظام توازن میں ان کی یہ غلط اندازی بڑے سانحوں کا سبب بھی بن سکتی تھی۔ برساتی نالوں کی بھرائی کر کے ان کا پاٹ کم کر دینے

سے سیلاب بھی آسکتا تھا۔

ان آبادکاروں کو اپنے مذموم رہائشی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں بااثر شخصیات کی پشت پناہی حاصل تھی۔ شیخ وارث بھی انہی میں سے ایک تھے۔ سیاسی آدمی تھے۔ زیرک اور موقع شناس بلکہ موقع پرست، جو پارٹی اقتدار میں ہوتی، اسی کا دم بھرتے۔ اعلیٰ ایوانوں تک رسائی تھی۔ چیچہ وطنی سے آئے آبادکاروں کا شیخ وارث سے تعارف ایک کاروباری شخصیت کے ذریعے ہوا۔ شیخ صاحب نے اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے انہیں ان کے رہائشی منصوبے کے لیے زمین کا قبضہ حاصل کرنے میں ان ''شرپسندوں'' کے خلاف ریاستی کمک فراہم کی جو اپنی آبائی زمین پر بنے آبائی گھروں کو کسی بھی قیمت پر چھوڑنے کے حق میں نہ تھے۔ شیخ وارث کی اس مہربانی کے شکرانے میں آبادکاروں نے برائے نام قیمت پر دس کنال کا پلاٹ نہایت عمدہ محلِ وقوع میں شیخ صاحب کی نذر کر دیا۔ مذکورہ قطعۂ زمین کالونی کے دیگر پلاٹس کی نسبت ذرا اونچائی پر واقع تھا۔ اردگرد منظر انتہائی دلکش تھا۔ تین سو ساٹھ ڈگری کے زاویے پر نظر جہاں تک گھومتی جاتی، پہاڑ تھے جو موسم بہار میں سبز لبادہ پہن لیتے اور خزاں میں سنگلاخ دکھائی دیتے۔ اس قطعۂ زمین کے غربی دامن میں برساتی نالا تھا جس میں بہتے پانی کی دھیمی دھیمی جلترنگ سماعت کو نہایت مدھر لگتی۔ کالونی کی داخلہ گاہ سے شیخ وارث کے پلاٹ تک مرکزی راستہ کسی الھڑ مٹیار کی طرح لہراتا، بل کھاتا چلتا۔

جن دنوں شیخ کا چیچہ وطنی والوں سے تعارف جڑا، شیخ وارث اقتدار میں بیٹھی جماعت کے ساتھ تھے۔ دو بیٹیوں اور دو بیٹوں کو بیاہ چکے تھے۔ سب سے چھوٹا بیٹا کنوارا تھا۔ شیخ صاحب اپنے بیٹوں اور پوتے پوتیوں کے ساتھ دارالخلافہ کے ایک پوش سیکٹر میں کرائے کے مکان میں رہ رہے تھے۔ آبائی علاقے میں ان کی ایک نہیں، دو حویلیاں تھیں۔ زرعی اراضی بھی تھی مگر وہاں ان کے بچوں میں سے کوئی بھی نہ رہنا چاہتا تھا۔ دونوں بیٹیاں شادی کے بعد بیرونِ ملک مقیم تھیں۔

شیخ وارث کا بڑا بیٹا انجینئر تھا اور ایک ملٹی نیشنل ادارے میں اچھی تنخواہ اور مراعات پر کام کر رہا تھا۔ منجھلے بیٹے کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا۔ سب سے چھوٹا غیر شادی شدہ بیٹا ایک این جی او چلا رہا تھا۔

شیخ وارث نے دس کنال کا پلاٹ مکان تعمیر کرنے کی غرض سے خریدا تو بیگم بولیں۔ ''ہمارے لیے تو دو کنال زمین ہی کافی تھی۔ اتنے بڑے پلاٹ کا کیا کرنا ہے۔''

''تم دیکھتی رہو۔''

''کیا دیکھتی رہوں؟ پچیس سال بعد تو آپ نے پہاڑی علاقے میں پلاٹ لیا ہے۔ مکان خدا جانے کب بنے گا۔''

''اپنی حکومت آنے کی دیر ہے، بن جائے گا۔''

''خدا جانے کس حکومت کی بات کرتے ہیں۔ آپ تو کبھی ایک پارٹی کے ساتھ ہوتے ہیں، کبھی دوسری کے ساتھ۔''

''تبدیلی ہوتی رہنی چاہیے۔''

''وفاداریاں بدلنے والا آدمی کہیں کا بھی نہیں رہتا۔''

چیچہ وطنی والوں کی کالونی میں تعمیرات کا آغاز ہو چکا تھا۔ پہلے ایک مکان تعمیر ہونا شروع ہوا پھر دوسرے کی بنیادیں کھودی جانے لگیں۔ پلاٹس ری سیل ہونے لگے۔

بنیادی سہولتوں کی عدم دستیابی کے باوجود محض ویو کے چکر میں خریدار پراپرٹی ڈیلر کی چرب زبانی میں آجاتے اور پلاٹ خرید لیتے۔ تعمیرات تیزی سے ہو رہی تھیں۔ یہاں آباد ہونے والے زیادہ تر لوگ متوسط اور نچلے متوسط طبقے کے وہ لوگ تھے جو دارالخلافہ میں رہنے کے عادی ہو چکے تھے۔ عادی نہ بھی ہوتے تھے تو اسلام آباد میں رہنا گویا ان کے لیے اسٹیٹس سمبل بن چکا تھا۔ اس اسٹیٹس کو گلے کا ہار بنائے رکھنے کو اب وہ دارالخلافہ نہ سہی، اس کے مضافات ہی میں رہنے کے خواہشمند تھے۔

شیخ وارث جو کہ ان دنوں ملک میں ایک آمر کی حکومت کے سبب خاصی فرصت سے تھے، گاہے بہ گاہے اپنی شاندار گاڑی میں کبھی اکیلے اور کبھی بیگم اور بچوں کے ساتھ اپنا پلاٹ دیکھنے کو آجاتے۔ اس پلاٹ کے گرد چہار دیواری کھڑی کرا کے انہوں نے ایک غریب آدمی کو جو اس علاقے میں مزدوری کرتا تھا، پلاٹ کے ایک کونے میں چھپر ڈال کر مع بیوی بچوں کے عارضی طور پر رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ علاقے میں ان کی غریب پروری کا چرچا بھی ہوا اور پلاٹ کی مفت چوکیداری بھی ہونے لگی۔ غریب آدمی کے بچے دن بھر اس پلاٹ کے طول و عرض میں بھاگتے دوڑتے پھرتے اور اس کی بیوی احاطے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کیاریاں بنا کر ان میں سبزیاں کاشت کرتی۔ شیخ وارث کی بیگم اس غریب کنبے کی کچھ نہ کچھ مدد کرتی رہتیں۔

☆☆☆

خدا خدا کر کے ملک سے آمریت کے خاتمے اور جمہوری دور کے آغاز کی راہ ہموار ہونے کی نوید ہوئی۔ شیخ

وارث کو اسمبلی میں جانے سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ستّر سے اوپر ہو چکے تھے۔ بلڈ پریشر اور ذیابیطس جیسے عارضے جان کو لگے تھے۔ قویٰ پہلے کی طرح نہ رہے تھے تاہم اثر رسوخ کے حامل اب بھی رہنا چاہتے تھے۔ ہواؤں کا رخ بھانپ کر آنے والے انتخابات کے لیے ایک پارٹی کے ہمنوا بنے۔ ان کی ولولہ انگیز تقریر کے بعد جلسہ گاہ پارٹی کے حق میں فلک شگاف نعروں سے گونجنے لگتی مگر اقتدار کے ہما کی اپنی مرضی...... جس کے سر پر چاہے جا بیٹھے۔ شیخ وارث جس پارٹی کے ساتھ تھے، وہ حزبِ اختلاف بن گئی اور مخالف پارٹی اقتدار میں آگئی۔

حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف میں ''من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو'' کی میثاق پر اتفاق ہوا۔ دونوں نے ''ملک وقوم'' کی بہتری کے لیے باہم مل جل کر کام کرنے کا عہد باندھا اور حزبِ اختلاف کے بہت سے گرگ باراں دیدہ کی طرح شیخ وارث کو بھی بہتی گنگا میں اشنان کرنے کا موقع مل گیا۔ سیاست بھی عجب کھیل ہے۔ بظاہر ایک دوسرے کے حریف مگر اندر سے ایک۔ شیخ وارث نے بھی کسی کے زور پر کوئی پرمٹ لیا۔ کسی کی سفارش سے بینک سے قرضہ لیا۔ کسی کے ذریعے کسی کا رکا ہوا کام نکلوانے کی قیمت لی۔ کسی کی پھنسی گوٹ کو ''کوئین'' کی مار سے اندر کیا۔ پلاٹ کی قیمت خاصی بڑھ چکی تھی۔ اسے فروخت کر کے دارالخلافہ میں مکان خریدنے کا ارادہ کیا تاکہ ہر ماہ خطیر رقم کرایہ مکان کی علت سے جان چھوٹے۔ شیخ وارث نے ایک بڑے بلڈر اور ڈیولپر کو اس سلسلے میں...... مشورے کی خاطر اپنا پلاٹ دکھانے کو مدعو کیا۔ پیشہ ورانہ مہارت اور دوراندیشی کے باعث وہ اس پلاٹ کو زیادہ سے زیادہ منافع بخش بنانے کے لیے اور اچھا مشورہ دے سکتے تھے۔ وہ آئے تو سوسائٹی کا دلفریب محل وقوع دیکھ کر پھڑک اٹھے۔ شیخ وارث کا پلاٹ دیکھا تو اور خوش ہوئے۔ ''کیا زبردست ویو ہے صاحب! کیوں فروخت کرنا چاہتے ہیں آپ ایسی اچھی جگہ کو؟''

''اسلام آباد میں مکان خریدنا چاہتا ہوں۔'' شیخ وارث نے کہا۔

''ارے صاحب! یہاں بنائیں مکان۔ اسلام آباد میں تو آپ کو اتنا بڑا پلاٹ اربوں میں بھی نہ ملے گا...... اور یہ ویو...... یہ تو آپ کو وہاں پوش سے پوش ایریا میں بھی دیکھنے کو نہ ملے۔ کیسا حسین منظر ہے۔ کب لیا آپ نے یہ پلاٹ؟ کب آباد ہوئی یہ کالونی؟ میرا کام پنڈی کی طرف ہے۔ مجھے پتا چلتا تو میں بھی پانچ سات کنال کا پلاٹ لے کر ڈال دیتا۔ بڑے گھر میں رہنے کی بات ہی اور ہوتی ہے صاحب۔ جتنے پیسوں میں آپ کا اس پلاٹ پر محل نما گھر بن جائے گا، اتنے پیسوں میں تو آپ اسلام آباد کے کسی وی آئی پی سیکٹر میں دو کنال کی کوٹھی بھی نہ خرید سکیں شاید۔'' مشورہ دینے کے لیے آنے والا بلڈر اینڈ ڈیولپر شناسا چہار اطراف منظر کو دیکھتے ہوئے جذب کے عالم میں بولے چلا گیا۔

''یہ ہمارے رہنے کی جگہ نہیں ہے جناب...... ہمارے تو سارے کام اسلام آباد ہی میں ہوتے ہیں۔''

''میں نے نوٹ کیا ہے۔ اٹھارہ بیس منٹ لگے ہیں مجھے اسلام آباد سے یہاں تک پہنچنے میں۔ آپ کو بھلا کیا مشکل۔ آپ کا ڈرائیور گاڑی دبائے گا اور پندرہ بیس منٹ میں آپ اسلام آباد پہنچے ہوں گے۔ ارے صاحب! بہت آئیڈیل جگہ ہے...... آپ جیسوں کے رہنے کی جگہ...... ہر سو پہاڑ، ہریالی، نیچے بہتے پانی کا دھیما دھیما شور۔ آپ یہاں انیکسیز بنائیں، پارٹیز کریں، فنکشنز کریں، بڑا سا لان بنائیں، پھول پھلواری لگائیں اور صبح و شام اپنے گھر کے اندر ہی لمبی واک کریں۔''

''اس علاقے میں نئی نئی آبادیاں ہو رہی ہیں۔ بہت سے ڈیولپرز یہاں کام کر رہے ہیں۔ اکثر ڈائنامیٹ سے پہاڑوں کو اڑانے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ پہاڑ دھماکوں سے اڑا کر ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔ نالوں کی بھرائی کر کے ان پر بھی ہاؤسنگ پراجیکٹس کا آغاز ہو چکا ہے پھر نہ یہ پہاڑ رہیں گے نہ ہریالی، نہ بہتے پانی کا دھیما دھیما شور نہ یہ منظر۔'' شیخ وارث نے کہا۔

''شیخ صاحب محترم! جب ہوگا، تب دیکھا جائے گا۔ کتنی ہی تبدیلی آجائے، آپ کے پلاٹ کا محلِ وقوع یہی رہے گا۔ بلندی پر اور الگ تھلگ۔''

''بات یہ ہے جناب کہ میرے بچے اسلام آباد میں رہنے کے عادی ہیں۔ انہیں اسلام آباد اتنا پسند ہے کہ گاؤں میں میری دو حویلیوں کو ذرا لفٹ نہیں کراتے۔ میں چاہتا ہوں اس جگہ کو فروخت کروں اور اسلام آباد میں گھر خرید لوں۔'' شیخ وارث کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

''صاحب! میری مانیں تو اس پلاٹ پر اپنا شاندار سا گھر بنائیں۔ ویسے بھی آج کل بڑے لوگوں میں بڑے گھر بنانے کا ٹرینڈ چل رہا ہے۔'' مشورہ دینے کے لیے آنے والے نے اگلی ہی سانس میں چند ایسی سیاسی اور شوبز شخصیات کے نام گنوا ڈالے جنہوں نے بڑے شہروں کے

نواحی علاقوں میں محل نما مکانات تعمیر کرارکھے تھے اور کنٹری سائڈ لائف کا مزہ لے رہے تھے۔ ''شیخ صاحب! برادرانہ مشورہ دے رہا ہوں...... دیہی علاقہ ہے...... پراپرٹی ٹیکس کا مسئلہ بھی نہیں۔''

''مسئلہ یہ ہے کہ یہاں جو کمیونٹی آباد ہو رہی ہے، وہ ہمارے اسٹیٹس سے میل نہیں کھاتی۔ کوئی کلرک، کوئی ٹیچر، کوئی دودھ فروش، کوئی دکاندار، کوئی کیبل کا کام کرتا ہے، کوئی گائے بھینسوں کے ساتھ لاٹھی ٹیکتا پھرتا ہے۔''

مشیر دھیرے سے ہنسا اور اس کی آنکھوں میں معنی خیز چمک ابھری۔ ''پھر تو موجاں ہی موجاں شیخ صاحب! بنی بنائی رعیت ملے گی آپ کو۔ اس علاقے میں رہنے والوں پر آپ کا دھاکا ہوگا۔ آپ یہاں مائی باپ بن کر رہیں گے۔ یہاں آپ کو ملازم اور خدمت گار بھی آسانی سے مل جائیں گے۔ اسلام آباد کی تو بات ہی چھوڑیے، پنڈی میں بھی اب گھریلو ملازموں کے اتنے نخرے ہوگئے ہیں کہ ہماری بیگم نے چند دن پہلے کام والی کو اپنا پرانا سوٹ دیا تو کہنے لگی یہ پرانے فیشن کا ہے جی۔ آج کل تو کیپری یا فلیپر کا فیشن ہے۔''

شیخ وارث بے ساختہ مسکرا دیے پھر گویا ہوئے۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اب میری سنیے۔ میں ایک روز یہاں آیا تو میرے چوکیدار کی بیوی کے ساتھ ایک خوش پوش خاتون بیٹھی تھی۔ میں نے سوچا ہوسکتا ہے آس پاس کسی گھر سے خاتون چوکیدار کی بیوی کو کچھ دینے آئی ہو مگر اس کے اٹھ کر جانے کے بعد چوکیدار کی بیوی نے میرے پوچھے بغیر خود ہی بتایا کہ وہ......'' شیخ وارث نے دور ایک مکان کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''جو کھپریل کی چھت والا مکان آپ دیکھ رہے ہیں، وہ اس گھر کی ملازمہ تھی۔''

''بس شیخ صاحب! آپ اس پلاٹ کو بیچنے کا نہ سوچیں۔ اس پر اپنا محل تعمیر کیجیے۔''

''محل تعمیر کرنے کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے گا جناب؟'' شیخ وارث نے کہا۔

''یہ بات آپ کہہ رہے ہیں؟ آپ کے بارے میں تو مشہور ہے کہ حزبِ اقتدار ہو یا حزبِ اختلاف، دونوں ہی کے لیے یکساں محترم ہیں۔''

''حسنِ ظن ہے لوگوں کا جو ایسا سوچتے ہیں۔'' شیخ وارث نے انکساری سے کہا۔

''بندہ بھی انہی میں سے ہے۔'' شیخ وارث کو مشورہ دینے کے لیے آنے والا بولا۔

''خوش رہیں۔''

جاتے جاتے مذکورہ شخص نے ایک وفاقی وزارت میں پھنسی ایک فائل کو واگزار کرانے کی عرض گزاری۔

''آپ فکر نہ کریں۔ وزیر موصوف سے میری اچھی یاد اللہ ہے۔''

''شکریہ...... نوازش...... مہربانی۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر رطب اللسان ہوا۔

''آپ نے یہ پلاٹ تو دیکھ ہی لیا ہے۔ کسی آرکیٹیکٹ سے اچھا سا نقشہ تو بنوا کر دیں۔''

''ان شاء اللہ، بہت جلد۔''

☆☆☆

ہفتہ بھر میں نقشہ بن کر آ گیا اور خود شیخ وارث اور ان کے اہلِ خانہ کی جانب سے بہت سی ترمیمات کے بعد بالآخر فائنل بھی ہوگیا۔ دو منزلہ مرکزی عمارت، تین ون یونٹ انیکسیز۔ مرکزی عمارت خود شیخ وارث اور ان کی بیگم کے لیے تھی۔ ون یونٹ انیکسیز تینوں بیٹوں کے لیے۔ اس کے علاوہ اہلِ خانہ اور مہمانوں کی گاڑیوں کے لیے وسیع پارکنگ لاٹ...... وسیع و عریض لان...... اور بہت کچھ۔

تعمیراتی کام شروع ہونے سے قبل ایک کل وقتی فورمین کام کی نگرانی کے لیے سائٹ پر ملازم رکھ لیا گیا۔ فورمین کی تجویز پر غریب چوکیدار اور اس کے بال بچوں کو بے دخل نہ کیا گیا۔ فورمین چوبیس گھنٹے تو نگرانی نہ کرسکتا تھا۔ چوکیدار کی ضرورت بہرحال تھی۔ فورمین نے کہا اس آدمی سے مزدوری بھی کرالیں گے اور چوکیداری بھی بلکہ وہ کیا، اس کے تو بال بچے بھی چوکیداری کریں گے۔

کنسٹرکشن شروع ہوگئی۔

پروجیکٹ بڑا اور خطیر اخراجات کا حامل تھا۔ گھر کی چھت پڑتے ہی شیخ وارث کی جیب جواب دے گئی۔ کام روک دیا گیا۔ فورمین کی زبانی آس پڑوس کے مکینوں کو سن گن ملی کہ شیخ صاحب اس ادھوری تعمیر کو فروخت کرنے کا سوچ رہے تھے۔

کافی عرصہ کام بند پڑا رہا۔ فورمین کی چھٹی ہوئی اور غریب چوکیدار بال بچوں سمیت نامکمل عمارت کے ایک کمرے میں منتقل ہوگیا۔ کام بند ہوجانے پر اس نے پھر اِدھر اُدھر مزدوری شروع کردی تھی۔

حکومت بدلی تو شیخ صاحب کو بھی ایک اعزازی عہدہ مل گیا۔ فورمین واپس آ گیا اور رکا ہوا کام دوبارہ شروع ہوگیا اور اس بار نہایت تیزی سے۔ دن رات بھاری بھاری عمارتی سامان لانے والے ٹرکوں اور ٹرالروں نے

علاقے کے مکینوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ تعمیراتی کام کرنے والے ہنرمندوں کا بے ہنگم شور اور موبائل پر بلند آہنگی سے گانے سننا علاقے کی مسحور کن خاموشی کا سینہ چیرے جاتا۔ شیخ صاحب لشکارے مارتی بیش قیمت گاڑی میں بلاناغہ کبھی اکیلے، کبھی بیگم اور دیگر اہلِ خانہ کے ہمراہ پلاٹ پر ہونے والے کام کا جائزہ لینے آتے۔ پلاٹ کی جائے وقوع ایسی تھی کہ کام کرتے افراد میں سے کسی نہ کسی کی نظر دور سے آتی شیخ وارث کی گاڑی پر پڑ جاتی اور وہ ''صاب آ رہا ہے'' کا نعرہ لگا کر سب کو الرٹ کر دیتا۔ آن واحد میں مزدوروں اور مستریوں کی بے ہنگم آوازیں اور موبائل پر بجتے گانے سناٹے میں آجاتے۔ گاہے بہ گاہے ایک ماہر تعمیرات بھی کبھی اکیلا اور کبھی شیخ کی گاڑی کے پیچھے پیچھے اپنی گاڑی چلاتا سائٹ پر آتا۔ وہ کام کا جائزہ لیتا۔ شیخ وارث ساتھ ہوتے۔ فورمین ہاتھ باندھے مؤدب سا ان کے پیچھے پیچھے چلتا۔ بلڈر اور شیخ وارث کبھی چلتے چلتے کبھی تھم کر فورمین کو ضروری ہدایات دیتے اور وہ اپنا سر سہلاتے ہوئے ''جی سر'' کی گردان کیے جاتا۔

وہی نامکمل مکان جس کے بارے میں فورمین کی زبانی آس پاس کے مکینوں کو یہ خبر ملی تھی کہ شیخ صاحب پیسے ختم ہوجانے کی وجہ سے اسے نامکمل حالت میں فروخت کرنا چاہ رہے تھے، اس قدر سرعت اور جوش وخروش سے تکمیل پذیر ہو رہا تھا جیسے روئے ارض پر کوئی اہم ترین کام اگر تھا تو شیخ وارث کے گھر کی تکمیل۔ ٹرک اور ٹرالرز لدے پھندے آتے اور سامان اتار کر چلے جاتے۔ علاقے کے اوسط درجہ مکین حیران ہو کر دیکھتے کہ گھر تعمیر ہو رہا تھا یا کوئی سلطنت آراستہ کی جا رہی تھی۔ ٹوہ میں رہنے والے اکثر مرد و زن ایسے وقت میں جب شیخ صاحب کے آنے کا امکان نہ ہوتا، ان کے تکمیل پذیر محل میں جا گھستے۔ عورتیں مرکزی اور دیگر عمارتوں کا تفصیلی دورہ کرتیں۔ ایک ایک چیز کو نہایت اشتیاق اور حیرت سے دیکھتیں۔ باتھ روم میں ٹائلز لگاتے ٹائل فکسر سے تجسس سے پوچھتیں۔ ''ٹائلز کہاں سے لیے؟ بہت خوبصورت ہیں۔''

ٹائل فکسر نہایت رعونت سے جواب دیتا۔ ''امپورٹڈ ہیں۔ اسپین سے منگوائے ہیں مالک نے۔''

گھر کی مرکزی اور دیگر عمارتوں کی گنبدی چھتوں پر گیروی رنگ کے کھپریلی ٹائلز لگانے والے مستری ان ڈھلواں چھتوں پر بریک ڈانسرز کے سے انداز میں ایک ایک قدم دیکھ بھال کر رکھتے اور جھکے لیتے ہوئے اترتے چڑھتے اور صبح سے شام تک بڑی چوکسی سے اکڑوں بیٹھے اپنا کام کرتے اور گھر کے آس پاس سے گزرتی نوجوان کام والیوں کو دیکھ کر ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کو خوامخواہ ہی اونچی آواز میں نیچے کام کرتے ساتھیوں کو پکارنے لگتے یا بے سُری آواز میں گانا گانے لگتے۔

گھر کے اندر تعمیرات کا کام مکمل ہوتے ہی راج، مستری سدھارے اور ترکھانوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ مالیوں نے لان پر گھاس لگانے کے لیے زمین کی تیاری کے ساتھ ساتھ احاطے کی دیواروں کے دامن میں موسمی اور پکے پودے لگانے کے لیے کیاریاں گھڑنی شروع کر دیں اور ٹائلز لگانے والے مستریوں نے احاطے میں بھاری، مضبوط اور دیرپا ٹائلز سے روشیں بنانے کا کام شروع کیا۔ گھر کی اندرونی تزئین و آرائش میں تجسس اور اشتیاق رکھنے والے محلے دار موقع تاک کر جب بھی اندر آتے، لکڑی کے خوشنما اور پھسلواں فرش اور چھتوں کی دیدہ زیب کندہ کاری میں ترکھانوں کی صناعی دیکھ کر مبہوت رہ جاتے۔ ماہر ترکھانوں نے اپنی ہنرمندی سے بے زبان لکڑی کو گویائی دے دی تھی۔ نوع بنوع برقی آلات سے مزین وسیع و عریض کچن کسی بڑے ہوٹل کے کچن سے کم نہ تھا جہاں دیسی بدیسی ہر طرح کے کھانے پکانے کی سہولت کا سامان کیا گیا تھا۔

شیخ وارث کے گھر کے احاطے کی تین دیواریں ایسی تھیں جن کے عقبی رخ پر نہ کوئی تعمیر تھی نہ ہی ہونے کا امکان تھا۔ البتہ ایک دیوار سے متصل چند چھوٹے چھوٹے گھر تھے جن کے مکین اپنے گھروں کی چھتوں سے شیخ وارث کے گھر میں تھوڑی بہت تاک جھانک کر سکتے تھے۔ ویسے تو شیخ صاحب کا پروگرام تھا کہ اس تاک جھانک سے محفوظ رہنے کے لیے اس دیوار پر کچھ نہ کچھ بندوبست کرادیں گے مگر دوسرے کام مکمل ہونے تک یہ پروگرام مؤخر تھا۔ ویسے بھی ملحقہ گھروں سے تاک جھانک کے سوا کسی اور گڑبڑ کا اندیشہ نہ تھا۔

انہی گھروں میں سے ایک پانچ مرلہ گھر میں رہنے والی ایک بڑی بی ایک روز اپنے کمسن پوتے کی انگلی پکڑے شیخ وارث کا گھر اندر سے دیکھنے کو آئیں تو اپنے گھر واپس جا کر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولیں۔ ''اللہ معافی! میں تو اس گھر میں جا کر رستہ ہی بھول گئی۔ ادھر جاؤں تو دروازہ ملے...... ادھر جاؤں تو چوبارہ...... سیڑھی اتری تو تہ خانہ...... اوپر چڑھی تو یہی سوچتی رہی کدھر جاؤں...... توبہ توبہ، گھر ہے کہ بھول بھلیاں۔''

''بڑے لوگوں کے گھر ایسے ہی ہوتے ہیں اماں!''
بہو نے کہا۔

''نہ بہو! ایسے گھروں سے جہاں آدمی رستہ ہی بھول جائے، اپنے ہی گھر اچھے۔ آدمی رستہ تو نہیں بھولتا۔''

''سچ کہتی ہو اماں! مجھے تو بڑے گھروں سے ویسے ہی ڈر لگتا ہے۔'' بہو نے تائید کی۔

جبکہ سچ یہ تھا کہ بہو جب بھی اپنے گھر کی چھت سے شیخ وارث کے زیر تکمیل گھر کو دیکھتی، اس کے دل میں ہوکیں اٹھنے لگتیں۔

مالیوں نے شیخ وارث کے گھر کے سرسبز لان کے وسط میں خوش رنگ موسمی پھولدار پودوں سے ایک تھال سا بچھا دیا اور لان کے چہار اطراف کناروں پر فلاکس کے ننھے منے رنگ برنگے پھول اپنی چھب دکھانے لگے۔

''بہو! ذرا گھاس تو دیکھ، کیسی ہری بھری ہے۔'' ساس نے جو بہو کے ساتھ اپنے گھر کی چھت پر کھڑی شیخ وارث کے گھر میں جھانک رہی تھی، رشک سے کہا۔

''اماں! یہ مصنوعی گھاس ہے۔''

''لے...... گھاس بھی کبھی مصنوعی ہوتی ہے؟''

''ہاں ہاں...... برابر والی بتا رہی تھیں تیار مصنوعی گھاس کی پٹیاں ملتی ہیں، وہ بچھا دیتے ہیں...... سارا سال ہری رہتی ہے، کبھی مرجھاتی نہیں۔''

''ہا!'' ساس نے حیرت سے کھلے منہ پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

پھر گھر کی اندرونی اور بیرونی سجاوٹ کے لیے چھوٹے، درمیانے، بڑے اور جہازی گملوں میں تیار پودے آنا شروع ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے صحنِ مکاں گل و گلزار ہوگیا۔

پھر درونِ خانہ آرائش کرنے والوں کی ٹیم آئی۔ چھوٹے ٹرکوں اور ٹرالروں میں دیدہ زیب فرنیچر اور آرائشی اسباب پہنچنا شروع ہوا۔ گھر کے صدر دروازے پر بندوق بردار سیکیورٹی گارڈز آ بیٹھے جو کسی غیر متعلق بندے کو گھر کے اندر آنے کی اجازت نہ دیتے۔ تاہم اس وقت تک علاقے کے لوگوں کو یہ معلومات حاصل ہو چکی تھیں کہ اس گھر کے صاحب حیثیت مالک نے اپنے شاندار گھر کو بجلی کی بنا شرکت فراہمی کے لیے ذاتی ٹرانسفارمر گھر کے عقبی حصے میں نصب کرالیا تھا اور بجلی کی فراہمی منقطع ہونے کی صورت میں اپنے گھر کو روشن اور ٹھنڈا رکھنے کے لیے دیوہیکل جنریٹر بھی لگوالیا تھا۔ فورمین کے بقول پانی کی ذخیرہ بندی کے لیے تیس ہزار گیلن پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش کا حامل زمین دوز واٹر ٹینک بنوایا گیا تھا مگر عجیب بات یہ تھی کہ گھر کے احاطے میں چھ سات مختلف مقامات پر بورنگ کروانے کے باوجود پانی کہیں بھی نہ نکلا تھا حالانکہ آس پاس تمام گھروں میں بورنگ کا پانی وافر موجود تھا۔ گھر کی تعمیر و تکمیل کے لیے روزانہ پانی کا ٹینکر منگوا کر پانی زیر زمین ٹینک میں ذخیرہ کروایا جاتا رہا تھا۔

جوں جوں شیخ کا شاندار گھر مکمل ہوتا جا رہا تھا، علاقے کے لوگوں بالخصوص شیخ وارث کے پڑوس میں بسنے

تعارف

جونیئر کلرک نے باس کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا اور اپنی جوان اور حسین بیوی سے متعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''سر! اس سے ملیے۔ یہ ہے میری بیوی۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' باس نے خوش خلقی سے کہا پھر جونیئر کلرک کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''میں چاہتا ہوں اب تم بھی میری بیگم سے مل لو۔ وہ پندرہ منٹ بعد والی ٹرین سے اسٹیشن پہنچنے والی ہے۔ اس کے ساتھ پانچ ٹن سامان ہوگا۔ تم اسے ریسیو کر کے گھر پہنچا کر آ جاؤ۔''

(مرسلہ: حمیرا اقبال، کراچی)

تصحیح

بحری جہاز پوری رفتار سے چلا جا رہا تھا جب ایک نئے ملاح نے شور مچا دیا کہ ایک آدمی عرشے سے سمندر میں گر گیا ہے۔ چند منٹ میں اطلاع کیپٹن تک پہنچی اور اس نے جہاز کا رخ موڑنے کے احکامات دیے۔ جہاز کئی میل پیچھے آ چکا اور کیپٹن عرشے پر پہنچا تو ملاح ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''سر! مجھ سے غلطی ہوئی۔ دراصل کوئی آدمی سمندر میں نہیں گرا ہے۔''

کیپٹن اس پر خوب گرجا برسا، اسے بُرا بھلا کہا اور ایک بار پھر جہاز کا رخ موڑا گیا۔ جہاز تیز رفتاری سے دوبارہ اپنی اصل سمت میں روانہ ہوا تو ملاح نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''سر! میں یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ سمندر میں کوئی آدمی نہیں بلکہ ایک نرس گری ہے۔''

(مرسلہ: نازیہ خان، پشاور)

والے لوگوں کی دلچسپی اور تجسس بڑھتا جارہا تھا۔
پھر ایک روز شیخ وارث کے گھر میں آگے پیچھے تین چار چمکتی دمکتی گاڑیاں آکر رکیں اور ایک شہ زور جس میں پانچ سات سیاہ بکرے سوار تھے، گھر کے احاطے میں آکر ٹھہرا۔ گاڑیوں سے شیخ وارث، ان کی بیگم اور دیگر اہل خانہ جو گھر کی تعمیر و تکمیل کے دوران گاہے بہ گاہے آتے دیکھے گئے تھے، اترے۔ گاڑیوں کے ڈرائیورز سواریاں اتار کر گاڑیاں وسیع و عریض شاندار پورٹیکو میں لے گئے۔ شہ زور سے بکروں کو اتارا گیا اور ملازمین انہیں گھر کی مرکزی عمارت کی دہلیز تک لے گئے۔ قصائی چھری بغدے لیے سوزوکی سے برآمد ہوئے اور آس پاس گھروں کی چھتوں پر کھڑے اور منڈیروں پر جھکے ہمسائے سمجھ گئے کہ شیخ وارث اور ان کے اہل خانہ اپنے نئے گھر میں رہائش اختیار کرنے سے قبل بکرے صدقہ کررہے تھے۔
پھر علاقے کے لوگوں کو شیخ وارث کے گھر اور اہل خانہ کے بارے میں خبریں فراہم کرنے والا فورمین بھی اپنا بیگ اٹھا کر رخصت ہوا اور شیخ وارث مع اہل خانہ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہوگئے۔

☆☆☆

بڑے لوگوں کی روایت کے مطابق شیخ وارث کے نئے گھر کی ''ہاؤس وارمنگ'' تقریب بھی ہوئی۔ اس تقریب میں بڑے بڑے لوگ مدعو تھے۔ دن میں کالونی کی مسجد سے اعلان کیا گیا کہ کالونی کی مرکزی داخلہ گاہ سے شیخ وارث کے گھر کے راستے میں واقع مکانوں کے مکین اپنے اپنے اسکوٹرز، موٹر سائیکلیں اور گاڑیاں گھروں کے اندر یا کسی دوسری گلی میں کھڑی کریں تاکہ شیخ وارث کے گھر آنے والے مہمانوں کو اپنی گاڑیاں کھڑی کرنے میں دشواری نہ ہو۔ اس اعلان پر علاقے کے بعض لوگ بہت بھنائے کہ یہ کہاں کا انصاف تھا کہ شیخ وارث کے مہمانوں کی گاڑیوں کے لیے پارکنگ کی جگہ بنانے کو علاقے کے مکین اپنی گاڑیاں گھروں کے اندر کرلیں یا عارضی طور پر کسی اور گلی میں کھڑی کردیں۔
''آج ہمیں گاڑیاں ہٹانے کو کہا جارہا ہے، کل کچھ اور حکم دیا جائے گا۔''
اہل محلہ میں سے بعض سمجھ دار اور مفاہمت پسند لوگوں نے احتجاج کرنے والوں کو سمجھایا بجھایا کہ شام کو شیخ کے ہاں تقریب ہے۔ آج تو گاڑیاں گلی سے ہٹالی جائیں۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔
شیخ وارث کے گھر کے راستے میں مقیم ایک ملازمت پیشہ خاتون نے ان مفاہمت پسندوں کی ایک نہ سنی اور اپنے گھر کے باہر کھڑی گاڑی کو کسی صورت ہٹانے اور گھر کے اندر یا کسی دوسری گلی میں کھڑی کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔
''میری گاڑی ہے...... میرا گھر ہے۔ میری مرضی، اپنے گھر کے گیٹ کے باہر کھڑی کروں یا اندر۔ مسجد کا مولوی کون ہوتا ہے یہ اعلان کرنے والا کہ گاڑیاں گھر کے اندر یا کسی دوسری گلی میں کھڑی کریں۔'' اس خاتون کے سامنے مفاہمت پسندوں کی ایک نہ چلی۔
دوپہر کو کیٹرنگ والوں کی گاڑیاں آنا شروع ہوئیں۔ سہ پہر کو پولیس کی حفاظتی گاڑیاں پہنچنا شروع ہوگئیں اور کالونی کی مرکزی داخلہ گاہ سے شیخ وارث کے گھر تک باوردی پولیس والوں کا پہرا لگ گیا۔ ایک ایمبولینس بھی آکر کھڑی ہوگئی۔ باوردی پولیس والوں کے ساتھ سادہ کپڑوں میں ملبوس افراد بھی موجود تھے۔ کالونی کی داخلہ گاہ سے شیخ وارث کی رہائش گاہ تک راہنمائی کے لیے جابجا اشارے لگائے گئے تھے۔ کالونی کے مکین اپنے گھروں کی چھتوں سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔
شام ہوئی تو شیخ وارث کے گھر میں سازینہ بجنے کی آواز آنے لگی اور فضا میں اشتہا انگیز خوشبوئیں حلول کرنے لگیں۔ شیخ کے گھر کی مرکزی عمارت کے وسیع ٹیرس پر انگیٹھیاں لودینے لگیں اور دھوئیں کے مرغولے فضا میں رقص کرنے لگے۔
جھٹپٹا ہوتے ہی شیخ وارث کا گھر بقعۂ نور بن گیا اور آس پاس گھروں کی چھتوں اور منڈیروں سے نظارہ بازی کرتے لوگوں کے لیے منظر دن سے بھی زیادہ واضح ہوگیا۔ ٹیرس سے متصل طعام گاہ میں کھانے کی میزیں آراستہ تھیں۔
رات ہوئی تو شیخ وارث کے مہمان آنا شروع ہوئے۔ آگے پیچھے نئے ماڈلز کی لشکارے مارتی بیش قیمت گاڑیاں شیخ کے گھر تک پہنچتیں اور ڈرائیور سواریاں اتار کر گاڑی کو مناسب جگہ پر کھڑی کرنے کے لیے موڑ لیتے۔ رنگ برنگے جدید اور نیم عریاں پیراہنوں والی بنی سنوری عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ گاڑیوں سے اترتی چلی جارہی تھیں۔ ہر عورت حسین تھی یا شاید بناؤ سنگھار نے ان میں سے کسی کو بھی معمولی نہ رہنے دیا تھا۔ ان کے چہرے اور عریاں بازو ان کی گاڑیوں سے بڑھ کر چمک دمک رہے تھے۔ مرد اپنی ٹکٹائیوں کو نہایت نزاکت سے چھوتے، گردن اکڑائے، نہایت کروفر سے قدم اٹھاتے اور خواتین

اپنی اونچی ایڑیوں والے سینڈلز پر مورنی کی سی چال چلتی گھر کی مرکزی داخلہ گاہ پر آراستہ استقبالیہ تک پہنچتیں جہاں میزبان اپنے مہمانوں کی پذیرائی کو موجود تھے۔

کالونی والے دنوں انگشت بدنداں رہے۔

شیخ وارث کے محل نما گھر کا صدر دروازہ جو اس شب رات گئے تک کھلتا اور بند ہوتا رہا تھا، اس تقریب کے بعد پھر پہلے کی طرح دور سے بندوق کی گولی کی سی تیز رفتاری سے آتی اور اپنی آمد کا اعلان کرتے ہارن کی آواز پر پھر میکانکی انداز میں کھلنے اور بند ہونے کی ڈیوٹی کا پابند ہو گیا۔ صدر دروازے پر تعینات بندوق بردار سیکیورٹی گارڈز باری باری اپنی ڈیوٹی سنبھالتے اور ڈیوٹی کا وقت ختم ہونے پر وردی اتار کر سادہ کپڑوں میں گھر چلے جاتے۔

☆☆☆

ہاؤس وارمنگ کے بعد شیخ وارث کے ہاں آئے دن ہاؤس وارمنگ کے مقابلے میں محدود پیمانے پر ضیافتیں اور تقریبات منعقد ہونے لگیں جن میں ملکی ہی نہیں، غیر ملکی مہمان بھی مدعو ہوتے اور تقریب رات گئے تک جاری رہتی۔ کالونی کے گھروں سے کچرا لے جانے والا شخص ان تقریبات کے بعد اگلی صبح شراب کی بوتلوں میں بچ جانے والی ذرا ذرا سی شراب کالونی کے کسی محفوظ گوشے میں ایک بوتل میں اکٹھی کر کے مزے سے چسکیاں بھرتے دیکھا جاتا۔

شیخ صاحب اور ان کے اہل خانہ اکثر خود بھی رات گئے اپنی گاڑیوں کے ہارن بجاتے گھر واپس ہوتے۔ کبھی اہل علاقہ کو گھر کے ایک دو یا سبھی افراد کے بیرون شہر اور کبھی بیرون ملک سفر پر ہونے کی اطلاع بھی ملتی۔

ہاؤس وارمنگ کے بعد شیخ وارث کے گھر میں ہونے والی دوسری بڑی تقریب شیخ صاحب کے تیسرے اور سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی کی ابتدائیہ تقریب تھی۔ ویسے ہی جیسے عام گھرانوں میں ڈھولکی یا مایوں، مہندی کی تقریب ہوتی ہے۔ کالونی والوں پر اس تقریب کا انکشاف تقریب والے دن صبح کو دن چڑھنے پر اس وقت ہوا جب دُلہا میاں شارٹس پہنے چند ملازمین کے جلو میں اپنے گھر سے کالونی کی داخلہ گاہ تک گشت کرتے اور اس راستے کے دونوں اطراف بنے مکانوں کے مکینوں کو اپنی اپنی موٹر سائیکلیں اور گاڑیاں آڑی ترچھی کھڑی کرنے کے بجائے تہذیب کے دائرے میں کھڑی کرنے کی ہدایت دیتے دیکھے گئے۔ غنیمت تھا کہ ہاؤس وارمنگ کی طرح اس بار گاڑیاں گھروں کے اندر لے جانے کی ہدایت نہ تھی۔

شادی کی افتتاحی تقریب کے لیے دیدہ زیب فرنیچر اور آرائشی سامان بڑے بڑے ٹرکوں میں لد کر آیا۔ کیٹرنگ والوں کی گاڑیاں دوپہر ہی کو آپہنچیں۔ شیخ وارث کے گھریلو ملازمین تندہی سے مصروف کار رہے۔ شاندار اسٹیج بھی آراستہ ہوا۔ سرشام گھر کے اندر باہر اور بام و در پر سجی آرائشی بتیاں جگمگا اٹھیں اور شیخ وارث کا گھر بقعۂ نور بن گیا۔ کالونی کے مکینوں کی نگاہیں ابھی اس جگمگاہٹ کی تاب ہی نہ لا پائی تھیں کہ ساعت پُر ہنگام موسیقی کے شور سے جھنجھنا اٹھی۔ رات ہوتے ہی مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ شیخ وارث کے گھر سے لے کر کالونی کی شرقی، غربی، شمالی، جنوبی تمام گلیوں میں شیخ کے مہمانوں کی بیش قیمت گاڑیوں کا ازدحام لگ گیا۔ کالونی کے ایک جہاندیدہ بوڑھے نے اس ازدحام کو دیکھ کر فکرمندی سے کہا۔ ”مجھ جیسے کسی بوڑھے کو اچانک ایمرجنسی میں اسپتال لے جانے کی ضرورت پڑ جائے تو ایمبولینس کو آنے جانے کے لیے راستہ کہاں سے ملے گا؟“

”فکر مت کرو دادا! ہم آپ کو کندھوں پر لے جائیں گے۔“ موقع پر موجود ایک لاابالی نوجوان نے بڑے میاں کی بات سن کر مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

رات گئے تک شیخ وارث کے گھر میں بلند آہنگ موسیقی، شرکائے تقریب کی اونچی اونچی آوازوں، بلند وبانگ قہقہوں، ہاہو اور رقص کا سلسلہ جاری رہا۔ پڑوس میں آباد بڑی بی نیند نہ آنے پر دوبارہ چھت پر جا پہنچیں۔ بڑی بی کی نوجوان بہو پہلے ہی چھت پر موجود تھی اور چھت کی منڈیر پر دونوں ہاتھ ٹیکے شامیانے کے اندر اسٹیج پر ہوتے رقص و سرود کی تاک جھانک میں لگی تھی۔

”توبہ! یہ کیسا پڑوسی ہے بہو جس نے پڑوس کے کسی ایک گھر کو بھی دعوت نہ دی۔“

”اماں! یہ ہم میں سے نہیں ہیں..... کوئی اور ہی مخلوق ہیں یہ۔ ذرا دیکھو تو ان آدھی آدھی ننگی عورتوں کو..... کیسے ایک کے بعد دوسرے مرد کے ساتھ ناچ رہی ہیں۔“

”ارے تو اپنے جیسوں ہی میں گھر بناتا نا..... ہم غریبوں کی نیند خراب کرنے کو یہاں گھر کیوں بنالیا۔ رات گزرنے کو آئی، اب تک آنکھ لگ کر نہ دی ہے اس شور سے۔“

بہو نے ساس سے مکالمہ کرنے کے بجائے شیخ کے گھر کی چکاچوند میں اپنی نگاہیں الجھائے رکھنے کو ترجیح دی۔

”ہاہ!“ بڑی بی نے سرد آہ بھری۔ ”ہمارا زمانہ ہی بھلا تھا۔ ایک گھر میں شادی، غمی ہوتی تو سارا محلہ امڈ آتا۔ اس بدبخت نے تو محلے کے کسی ایک گھر کو بھی نہ پوچھا۔“

"ارے اماں دل کو مت لگاؤ۔ یہ بڑے لوگ ہیں۔ انہوں نے تو یہاں اپنی جنت سجائی ہے۔ ہم تم ان کے لیے اچھوت ہیں، اچھوت۔"

"اور ہمارے لیے ان جیسے اچھوت۔ اللہ جانے کہاں سے چھاجوں پیسا برسے ہے ان کے لیے۔ ہمارے گھر کا مرد تو بے چارہ صبح کو گھر سے نکل کے شام کو تھکا ہارا واپس لوٹے ہے پھر بھی گزارہ مشکل۔"

"اللہ کا شکر ہے اماں! گزارہ تو ہو رہا ہے نا۔" بہو کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ بڑی بی کی باتوں سے اوب چلی تھی۔

"بس بہت دیکھ لیا تماشا بہو! اب نیچے آجاؤ۔" بڑی بی نے کہا۔

"آتی ہوں اماں، آپ تو چلو۔"

بہو کی یہ بات غلط نہ تھی کہ شیخ وارث نے تو اپنی جنت سجائی تھی۔ اس جنت میں رہنے والوں کی اپنی دنیا، اپنا رہن سہن، اپنا دستور اور چلن تھا۔ اس جنت کے گرداگرد اونچی دیواریں تھیں۔ ان دیواروں کے باہر رہنے بسنے والوں کو تو ان دیواروں کے اندر بسی جنت میں جھانکنے سے دلچسپی اور تجسس ضرور رہتا تھا مگر ان دیواروں کے بیچ بسی جنت کے مکینوں کو اپنے آس پاس بسے گھروں میں جھانکنے کی نہ فرصت تھی نہ ضرورت۔ ان کی گاڑیاں برق رفتاری سے کالونی کے مرکزی راستے سے داخل ہوتیں اور دور ہی سے ہارن بجا کر اپنی آمد کا اعلان کر دیتیں۔ برق رفتاری سے آتی گاڑی یہ دیکھے بنا کہ اس کی تیز رفتاری کی زد میں کوئی معصوم بچہ، کوئی بے زبان جانور بھی آسکتا تھا، بندوق کی نالی سے نکلی گولی کی سی سرعت سے کھلے گیٹ سے اندر چلی جاتی۔ اس جنت کے مکین اپنی گاڑیوں میں آتے جاتے گاڑیوں کے شیشے چڑھائے رکھتے اور علاقے کے لوگوں سے چنداں میل جول نہ رکھتے بلکہ شاید میل جول رکھنے کو اپنی توہین سمجھتے تھے۔ ان کی عورتیں کالے شیشے والی گاڑیوں میں سفر کرتیں۔ اس جنت کے باسی بچے اپنے سبزہ زار پر کھیلتے ہوئے آس پاس گھروں کی چھتوں سے تاک جھانک کرتے لوگوں کو حقارت سے دیکھتے اور کبھی "فلتھی" کبھی "دس گسٹنگ" کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے۔ اس جنت کے باسیوں کو ہمسایہ افراد کے زندگی کے مسائل سے نہ کوئی دلچسپی تھی نہ غرض۔ جانے انہیں شداد کی جنت کا قصہ معلوم تھا کہ نہیں۔

☆☆☆

شیخ وارث کے پڑوسی ابھی شیخ صاحب کے بیٹے کی شادی میں مدعو نہ کیے جانے کا گلہ فراموش نہ کر پائے تھے کہ شیخ وارث کے ایک پوتے کی سالگرہ کا جشن انہیں مزید شکوہ سنج کرنے کو آپہنچا۔

گلابی جاڑوں کا موسم تھا۔ دن سہانے تھے۔ موسم گرما سے بیزار لوگوں کو نکھری نکھری ہلکی ہلکی دھوپ بھلی لگنے لگی تھی۔ علی الصباح شیخ وارث کے گھر یکے بعد دیگرے بڑی بڑی بار بردار بھاری گاڑیوں کی مسلسل آمدورفت نے کالونی کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کر کے علاقے کے مکینوں کو زبان حال سے بتا دیا کہ شیخ وارث کے ہاں پھر کوئی بڑی تقریب ہونے جا رہی تھی۔ اہل محلہ متجسس ہوئے تو گھر سے باہر آتے جاتے ملازمین کے ذریعے پتا چلا کہ شیخ وارث کے پوتے کی سالگرہ کی تیاریاں تھیں۔

ہفتہ واری تعطیل کا دن تھا۔ موسم کی گلابیت اور بچوں کی سہولت کے پیش نظر کھلی دھوپ میں گھر کے وسیع لان اور احاطے میں تقریب میں مدعو کیے گئے بچوں کی تفریح طبع کا پورا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ ہفتہ واری تعطیل کے باعث کالونی کے گھروں میں بچے ابھی سو ہی رہے تھے۔ ان کی مائیں بھی انہیں اسکول بھیجنے کے لیے جلدی جلدی ناشتا بنانے کی فکر میں نہ تھیں۔ بے نمازی مرد روزگار سے چھٹی کے باعث ہفتہ بھر کی تکان اتارنے کو گہری نیند میں تھے۔ نمازی مردوں کی مسجد سے واپسی کے باعث گلیوں میں معمولی چہل پہل تھی۔ سویرے سویرے شیخ وارث کے گھر آنے والی بھاری بھرکم گاڑیوں میں سے کیا کچھ ڈھویا گیا، اس کا عقدہ دن چڑھنے پر کھلا۔ ایک نے اپنی چھت سے بہ چشم حیرت دیکھا اور دوسرے کو خبر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آس پاس کی چھتوں پر نظارہ بازوں کا میلا لگ گیا۔

شیخ وارث کے گھر کے سبزہ زار پر دیسی ڈزنی لینڈ کا منظر تھا۔ مہمانوں کی آمد شروع ہوئی تو آس پاس گھروں کی عورتیں اپنے گھروں کی چھتوں کی منڈیروں پر ادھوری ہو گئیں اور بچے محو حیرت دیکھا کیے۔ کیا منظر تھا۔ آدھے ادھورے ملبوسات والی الٹرا ماڈرن جوان مائیں۔ سوٹڈ بوٹڈ گردنوں میں میخیں ٹھونکے باپ اور خود کو پیلے اسکولوں میں پڑھنے والے علاقے کے بچوں کی ندیدی نگاہوں سے بچاتے، سمٹتے سمٹاتے اور سنبھل سنبھل کر اپنے ایلیٹ کلاس ماں باپ کے ساتھ ساتھ چلتے اور انگریزی میں منمناتے مراعات یافتہ طبقے کے بچے۔

تقریب کا آغاز دن چڑھے پنجروں میں بند پرندوں کو آزاد کرنے، فضا میں گیس بھرے غبارے چھوڑنے سے ہوا۔ کیک کٹائی کے ساتھ ہی بینڈ نے "ہیپی برتھ ڈے" کی

روایتی اور مسحور کن دھن چھیڑ دی پھر کھانا پینا شروع ہوا۔

شیخ وارث کی ہمسایہ بڑی بی کا اکلوتا اور گھر بھر کا لاڈلا نو عمر پوتا اپنے گھر کی چھت پر رکھی تپائی پر کھڑا اپنی ہی عمر کے ایک بچے کے برتھ ڈے کا مسحور کن منظر پلک جھپکائے بنا دیکھتا رہا۔

دن چڑھے شروع ہونے والی تقریب سہ پہر تک جاری رہی۔

اگلے روز شیخ وارث کے ملازمین شیخ کے گھر کے سامنے سے گزرتے بچوں میں ان محرابوں سے پھیکے غبارے نوچ نوچ کر تقسیم کرتے دیکھے گئے جو گزشتہ روز تقریب کی رونق کا حصہ بنی رہی تھیں۔

پڑوس کی بڑی بی کا پوتا بھی خوش خوش تین چار غبارے لہراتا گھر آیا تو بڑی بی نے اسے چمکارتے ہوئے سمجھایا۔ ''نہ میرا بچہ...... ! ہم خیرات نہیں لیتے۔ جا، یہ غبارے واپس کر کے آ۔'' بچہ منہ بنانے لگا۔ ''میں تجھے نئے غباروں کی پوری تھیلی لا کر دوں گی۔''

پرائیویٹ اسکول کی ابتدائی جماعت میں پڑھنے والا پوتا قدرے شک سے اپنی دادی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پرومس؟'' دادی نے پوتے کو محبت سے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بچہ غبارے واپس کرنے جانے لگا تو دادی بھی اس کے ساتھ ہولی اور غبارے تقسیم کرتے شیخ وارث کے ملازموں سے بولی۔ ''اپنے صاحب سے کہنا ساری کالونی کے نہ سہی، ہمسایوں کے بچوں ہی کو بلا لیتا اپنے پوتے کی سالگرہ میں تو کوئی کال نہ پڑ جاتا۔''

شیخ وارث کے ملازمین بڑی بی کی بڑ بڑ پر مسکرا دیے۔

☆☆☆

کچھ ہی عرصے بعد بڑی بی کے پوتے کی بھی سالگرہ کا دن قریب آ پہنچا۔ دستور تھا کہ بڑی بی پوتے کی سالگرہ والے دن شکرانے کے نوافل ادا کرتیں اور اپنے جستی ٹرنک سے کلاوہ نکال کر اس میں ایک اور گرہ کا اضافہ کر دیتیں۔ بہو اس دن پلاؤ یا بریانی اور اس کے ساتھ کچھ میٹھا بھی بنا لیتی۔ بڑی بی کا بیٹا یعنی بچے کا باپ بازار سے کیک، سموسے، نمکو، سافٹ ڈرنک اور چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی موم بتیوں کا پیکٹ لے آتا۔ دادی، ماں اور باپ بچے کے لیے چھوٹے چھوٹے تحائف پہلے ہی خرید کر رکھ چکے ہوتے تھے۔ ہمسایہ گھرانوں سے چند بچوں کو سالگرہ کی تقریب میں بلا لیا جاتا۔ بڑی بی کی بہو کیک کو پیتل کی تھالی میں رکھتی اور اس کے ارد گرد موم بتیاں سجا دیتی۔ چھوٹے چھوٹے معمولی تحائف دیکھ کر بچہ بے حد مسرور ہوتا اور دوسرے بچے للچائی نظروں سے دیکھے جاتے۔ مہمان بچے رخصت ہوتے۔ مغرب کی نماز کے بعد دادی، پوتا، بہو اور بیٹا معمول سے ہٹ کر اچھا کھانا کھاتے۔ بچہ بار بار اپنے تحائف دیکھتا اور خوش ہوتا اور رات کو یہ تحائف اپنے پاس رکھ کر سوتا پھر کئی دن ان تحائف کی خوشی سے نہال رہتا۔ اس مرتبہ بھی اس کی سالگرہ والے دن یہی سب کچھ ہونا تھا اگر اس بچے نے اپنی ماں اور دادی کے ساتھ اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر شیخ وارث کے پوتے کی سالگرہ کا جشن نہ دیکھا ہوتا۔

''پاپا جی! پپٹس، گھوڑے، ٹرین اور اتنے ڈھیر سارے غبارے بھی لانا میرے برتھ ڈے پر۔'' بچے نے اپنے دونوں بازو افقاً وا کرتے ہوئے ڈھیر سارے غبارے کہا۔ ''اور پاپا جی! بندر کے تماشے والا بھی...... اور اسپائیڈر مین بھی پاپا!'' بچے کی باڈی لینگویج میں پُرزور تقاضا بھی تھا اور اپنی فرمائشوں کو یقینی طور پر پورا ہوتے دیکھنے کی مسرت بھی۔

''پاپا! لائیں گے نا؟'' بچے نے اپنے باپ کا بازو اپنے چھوٹے سے ہاتھ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

موقع پر موجود بڑی بی نے بیٹے کو، بیٹے نے بیوی کو اور بیوی نے پہلے اپنے شوہر پھر بیٹے اور ساس کو دیکھا۔ بڑی بی، بہو اور بیٹے کی نگاہیں باہم ملیں پھر حسرت کا مرقع بنیں اور فرش پر بچھے لنڈا بازار کے غالیچے کے نقش و نگار میں الجھ گئیں۔

بچہ اپنی فرمائشیں داغ کر گھر میں نئے نئے وارد ہوئے بلی کے بچے کو پکڑنے کے لیے اس کے آگے پیچھے بھاگنے لگا۔

بیٹے نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ''اس بار تنخواہ ملے تو شیخ صاحب کے گھر کی طرف اپنی چھت کی منڈیر اونچی کرا لیتے ہیں۔''

بہو دل گرفتگی سے بولی۔ ''کہاں کہاں منڈیریں اونچی کراؤ گے؟'' پھر بلی کے بچے کے آگے پیچھے دوڑتے اپنے بچے کو ایک نظر دیکھ کر کہا۔ ''ابھی تو چھوٹا ہے، قد بھی نکالے گا...... پھر؟''

بڑی بی نے اپنی زندگی بھر کی محرومیوں کی تلخی اپنے لہجے میں اتاری اور شدید غصے اور نفرت سے بولیں۔ ''یہ بڑے لوگ ہم جیسوں کو کہیں چین سے رہنے بھی دیں گے کہ نہیں۔''

باہر گلی سے گزرتی شیخ وارث کی برق رفتار گاڑی کے ہارن کی آواز نے بڑی بی کی آواز کو اپنی بلند آہنگی میں مدغم کر لیا۔

⌘⌘⌘
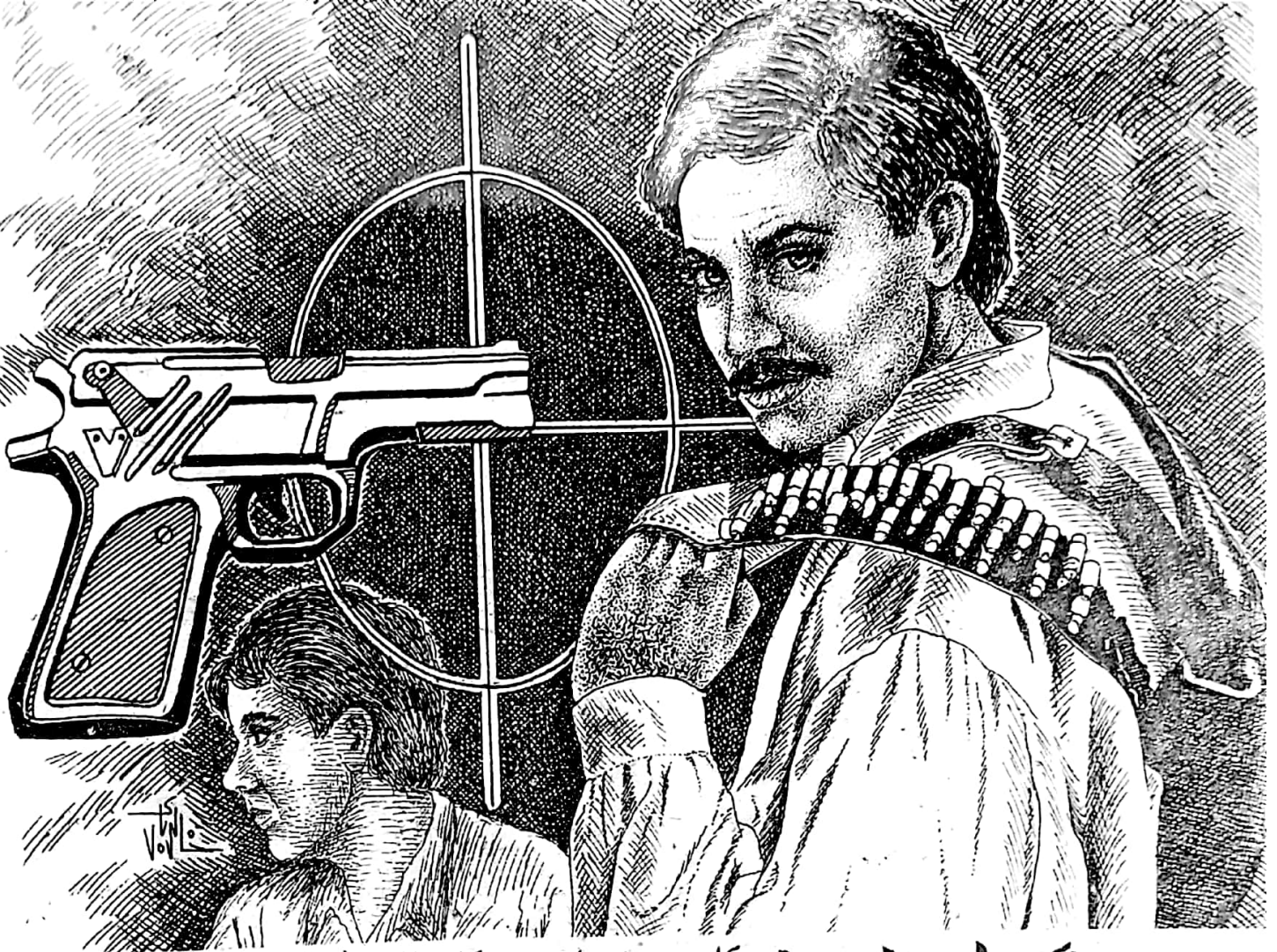
جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط :7

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہوجاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ درو دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں ... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

ہم تیزی سے آگے بڑھتے جا رہے تھے اور پھر ہم نے جلد ہی اس ریڑھے سوار فقیر کو جالیا۔ وہ ہم سے آگے آگے جا رہا تھا اور اب دکانوں والی گلی میں مڑ رہا تھا۔ نادو نے مجھے اسکوٹر روک لینے کا کہا۔

"مجھے روکا کیوں ہے؟ میں ابھی اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اس سے فوزیہ کے بارے میں اگلوانے لگا تھا۔" میں نے نادو سے کہا۔ میرے روئیں روئیں میں جوشِ غیظ بھر گیا تھا۔

"اتنا اتاؤلا نہ ہو۔" نادو مجھے سمجھاتے ہوئے بولی۔ "اس کے تو کیا ہاتھ پاؤں توڑے گا، وہ پہلے ہی منڈا ٹنڈا نظر آ رہا ہے اور یہ اتنی آسانی سے اگلنے والا بھی نہیں۔"

"تو پھر کیا کریں؟ چھوڑ دیں اسے؟"

"سن، میرے ذہن میں ان جیسے مکار لوگوں سے نمٹنے کی ایک تجویز آئی ہے۔" وہ بولی۔ میں غور سے اس کی بات سننے لگا۔

"ہم اس سے ایسا کھیل کھیلیں گے جیسا کہ وہ چاہتا ہے۔"

"یعنی؟"

"یہ تو مجھ پر چھوڑ...... لے سن اب۔" کہتے ہوئے اس نے دھیرے دھیرے نیچی آواز میں مجھے ساری منصوبہ بندی بتا ڈالی۔ میں اس کی ذہانت کا تو پہلے ہی معترف تھا، اب تو اور معتقد ہونے لگا۔

ہم نے سب سے پہلے مکینک کے پاس جا کر ایک بوتل جو ڈیڑھ لیٹر کی تھی، اسکوٹر میں پیٹرول ڈلوایا۔ اس کے بعد فقیر کے ساتھ ساتھ لگے رہے۔ بستی کے لوگ ہم پر ایک نظر ڈالتے اور آگے بڑھ جاتے۔

سب لوگوں کو اپنے پیٹ کا جہنم بھرنے کی لگی ہوئی تھی۔ کوئی کسی کام سے نکلا بھاگا جا رہا تھا تو کوئی کسی کام سے۔

سہ پہر ہوگئی۔ ہمیں پولیس اور دشمنوں کا بھی ڈر تھا۔ ہماری کوشش یہی تھی کہ ہم ایک جگہ بیٹھ جاتے مگر ہمیں اس فقیر بجلی کا پیچھا نہیں چھوڑنا تھا۔ بہرحال سہ پہر ہوتے ہی اس نے واپسی کا رخ کیا اور میں نے دیکھا کہ بستی کی جنوبی سمت جدھر اجاڑ اور قدرے ویرانہ پھیلا ہوا تھا، اس طرف کو وہ چلا۔

اس کی لڑکی اب تیز تیز قدموں سے ریڑھا کھینچے جا رہی تھی۔ وہ ایک کچا راستہ تھا۔ اب ہمارا اصل کام شروع ہونے والا تھا۔

بقول نادو کے یہ بجلی فقیر اب اس جگہ کا رخ کیے ہوئے تھا جدھر یقیناً اس جیسے اور لوگ آباد ہوں گے۔ یہ لوگ بنجاروں کی طرح جھونپڑوں میں رہتے تھے۔

جب میں نے دیکھا کہ آس پاس اور کوئی ذی نفس نہیں اور یہ کہ اب ویران علاقہ شروع ہوگیا ہے تو میں نے اسکوٹر اس کے قریب لے جا کر روک دیا۔ لڑکی نے بھی ریڑھا روک دیا۔

بجلی فقیر چونک کر ہمیں گھورنے لگا پھر دوسرے ہی لمحے اپنے مکروہ چہرے پر ازلی بے چارگی ولاچاری سموتے ہوئے لگا خیرات مانگنے۔ اس نے کشکول آگے بڑھا دیا۔

"اللہ کے نام پر بابا! اس غریب محتاج کو کچھ دے دے۔"

میں اسکوٹر سے اتر آیا۔ نادو بھی اتر آئی۔ پلاننگ کے مطابق نادو ایک ڈری سہمی لڑکی کا رول پلے کرنے لگی اور میں ایک سخت گیر آدمی کی طرح اس سے درشتی سے تحکمانہ بولا۔

"خبردار! ادھر سے ہلنے کی بھی کوشش مت کرنا، سمجھی تو۔"

نادو بدستور خوفزدہ نظر آنے کی کوشش میں لگی رہی۔ یہ رول "پلے" کرتے ہوئے میں نے دزدیدہ نظروں سے بجلی فقیر کی طرف بھی دیکھا۔ حسبِ توقع اس کے مکروہ چہرے پر بے چارگی کی جگہ اچانک ایک معنی خیز چمک ابھر آئی۔ میں نے دیکھا اس کا ریڑھا کھینچنے والی جوان لڑکی بھی مجھے خاص نگاہوں سے گھورے جا رہی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ مجھے کم وبیش بیس بائیس کے لگ بھگ ہی ہوا تھا۔ وہ سانولی مگر اچھے نقوش کی مالک تھی۔

"ہاں بھائی! کیا حال ہے تیرا...... بجلی تو ہی ہے نا؟"

"ہاں، میں ہی تو بجلی فقیر ہوں۔ سب ہی مجھے جانتے ہیں۔" وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ میں نے دانستہ گردن موڑ کر دوسری جانب منہ کیے کھڑی نادو کی طرف دیکھا اور بجلی کی جانب گردن دوبارہ موڑی تو وہ بھی اسی طرف گھور رہا تھا۔

"مجھے یہاں ایٹاں والی بستی میں مرادے نے بھیجا ہے تیرے پاس۔" میں نے لہجے کو رازدارانہ اور دھیما بناتے ہوئے اس سے کہا۔

"کک...... کون مرادا؟" بجلی ہونق سا بن گیا لیکن میں اس کے مکروہ چہرے سے اور ابلتی ہوئی وحشت انگیز آنکھوں میں مخصوص چمک کو تاڑ رہا تھا، بولا۔

"چل اب آئٹم چھوڑ۔ مرادا کون......! وہی پھلاں وتی کا گورکن مرادا...... جس کی آنکھیں پیلی ہیں۔"

وہ مکار تھا مگر جان بوجھ کر سوچتا بن گیا۔ تب ہی میں نے بھی پینترا بدلا۔

"اچھا ٹھیک ہے پھر تو اپنے راستے تو میں اپنے راستے۔ ایک شکار کا سودا کرنے بھیجا تھا تیرے پاس۔ نہیں تو نہ سہی۔" کہتے ہوئے میں پلٹنے لگا تو یک دم اس نے پکارا۔

"ارے بھائی ٹھہر تو جا...... پہچان گیا، پہچان گیا......

تجھے...... ادھر آ......''

میں پھر اس کی جانب مڑا۔

''ہاں، بول اب...... کیا لے گا اس کے...... پر پٹھے پر ہاتھ رکھنے دیتی ہے یا نہیں...... اور یہ اس کی پیشانی پر زخم کیسا ہے؟'' بجلی فقیر اب اداکاری چھوڑ کر سودے بازی پر اتر آیا۔ میں اندر ہی اندر اپنی کامیابی پر خوش اور نادو کی اس ترکیب پر معترف ہوئے جا رہا تھا۔

''یہ معمولی زخم ہے۔ اسکوٹر سے گر گئی تھی سالی۔'' میں نے کہا۔ ''پر بات کہیں چل کر آرام سے بیٹھ کر کی جاوے تو زیادہ بہتر ہے۔ باقی پٹھے وٹھے کی بات کر کے سودا سستا کرنے کی مکاری مت کر بجلی......! مجھے مرادے نے تیری چالاکیوں کے بارے میں بتا رکھا ہے۔ اس ہاتھ سودا کر اور اس ہاتھ روانہ کر۔''

''ہالا ہالا...... گسہ مت کر، چل اگے ہو۔'' وہ بڑا سا گنجا سر ہلاتے ہوئے بولا پھر لڑکی سے مخاطب ہوا۔

''چل نی چھوری! کھیڑا اگے گیرڑاں۔'' لڑکی نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی، اس کے بعد ہتھ ریڑھی کو آگے دھکیلا۔ میں پلٹ کر اسکوٹر کی جانب آیا۔ نادو آ کر میرے پیچھے بیٹھ گئی۔

''کام ہو گیا ہے نادو! یہ کمینہ جھانسے میں آ رہا ہے۔'' میں نے جوشِ مسرت تلے اس سے کہا۔

''شش......'' اس نے مجھے ٹوکا۔ ''اداکاری جاری رکھ۔''

میں اسکوٹر اسٹارٹ کر چکا تھا۔ نادو کے بیٹھتے ہی گیئر ڈال کر آگے بڑھا دیا۔ ریڑھے کی رفتار آہستہ تھی۔ اسی لیے مجھے بھی اسی رفتار سے اسکوٹر اس کے ساتھ ساتھ چلانا پڑ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک جنگلی ڈھینگروں سے اٹے پڑے ٹیلوں ٹبوں کے ایسے میدان نما علاقے میں آ گئے جدھر ایک نہر بہہ رہی تھی اور وہاں ان گنت جھونپڑیاں بنی نظر آ رہی تھیں۔ ننگ دھڑنگ کالے سیاہ بچے، ان کی عسرت زدہ مائیں اور کچھ بوڑھے جوان وہاں منڈلاتے نظر آئے۔ کچھ عورتیں نہر کنارے کپڑے دھوتے اور بچوں کو نہلاتی بھی نظر آئیں۔

ہم پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر وہ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ یہ بجلی نامی فقیر یہاں کا مجھے ''مکھیا'' ہی لگا تھا کیونکہ ہر آنے جانے والا اسے جھک کر سلام کر رہا تھا۔

وہ ہماری راہنمائی کرتا ہوا ایک نسبتاً بڑے سے جھونپڑے میں ہمیں لے آیا۔ یہاں آتے ہی میرا دل یکبارگی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی ......فوزیہ کسی گوشے سے برآمد ہو گی اور چیخ کر مجھے پکارے گی ''سہراب'' اور اس کے بعد مجھ سے دیوانہ وار لپٹ جائے گی۔

ریڑھا رک گیا۔ لڑکی اندر چلی گئی۔ میں نے بھی اسکوٹر روک دیا اور حسبِ سابق نادو کو ایک عدد مصنوعی غصیلی اور دھمکی آمیز جھڑکی سے بھی نوازا۔ میں ریڑھے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

تب ہی مجھے ایک جھٹکا لگا۔ تھوڑی دیر پہلے بجلی فقیر جو ایک ٹنڈا منڈا معذور بنا ریڑھے پر ادھ موئے انسان کی طرح قابلِ رحم حالت میں پڑا تھا، یک دم ہی بھلا چنگا نظر آنے لگا۔ سب سے پہلے اس نے اپنی خالی آستین میں بازو ڈالا جو اس نے نکال کر اپنی پشت کی جانب چھپا رکھا تھا۔ اس کے بعد اپنا مڑا ہوا گھٹنا سیدھا کیا پھر میری پھٹی پھٹی آنکھوں نے ایک اور منظر دیکھا۔ کچھ ہی منٹوں بعد میرے سامنے کوئی ٹنڈا منڈا نہیں بلکہ ایک پہلوان نما شخص کھڑا تھا۔ اس بدبخت کا قد بھی دراز تھا اور خاصا صحت مند نظر آ رہا تھا۔

اس جیسے مکار فریبی اور گرانڈیل انسان کو دیکھ کر میرے اندر خون کھولنے لگا۔ کس طرح یہ پیشہ ور بھکاریوں کا گروہ لوگوں کے انسانی جذبات سے کھیل کر خیرات بٹورا کرتا تھا۔

یہ پوری خیمہ بستی ہی مجھے انہی جیسے پیشہ ور بھکاریوں کا ایک گروہ معلوم ہوئی، بلکہ یہی نہیں یہ لوگ اور بھی انسانیت سوز خطرناک جرائم میں بھی ملوث تھے۔

مجھے افسوس ہونے لگا کہ یہاں آنے سے پہلے مجھے کسی ہتھیار کا بندوبست کر لینا چاہیے تھا اور کچھ نہیں تو ایک عدد چاقو ہی ہوتا۔

نادو بھی بجلی فقیر کو پورے قد کے ساتھ صحت مند حالت میں دیکھ کر بھونچکا سی رہ گئی۔ ایک تشویش آمیز خوف کی جھلک اس کے چہرے سے بھی مترشح ہوئی۔ یہ اس کی بہرحال ''اداکاری'' نہیں تھی۔

اسی لمحے اندر سے ایک کالی موٹی سی عورت برآمد ہوئی۔ وہ بھی کوئی کم پہلوان نہ تھی۔ اس کے ہمراہ ایک دبلا پتلا مخنث سا نظر آنے والا جوان آدمی بھی تھا۔ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ چہرہ لومڑی کی طرح لمبوترا، آنکھوں میں بلا کی مکاری اور خود غرضی کے علاوہ بے حسی بھی رقصاں تھی۔

اس نے نیچے لنگی اور اوپر سیاہ کرتہ پہن رکھا تھا۔ آنکھیں نہایت چندی چندی سی تھیں۔ وہ بڑے غور سے مجھے اور پھر نادو کو تکے جا رہا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں میں تیلا دبا ہوا تھا۔

موٹی سی عورت کے چہرے پر مجھے ایک ازلی منحوسیت ٹپکتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بھی کبھی مجھے اور کبھی نادو کو گھورنے لگی۔

یہ بہت خرانٹ لگ رہی تھی۔ ان دونوں مرد عورت کی شکلوں کی مماثلت پر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ دونوں بھائی بہن تھے۔ نیز بجلی فقیر اس عورت کا شوہر ہی تھا۔ ان کے عقب میں وہی لڑکی دوبارہ نمودار ہوئی تھی اور مجھے یہ ان کی بیٹی ہی لگی۔

''یہ لوگ کون ہیں؟'' موٹی عورت نے بجلی سے پوچھا۔

''اپڑیں ہی لوگ ہیں۔'' بجلی عورت سے بولا پھر عورت کے ساتھ کھڑے دبلے پتلے جوان مرد سے بولا۔

''اوئے پھکو! ان دونوں کو پچھواڑے لے جا۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' اس کا اشارہ ہماری طرف تھا۔ پھکو نامی چھریری قامت والا میری طرف دیکھ کر خباثت سے مسکرایا اور اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کردیا۔

''م...... میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے گھر جانا ہے۔'' حسبِ منصوبہ نادو نے اداکاری دکھائی تو میں نے اسے بالوں سے دبوچ لیا اور خونخوار لہجے میں بولا۔

''بکنا بند کر سالی! ورنہ تجھے سیدھا تھانے لے جاکر پولیس کے حوالے کردوں گا۔ سمجھی تو......!'' میری دھمکی پر نادو ڈر کے خاموش ہوگئی اور بے چون وچرا میرے ساتھ ہولی۔

ہیجڑا سا پھکو لہراتا، بل کھاتا، جھونپڑے کی عقبی سمت ہمیں لے آیا۔ یہاں بھی ایک تنگ چوکھٹ والا دروازہ تھا جس پر میلا چیکٹ ٹاٹ جھول رہا تھا۔ اس نے وہ دروازہ کھولا اور ہمیں اندر لے آیا۔

اندر کی فضا بڑی تنگ وتاریک اور گھٹن آمیز محسوس ہوئی یا پھر شاید یہ بیٹھک نما سی جگہ ہی اتنی تھی۔ پھکو نے جلدی سے اس کی کھڑکیاں کھولیں تو روشنی کا یارا ہوا۔

ایک ہی جھلنگا سی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ فرش کچا اور ناہموار تھا۔ پانی کا گھڑا دو اینٹوں پر رکھا ہوا تھا۔ عجیب کثیف فضا تھی۔ ایک تنگ سا دروازہ جھونپڑے کے شاید اندرونی گوشے میں کھلتا تھا۔

''تم بیٹھو میں کچھ کھانے پینے کو لاتا ہوں۔'' پھکو لہرا کر بولا تو میں نے کہا۔

''کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بجلی کو بلاؤ۔ میں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔'' میں نے کہا۔

''آئے ہائے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ذرا بیٹھو تو سہی۔'' پھکو مخصوص لہجے میں دو ہاتھ کی تالی بجا کر بولا۔ وہ بار بار نادو کو گھورے جارہا تھا۔ اس نے چارپائی کی جانب اشارہ کیا۔ اس کے سامنے ایک سرکنڈوں کا سالخوردہ سا مونڈھا بھی دھرا پڑا تھا۔

تاہم وہ رکا نہیں اور ابھی جھک کر اندرونی گوشے میں کھلنے والے دروازے کو پار کرنے ہی لگا تھا کہ اسی وقت دونوں طرف سے ''ہائے'' کی زوردار آواز برآمد ہوئی۔ پتا چلا کہ دوسری جانب سے بھی کوئی اسی وقت سر جھکائے اندر داخل ہونے کی کوشش میں تھا کہ دونوں کے سر آپس میں ٹکرا گئے۔

''منحوس مارا۔ ایک طرف ہو۔'' یہ موٹی عورت کی غصیلی آواز تھی۔ پھکو چلاّیا۔

''ہائے دیدی! تو مجھے کیا پتا تھا کہ تُو بھی ادھر ہی آتی پڑی تھی۔'' وہ چلا گیا اور وہی موٹی عورت اندر آگئی۔ اس کے پیچھے بجلی فقیر بھی آگیا۔

میں ابھی تک کھڑا ہوا تھا۔ نادو بھی دانستہ ایک کونے میں سہمی ہوئی کھڑی ہوگئی۔

''بیٹھ جانا، کھڑا کیوں ہے تُو......؟ اور اس چھوری کو بھی بٹھادے۔'' بجلی مجھ سے بولا۔

''نہیں، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا تاہم میں نے نادو کو تحکمانہ بیٹھنے کا کہا۔ وہ چارپائی کی پائینتی پر سکڑ سمٹ کر ٹک کے بیٹھ گئی۔

''یہ میری جنانی (زنانی) ہے۔ جنی مائی۔'' بجلی فقیر نے موٹی کالی عورت کے بارے میں بتایا۔ ''اب ذرا تو اپنے بارے میں بھی تو کچھ بتا؟''

بجلی موڑھے پر بیٹھ گیا۔ ذرا ہی دیر میں وہی لڑکی ہاتھ میں کوئی بڑا سا برتن لیے نمودار ہوئی جو مجھے ان کی بیٹی ہی لگ رہی تھی۔ اس کے پیچھے پھکو دوبارہ نمودار ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بوسیدہ سی تپائی اور ایک لکڑی کا اسٹول تھا۔

ناچار میں بھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ اسٹول اس نے میرے سامنے رکھ دیا۔ اس پر لڑکی نے کھلا برتن رکھ دیا جس پر پانی کا جگ، ایک گلاس اور چائے کا پیالہ رکھا تھا۔ پھکو نے اسٹول موٹی عورت کو دے دیا۔ خود چلا گیا۔ لڑکی کھڑی رہ گئی لیکن عورت نے اسے بھی جانے کا کہہ ڈالا۔ وہ چلی گئی۔

''میرا نام سکندر ہے۔ احمد پور میں رہتا ہوں۔''

''مرادے گورکن سے تیرا یارانہ کیسے پڑا؟'' اس بار عورت نے خرانٹ لہجے میں پوچھا۔ اس کی تیز سی نظریں بار بار میرا اور نادو کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''میں مرادے کو نہیں جانتا تھا۔ ہاں، پھلاں وتی کے ڈاڈے سے میری دوستی تھی۔'' کہتے ہوئے میں نے دانستہ گردن موڑ کر قریب پائینتی پر بیٹھی نادو کی طرف دیکھا اور آگے بولا۔

''مال کھپانا تھا۔ وہ تو کچھ نہیں کر سکا، اسے کہیں اور جانے کی جلدی تھی، پر اس نے مہر شاہ کے قبرستان، گورکن مرادے کے پاس مجھے پیغام دے کر بھیج دیا۔''

''اچھا...... اچھا...... ٹھیک ہے۔ یہ پانی اور چا (چائے) تو لی۔'' درمیان میں بجلی بولا۔ ''اور اسے بھی دے۔ پتا نہیں کب سے پیاسی ہے۔ کچھ کھانا پینا ہے تو دال چاول کا بندوبست کردوں؟''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے منع کر دیا اور کسی برتن کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

''رے بجلی! یہ ڈاڈا ہی تو نہیں جو......'' اس کی بیوی جنی مائی نے اپنے شوہر سے کچھ کہنا چاہا مگر بجلی درمیان میں اس کی بات کاٹ کر ایک دم بولا۔

''ہاں، ہاں وہی ہے۔ بتایا تو تھا تجھے جنی! وہ بھی اپڑاں ہی آدمی ہے۔''

مجھے صاف لگا کہ جنی نادانستگی یا بے وقوفی میں کچھ آگے بولنا چاہ رہی تھی مگر بجلی اس کے منہ سے وہ اگلوانے کا خواہاں نہ تھا۔ اسی لیے اس کی بات کاٹ کر اسے خاموش کروا دیا۔ میں نے بھی بظاہر کوئی توجہ نہ دی اور بولا۔

''کام کی بات کر، بجلی! میرے پاس وقت نہیں ہے۔ کتنے میں اٹھائے گا یہ مال؟'' میں نے نادو کی طرف اشارہ کیا۔

''ارے...... تو، تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے۔'' بجلی ہنسا۔

''ایسے کاموں کے لیے ہوا کے گھوڑے ہی پر سواری کرنا پڑتی ہے۔ آگے بول۔'' میں نے بھی ٹھیٹھ جرائم پیشہ والے کاروباری انداز میں کہا۔

بجلی، نادو کی طرف کچھ ایسی ہی وحشت زدہ نظروں سے گھورنے لگا جیسے قصائی بکری کو دیکھتا ہے۔ جنی بھی کچھ ایسی ہی نگاہوں سے نادو کو گھورتی رہی۔

''تی ہجار (تیس ہزار)۔'' بجلی نے کہا۔

''کیا؟ صرف تیس ہزار......؟'' میں نے اداکاری کی۔

''تو اور کتنے، لکھوں (لاکھ) دوں؟''

مجھے بھی جلدی تھی پر سودے بازی کا انداز اپنانا ضروری تھا تاکہ ہم پر ان دونوں گرگ باراں دیدہ جوڑے کو شبہ نہ ہو سکے۔

''پھر تو نے ابھی تک اس کے بارے میں بھی نہیں بتایا کہ یہ ہے کون ہے؟ کہاں سے اسے اٹھا لایا ہے؟ آسان مال ہے یا مشکل؟'' اس بار پھر جنی مجھ سے بولی۔

''آسان مال ہے۔ اس کا خصم منشیات بیچتے ہوئے پندرہ سال کے لیے اندر ہو گیا ہے۔ پولیس اس کے بھی پیچھے تھی۔ یہ میرے پاس مدد کو آئی۔ اس کا خصم میرا دوست تھا۔ اب ختم کر۔'' میں نے کہا۔

''اوئے بڑا پالا مارا ہے سالے! اپنے ہی دوست کے گھر ہاتھ صاف کر دیا۔'' بجلی خباثت سے بولا۔

''پھر وہی فضول باتیں۔ چل اچھا پینتیس کر لے اور روپے لا...... اور ہاں......'' کہتے ہوئے میں نے یوں کہا جیسے کچھ یاد آیا ہو۔

''مرادا کہہ رہا تھا کہ بجلی سے پانچ ہزار بھی لیتے آنا۔'' میں نے نادو کے بتائے ہوئے منصوبے کے تاروپود اب آہستہ آہستہ کھینچنا شروع کر دیے۔

''پانچ ہجار......؟ کس بات کے؟'' بجلی بولا۔ دونوں ہی میاں بیوی میری بات پر چونکے بغیر نہ رہ سکے۔

''وہ پچھلے مال کے رہ گئے تھے تیرے پاس مرادے کے۔''

''پچھلا مال......؟'' بجلی بھویں سکیڑ کر میری طرف گھورنے لگا۔

''ہاں، ہاں وہی۔ کیا نام بتایا تھا سالے گورکن مرادے نے...... چھوکری کا...... ہاں...... یاد آیا...... فائزہ...... نہیں فوزیہ...... اس کے پیسے رہ گئے تھے تیرے پاس۔'' میں نے کوشش کی تھی کہ اپنے بولنے کا انداز رواں، عام فہم اور پیشہ ورانہ رکھوں۔ اس میں، میں کامیاب بھی رہا تھا۔

میرا مقصد یہ بات کہہ کر فوزیہ کے بارے میں معلوم کرنا تھا کہ اس کے بارے میں بھی کوئی بات چھڑے تو اس کا سراغ معلوم ہو۔ یوں میں نے اپنے منصوبے کے تابوت پر آخری کیل ٹھونک دی تھی۔ بازی کا آخری ترپ کا پتا پھینک دیا تھا۔ پانسے بساط پر گھوم رہے تھے۔

دونوں میاں بیوی ایک دم چونک کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

''اس چھوکری کے تو ہم پورے پیسے مرادے کو دے چکے تھے۔ اب کس بات کے وہ کھا مکھا (خوامخواہ) پانچ ہجار مانگ رہا ہے؟'' بجلی حیرت سے بولا اور میرا دل اپنی کامیابی پر بلیوں اچھلنے لگا لیکن ابھی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک پھکو بوکھلایا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''جیجا......! پپ...... پولیس کا چھاپا پڑ گیا ہے۔ دو تین گاڑیاں اسی طرف آ رہی ہیں۔''

اس نے جیسے ہم سب کی ہی سماعتوں میں دھما کا کیا

تھا۔ پولیس کی آمد سے میں اور نادو بھی بُری طرح بدکے تھے۔ نادو اب کے واقعی ہراساں نظر آ رہی تھی۔ خود میرے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ کیا خبر پولیس میری اور نادو کی ہی تلاش میں یہاں آئی ہو۔ ہم بھی تو بہرحال پولیس کو مطلوب تھے اور دشمنوں کو بھی۔

''کیا......؟'' جنی نے اپنے سینے پر ہتڑ مارا پھر میری طرف شک کی نگاہ سے گھورتے ہوئے شوہر سے بولی۔

''یہ سب اس کی وجہ سے ہے۔ یہ پولیس کا مخبر ہے۔''

''کیا بکواس کر رہی ہے تو مائی؟'' میں ایک دم غصے سے بولا۔ ''میں خود پریشان ہو گیا ہوں۔'' پھر میں نے بجلی کی طرف دیکھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بجلی بھائی! کچھ کرو، مال ساتھ ہے۔ معاملہ خراب ہو گیا تو سب گئے کام سے۔''

ہم سب اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

بجلی اپنی گھاگ اور بھانپتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور اس بار چونکہ یہ اداکاری نہیں تھی کیونکہ ظاہر ہے لامحالہ ہم بھی پولیس سے خائف ہی تھے اسی لیے اس نے فوراً اپنی بیوی کو ہمارے حق میں ٹوک دیا اور پھکو سے بولا۔

''تو ان سب کو ہوت رام کے جھونپڑے پہ لے جا اور سن...... اسے کہنا کہ فوراً ان دو چھوکریوں کو بھی گدھا گاڑی میں سوار کرا کے نہر پار والے میدان میں لے جائے۔''

''لیکن میرے پیسے؟'' میں نے لالچی پن دکھا کے گویا ڈرامے میں رنگ آمیزی کرنا ضروری سمجھا۔

''وہ بھی مل جائیں گے۔ پہلے ان سسرے پولیس والوں سے تو جان چھڑا لیں۔'' بجلی بولا۔ ''تم جاؤ، ہوت رام ہوشیار آدمی ہے میرا۔ تم وہیں اس کے جھونپڑے میں ہی رہنا۔''

''دونوں چھوکریوں'' سے بجلی کی کیا مراد ہو سکتی تھی؟ اس بارے میں قابلِ قیاس بات یہی تھی کہ وہاں اور بھی دو قیدی لڑکیاں موجود تھیں اور اس کے خاص ساتھی ہوت رام کے پاس مقید تھیں۔ کیا خبر ان دونوں مذکورہ ''چھوکریوں'' میں فوزیہ بھی ہو۔

چال جب کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے تو دونوں ہی رخ سے ہوتی ہے۔

میں نادو کا ہاتھ پکڑے بلا دیر پھکو کے پیچھے ہو لیا۔ پھکو مجھے لیے بھاگتا دوڑتا جھونپڑیوں کی عقبی آڑ لیتا ایک جھونپڑے میں پہنچا۔ دروازہ بند تھا، اس نے دھکا دے کر دروازے پر لگا چوبی فریم کھول دیا۔ میں اور نادو اس کے ساتھ ہی اندر داخل ہو گئے۔

میرا مصمم ارادہ تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو، یہاں مجھے جیسے ہی فوزیہ نظر آئے گی میں اسے لے بھاگوں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے یہاں بھی دو تین بندے لٹاتے ہی کیوں نہ پڑیں۔

اسکوٹر بھی میں ساتھ ہی لے آیا تھا۔

اندر دو آدمی موجود تھے۔ ایک ادھیڑ عمر اور دوسرا قدرے جوان .... درمیانی عمر کا آدمی صورت سے ہی چھٹا ہوا بدمعاش لگتا تھا۔ وہ دونوں سامنے ہی ایک چوبی بینچ پر بیٹھے سگریٹ پھونک رہے تھے جس کے کثیف دھوئیں کی مخصوص بُو بتا رہی تھی کہ وہ چرس تھی۔

ہمیں دیکھتے ہی دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ہوت رام...... ! کھیا نے مجھے بھیجا ہے یہاں...... باہر بستی میں پولیس کا چھاپا پڑ گیا ہے۔'' پھکو جوان نظر آنے والے آدمی سے مخاطب ہو کے جلدی جلدی بولا اور وہ سب اسے کہہ ڈالا جس کی بجلی نے اسے ہدایت کی تھی۔ ساتھ ہی ہمارے بارے میں بھی اسے بتا دیا کہ ہم ''سودے والے'' لوگ تھے، وغیرہ۔

ان دونوں کے چہرے بھی فق ہو گئے۔

میں تب تک جھونپڑے کا جائزہ لینے لگا۔ میرا دل تیزی سے دھڑ دھڑانے لگا تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ مجھے یہاں فوزیہ کے وجود کی خوشبو آتی محسوس ہوئی۔ میرے سیدھے ہاتھ کی طرف ایک گوشہ نما سی کوٹھری تھی جس کی چوکھٹ خالی تھی اور اس پر ٹاٹ جھول رہا تھا۔

''اوئے بابو! تو جلدی سے ریڑھا تیار کر۔'' ہوت رام نے اپنے ساتھ حیران پریشان کھڑے ادھیڑ عمر آدمی سے کہا۔ وہ ترنت باہر کو بھاگا جبکہ ہوت رام نے اسی خالی چوکھٹ والی کوٹھری کا رخ کیا۔ میرے اندر سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ شاید اندر مقید ان دونوں ''چھوکریوں'' کو لینے گیا تھا جس کے بارے میں بجلی نے ہدایت دے کر پھکو کو یہاں بھیجا تھا۔

میرا جی چاہا میں بھی دیوانہ وار ہوت رام کے پیچھے کوٹھری میں گھس جاؤں اور فوزیہ کو نکال کر دوڑ پڑوں لیکن بڑی مشکل سے میں نے خود کو اپنے اس ارادے سے باز رکھا کیونکہ ''کام'' تو ویسے ہی ہو رہا تھا۔ جلد بازی بنا بنایا کام بگاڑ سکتی تھی۔

میری منتظر نظریں کوٹھری کی خالی چوکھٹ پر لگی ہوئی تھیں۔ اس وقت میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ میرا دل رک رک کے دھڑکنے لگا۔

ہوت رام ان دو مذکورہ لڑکیوں کو لے کر کسی بھی وقت

اندر سے برآمد ہونے والا تھا جنہیں یہاں یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا اور میرا دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ان میں ایک ضرور فوزیہ بھی شامل تھی......

☆☆☆

اسی وقت ہوت رام دو لڑکیوں کو دبوچے اندر سے برآمد ہوا اور اگلے ہی لمحے جیسے میرا رک رک کے دھڑکتا دل یکلخت تھم گیا۔

پل کے پل مجھے یوں لگا کہ اب مجھے ماسوائے ایک ہی ہستی کے اور کچھ دکھائی نہ دے رہا ہو۔ کائنات جیسے میرے لیے رک گئی ہو، وقت کو موت آگئی ہو...... اردگرد کا منظر اوجھل ہو کر صرف دو وجود کا عکس پیش کرنے لگے ہوں۔ ایک میرا اور...... ایک فوزیہ کا......

ہاں...... وہ فوزیہ ہی تھی، میری فوزیہ...... میری پہلی اور آخری محبت۔ وہی فوزیہ جسے میں نے دل و جان سے چاہا تھا اور جس کی میں نے پرستش کی تھی۔ اس کی کھوج اور تلاش کے لیے میں اپنی ذات کو مٹا دینے پر تلا ہوا تھا۔ جس کے حصول کی خاطر میں دیوانہ وار آگ میں بھی کود سکتا تھا۔ میں جیسے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھا تھا۔ ہاں، وہ واقعی وہی تھی۔

پھر یہی وہ وقت تھا جب اچانک مجھے کسی نے زور سے ٹہوکا دیا۔ یوں جیسے مجھے سکتے کی حالت میں جگا دیا گیا ہو۔ ہوش و خرد کا یارا پاتے ہی مجھے اپنی دم بخود سی سماعتوں میں نادو کی تیز سی سرگوشی سنائی دی۔

''سہراب! ہوش کر...... یہ وقت ڈوبنے کا نہیں ہے۔'' یہ نادو تھی۔ وہ شاید اپنے نسوانی وجدان تلے میری کیفیات بھانپ چکی تھی۔

ہاں، مجھے خود کو اب سنبھالنا ہی تھا۔ میری منزل میرے سامنے تھی۔ دل تو چاہا کہ فوزیہ کو اسی وقت جا کے اپنے قبضۂ گرفت میں لے لوں اور مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاؤں لیکن یہ حالات اور وقت کا تقاضا نہ تھا۔ جوش کی جگہ ہوش منفعت بخش ہو سکتا تھا۔

فوزیہ کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی، کپڑے مسلے اور میلے نظر آرہے تھے، بال بکھرے ہوئے تھے۔ یہی حالت دوسری لڑکی کی بھی تھی۔ وہ غریب جانے کون تھی؟ یقیناً ان مردودوں کا شکار ہی تھی۔

میرا جی چاہا کہ اسی وقت آگے بڑھ کر فوزیہ کی آنکھوں سے پٹی اتار دوں تاکہ وہ مجھے دیکھ کر سکون پالے لیکن نہیں، یہ بھی شاید اچھا ہی تھا کہ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی ورنہ وہ مجھے دیکھتے ہی، مجھے پہچانتے ہی یکدم خوشی کے مارے چیخ پڑتی اور پھر ہوت رام وغیرہ چونک سکتے تھے۔ میں نے خود پر، اپنے اندر کے جوشِ ابال پر بڑی مشکلوں سے قابو پائے رکھا۔

دونوں ہی ڈری ہوئی اور دہشت زدہ تھیں۔ انہیں شاید اس قدر خوفزدہ اور ہراساں کیا ہوا تھا کہ وہ صرف سراسیمگی کے عالم میں خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے کے سوائے اور کچھ نہیں کر پا رہی تھیں۔

ہوت رام بڑی بیدردی سے ان دونوں کو دبوچے جانور کی طرح کھینچتا ہوا اور ہمیں بھی ساتھ آنے کا اشارہ دیتا ہوا باہر کو لپکنے لگا۔ میری نظریں فوزیہ پر جمی ہوئی تھیں۔ جی چاہا اس مردود ہوت رام کا ادھر ہی قصہ پاک کر ڈالوں مگر معاملہ اس طرح کے جوش میں بگڑ سکتا تھا جبکہ سب کچھ پہلے ہی ''ٹھیک'' جا رہا تھا۔

ہم باہر آ گئے۔ بابو رام گدھا گاڑی تیار رکھے ہوئے تھا۔ ادھر بستی میں ہڑبونگ کا شور صاف سنائی دینے لگا تھا۔

ہم سب ریڑھے میں سوار ہو گئے۔ اسکوٹر اب کام کا نہیں رہا تھا۔ اسے میں نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔

میں دانستہ فوزیہ کے قریب ہی آ بیٹھا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں اس کے قریب، بالکل قریب آ چکا تھا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ فوزیہ! میں آ گیا ہوں۔ تمہارے بالکل قریب ہوں۔ اب اپنے دل و دماغ سے یہ ڈر اور خوف نکال پھینکو۔ اب دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے نہیں چھین سکتی...... مگر میں اس غریب سے یہ بھی نہ کہہ سکا۔ بس، اس کی ہیئت کذائی پر اندر ہی اندر کڑھتا رہا تا ہم دلِ بے قرار و بے چین کو ایک سکون ضرور عطا ہو چکا تھا جس نے میری ہمت کو مہمیز کیا تھا، جس نے میرے حوصلوں کو سوا کیا تھا۔

پھکو واپس لوٹ گیا تھا۔ بابو رام نے بھی دوبارہ اپنے جھونپڑے کا رخ کیا تھا۔ ہوت رام نے گدھے کی باگ تھام لی تھی۔ یہ لوگ پولیس کے چھاپے سے سخت خوفزدہ اور ڈرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ شاید اسی وجہ سے ان کی عقل بھی خبط ہو گئی تھی۔

ہوت رام نے گدھے کی رسی تھامے ہوئے تھی اور اسے لشکارے جا رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں اس کے ڈنڈا تھا جس کے سرے پر کوئی جست کا زنگ آلود ڈبا تھا۔ اس کے اندر کنکریاں تھیں۔ وہ جب اسے گدھے کی پشت پر مارتا تو وہ زور سے ڈبے کے اندر بجنے لگتیں جس کے بعد گدھا گھبرا کر مزید دوڑنے لگتا۔

جلد ہی ہم نہر کے پار قدرے نشیب میں آ گئے۔ آبادی پیچھے رہ گئی تھی۔ نہر کا کراڑا اس قدر بلند تھا کہ اس پر بڑے سے تودے کا گمان ہوتا تھا۔

ایک جگہ ہوت رام نے گدھا گاڑی روک دی۔ یہاں کہیں کہیں کیکر اور لئی کے درخت نظر آ رہے تھے اور کہیں خشک ٹیلے بے پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان میں.... .... ناگ پھنی کی جھاڑیاں بھی دکھائی دیتیں۔ یہاں سرکنڈے اور پھونس کی ایک اور بڑی سی مڑھی دکھائی دی۔

ہوت رام نے مڑھی کے قریب گدھا گاڑی روک دی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ اندر اس کے اور ساتھی بھی ہو سکتے تھے۔ ایک پچھتاوے نے بھی کھد بڑا کہ میں یہاں آنے سے پہلے ہی راہ میں ہوت رام پر قابو پا کے اس ریڑھے پر فوزیہ کو آگے لے نکلتا لیکن خیر، میں تو اب فوزیہ کی خاطر دنیا سے بھڑ جانے کا عزم کیے ہوئے تھا۔ اندر جتنے بھی لوگ موجود ہوئے، میں ان سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔

گدھا گاڑی رکتے ہی ہم سب نیچے اتر آئے۔ میں نے ہوت رام سے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ ادھر پولیس نہیں آئے گی؟''

''بھگتو......! اوئے باہر آ جلدی......'' میری بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے مڑھی کی طرف منہ کر کے ہانک لگائی اور پھر مختصراً کہا۔

''نہیں۔''

ذرا دیر بعد ہی ایک کالا سا موٹا۔آدمی ٹاٹ کے جھولتے پیوند زدہ پردے کو ہٹا کر نمودار ہوا۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ چونک سا گیا پھر ہوت رام سے بولا، جو گدھے کی رسی کو ایک چھپر کے بدنما بانس سے باندھ رہا تھا۔

''خیریت تو ہے بھائی ہوتو! یہ سب کیا ہے؟ یہ کون ہے؟'' اس کا اشارہ میری اور نادو کی طرف تھا۔ میں بھی اس کا بغور جائزہ لینے میں محو تھا اور کبھی اس کے عقب میں مڑھی کے جھولتے ٹاٹ کی طرف دیکھ لیتا کہ شاید اس کا کوئی اور ساتھی اندر سے نمودار ہو۔

''کوئی خیریت ویریت نہیں ہے بھگتو!'' وہ اس کے پاس آ کر بولا پھر ایک نظر مجھ پر ڈالی اور دوبارہ بھگتو سے اندر کی جانب چلنے کا اشارہ دیتے ہوئے بولا۔

''ادھر پولیس آ گئی تھی۔ مکھیا نے ادھر بھیج دیا ہمیں۔ یہ سودے والی پالٹی (پارٹی) ہے۔'' آخر میں اس نے میری جانب اشارہ کیا تھا۔

ہم اندر آ گئے۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ ان دونوں کے علاوہ اندر اور کوئی نہ تھا۔

وہ لوگ فوزیہ اور اس کے ساتھ ہی لڑکی کو بھی اندر لے آئے تھے۔ نادو بھی ساتھ تھی۔ مڑھی اندر سے کشادہ تھی۔ وجہ یہی تھی کہ اس میں کوئی کوٹھری کمرا نہ تھا۔ دو کھری اور جھلنگا سی چارپائیاں دائیں بائیں دھری پڑی تھیں۔ پانی کا مٹکا تھا، جست کا کٹورا۔ ایک کونے میں سیاہی مائل اینٹوں کا چولہا بنا ہوا تھا اور اس پر ہانڈی تھی۔ آگ بجھی ہوئی تھی۔ کچھ گندے برتن ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ گرمی تھی تاہم ہوا کا گزر تھا جو کبھی گرم اور کبھی معمول کی محسوس ہوتی۔ ایک پرانا سا پیڈسٹل فین گزارے لائق رفتار سے چل رہا تھا۔

دو پیڑھیاں تھیں۔ ہم کھڑے رہے۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ میں فوراً حرکت میں آ گیا۔ سب سے پہلے بجلی کی سی تیزی سے ایک کھڑی ہتھیلی کا وار ہوت رام کی سوکھی گردن پر کیا۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ بھگتو کی آنکھیں پھیل گئیں۔

پھر یکلخت جیسے اسے ہوش آیا اور وہ قریب رکھے ہوئے ایک موٹے ڈنڈے کو اٹھانے کے لیے لپکا تو میں نے شکاری چیتے کی طرح اس پر جست لگائی۔ اسے رگیدتا ہوا فرش پر آ رہا اور وہ ڈنڈا بھی اچک لیا۔ میں نے ایک ہی وار اس بدبخت کی پیشانی پر کر کے اسے بھی ڈھیر کر دیا۔

نادو جیسے میری فتح کی منتظر تھی۔ اس نے فوراً آگے بڑھ کر فوزیہ کے دونوں ہاتھ کھول دیے اور اس کی آنکھوں سے بندھی ہوئی پٹی بھی کھول کر اتار پھینکی پھر دوسری لڑکی کی جانب بڑھی۔

''سہراب......!'' فوزیہ مجھے دیکھتے ہی چیخ پڑی اور بے اختیار میری جانب لپکی۔ میں خود دیوانہ وارفتانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا اور پھر ہم دونوں یوں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ گئے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے ہوں۔ ہم نے ایک دوسرے کو اس طرح بھینچ لیا تھا جیسے اب ساری زندگی اسی طرح بتا دینا چاہتے ہوں۔

''اگے ٹرن دی سوچو (آگے بڑھنے کی سوچو)۔ ایہہ وقت اگے بوہتا مل سکیں۔'' (یہ وقت آگے بہت ملتا رہے گا)۔

نادو نے ایک دم اپنے مخصوص پنجابی سرائیکی لہجے میں ہم سے کہا۔ اب نہ جانے اس نے شرارتاً کہا تھا یا روا روی میں، بہرحال اس کی بات غلط نہ تھی۔

ہم دونوں دھیرے سے الگ ہوئے۔ وہ لڑکی بھی ہمیں حیرانی سے تکے جا رہی تھی۔ ماحول کو دیکھ کر بات اس کی سمجھ میں کسی حد تک آنے لگی تھی کہ صورت حال بدل چکی ہے۔

نادو نے بھی اسے کچھ سمجھا دیا تھا۔
''فوزیہ! راحیلہ کہاں ہے؟'' میں نے ایک ذرا ٹھہر کر اس سے پوچھا۔
''مجھے اس کا کچھ نہیں معلوم۔'' فوزیہ دکھی لہجے میں بولی۔
میں نے ہونٹ بھینچ لیے پھر پوچھا۔ ''تم سے وہ کب اور کہاں بچھڑی تھی اور کیسے؟''
''یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ کسی جگہ پہنچ کر بتادوں گی۔ اس وقت میرا اپنا ذہن......''
''او کے......او کے......'' میں نے جلدی سے کہا۔
اس کے بعد ہم سب تیزی سے باہر نکلے۔ میں نے گدھے کی رسی کھولی۔ وہ تینوں سوار ہوئیں۔ میں بھی جلدی سے چوبی تختے پر گدھے کی رسیاں تھامے بیٹھ گیا۔
ڈنڈا اٹھایا اور فضا میں تھوڑا کھڑکا کر گدھے کو ٹٹکارا۔
''یہ چھنچھنا مت بجا۔ گدھا اڑیل نہیں۔ دوڑاتا جاسے۔'' نادو بولی۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ ڈنڈا ایک طرف رکھ دیا۔ گدھا گاڑی چلانے کا یہ میرا زندگی میں پہلا ہی تجربہ تھا۔
''کدھر چلنا ہے؟ مجھے آگے کا راستہ نہیں معلوم۔'' میں نے قدرے پریشانی سے کہا۔
''راستہ تو یہاں کا مجھے بھی نہیں پتا۔'' نادو بے بسی سے بولی۔
''میں بتاتی ہوں۔ اس طرف کو لے لو۔ وہ سامنے کچی کھوہ ہے۔ اس سے دائیں جانب ایک کچا دیہاتی راستہ ہے۔ اس پر لے لینا۔'' لڑکی نے اچانک کہا۔
''تم پھر اس طرف آجاؤ۔'' میں نے اس سے کہا۔ وہ کھسک کر میرے قریب آبیٹھی۔ فوزیہ میری پشت سے لگی بیٹھی تھی۔ نادو اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ میں نے گدھا گاڑی دوڑادی۔
کچا کھوہ قریب آگیا۔ وہاں سے ایک ٹیڑھا میڑھا ناپختہ راستہ دکھائی دیا۔ میں نے اس راہ پر گدھا گاڑی ڈال دی۔

☆☆☆

لڑکی فوزیہ ہی کی ہم عمر تھی جس نے اپنا نام ببلی بتایا تھا۔ وہ واجبی سی شکل کی ایک دیہاتی لڑکی تھی۔ رنگ گندمی تھا اور بوٹا سا قد۔
اب پتا نہیں یہ اس کا ''نک نیم'' تھا یا اصل۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ پوچھنے پر اس نے آگے بتایا کہ وہ بستی مٹھن کی رہنے والی ہے جو کچا صادق آباد روڈ اور ایک بڑی سی نہر کے کنارے کے قریب جمال دین والی کی حدود میں واقع ہے۔
صادق آباد سے لے کر یہ علاقے ضلع رحیم یار خان میں آتے تھے۔ مغربی سمت چلتے جاتے تو دریائے سندھ آجاتا اور اس کے پار سندھ تھا اور جنوبی پنجاب کے پہلے شہر ''روجھان'' کی حدود شروع ہوجاتی تھی۔ ابھی ہم دائیں جانب والی پٹی پر تھے۔
بھلا مجھے یہ سب کہاں معلوم تھا۔ میں تو خود زندگی میں پہلی بار اس طرف اور وہ بھی حادثاتی طور پر آیا تھا۔ مجھے یہ عمومی سی معلومات ببلی سے ملی تھیں۔
چونکہ خود نادو کی بھی منزل انڈس ریور کے پار واقع راجن پور تھی اور ہم بھی اس وقت ایک زاویے سے اسی جانب ہی بڑھے چلے جارہے تھے۔
دریا کے دوسری طرف جدھر ہم تھے، یہاں صادق آباد سے رحیم یار خان، بہاولپور اور ملتان تھا۔
ہم نے اپنا گدھا گاڑی والا سفر جاری رکھا۔ راہ میں جدھر آبادی نظر آتی، وہاں پانی وغیرہ پی لیتے اور کچھ لے کر کھالیتے اور پھر آگے بڑھ جاتے۔
ادھر میں ببلی سے انٹرویو لے رہا تھا اور دوسری جانب نادو، فوزیہ سے باتیں کرنے میں مصروف رہی۔
ببلی نے بتایا کہ وہ اپنے بڑے بھائی اور بھابی کے ساتھ رہتی تھی۔ بھابی اس پر بہت ظلم کرتی تھی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ دراصل اپنے ایک آوارہ اور بدمعاش ٹائپ بھائی سے اس کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ ببلی کیا، کسی بھی شریف لڑکی کو وہ پسند نہیں آسکتا تھا۔ انکار پر بھابی نے اس سے ناروا سلوک کرنا شروع کردیا تھا۔
بھائی زن مریدی کی اعلیٰ مثال قائم کیے ہوئے تھا۔ اس نے بھی بہن کو مجبور کرنا شروع کردیا تو وہ بھاگ کر اپنے ماموں کے پاس آگئی جو ایک خداترس اور دین دار آدمی تھا۔ بنگل جان جو اس کی بھابی کا مذکورہ بدمعاش اور بدقماش بھائی تھا، اس نے سزا اور ضد میں آکر ببلی کو اٹھوالیا۔ پہلے اس بے چاری کی عزت تار تار کی اس کے بعد اسے بھکاریوں کے ایک بڑے جرائم پیشہ گروہ بجلی کے آدمی کے ہاتھ فروخت کردیا۔
ببلی اپنے بارے میں یہ سب بتا کر شدتِ جذبات سے رو پڑی۔ میں نے اسے بہن کہہ کر مخاطب کیا اور تسلیاں دیتا رہا۔
ہمارا سفر بہ خیریت نارنجی پڑتی شام تک جاری رہا۔ ہم کچا صادق آباد روڈ اور اس کے بعد شہر بھی کراس کرچکے۔

جنوبی پنجاب اور دریا کی دوسری جانب کے زیادہ تر علاقے بیک وقت ویران، خشک، بنجر اور جنگلات پر مشتمل تھے۔ ایک طرف قحط اور خشک سالی رہتی اور دوسری جانب کی پٹی سیلاب کی زد میں۔

یہاں میں نے تھوڑی دیر کے لیے پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ کیا۔ گدھے کو کھول کر میں نے چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ قریب ٹوبہ بنا ہوا تھا۔ وہاں ہم نے جا کر منہ ہاتھ دھویا اور کچھ پانی اور خوراک کچے کے علاقے کی کسی بستی سے خرید کر ہم نے زادِراہ کے طور پر رکھی ہوئی تھی، اسی سے ہم نے گزارہ کیا۔

بلی خوش تھی۔ اس نے بتایا کہ ہم مٹھن بستی کے قریب ہی ہیں۔ ہم اسے اس کے ماموں گل شاد شاہ کے پاس چھوڑنا چاہتے تھے۔

ہم جدھر فروکش تھے، یہ کچے کا علاقہ سہی مگر ہریالی والا تھا۔ دور آبادی کے آثار نظر آرہے تھے مگر ہم نے وہاں جانے سے گریز ہی کیا تھا۔ ہم نہر کے قریب ہی ڈیرا ڈالے ہوئے تھے۔ ہمارے اردگرد درخت، جنگلی جھاڑیاں اور کہیں کہیں مٹی کے تودے نما ٹیلے بنے تھے۔ ہلکی مرطوب ہوا چل رہی تھی اور موسم خوشگوار تھا۔

میں فوزیہ کے ساتھ بیٹھ گیا اور میرے اشارے پر نادو، بلی کو لے کر ایک طرف جا بیٹھی۔ میں نے فوزیہ سے راحیلہ اور اس کے اپنے متعلق تفصیل پوچھی جس کے لیے میں پہلے ہی بہت بے چین تھا کیونکہ راحیلہ کے ابھی تک نہ ملنے کا مجھے دکھ تھا۔ وہ میری بہن تھی۔ فوزیہ کو ہی نہیں بلکہ یہ راز نادو کو بھی میں نے نہیں بتایا تھا کہ راحیلہ کا میرے ساتھ کیا رشتہ تھا۔

راحیلہ میرے لیے ہر وقت ایک مشیر کی طرح رہی تھی۔ بالخصوص ان نازک حالات میں جب میں سیٹھ سکندر، اقبال اور سلیم چھالیا وغیرہ کے چکروں میں پڑ کر ادھ موا ہوا جاتا تھا تو یہ راحیلہ ہی تھی جس نے مجھے حوصلہ اور سنبھالا دیا تھا۔ بے چاری کو اگرچہ اپنا بھی ''دکھ'' تھا مگر میں بھی مجبور تھا۔ وہ میری حقیقی بہن نہ سہی مگر بہرحال ایک راز کے طویل عرصہ مخفی رہنے کے سبب میں اسے بچپن اور لڑکپنے تک اپنی حقیقی بہن ہی سمجھتا رہا تھا اور یہ راز صرف میری ماں اور راحیلہ کو ہی معلوم تھا کہ ہم دونوں حقیقی بہن بھائی نہیں ہیں اور مزید یہ کہ اب جبکہ ہم دونوں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے تو ماں نے یہ راز مجھ پر آشکار کرتے ہوئے یہ بھی انکشاف کر ڈالا تھا کہ اب میں اور راحیلہ میاں بیوی بننے والے ہیں مگر میں نے صاف انکار کر دیا تھا اور ماں سے صاف کہہ دیا تھا کہ میں تیرے حکم سے کنوئیں میں چھلانگ لگا سکتا ہوں لیکن راحیلہ سے شادی کبھی نہیں کر سکتا کیونکہ میں آج تک اسے اپنی حقیقی بہن کے روپ میں ہی دیکھتا آیا ہوں۔ راحیلہ کو اس بات کا رنج تھا کیونکہ وہ اس ''راز'' سے واقف تھی اور مجھ سے محبت کرنے لگی تھی لیکن میں نے اسے بھی سخت لہجے میں جتا ڈالا تھا کہ وہ ایسا خیال دل میں بھی کبھی نہ لائے۔ باوجود میری اس بے رخی کے، اس نے ہر کڑے حالات میں میرا ساتھ دیا تھا اور مجھے اس میں کامیابی ملتی رہی تھی۔ یوں میں اسے اب بھی اپنی حقیقی بہنوں ہی کی طرح چاہتا تھا۔

فوزیہ نے اپنی بپتا صادق آباد اسٹیشن سے بچھڑنے کے بعد سے بتانا شروع کی۔

☆☆☆

ٹرین کے صادق آباد سے روانہ ہوتے ہی اچانک برتھ پر سوئی ہوئی فوزیہ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ سیٹ پر مجھے نہ پا کر پریشان ہوگئی اور اس نے دوسری برتھ پر لیٹی ہوئی راحیلہ کو جگا دیا۔

''سہراب سیٹ پر نہیں ہے۔'' فوزیہ نے متوحش ہو کر راحیلہ کو بتایا۔

''ٹوائلٹ گیا ہوگا۔'' راحیلہ جو بھری نیند میں تھی، غنودہ لہجے میں بولی تو فوزیہ نے اسے دوبارہ جھنجوڑا۔

''وہ ٹوائلٹ میں بھی نہیں ہے۔ اٹھو، اسے تلاش کرنا ہے۔ کہیں وہ نیچے پلیٹ فارم پر نہ رہ گیا ہو۔''

راحیلہ کو اب فکر ہوئی اور وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ دونوں نے مجھے بوگی کے تقریباً سارے ٹوائلٹ میں ڈھونڈ لیا۔ اب انہیں تشویش ہوئی۔ مسافروں سے پوچھا بھی تو ایک نے بتایا کہ میں صادق آباد کے پلیٹ فارم پر اترا تھا۔

راحیلہ کو اور تو کچھ نہ سوجھا، اس نے ٹرین کی زنجیر کھینچ دی۔ ٹرین ذرا دیر میں رک گئی۔ کنڈیکٹر گارڈ بوگی میں داخل ہوا۔ ان دونوں نے میرے بارے میں بتایا۔ وہ سخت بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے چڑ کر بولا۔

''او بی بیو! وہ کوئی بچہ تو نہیں تھا جو اسٹیشن پر رہ گیا۔ اب اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکے گی۔ دوسری گاڑی کے آنے کا وقت ہونے والا ہے۔ اس میں دوبارہ صادق آباد پہنچ کر اسے تلاش کر لینا۔''

''نہیں، ہم دوسرے اسٹیشن پر رک کر ریلوے تھانے میں رپورٹ کریں گے۔'' راحیلہ نے جواب دیا۔

’’تو کر دینا مگر ٹرین تب تک نہیں رکی رہے گی۔‘‘ کنڈیکٹر نے راحیلہ کے تیز لہجے سے ذرا خائف ہو کر کہا۔

’’ٹھیک ہے۔ اگلا اسٹیشن کتنی دور ہے؟‘‘ راحیلہ نے پوچھا۔

’’وہ ٹرین کا اسٹاپ تو نہیں ہے مگر تمہاری پریشانی کو دیکھتے ہوئے وہاں ٹرین رکوا دوں گا۔ انتظار کرو اور اب دوبارہ زنجیر مت کھینچنا ورنہ بھاری جرمانہ وصول کرلوں گا۔‘‘ گارڈ یہ کہتا ہوا چلا گیا۔

چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ٹرین رک گئی۔ فوزیہ اور راحیلہ سامان سمیت اتر گئیں۔ یہ ایک غیر آباد اور غیر معروف سا اسٹیشن تھا۔ بالکل سنسان اور ویران۔ اِکّا دُکّا اسٹالز تھے مگر وہ بھی بند۔ ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ اسٹیشن کی مختصر سی عمارت میں ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ ٹرین انہیں اتار کر فوراً ہی آگے روانہ ہو گئی۔

دونوں سوٹ کیس وغیرہ اٹھائے اسی عمارت کی جانب بڑھ گئیں۔ تاریک رات اور ویران غیر آباد ریلوے اسٹیشن میں دو جوان لڑکیاں کیسا محسوس کر سکتی تھیں، وہ ان کا دل ہی جانتا تھا۔

انہیں پلیٹ فارم پر ذرا فاصلے سے دو آدمی بھی دکھائی دیے جو اسی ٹرین سے نیچے اترے تھے۔ یہ دونوں درحقیقت شالا جی کے وہی گماشتے جیدا اور لاکھو تھے جنہوں نے بجھے صادق آباد اسٹیشن پر دھوکے سے پکڑ کر پہلے سے گھات لگائے ہوئے ساتھیوں کے حوالے کیا تھا۔ اب فوزیہ اور راحیلہ کو دبوچنے کے چکر میں دوبارہ ٹرین میں سوار ہو گئے تھے۔

ادھر یہ دونوں ان سے ناواقف تھیں۔ البتہ ایک سرسری نگاہ ان پر ضرور ڈالی تھی۔ وہ انہیں کوئی مسافر ہی سمجھی تھیں۔ انہوں نے ریلوے کی بوسیدہ عمارت کی طرف دیکھا اور سوچنے لگیں۔ جیدا اور لاکھو ان کی جانب بڑھنے ہی والے تھے کہ رک گئے کیونکہ اسی وقت ٹرین رکتے دیکھ کر ایک شخص سگنل والی سرخ اور ہری لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں انہی رنگوں کی جھنڈی پکڑے ان کے قریب آ گیا تھا۔

ان دونوں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا۔ وہ انہیں لے کر دروازے سے اندر داخل ہوا۔ سامنے ایک سیٹ پر ایک سفید وردی میں عملے کا ایک شخص بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کے سامنے بڑے سے چوبی فریم میں مختلف ڈائل، نقشے اور ایک عدد ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔

’’مشتاق صاحب! اٹھیے۔ کمپلین آئی ہے۔‘‘ مشتاق نامی وہ شخص جاگا اور السائی ہوئی آنکھوں سے جب رات کے اس سمے دو نوجوان اور خوب صورت لڑکیوں کو اپنے سامنے دیکھا تو ایک دم تن کر بیٹھ گیا۔ اس کی نیند بھی غائب ہو چکی تھی۔

’’جی، جی فرمائیے؟‘‘ اس نے دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

’’ہمیں رپورٹ لکھوانی تھی۔ ہمارا ایک ساتھی صادق آباد اسٹیشن پر رہ گیا ہے۔‘‘ راحیلہ نے کہا۔ ’’بھائی صاحب! آپ پلیز صادق آباد اسٹیشن فون کر کے سہراب نامی اس شخص کی تلاش کا حکم دیں اور اگر وہ مل جاتا ہے تو ہمارے بارے میں بھی اسے بتا دیں کہ ہم یہاں موجود ہیں۔‘‘

’’عمر کتنی ہے تمہارے ساتھی کی؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’وہ نوجوان ہے جی۔ ہماری ہی عمر کا ہے۔ ہمارا عزیز ہے وہ......‘‘ راحیلہ نے جواب میں بتایا۔

’’اچھا!‘‘ مشتاق نامی اسٹیشن کلرک عجیب سے لہجے میں بولا۔ ’’آپ سامنے بیٹھیے، میں دیکھتا ہوں۔‘‘ کہتے ہوئے اس نے دونوں کو سامنے ایک دیوار گیر لکڑی کی بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ دونوں خاموشی سے بیٹھ گئیں اور امید بھری نگاہوں سے کلرک کی طرف دیکھتی رہیں۔ اس نے اپنے سامنے رکھے فون سے صادق آباد ریلوے اسٹیشن میں انکوائری میں فون کیا اور ساری صورتِ حال بتائی۔ اس کے بعد اس نے ریسیور رکھا اور ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

’’پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے بتا دیا ہے۔ وہ پلیٹ فارم پر اعلان کر رہے ہیں کہ سہراب نامی شخص اگر پلیٹ فارم پر موجود ہے تو فوراً ریلوے انکوائری آفس کا رخ کرے۔‘‘

فوزیہ اور راحیلہ نے اس بھلے مانس آدمی کا شکریہ ادا کیا اور خاموشی سے بیٹھی رہیں۔ مشتاق ان سے پوچھنے لگا کہ وہ کہاں جا رہی تھیں؟ ان کا ساتھی کون تھا؟ وغیرہ۔ راحیلہ ہی اسے مناسب اور مختصر انداز میں جواب دیتی رہی۔

اس دوران میں کھڑکی سے پار نظر آنے والے نیم تاریک پلیٹ فارم پر راحیلہ کی نگاہ ان دونوں (جیدے اور لاکھو) پر پڑی۔ وہ بھی اندر ہی دیکھ رہے تھے پھر آگے بڑھ گئے۔ راحیلہ نے پھر بھی ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

کافی دیر گزر گئی تو راحیلہ نے اسے دوبارہ فون کر کے پتا کرنے کی درخواست کی۔ مشتاق نے دوبارہ فون کر کے معلوم کیا تو عقدہ کھلا کہ اعلان کے باوجود سہراب یا کسی بھی شخص نے صادق آباد ریلوے اسٹیشن کے انکوائری آفس سے

رابطہ نہیں کیا ہے۔
''اب کیا ہوگا؟ سہراب آخر کدھر چلا گیا؟'' فوزیہ ایک دم پریشان اور ہراساں ہوکر بولی۔ ''خ...... خ...... خدانخواستہ سہراب کے ساتھ کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا ہے؟''
مارے تشویش کے فوزیہ بینچ پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
''حوصلہ رکھو۔ میں دیکھتی ہوں۔ اللہ خیر کرے گا۔''
راحیلہ نے بھی اٹھ کر اسے تسلی دی اور مشتاق نامی اس بھلے مانس آدمی سے پھر درخواست کی۔
''بھائی صاحب! آپ پلیز یہاں ریلوے پولیس سے ہمارا رابطہ کروادیں۔ بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔ آپ نے اتنا تعاون کیا، تھوڑا اور کردیں۔''
''تعاون کرنا تو ہمارا فرض ہے بی بی! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔'' مشتاق خلیق لہجے میں بولا۔ ''مسئلہ یہ ہے کہ یہ ایک چھوٹا سا اسٹیشن ہے۔ پولیس تھانہ باہر ہے۔ آپ اسٹیشن کی عمارت سے سیدھی نکل جائیں اور دائیں جانب مڑ جائیں۔ سامنے ہی آپ کو تھانے کی پیلی عمارت دکھائی دے جائے گی۔''
''کیا وہاں تک آپ ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے؟'' فوزیہ نے ملتجی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''ضرور چلتا لیکن میں یہاں پینل ڈیسک پر بالکل اکیلا ہوں۔ مجھے منٹ منٹ میں کالیں ریسیو کرنا ہوتی ہیں اور آتی جاتی ٹرینوں کے بارے میں ریکارڈ نوٹ کرانا ہوتا ہے۔''
''وہ جو آدمی ہے جھنڈی والا......'' راحیلہ نے تجویز دی۔ ''اسے پلیز ہمارے ساتھ ذرا تھانے تک......''
''وہ بھی اکیلا ہے۔ اس وقت ہم دونوں میں سے کوئی بھی اپنی ڈیوٹی ایک سیکنڈ کے لیے بھی چھوڑنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔'' مشتاق بولا پھر انہیں حوصلہ دیتے ہوئے بولا۔
''آپ بالکل فکر نہ کریں اور بے دھڑک چلی جائیں۔ تھانہ زیادہ دور نہیں ہے۔''
ناچار دونوں آفس سے باہر آگئیں اور تاریک ویران پلیٹ فارم پر نیم مردہ قدموں سے چلنے لگیں۔
''آپ دونوں شاید اپنے اس ساتھی کی وجہ سے پریشان ہیں جو صادق آباد اسٹیشن پر تھوڑی دیر کے لیے اترا تھا؟''
اچانک ایک کھردری سی مردانہ آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی اور وہ چونک کر پلٹیں۔ راحیلہ نے دیکھا، یہ دونوں وہی مسافر تھے جو اسی ٹرین سے اترے تھے۔
ناموافق حالات اور پریشانی کے سبب وہ دونوں انہیں اپنا مددگار سمجھنے لگیں۔ راحیلہ نے تو نہیں البتہ بے چاری فوزیہ نے فوراً امید بھری نگاہوں سے ان دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے فوراً اثبات میں سر ہلا کر کہا۔
''ہاں...... ہاں...... بالکل...... ہم اپنے اسی ساتھی کو تلاش کررہے ہیں۔ کیا آپ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟ پلیز ہماری مدد کریں۔''
راحیلہ اب ان دونوں کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگی تھی۔ وہ فوزیہ کے مقابلے میں زیادہ ہوشیار اور چوکنا لڑکی تھی۔
''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ ہمارے سامنے ہی تو وہ نیچے اترا تھا۔'' جیدا چالاکی سے بولا۔ ''پھر صادق آباد اسٹیشن کے ایک ٹی اسٹال سے چائے پی کر وہ باہر چلا گیا تھا۔''
''باہر چلا گیا تھا؟ ہرگز نہیں......'' راحیلہ ایک دم تنک کر بولی۔ ''وہ ہمیں ٹرین کے اندر چھوڑ کر بھلا باہر کیا کرنے جاسکتا ہے؟ آپ ہمارا راستہ چھوڑیں۔ ہم خود ہی ڈھونڈ لیں گے۔'' راحیلہ کی تڑی پر وہ دونوں ایک طرف ہوگئے۔ راحیلہ نے حیران پریشان کھڑی فوزیہ کا بازو تھاما اور فوراً آگے چل دی۔
اس کے بعد پھاٹک سے باہر آگئیں اور چند لمحوں کے لیے رک کر اطراف واکناف کا جائزہ لیتی رہیں۔
''میرا تو دل ہول رہا ہے راحیلہ! خدا کرے سہراب خیریت سے ہو۔'' فوزیہ ایک گہری تشویش تلے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے بولی۔
''اللہ بہتر کرے گا فوزیہ! حوصلہ رکھو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں نا۔'' راحیلہ نے ازراہِ تشفی اس سے کہا۔
حقیقت یہی تھی کہ بے چاری راحیلہ میری اس طرح اچانک گمشدگی پر خود بھی پریشان اور متوحش سی ہورہی تھی لیکن وہ فوزیہ کے مقابلے میں ذرا زیادہ ہمت اور جرأت والی اور حوصلہ مند تھی۔
''تمہارا کیا خیال ہے؟ سہراب کے ساتھ خدانخواستہ کیا حادثہ پیش آیا ہوگا؟'' فوزیہ نے تشویش زدہ لہجے میں راحیلہ سے پوچھا۔
راحیلہ کا ذہن بہت پہلے سے ہی اس بارے میں سوچنے میں منہمک تھا۔ کئی خدشات، خیالات اس کے ذہن میں ابھرے تھے مگر وہ سب بتا کر فوزیہ کو مزید پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی، بولی۔
''کہا نا اللہ بہتر کرے گا۔ چلو آگے بڑھو۔''
ہر سو گھور تاریکی تھی۔ کچھ کچھ سے آوارہ کتے ادھر ادھر منڈلاتے ہوئے نظر آئے۔ اسٹیشن کی عمارت کے بیرونی پھاٹک کے باہر ایک پتلی سی نیم پختہ سڑک سامنے

جاتی تھی جس کے کنارے درخت اُگے ہوئے تھے۔ ایک اکلوتے پول پر ٹمٹماتا پیلی روشنی کا بلب مقدور بھر روشنی بکھیر رہا تھا۔ اسی کی روشنی میں دونوں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھتی رہیں۔

ایک احتیاط کے پیشِ نظر راحیلہ نے مڑ کر دیکھا تو وہی دونوں مشکوک آدمی جیدا اور لاکھو ان کے پیچھے پیچھے چلے آرہے تھے۔

''بھاگو فوزیہ......'' راحیلہ نے کہا اور دونوں نے دوڑ لگا دی۔ جیدا اور لاکھو بھی ان کے تعاقب میں دوڑنے لگے۔ راحیلہ ان دونوں کو ایسے ہی بدمعاش سمجھی تھی جو عموماً رات میں جوان عورتوں اور لڑکیوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔

بالآخر دائیں جانب گھومتی سڑک کے ساتھ وہ دونوں مڑ گئیں۔ سامنے ہی انہیں چند گام کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی پیلی عمارت دکھائی دے گئی۔ وہاں کچھ روشنی ہو رہی تھی۔ ان کی رفتار بڑھ گئی۔ پھاٹک پر ایک سادہ وردی والا شخص کرسی پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

جیدا اور لاکھو انہیں پولیس تھانے کی عمارت کے قریب دیکھ کر یکدم غائب ہو گئے تھے۔ شاید انہیں مزید کسی اور اچھے موقعے کی امید تھی۔

''کون ہو آپ؟ یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اس نے ان دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ راحیلہ نے اسے اپنا مسئلہ بتایا تو وہ کچھ سوچ کر انہیں اندر لے گیا۔ مختصر سے کچے احاطے میں پرانے ماڈل کی پولیس جیپ کھڑی تھی اور دوسری طرف احاطے کی سالخوردہ دیوار کے بالکل پاس ایک پولیس موبائل بھی کھڑی تھی مگر اس طرح کہ اس کے چاروں ٹائر فلیٹ تھے اور نہ جانے برسوں اسی طرح کھڑے رہنے کے سبب وہ کچی زمین میں دھنس گئے تھے۔ شیشے بھی اس کے ٹوٹے ہوئے نظر آرہے تھے۔ وہ ایک بیکار گاڑی تھی۔ کچھ ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کا ڈھیر بھی بکھرا دکھائی دیا۔

سادہ وردی والا انہیں لیے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا ایک کمرے کے دروازے کے سامنے رکا۔ چق ہٹائی اور انہیں لیتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

سامنے ہی ایک میز کرسی موجود تھی۔ وردی میں بیٹھا شخص دونوں ٹانگیں میز پر دھرے کرسی کی پشت گاہ سے سر لکائے خراٹے لے رہا تھا۔

''نظام صاحب! ایک کمپلین آئی ہے۔''

وہ آدمی ہڑبڑا کر جاگا اور پھر دو نوجوان لڑکیوں کو دیکھ کر ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ اب گھور گھور کر ان دونوں کو دیکھے جا رہا تھا پھر اس نے سامنے ایک بینچ پر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

راحیلہ نے اسے ساری بات بتا دی اور مدد کی درخواست کر ڈالی۔ وہ بولا۔

''دیکھیں بی بی! یہ معاملہ ہماری حدود میں تو پیش نہیں آیا ہے نا۔ وڈے انسپکٹر صاحب بھی اچانک پوری نفری لے کر کسی بڑے آپریشن پر گئے ہوئے ہیں۔''

''تو پھر ہم اب کیا کریں؟ ہمارے پیچھے تو دو غنڈے بھی لگے ہوئے ہیں۔'' راحیلہ نے تڑخ کر کہا۔ وہ فطرتاً نڈر تھی۔ کانسٹیبل جزبز سا ہوا پھر بولا۔

''آپ پھر ادھر ہی بیٹھ جائیں۔ آرام سے رات گزاریں۔ مجھے خود ساری رات ادھر ہی موجود رہنا ہے۔''

راحیلہ سوچتی بن گئی۔ اس کے پاس کانسٹیبل کا مشورہ ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ اب ایسے وقت میں جاتی بھی کہاں۔ اس نے اثبات میں جواب دیا تو فوزیہ یکدم فکرمندی سے بولی۔

''نہیں، صبح تک تو نہ جانے سہراب کے ساتھ کیا ہو جائے۔ ہمیں واپس اسٹیشن جانا چاہیے۔ گارڈ نے بتایا تھا کہ دوسری جانب سے ٹرین آنے والی ہے۔ اس میں سوار ہو کر ہم صادق آباد روانہ ہو جائیں گے۔ سہراب وہیں کھویا ہے، اسے تلاش بھی وہیں کیا جانا چاہیے۔''

فوزیہ کو بضد دیکھ کر راحیلہ بھی خاموش ہو گئی۔ وہ دونوں تھانے کی عمارت سے باہر آگئیں۔ وہی آدمی پھاٹک پر بیٹھا تھا۔ راحیلہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ دونوں بدمعاش (جیدا اور لاکھو) غائب ہو چکے تھے۔

دونوں دوبارہ تیز تیز قدموں سے ریلوے اسٹیشن کی جانب بڑھنے لگیں۔ اچانک ہی انہیں وہی دونوں بدمعاش ایک دم تاریکی سے نمودار ہوتے دکھائی دیے۔

''سامان پھینک کر بھاگو فوزیہ......!'' راحیلہ چیخی۔ دونوں نے یہی کیا۔ وہ اضافی بوجھ کے ساتھ نہیں دوڑ سکتی تھیں۔ دونوں بدمعاش بھی اسی سمت پر ان کا راستہ روکے کھڑے تھے جس طرف تھانہ تھا تاکہ یہ دونوں بھاگ کر دوبارہ تھانے کا رخ نہ کر سکیں۔

دونوں بگٹٹ بھاگیں۔ وہ بھی ان کے تعاقب میں لپکے۔ انہوں نے پتلی سی سڑک چھوڑ کر گھنے درختوں اور جھاڑیوں کی طرف رخ کیا پھر اندھیرے اور تاریکی سے فائدہ اٹھاتی ہوئی وہ انہیں جل دے کر بہت آگے جا نکلیں۔ یہاں تک کہ ایک آبادی دیکھ کر انہوں نے پناہ کے لیے

مجبوراً ایک گھر کا دروازہ بھی کھٹکھٹا دیا مگر دستک کے لیے پہلا ہی ہاتھ مارا تھا کہ دروازہ خود ہی کھل گیا۔

دونوں پہلے ہی اپنے حواسوں میں نہیں تھیں اور پناہ کے لیے بلا سوچے سمجھے اندر داخل ہو گئیں۔ راحیلہ نے پلٹ کر جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور بعد میں اسے خیال آیا کہ آخر مکان کا دروازہ کیوں کھلا تھا؟ یا پھر کس نے کھولا تھا؟ اس خیال سے وہ خوفزدہ سی ہو گئی۔ فوزیہ کی بھی یہی حالت تھی۔

''دروازہ کھلا ہوا تھا یا پھر کسی نے کھولا ہے؟'' فوزیہ بولی۔

''نہیں، پہلے سے ہی کھلا ہوا تھا۔'' راحیلہ نے جواب دیا۔ دونوں مکان کا جائزہ لینے لگیں۔ دو کوٹھری نما کمروں اور چھوٹے سے نیم پختہ صحن کے اس چھوٹے سے مکان کے صرف ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ دونوں تھوڑی دیر کے لیے سراسیمہ سی صحن کے ہی ایک کونے میں دبکی بیٹھی رہیں۔ تاہم ان دونوں کی نگاہیں اسی ہلکی روشنی پھوٹنے والے کمرے پر جمی رہی تھیں۔

دونوں کا نیند اور تھکن سے برا حال تھا۔ یہ گھر چھوٹا سہی لیکن گھر تو تھا اور ضرور یہاں کوئی عورت بھی رہتی ہوگی۔ اس طرح کونے میں چھپے رہنے سے بہتر تھا کہ وہ پناہ مانگ لیتیں اور آرام سے رات گزارتیں مگر انہیں کھٹک اس بات کی تھی کہ آخر اتنی رات گئے ایک گھر کا دروازہ کیونکر کھلا ہوا تھا؟ ممکن تھا کسی وجہ سے رات میں کوئی دروازہ بند کرنا بھول گیا ہو۔

کسی نئی مصیبت میں پھنسنے سے بہتر انہوں نے یہی خیال کیا کہ انہیں نکل جانا چاہیے مگر پھر باہر بدمعاشوں (جیدا اور لاکھو) کے خوف کے سبب ان کی ہمت نہ ہو سکی۔

یہ سوچ کر وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھیں اور آہستہ آہستہ ڈرتے ڈرتے اسی کمرے کی جانب بڑھنے لگیں۔ کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ دروازہ فقط بھڑا ہوا تھا۔ وہ جیسے ہی دروازے کے قریب پہنچیں تو ایک دم ٹھٹک کر رک گئیں اور ساتھ ہی ان دونوں کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخیں خارج ہو گئیں۔ ان دونوں کے دروازے کے پاس پہنچتے ہی وہ ایک دم کھلا تھا اور سامنے جو منظر انہوں نے دیکھا وہ ان دونوں لڑکیوں کا دل دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ کوئی چڑیل سی بکھرے بالوں اور وحشت زدہ آنکھوں والی درمیانی عمر کی عورت ہی تھی جس کے ایک ہاتھ میں خون آلود خنجر دبا ہوا تھا۔

وہ خنجر بدست عورت بھی انہیں دیکھ کر چونکی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے ناگن کی طرح پھنکار کر کہا۔

''خبردار! اب کوئی آواز حلق سے مت نکالنا ورنہ ادھر ہی تم دونوں کو ذبح کر ڈالوں گی۔'' فوزیہ اور راحیلہ کی خوف سے گھگی بندھی ہوئی تھی۔

''اسی طرح خاموشی سے اندر آ جاؤ۔'' اس عورت نے دوسرا حکم صادر کیا اور پھر ایک طرف ہٹ کر انہیں کمرے میں داخل ہونے کا راستہ بھی دے دیا۔ راحیلہ اور فوزیہ لرزتی کانپتی اندر داخل ہوئیں تو یکلخت ایک اور خوفزدہ سی کراہ آمیز چیخ ان کے منہ سے برآمد ہوئی۔

سامنے ایک چارپائی پر کسی کی خون میں لت پت پڑی ہوئی لاش نظر آئی۔ اس کے سینے پر کسی نے خنجروں سے وار کر کے شاید سوتے میں ہلاک کر ڈالا تھا۔ ان دونوں کو یہ سمجھنے میں کیا دیر لگی ہوگی کہ یہ حرکت اسی چڑیل نما عورت ہی کی ہو سکتی تھی جس کے ہاتھ میں ابھی تک خون آلود خنجر دبا ہوا تھا۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا خصم تھا۔ بگو نام ہے اس کا۔'' وہ عورت ان کے عقب میں اندر آتے ہی سرد اور سپاٹ لہجے میں بولی۔

''تت...... تم نے اسے اتنی بیدردی سے کیوں قتل کر ڈالا؟'' راحیلہ نے ذرا ہمت کر کے اس سے پوچھا۔

''اس نے میرے ساتھ اس سے زیادہ بیدردی کا سلوک کیا تھا۔'' عورت جواب میں بولی پھر وہ ان دونوں کی طرف تیکھی نگاہوں سے گھورتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''اب ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم دونوں کون ہو اور کہاں سے بھاگ کر آ رہی ہو؟''

فوزیہ کی تو ہمت نہیں پڑ رہی تھی بولنے کی البتہ راحیلہ نے کچھ حوصلہ جما رکھا تھا، بولی۔

''ہم دونوں کہیں سے بھاگی ہوئی نہیں ہیں۔ مصیبت کی ماری ضرور ہیں۔ پناہ کے لیے یہاں آئے تھے۔ دروازہ کھلا تھا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔''

''کیا؟'' وہ عورت چونکی۔ ''دروازہ کھلا تھا؟'' یہ سنتے ہی وہ تیزی سے باہر کو لپکی۔ وہ شاید دروازہ بند کرنے کمرے سے نکلی تھی۔

''راحیلہ! یہاں سے چلو۔ مم...... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' فوزیہ نے کہا۔ دونوں کو یوں بھی خون آلود لاش والے اس کمرے سے وحشت ہو رہی تھی۔

دونوں باہر نیم تاریک صحن میں آ گئیں۔ وہ عورت دروازہ بند کر چکی تھی۔

''دلشاد نام ہے میرا۔ تمہاری طرح میں بھی مصیبت کی ماری ہوئی ہوں۔'' وہ ان کے قریب آ کر بولی۔ خنجر ہنوز اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم اب یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔
راحیلہ نے کہا اور فوزیہ کا ہاتھ پکڑے جیسے ہی دروازے کی جانب بڑھی تو اس عورت نے یکدم آگے بڑھ کر ان کا راستہ روک لیا اور ساتھ ہی خنجر والا ہاتھ بھی سامنے کر دیا۔ دونوں بوکھلا کر رک گئیں۔

''تم دونوں اب میری مرضی کے بغیر یہاں سے نہیں جاسکتیں۔'' وہ عورت زخمی ناگن کی طرح پھنکار کر بولی۔
''کیونکہ تم نے یہ سب دیکھ لیا ہے۔''
''ہتت...... تو کیا تم ہمیں قتل کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟''
راحیلہ نے قدرے سنبھل کر کہا۔
''اگر میری بات نہیں مانو گی تو یہ بھی کر گزروں گی۔''
وحشت زدہ اس عورت نے خونخوار لہجے میں تنبیہ کی۔ اس دھمکی اور خطرناک ارادوں پر فوزیہ بے چاری ڈر کے راحیلہ سے لگ گئی۔ راحیلہ نے ہمت کی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''تم ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں۔ ہم شور مچا دیں گے۔ تم رنگے ہاتھوں پکڑی جاؤ گی۔''
ان کا خیال تھا کہ یہ عورت ڈر جائے گی مگر اس کے برعکس اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔
''مچا دو شور...... میں بھی کہہ دوں گی لوگوں سے کہ اس جرم میں تم دونوں بھی میرے ساتھ شریک تھیں۔''
اس کی مکاری پر راحیلہ اندر سے بری طرح کھول اٹھی۔ اس نے بے بسی سے اپنے ہونٹ چبائے اور بالآخر ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔
''تم کیا چاہتی ہو؟''
''مدد۔''
''کیسی مدد؟''
''تم دونوں نے اس لاش کو دفنانے میں میری مدد کرنا ہوگی۔''
''لل...... لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' راحیلہ کا لہجہ اٹکنے لگا۔
''دوسرے کمرے کا فرش سارا کچا ہے۔ وہیں قبر کھود کر لاش کو گاڑ دینا ہے۔ قصہ ختم پھر تم اپنا راستہ لینا اور میں اپنا۔''
''نن...... نہیں، ہم یہ کام نہیں کر سکتے۔ خدا کے لیے ہمیں جانے دو۔'' فوزیہ اس وحشی عورت کے عزائم سن کر سراسیمہ انداز میں بولی۔
''تمہیں میری مدد کرنا ہوگی ورنہ میرے ساتھ تم دونوں بھی پھنس جاؤ گی۔'' اس عورت نے پھر انہیں گھورتے

کامیاب لوگ

کامیاب لوگ اپنے کردار، سلوک، رویے یا حالات کے لیے دوسرے افراد کو الزام نہیں دیتے بلکہ طرزِ عمل کا ذمے دار اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ کوئی فرد آپ کی مرضی یا کوتاہی کے بغیر آپ کو دکھ نہیں دے سکتا۔ ہمیں حالات پریشان نہیں کرتے بلکہ ان حالات میں ہمارا ردِعمل کیا ہوتا ہے۔ مثبت ردِعمل حالات کی گتھی کو سلجھا دیتا ہے اور منفی ردِعمل دکھ دیتا ہے۔ تمام کامیاب لوگ اس انداز سے کام کرنا پسند نہیں کرتے جیسا کہ ناکام لوگ کرتے ہیں۔ کامیاب لوگ اپنا کام صرف اس لیے نہیں کرتے کہ وہ کام انہیں پسند ہوتا ہے بلکہ وہ اس کام کو ہر صورت میں کرتے ہیں جو کامیابی کے لیے ضروری ہو، چاہے وہ انہیں پسند ہو یا نہ ہو۔

آئیڈیل

یہ فقرہ اکثر لوگوں کو بولتے ہوئے سنا ہے کہ دوسروں کو آئیڈیل مت بناؤ بلکہ خود دوسروں کے آئیڈیل بنو۔
اگر اس پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ عمل بھی کر لیا جائے تو اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوگی۔ انسان کی زندگی ہی سنور جائے گی کیونکہ دوسروں کا آئیڈیل ہم اسی صورت میں بن سکتے ہیں جب ہم میں خوبیاں پائی جائیں اور یاد رکھیے کہ جب کسی شخص میں خوبیوں کا بسیرا ہو جائے تو خامیاں تو خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔

قابلِ غور

☆ مایوسی سے بڑھ کر دنیا میں بُری چیز کوئی نہیں۔ مایوسی موت کا دوسرا نام ہے۔
☆ اگر آپ سیکھنا چاہیں تو اپنی ہر ایک غلطی سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتے ہیں۔
☆ گزرے ہوئے وقت پر افسوس نہ کرو کہ وہ واپس نہیں آسکتا۔ موجودہ وقت سے فائدہ حاصل کرو کیونکہ یہ تمہارے اختیار میں ہے اور تم اس سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہو۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم۔ حویلی لکھا، اوکاڑہ)

ہوئے دھمکایا۔ ”اگر صبح بگو کا کوئی رشتے دار آ گیا یا کوئی اور تو پھر کسی کی بھی خیر نہیں۔“

”فوزیہ! ہمت کرو۔ ہمیں اب یہ کرنا ہی پڑے گا۔“ راحیلہ نے ہار مانتے ہوئے فوزیہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ وحشی عورت کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔

”تم آرام سے ایک طرف بیٹھ جانا۔ میں اور یہ اس کام کو جلد ہی نمٹا دیتے ہیں۔“ پھر وہ اس عورت سے مخاطب ہو کر بولی۔

”یہ بتاؤ، کھدائی کرنے والا کوئی سامان بھی تمہارے پاس موجود ہے یا نہیں؟ یا اس کا بھی بندوبست کرنا پڑے گا؟“

”سب موجود ہے۔“ وہ عورت بولی۔ ”دوسرے کمرے میں پھاوڑا اور کدال پڑے ہیں۔ آؤ میرے ساتھ پہلے قبر کھود تے ہیں۔“

اس نے دوسرے کمرے کی جانب اشارہ کیا۔ فوزیہ سراسیمہ انداز میں صحن میں ہی کھڑی رہ گئی۔ وہ عورت راحیلہ کو لیے دوسرے کمرے میں آ گئی۔ اندر آتے ہی اس نے بتی جلا دی۔

کمرا خالی تھا۔ معمولی بوسیدہ فرنیچر نظر آ رہا تھا۔ اس کا فرش بھی کچا اور قدرے اونچا نیچا تھا۔ ایک جانب پھاوڑا اور کدال رکھے تھے۔ اس عورت نے واقعی پہلے سے ہی یہ بندوبست کر رکھا تھا۔

دونوں کام میں جت گئیں۔ کبھی ستانے لگتیں اور کبھی کھچا کھچ گڑھا کھودنے میں مصروف ہو جاتیں۔ دونوں اس مشقت اور گرمی کے سبب پسینے سے تر بتر ہو چکی تھیں۔ راحیلہ بے چاری کا تو پہلے ہی تھکن سے برا حال تھا لیکن اس نئی مصیبت کو بھی جھیلنا پڑا۔

انہیں دو گھنٹے لگ گئے۔ اب آخری مرحلہ لاش کو دوسرے کمرے سے اٹھا کر یہاں لا کے گاڑ دینا تھا اور مٹی برابر کر دینا تھی۔

تھکی ہاری دونوں کمرے سے باہر آئیں تو دیکھا فوزیہ بے چاری صحن میں ہی ایک کونے میں بیٹھے بیٹھے سکڑ سمٹ کر سوئی پڑی تھی۔

”میں کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔ تم جب تک ستالو۔“ عورت نے کہا۔ اس کا نام ابھی تک انہیں معلوم نہیں ہوا تھا۔

وہ رسوئی میں چلی گئی۔ راحیلہ، فوزیہ کے قریب آ کر بے سدھ پڑ گئی لیکن ذرا دیر بعد ہی عورت نے دونوں کو ہی جگا دیا۔ صبح کی روشنی منڈیروں سے جھانکنے لگی تھی۔

عورت اندر سے ایک چارپائی لے آئی تھی۔ تینوں نے اسی پر بیٹھ کر ناشتا زہر مار کیا۔

اس دوران عورت بولتی بھی رہی۔ اس نے اپنا نام بتول بتایا تھا۔ وہ تیس پینتیس کے پیٹے میں تھی۔ بگو سے اس کی شادی کو پانچ برس بیت چکے تھے۔ اولاد کوئی نہ تھی۔ بتول نے بگو سے محبت کی شادی کی تھی۔ چونکہ بگو کو بتول کے گھر والے پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ دوسرے گاؤں میں رہتے تھے۔ بتول نے بگو سے بھاگ کر شادی کی تھی اور دونوں یہاں آن بسے تھے اور ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے کہ بگو کا رویہ بدلنے لگا۔ وہ بات بات پر بتول سے لڑنے جھگڑنے لگتا۔ بتول یہ سب سہتی رہی۔ وہ اسے مارتا بھی تھا تب بھی بتول چپ رہتی کیونکہ اب وہ کہاں جاتی۔ گھر والوں کی مرضی کے بغیر اس نے شادی کی تھی اور وہ بھی گھر سے بھاگ کر۔

لہٰذا بتول شوہر کا ظلم سہتی رہی لیکن جب اس پر ایک دن یہ انکشاف ہوا کہ درحقیقت وہ اپنے ہی گاؤں کی ایک لڑکی کو پسند کرنے لگا ہے، نہ صرف یہ بلکہ وہ اس سے شادی بھی کرنے والا تھا تو بتول کے اندر کی منتقم عورت جاگ گئی۔ اس نے شقاوت قلبی میں آ کر بگو کو اس رات خاموشی سے سوتے میں خنجر کے وار سے ہلاک کر ڈالا تھا۔

ناشتے کے بعد بتول اور راحیلہ نے ہی مل کر اندر جا کر بگو کی لاش اٹھائی اور گڑھے میں جا کر ڈال دی۔

خون آلود خنجر بھی گڑھے میں پھینک دیا گیا تھا۔ ساری نشانیاں دھو دی گئیں۔

”اب تم بگو کے بارے میں لوگوں کو کیا بتاؤ گی؟ آخر تو لوگ تم سے یہ سوال کریں گے ہی، کہ تمہارا شوہر اچانک کدھر غائب ہو گیا؟“ راحیلہ نے بتول سے پوچھا۔

”یہی کہوں گی کہ کسی کام کا بتا کر گاؤں سے باہر چلا گیا ہے۔“ بتول بے پروائی سے بولی۔

”آخر کب تک چھپا سکو گی یہ سب؟“ راحیلہ نے دوسرا سوال داغا۔

”کچھ دنوں بعد میں بھی خاموشی سے چلی جاؤں گی۔“ بتول نے جواب دیا۔

وہ تینوں تھکی ہوئی تھیں۔ زیادہ باتیں نہ کر پائیں اور سو گئیں۔ دن چڑھے تک سوتی رہیں۔ ان کی آنکھ دروازہ زور سے دھڑ دھڑانے پر کھلی تھی۔

تینوں جاگ گئیں۔ راحیلہ اور فوزیہ گھبرانے لگیں۔ بتول نے انہیں تسلی دی۔ ”کوئی آیا بھی ہوگا تو میں اسے

بہانے سے چلتا کردوں گی۔تم فکر نہ کرو۔‘‘

وہ دروازے پر گئی۔کوئی ملنے والی تھی۔بتول نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے اسے دروازے سے ہی چلتا کردیا۔

راحیلہ نے اپنے بارے میں بتول کو کچھ نہیں بتایا تھا۔فقط روایتی سی جھوٹی کہانی سنادی تھی کہ وہ بھی گھر سے بھاگی ہوئی ہیں۔دونوں کزنز ہیں۔لاہور جانا چاہتی ہیں اور فلم میں کام کرنے کا شوق ہے وغیرہ۔ان دونوں نے ایک عقل مندی یہ بھی کی تھی کہ بتول کو اپنے نام بھی غلط بتائے تھے۔

درحقیقت راحیلہ اور فوزیہ کا ارادہ صادق آباد میری تلاش میں جانے کا تھا مگر وہ بتول کو یہ بات نہیں بتانا چاہتی تھیں۔ان کا ارادہ خاموشی سے بتول کے گھر سے نکل جانے کا تھا۔

فوزیہ تو ایک پل کے لیے بھی یہاں نہیں رکنا چاہتی تھی۔ایک موقعے پر فوزیہ اور راحیلہ دونوں کی آپس میں مختصر سی بحث بھی ہوگئی۔

’’تم نے کیا اس وحشی اور خونی عورت سے انٹرویو شروع کردیا ہے۔فوراً یہاں سے نکلنے کی کرو۔‘‘فوزیہ نے راحیلہ سے تیز لہجے میں کہا تو راحیلہ برا منائے بغیر بولی۔

’’ہمیں اب یہاں سے نکلنے کے لیے بھی پہلے سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے فوزیہ!‘‘

’’وہ کیوں؟‘‘

’’تم بہت بھولی ہو۔تمہیں موجودہ حالات کی خطرناکی کا احساس ہی نہیں ہوا۔‘‘ راحیلہ بولی۔’’ہم اب بتول یا اس کے گھر سے چھپ کر ہی نکل سکتے ہیں۔کسی کی ہم پر نظر نہ پڑے ورنہ آج یا کل اس قتل کا بھید تو کھل ہی جائے گا۔ہم نظروں میں آگئے تو ہم پر بھی الزام آسکتا ہے۔‘‘

فوزیہ کو اب حالات کی اصل خطرناکی کا ادراک ہوا۔وہ پریشان اور متوحش سی ہوگئی۔اسی لہجے میں بولی۔

’’تو پھر ہم کیسے نکلیں گے یہاں سے؟‘‘

’’اسی لیے تو میں بتول سے گھلنے ملنے کی کوشش کررہی ہوں کیونکہ یہی ہمیں کسی طرح اپنے پاس سے محفوظ طریقے سے باہر نکال سکتی ہے۔‘‘

’’تو کرو نا اس سے بات۔‘‘فوزیہ کو جلدی تھی۔

راحیلہ نے جب بتول سے یہ بات کہی کہ اب ان دونوں کا بھی یہاں سے نکلنے کا وہ ’’محفوظ‘‘ بندوبست کر ڈالے تو بتول مکارانہ مسکراہٹ سے بولی۔

’’میں نے ایک اور فیصلہ کیا ہے۔‘‘

خوش رہنے کا فن

کون خوش نہیں رہنا چاہتا لیکن خوش رہنے کے فن سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے لوگ خوشیاں سمیٹ نہیں پاتے۔خلیل جبران کہتا ہے کہ ’’ہر حال میں خوش رہا جاسکتا ہے اور اگر تم نے ہر حال میں خوش رہنے کا فن سیکھ لیا تو تم نے زندگی کا سب سے بڑا فن سیکھ لیا ہے۔‘‘خوش رہنا پریشان رہنے سے زیادہ آسان ہے لیکن اس کو سیکھنے سے پہلے آپ کو ان وجوہات کا علم ہونا چاہیے جن کی وجہ سے لوگ عموماً ناخوش رہتے ہیں۔

1-انسان خوش نہیں رہ سکتا جب اسے وہ کچھ مل رہا ہو جو وہ چاہتا نہیں اور وہ کچھ نہ مل رہا ہو جو وہ چاہتا ہے۔

2-دوسروں میں دلچسپی نہ لینے والا خوش نہیں رہ سکتا۔

3-خوشی تمنا سے نہیں ملتی بلکہ یہ تو بانٹنے سے ملتی ہے۔

4-دوسروں سے زیادہ توقعات وابستہ کرنے والا خوش نہیں رہ سکتا۔

5- وہ خوش نہیں رہ سکتا جو کسی شرط (Condition) کی بنیاد پر خوش ہے۔مثلاً اگر مجھے فلاں چیز ملی تو میں خوش ہوں گا۔

6-وہ لوگ جو چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت بڑا کرنے کے عادی ہوتے ہیں، وہ کبھی خوش نہیں ہوسکتے کیونکہ چھوٹی باتیں چھوٹے دماغوں کو پریشان کرتی ہیں۔

احساس اور رشتے

خالی ضرورتیں پوری کرنے سے رشتے نہیں نبھتے۔ضرورتیں تو آپ ملازمین کی بھی پوری کرتے ہو۔ضرورتیں تو آپ ان کی بھی پوری کردیتے ہو جن کو آپ جانتے تک نہیں۔

اصل چیز ’’احساس‘‘ ہے۔

جب تک احساس پیدا نہیں ہوگا، رشتہ نبھتا نہیں......گھسیٹا جاتا ہے۔

(مرسلہ:محمد انور ندیم،حویلی لکھا،اوکاڑہ)

''وہ کیا؟'' راحیلہ پریشان سی ہوگئی۔
''میں بھی تم دونوں کے ساتھ لاہور کا رخ کروں گی۔'' بتول نے اپنا فیصلہ مختصراً انداز میں سنا دیا۔ راحیلہ اور فوزیہ کا چہرہ فق ہوگیا کیونکہ انہوں نے تو اس سے یہ جھوٹ ہی بولا تھا کہ یہ دونوں فلم کے شوق میں گھر سے بھاگ کر لاہور جارہی ہیں جبکہ حقیقت یہ تھی ان کا ارادہ میری تلاش میں صادق آباد جانے کا تھا۔
''آخر ہم تینوں اب ایک ہی کشتی کی سوار بن چکی ہیں۔'' بتول نے آخر میں اٹھلا کر کہا۔ وہ ایک قتل کرکے اس قدر مطمئن نظر آرہی تھی جیسے شب گزشتہ کچھ ہوا ہی نہ ہو جبکہ راحیلہ بالخصوص فوزیہ کو یہ سوچ سوچ کر ہی ہول آرہا تھا کہ وہ ایک خونی عورت کے ساتھ ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ اس نے اپنے بے وفا شوہر کا قتل کرکے اس کی لاش بھی اسی گھر میں گاڑ رکھی ہے۔
''نن...... نہیں، ہم...... تمہیں اپنے ساتھ کہیں نہیں لے جاسکتے۔'' راحیلہ کے بجائے فوزیہ نے یکدم بتول سے کہا۔
''وہ کیوں؟'' بتول نے تیکھے چتونوں سے فوزیہ کو گھور کر کہا تو فوزیہ بے بسی سے راحیلہ کی طرف دیکھنے لگی۔ راحیلہ کو پہلے ہی بتول پر غصہ تھا۔ اسی لہجے میں اسے مخاطب کرکے بولی۔
''دیکھو بتول! تم نے جو گل کھلایا، ہم نے مجبوری میں تمہارا ساتھ دیا۔ ہمارے راستے الگ ہیں۔ تم ہمارے ساتھ......''
''بکواس بند کرو اپنی۔'' بتول نے انہیں جھاڑ دیا اور لگی آنکھیں دکھانے۔ ''مت بھولو کہ تم دونوں اب اس جرم میں شریک ہوچکی ہو میرے ساتھ۔ مجھے تو یوں بھی اب زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ زندگی نے میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا کیا ہے۔ میں بددل ہوچکی ہوں۔ لاہور جاکر کسی کوٹھے میں بیٹھ جاؤں گی۔ تقدیر نے گندا کرہی دیا ہے تو یہی سہی۔''
بتول بہت مایوس اور منتشر الدماغ ہورہی تھی۔ فوزیہ بے چاری تو اس عورت سے خوفزدہ تھی ہی، اب راحیلہ کو بھی اس سے ڈر محسوس ہونے لگا تھا۔
بالآخر فوزیہ نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے فی الحال اس کی بات پر صاد کرلیا اور اگلے دن صبح تڑکے تینوں نے یہاں سے نکل جانے کا منصوبہ بنالیا۔
پھر جب پو پھٹنے لگی تھی تو راحیلہ اور فوزیہ، بتول کو سوتا چھوڑ کر اس کے گھر سے نکل بھاگیں۔ یہ دونوں مکان سے اس احتیاط کے ساتھ باہر نکلیں کہ کسی راہ چلتے کی ان پر نظر نہ پڑ جائے۔
وہ وہاں سے بھاگتی ہوئی کسی مین روڈ کی تلاش میں تھیں تاکہ واپس صادق آباد کا رخ کیا جائے مگر راستوں سے انجان تھیں۔ کسی سے اب پوچھ پاچھ بھی نہیں سکتی تھیں کیونکہ بقول راحیلہ کے ایک مکان میں قتل اور چوری کی واردات ہوچکی تھی۔ اس گاؤں میں یہی دونوں اجنبی تھیں۔ یوں چوری اور قتل کا عقدہ کھلنے کے بعد کہیں لوگ انہی پر شبہ نہ کرنے لگ جائیں۔ یوں دونوں سڑک کی تلاش میں اسی طرح بنجر اور ویران علاقوں میں دور تک بھٹکتی رہ گئیں۔ گنے سے لدی ہوئی ایک ٹریکٹر ٹرالی میں انہوں نے چوری سے سواری کی اور ایک اور بستی میں جانکلیں۔ وہاں بھی انہیں یہی خوف رہا کیونکہ اس طرف انہوں نے ایک پولیس موبائل کو گشت کرتے پایا۔ لامحالہ انہیں وہی خوف لاحق ہوا کہ کہیں پولیس ان کی تلاش میں تو نہیں۔
وہ وہاں سے بھی بھاگ نکلیں پھر ایک ٹرک میں چوری چھپے سواری کی۔ رات ہوچکی تھی۔ وہ نصف رات میں کہیں بھلاں وستی میں ذرا دیر کو رکا۔
فوزیہ کو حاجت محسوس ہوئی اور وہ ذرا دیر کے لیے رکی تو ٹرک آگے نکل چکا تھا۔ راحیلہ اسی ٹرک میں فروٹوں کے ڈبوں سے ٹیک لگائے سوتی رہ گئی تھی۔
اب فوزیہ رات میں تنہا رہ گئی۔ راحیلہ سے اسے بہت حوصلہ تھا مگر اب اکیلی اور اجنبی علاقہ، رات کا وقت ...... وہ ہراساں ہوگئی اور یوں اس نے مجبوراً ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ وہ گھر شکور بے جراح کا تھا جس کے بدقماش بیٹے ڈاڈے نے اسے پناہ دی اور بعد میں زرد آنکھوں والے مرادے گورکن کی جھونپڑی میں قیدی بنالیا اور اس بدبخت گورکن نے بھی پیسوں کے لالچ میں چالاکی سے فوزیہ کو بجلی کے ہاتھوں فروخت کردیا۔
یوں اب راحیلہ کا کچھ پتا نہ تھا کہ وہ ٹرک میں سوئی ہوئی کہاں جاچکی تھی اور نیز فوزیہ کو نہ پا کر اس پر کیا بیتی ہوگی وغیرہ۔
☆☆☆
فوزیہ نے یہ سب بتا کر ایک غمگین سی خاموشی اختیار کرلی۔
میں اور نادو خاموشی سے فوزیہ کی یہ ساری بپتا بڑے غور سے سنتے رہے۔ راحیلہ کے لیے فوزیہ بھی اتنی ہی فکرمند اور غمگین تھی جس قدر میں تھا۔ دونوں میں بہنوں والا پیار اسی وقت سے پنپ چکا تھا جب فوزیہ کا دنیا میں کوئی نہ رہا تھا۔ بھائی ماجد (ماجا لکڑ) میرے ہاتھوں حادثاتی طور پر ہلاک ہوا

تھا جبکہ ماں جوان بیٹے کے غم میں داغِ مفارقت دے گئی تھی۔یوں بے چاری فوزیہ بھری جوانی اور بھری دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔تب میں اسے اپنے پاس لے آیا تھا۔راحیلہ نے اسے بہن بنالیا تھا اور اسی نے دکھوں کی ماری فوزیہ کو بہت حوصلہ ملا تھا۔یہی سبب تھا کہ راحیلہ کی جدائی اسے بالکل ایسے ہی محسوس ہو رہی تھی جیسے اس کی کوئی بہن کھو گئی ہو۔

''تم فکر مت کرو فوزیہ!'' اس کی سوگواری اور تشویش کو بھانپتے ہوئے میں نے ازراہ تشفی اس سے کہا۔''آخر تمہیں بھی میں نے ڈھونڈ ہی نکالا نا۔بھروسا کرو مجھ پر۔میں بہت جلد راحیلہ کو تلاش کرلوں گا۔آخر کو وہ میری بھی بہن ہے۔''

ایک ذرا توقف کے بعد میں نے سوال کیا۔''اچھا تم مجھے ذرا سوچ کر اس ٹرک کے بارے میں تھوڑا بہت کچھ بتا سکتی ہو جس میں راحیلہ سوئی رہ گئی تھی۔یعنی وہ کیسا ٹرک تھا؟ کس روٹ کا تھا؟ کہاں جا رہا تھا؟ اس کا کوئی نمبر وغیرہ؟''

''نمبر نوٹ کرنے کا مجھے بھلا کب ہوش تھا۔'' وہ جواب میں بولی۔''لیکن وہ ایک بڑے کیبن والا ٹرک تھا۔اس پر گنے اور کچھ فروٹ کی پیٹیاں لدی ہوئی تھیں۔اس کے پیچھے ڈبل وھیل تھے۔''

''دس وھیل......'' میرے ذہن میں ابھرا پھر پوچھا۔

''اب وہ کہاں، کس روٹ پر تھا؟ اس کا مجھے نہیں معلوم۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے فوزیہ سے کہا کہ وہ صرف اتنا بتادے کہ پھلاں وتی سے کس رخ پر وہ ٹرک جا رہا تھا؟ تو فوزیہ نے مجھے بتادیا۔چونکہ میں اور نادو پھلاں وتی کے گردو جوار میں رہے تھے۔یوں بھی مجھ سے زیادہ نادو ان راستوں سے اچھی طرح واقف تھی۔اس نے فوراً تاڑ لیا اور بولی۔

''میرا خیال ہے وہ ٹرک...... چک گیارہ سے بھٹاوان کی سڑک پر آیا ہوگا اور وہاں سے جمال دین والی سڑک پر آگے نکل گیا ہوگا۔''

''تم یہ کیسے یقین سے کہہ سکتی ہو؟'' میں نے امید طلب اور قدرے غیر یقینی سے انداز میں نادو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''اس لیے کہ جس ناپختہ سڑک سے وہ ٹرک آگے جا رہا تھا، وہ نہر والی شاخ روڈ کہلاتی ہے جو بھٹاوان سے جمال دین کی طرف ہی نکلتی ہے اور یقیناً یہ ٹرک وہاں سے گزرا ہوگا۔''

اس کی بات سن کر میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور پھر فوزیہ سے پوچھا۔

''تم اس ٹرک کے کیبن کا رنگ بتا سکتی ہو؟''

''سیاہ......'' فوزیہ نے بتایا تو میرے ذہن میں فوراً ہی ایک چمکتا ہوا خیال ابھرا۔

بہت کم دس وھیلر ٹرکوں کے ڈرائیونگ کیبن کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔عموماً سرخ، نیلے اور ہرے رنگوں کے یہ دس وھیلر ٹرک ہوتے ہیں۔

''سہراب! راحیلہ مل جائے گی نا؟'' فوزیہ نے اچانک گہری تفکیر تلے مجھ سے پوچھا۔

''ان شاء اللہ! میں اسے ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔'' میں نے محض فوزیہ یا اپنی طفل تسلی کے لیے یہ الفاظ نہیں کہے تھے بلکہ پورے مستحکم لہجے میں فوزیہ سے یہ کہا تھا۔اس پر نادو نے بھی فوزیہ کو تسلی دیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''تجھے بھی تو آخر ڈھونڈ نکالا نا ہم نے۔فکر نہ کر۔راحیلہ بہن کو بھی اسی طرح بہت جلد ڈھونڈ نکالیں گے۔اب شام ہو رہی ہے۔ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔''

شام واقعی گہری ہونے لگی تھی۔ہم پھر چل دیے اور بالآخر مٹھن بستی میں بلی کے ماموں کے گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔

وہ ایک باریش انسان تھا۔جب ہم نے اسے بلی کے بارے میں ساری دکھ بھری داستان سنائی تو وفورِ جذبات تلے اس نے بلی کو اپنے سینے سے لگالیا اور ہمارا بہت ممنون ہوا۔

اس نے بتایا کہ وہ بے اولاد ہے اور بلی کو ہی اس نے اپنی بیٹی بنا رکھا تھا۔وہ اپنے خودغرض اور زن مرید بھائی جمال اور اس کی بیوی کے پاس نہیں رہنا چاہتی تھی تو میرے پاس آگئی تھی۔

گل شاد کی بیوی بھی بلی کو بیٹیوں کی طرح چاہتی تھی۔ہم سب تھوڑی ہی دیر میں گھل مل گئے۔فوزیہ سے متعلق بھی میں نے اسی حد تک بتایا کہ ہمیں خبر ملی تھی کہ ان جرائم پیشہ بھکاریوں کے ایک گروہ نے جس کا سربراہ بجلی نامی موٹا کالا بھجنگ ایک شخص تھا جو خود بھی بھکاری بنا ہوا تھا۔اس کا گروہ خوب صورت اور جوان لڑکیوں کو اغوا کر کے ان سے بھیک وغیرہ منگواتا اور کھپانے کی کوشش کرتا تھا۔

گل شاد نے ہماری بہادری کی تعریف کی اور دعائیں دیں۔ہم نے اس سے اجازت چاہی اور اندر ہی اندر راستوں سے راجن پور پہنچنے کا اتا پتا دریافت کیا۔ساتھ ہی اسے سمجھا دیا کہ ہمارے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہے وغیرہ۔

اس کے علاوہ گل شاد نے بلی کی بھابی اور اس کے بھائی کے بدقماش سالے بنگل جان کے خلاف بھی کارروائی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔اسے اپنے کیے کی سزا ضرور ملنا

چاہیے تھی جس نے معصوم بلی کے ساتھ ظلم کیا تھا۔

وہ رات ہم نے وہیں گزاری اور صبح صادق ہم تینوں وہاں سے رخصت ہوئے۔ گدھا گاڑی ہمارے ساتھ تھی۔ بھلے مانس گل شاد نے ہمیں زادِراہ کے طور پر کچھ کھانے پینے کی اشیا دے دی تھیں۔

ہم شہر جمال دین والی میں جانے کے بجائے اس کے مضافاتی راستوں سے گزر کر انڈس ریور کے قریب پہنچنے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔ اس کے پار ہمارا سفر صحیح معنوں میں راجن پور کی طرف تھا۔ نادو کے مطابق وہاں کوٹ مٹھن ہماری منزل تھی جس کے قریب واقع ایک گاؤں میں اس کا کوئی ''جاننے والا'' رہتا تھا۔ یہ گاؤں دریا (انڈس ریور) کے پاس ہی تھا۔ کوٹ مٹھن ڈسٹرکٹ راجن پور میں ہی تھا۔

ایک مقام پر پہنچ کر ہم ذرا دیر کے لیے رکے تو میں نے نادو کو یاد دلایا کہ اس کا سوٹ کیس وغیرہ تو موسی کے پاس ہی رہ گیا۔

''اس کی فکر نہیں ہے مجھے۔'' نادو بولی۔ ''موسی کو میں جانتی ہوں۔ وہ کسی کی بھی امانت میں خیانت نہیں کرتی اور پھر مجھے تو وہ اپنی بیٹی ہی سمجھتی ہے۔ اس نے میری امانت سنبھالے رکھی ہوگی۔ میں کسی طرح اس سے وہ منگوالوں گی بلکہ وہ خود ہی آکر جہاں میں کہوں گی، مجھے پہنچادے گی۔''

میں اس تذبذب میں تھا کہ کیا مجھے آگے کا سفر کرنا چاہیے تھا جبکہ راحیلہ کا بھی کچھ پتا نہ تھا۔ ادھر دشمن اور پولیس میرے تعاقب میں تھے۔ نادو کے بارے میں فوزیہ کو میں نے مختصراً بتادیا تھا۔

''فوزیہ! تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس ٹرک کی آگے کہاں منزل تھی؟ یعنی وہ کہاں جارہا تھا؟''

فوزیہ بے چاری کیا جواب دیتی۔ وہ سوچتی رہ گئی تو نادو بولی۔

''اب اس بے چاری کو کیا معلوم لیکن میرا خیال ہے کہ راحیلہ، فوزیہ کو نہ پاکر آگے کہیں موقع تاک کر اس باربردار ٹرک سے اتر گئی ہوگی۔''

نادو کی بات مجھے معقول لگی اور میں نے غور کرنے کے انداز میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ راحیلہ بھی چک جھورا اور پھلاں وستی کے آس پاس کہیں بھٹک رہی ہوگی۔''

''یہ بھی ضروری نہیں۔'' نادو نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ سوتی رہی ہوگی اور جاگی بھی ہوگی تو ضروری نہیں کہ اسے اتنی جلدی ٹرک سے نیچے اترنے کا موقع بھی مل گیا ہو۔''

اس کی بات قابلِ غور تھی۔ نادو نے مجھے مزید یہ مفید مشورہ بھی دیا کہ راجن پور پہنچنے کے بعد وہ ہمارا سب سے محفوظ اور آخری ٹھکانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی راحیلہ کی تلاش کے لیے کوئی منصوبہ بنایا جاسکتا ہے۔

بقول اس کے راجن پور میں نادو کے بہت سے جاننے والے اور عزیز رشتے دار بھی تھے۔ وہ ہماری خاطر خواہ مدد بھی کرسکتے تھے۔ خود میرے اندر بھی راجن پور اور نادو کے حوالے سے ایک نامعلوم سا تجسس موجود تھا۔ بھولے کے ساتھ اس کا وہیں جانے کا ارادہ تھا۔

ہم سفر کرتے ہوئے دریا (انڈس ریور) پار کرگئے اور اب چلچلاتی دھوپ اور سخت گرمی تلے گدھا گاڑی کو چلاتے ہوئے کچے کے علاقوں سے گزر رہے تھے۔ راجن پور اب کچھ میل کی مسافت پر رہ گیا تھا۔

ایک جگہ کیاد کا کھیت تھا۔ وہاں پانی اور تیار فصلوں کی بھراس اٹھ رہی تھی۔ قریب ہریالی تھی۔ وہاں ایک چھتنار درخت تلے ہم نے گدھا گاڑی روک دی۔ اریب قریب میں آبادی کے آثار نظر آرہے تھے۔

گدھے کو ہم نے چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ ہم خود گدھا گاڑی سے اتر کر تھوڑا چل پھر کر جسم کی اکڑن دور کرنے لگے۔ چوبی تختے والی اس گدھا گاڑی نے ہمارے جسم کی چولیں ہلادی تھیں۔

قریب ایک چھوٹی سی نہر سے ہم نے منہ ہاتھ دھویا۔ اس کے بعد گدھا گاڑی پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ ہمارے سر پر گھنے چھتنار درخت کی چھایا تھی۔

ہم تھکے ہوئے تھے۔ ہمیں نیند آگئی۔ جاگے تو شام جھک آئی تھی۔ گدھا چرنے کے بعد ہمارے قریب ہی شریفوں کی طرح آکھڑا ہوا تھا۔ وہ خاصا سدھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے رینکنے سے ہی ہماری آنکھ کھلی تھی۔

میں نے اسے گاڑی کے ساتھ جوتا اور پھر روانہ ہوگئے۔ اب ہمارے سامنے کھلی آبادیوں والے اَن گنت کچے اور نیم پختہ راستے تھے۔ ہم آبادی سے ذرا ہٹ کر ہی اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ نادو نے خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر ہم اسی طرح بغیر رکے اپنا سفر جاری رکھیں تو رات تک راجن پور پہنچ ہی جائیں گے۔

ہم نے اب یوں بھی کہاں رکنا تھا۔ آرام اور نیند کرچکے تھے۔ زادِراہ تقریباً ختم ہی ہوچکا تھا ماسوائے ایک پانی کی بھری چھاگل کے۔

ہم ایک نیم جنگلاتی علاقے سے گزرنے لگے جس کے

پارکماد کے کھیت تھے۔ وہاں آبادی کے آثار نظر آتے تھے۔ ایک بورڈ نظروں سے گزرا جس پر بستی شکر پور درج تھا۔

دفعتاً ہماری گدھا گاڑی کا ایک پہیا زور سے چرچرایا اور اگلے ہی لمحے وہ ٹوٹ کر الگ ہوگیا۔ گاڑی ایک جانب جھک گئی۔ نادو اور فوزیہ کے حلق سے بے اختیار چیخیں برآمد ہوگئیں اور وہ نیچے آن گریں۔

میں بھی گرا تھا مگر جلد ہی سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور ان دونوں کو بھی سنبھالا۔ گدھا رک کر رینکنے لگا۔ میں نے اسے خاموش کرایا اور دیکھا تو سر پکڑ لیا۔

پہیا ٹوٹ کر جدا ہوگیا تھا۔ نادو نے ہی اس کی خرابی کا جائزہ لینے کے بعد بتایا کہ اس کی کِل ٹوٹ گئی ہے اور اب اسے کوئی کاریگر ہی بنا سکتا ہے۔ ناچار ہم نے آبادی کا رخ کیا۔

یہاں گدھا گاڑی مرمت کرنے والے موجود تھے۔ ایک دکان پر ہم نے اس کی مرمت کروائی اور پھر آگے روانہ ہوگئے۔

رات ہونے تک ہم راجن پور کی حدود میں داخل ہوچکے تھے۔ کوٹ مٹھن اب زیادہ دور نہ تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ نادو یہاں پہنچنے کے بعد بہت خوش اور مطمئن نظر آرہی تھی لیکن میں بہت پریشان اور فکرمند تھا۔ وجہ راحیلہ تھی۔ جہاں مجھے فوزیہ کے مل جانے کی خوشی تھی تو وہاں راحیلہ کی ہنوز گمشدگی کا دکھ بھی تھا۔

نادو مجھے تسلیاں دیتی رہی تھی کہ مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ راجن پور پہنچنے کے بعد ہمارے لیے بہت سی آسانیاں پیدا ہوجائیں گی۔ نیز یہ اسی کا علاقہ تھا۔ وہ پیدا بھی ادھر ہی ہوئی تھی۔ بعد میں وہ لوگ یہاں سیلاب اور کبھی خشک سالی کے سبب تنگ آکر صادق آباد کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔

راجن پور کے بارے میں نادو نے مجھے ایک مقامی شاعر کے خوب صورت مصرعے کو گنگناتے ہوئے بتایا تھا کہ راجن پور کا ایک بڑا علاقہ غیر آباد اور ویران ہے۔ اسے مقامی زبان میں ''پچادھ'' کہتے ہیں۔ اس علاقے میں پانی کی شدید کمی ہے اور بیشتر رقبے ویران پڑے رہتے ہیں۔ پانی کی عدم فراوانی کے سبب خال خال آبادی ہے۔ پانی کا واحد ذریعہ بارش ہے۔ بارش کو نشیب میں جمع کرلیا جاتا ہے جسے ''ٹوبہ'' کہتے ہیں۔

اس ٹوبے سے انسان اور جانور سبھی پانی پیتے ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ضلع راجن پور کا مشرقی حصہ سیلاب سے ڈوبتا ہے جبکہ مغربی حصہ قحط کا شکار ہوتا ہے۔

ہم بالآخر رات گئے راجن پور پہنچ ہی گئے۔ ایک طرح سے مجھے بھی نادو کی طرح ہی ایک سکون کا احساس ہونے لگا کیونکہ نادو نے مجھے بتایا تھا کہ یہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا لیکن جب میں اس سے یہ پوچھنے کی کوشش کرتا کہ اس کے یہاں رشتے کے کون لوگ آباد ہیں تو وہ ٹال جاتی۔ حالانکہ وہ ذکر کرچکی تھی کہ یہاں اس کے بہت جاننے والے ہیں۔

ایک گھر کو تلاش کرتے کرتے ہم وہاں دروازے تک پہنچ ہی گئے۔ ہر سو تاریکی اور ویرانی کا راج تھا۔ کچھ آوارہ کتے اِدھر اُدھر منڈلاتے اور کبھی بھونکتے دکھائی دیے۔ بھینسوں کے باڑے اور کچھ ڈولیاں باہر رکھی دکھائی دیں۔ کچے پکے گارے مٹی والے گھر ایک دوسرے سے فاصلے پر تھے اور کچھ تو بالکل ملے ہوئے تھے۔

ایک کنواں بھی تھا جو نہ جانے کتنے عرصے سے سوکھا پڑا تھا۔ اس کی منڈیروں اور دیواروں کی ننگی اینٹیں کہیں کہیں سے ادھڑی ہوئی تھیں۔ اس پر برسوں کی دھول اور درختوں کے پتے گرے ہوئے تھے۔ اندر کچھ پانی بچا ہوا تھا۔ اوپر کھجور کا ایک تنا گرا ہوا تھا اور اس پر چرخی کے ساتھ رسی بندھی ہوئی تھی جس سے بندھی بالٹی جھول رہی تھی۔ اس میں بھی ان گنت سوراخ نظر آرہے تھے۔

یہ گھر جس کے سامنے ہم رکے تھے، نسبتاً کشادہ اور پختہ سرخ اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بھینسوں کا باڑا تھا جس کا پھاٹک بند تھا اور وہاں دو کتے السائے ہوئے انداز میں اگلی ٹانگوں میں تھوتھنیاں دیے پڑے تھے۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے فقط ایک ذرا گردن اٹھا کر ہولے سے ''ہنہ'' کی تھی۔ اس کے بعد اپنی تھوتھنیاں اگلی ٹانگوں میں رکھ دیں۔

دروازے کی پیشانی پر پیلا بلب روشن تھا اور اس کے گرد مچھروں کے جھرمٹ نے سیاہ ہالا بنا رکھا تھا۔ مجھے یہ کسی چھوٹے موٹے زمیندار کا ہی گھر محسوس ہوا۔

میں اندر سے ڈر بھی رہا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ میرے پیچھے پولیس تھی۔ نادو پر بھی اب تک یقیناً پولیس کیس بن ہی چکا ہوگا۔ کیا ہم یہاں محفوظ ہوسکتے تھے؟ میرے ذہن میں یہی سوال بار بار گردش کررہا تھا۔

نادو نے دروازے پر دستک دی۔ دوسری اور تیسری دستک پر اندر سے کسی کی نیم غنودہ سی بھاری مردانہ آواز ابھری۔

''آتا ہوں، آتا ہوں۔ کون آگیا اس وقت؟'' اندر والے نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ نادو نے اس

کی طرف دیکھا۔ وہ شخص ایک خاصے ڈیل ڈول والا اور اونچا لمبا تھا۔ اوپری جسم ننگا تھا اور نیچے فقط لنگی۔ رنگ گندمی اور چہرے پر ڈاڑھی مونچھیں تھیں۔ اس کی عمر تیس پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ بال سیاہ اور گھنگرالے تھے۔

نادو پر اس کی نظر پڑی اور وہ جیسے یکلخت بت بن گیا۔ اسے ہمارا ابھی یارانہ رہا۔ اگرچہ ایک سرسری سی نظر ہم پر بھی اس نے ڈالی تھی مگر نادو کو تو دیکھتے ہی اسے ایک چپ کھا گئی۔

''وے ..... بختے! مجھے نہیں پہچان رہا ہے، اپنی نادی کو.....؟'' نادو نے یک گونا مسرت تلے اس سے کہا۔

''نن..... نادی.....! تو..... مم..... مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔'' اس آدمی کے حلق سے بہ مشکل برآمد ہوا اور پھر بے اختیار اس نے اپنے دونوں بازو وا کیے۔ نادو فوراً اس میں جا سمائی۔ میری طبیعت پتا نہیں کیوں مکدر سی ہونے لگی۔

نہ جانے ان دونوں کے بیچ کیا رشتہ تھا؟

''نادی! مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ یہ تو ہی ہے۔'' آدمی نے اسے آہستگی سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے سے بے پایاں مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی۔ نادو کا بھی یہی حال تھا، بولی۔

''خود سے لگا کر بھی اپنی نادی پر یقین نہیں آرہا ہے تجھے؟'' نادو نے ایک ادائے دلربائی سے کہا تو میں ہولے سے کھنکھارا۔ وہ جھینپ کر میری جانب متوجہ ہوئی اور پھر ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''یہ ہمارے ساتھ ہیں۔ ہمیں مدد کی ضرورت ہے، بختے!''

''مدد.....؟ تیرے واسطے تے میری جان بھی حاضر ہے۔'' بختے نے فوراً اس سے کہا اور پھر فوزیہ اور مجھ پر ایک نظر ڈالی اور ہمیں اندر لے گیا۔

صحن کشادہ تھا۔ سامنے برآمدہ اور تین کمرے نظر آئے۔ صحن میں ایک دو بڑی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان پر بستر بچھے ہوئے تھے۔ ایک خالی تھی۔ شاید اسی پر یہ ''کم بختا'' سو رہا تھا۔

دوسری چارپائی پر کوئی بوڑھی سی عورت سوئی ہوئی نظر آئی۔ اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔

ایک جانب چھپر تلے دو بھینسیں بندھی ہوئی تھیں اور قریب کھرلی تھی۔ وہاں نیم تاریکی تھی۔ صحن میں بختے نے روشنی کر دی تھی۔ اس کی چارپائی کے قریب ایک پیڈسٹل پنکھا تھا۔ دائیں جانب کے کونے میں مرغی کا دڑبا بنا ہوا تھا۔ ایک طرف غسل خانہ اور دوسری جانب رسوئی تھی۔

برآمدے میں تین عدد سرکنڈوں کے مونڈھے پڑے تھے۔ ایک لکڑی کی بینچ بھی تھی۔ وہ ہمیں اندر ایک کمرے میں لے گیا۔

اس نے کوئی سوئچ ٹٹول کر لائٹ جلائی۔ کمرا خاصا کشادہ تھا۔ یہاں بھی بڑی نقشین پایوں والی دو عدد چارپائیاں پڑی تھیں۔ ایک پر کوئی صحت مند سی نوعمر لڑکی سوئی ہوئی تھی۔ مجھے وہ گیارہ بارہ سال کے پیٹے میں ہی محسوس ہوئی۔ چھت کا پنکھا تیز چل رہا تھا۔

''ارے، یہاں تو شالی سو رہی ہے۔'' بختا بولا۔ ''یہ جھلی جنی، کبھی کہاں سو جاتی ہے تو کبھی کہاں۔ آجاؤ، دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔''

وہ لائٹ بجھا کر باہر آگیا۔ ہم بھی اس کے ساتھ نکل آئے۔ دوسرے کمرے میں پہنچے۔ اس نے لائٹ جلائی۔ یہاں کونے میں ایک پرانا مگر اچھی حالت میں ایک پلنگ پڑا تھا۔ دوسری سمت بڑا سا جھولا تھا۔ وسط میں فرنیچر تھا۔ ہم اس پر بیٹھ گئے۔ درمیان میں بڑی سی میز تھی۔

''تم لوگ آرام سے بیٹھو۔ میں کچھ کھانے پینے کو لاتا ہوں۔'' بختا یہ کہہ کر چلا گیا۔

میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ فوزیہ تھوڑی نروس نظر آرہی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ نادو سامنے والی کرسی پر۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''یہ آدمی تیرا کیا لگتا ہے؟'' میرے پوچھنے پر نادو نے ایک نگاہ فوزیہ پر ڈالی اور معنی خیز مسکراہٹ تلے کہا۔

''یہ میرا بہت کچھ لگتا ہے۔ چھوڑ اس بات کو..... تم دونوں اب کسی بات کی فکر مت کرو۔ یہ بختیار ہے۔ بہت اچھا اور شریف انسان ہے۔ ہر کسی کے لیے جان لڑا دینے والا۔''

مجھے نادو کی یہ بات ''یہ میرا بہت کچھ لگتا ہے'' عجیب ہی لگی۔ جی میں تو آئی کہ اس سے پوچھ ہی لوں۔ ''تو پھر بھولا کیا لگتا تھا تیرا..... جس نے تیری خاطر اپنی جان دے دی؟''

سچی بات یہی تھی کہ بھولے کو میں نہیں بھولا تھا۔ خواہ میرا اور اس کا ساتھ چند گھنٹوں کا ہی رہا ہو لیکن اس کی جی داری، اس کی باتیں اور اس کا میرے ساتھ دوستانہ سلوک ...... مجھے نہیں بھولتا تھا۔ انسان کے بھی ہزار رنگ ہوتے ہیں۔ نہ جانے اب یہ نادو کس رنگ میں ظاہر ہونے والی تھی؟ کون تھی، کیا تھی؟ میرا اس کے متعلق تجسس شاید اب تمام ہونے ہی والا تھا۔

تاہم اب نادو کے متعلق میرے دل کے کسی کونے میں جو تلخی دبی ہوئی تھی، وہ دوبارہ ضرور ابھرنے لگی تھی۔ وجہ یہی تھی کہ اگر یہ بختیار عرف ''بختا'' اس کا ''بہت کچھ'' تھا تو

پھر بھولے کے ساتھ نادو نے کیوں محبت کا جھوٹا کھیل کھیل رکھا تھا بلکہ بھولے کے ہی بقول وہ اس کی منگ تھی جسے شالاجی نے اس سے چھین لیا تھا۔

اب پتا نہیں کیا چکر تھا یہ۔ بہرحال میں نے اپنے دل میں تہیہ کررکھا تھا کہ نہ صرف نادو سے دریافت کروں گا بلکہ کسی موقع پر آڑے ہاتھوں بھی ضرور لوں گا۔

- نادو سے متعلق یہ پراسرار پھانس جو بہت دنوں سے میرے دل میں چبھی ہوئی تھی، وہ شاید اب نکلنے والی تھی۔

میرا موڈ خراب سا ہورہا تھا۔ نادو مجھے بھانپتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی مگر بولی کچھ نہیں۔ درحقیقت میں خود ایسا نہیں تھا۔ اپنی غرض کی خاطر کسی کو چھل فریب دینا میری فطرت میں نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو آج میں بھی اقبال اور سلیم چھالیا وغیرہ کے گینگ میں شامل ہوکر عیش کررہا ہوتا۔ یوں ''حالتِ جنگ'' میں نہ ہوتا۔ سیٹھ سکندر کے صرف ایک ادنیٰ ملازم کی حیثیت سے اس کی مدد کرتے ہوئے میں آج اس حال میں تھا۔

بھولے نے دوستی کے نام پر میرے دل ودماغ میں اپنی جو اثر پذیری قائم کی تھی، یہ اسی کا شاخسانہ تھا کہ نادو کے اس قدر ساتھ دینے کے باوجود میرا دل اس سے کھٹا ہونے لگا تھا۔ صرف اس ایک بات پر کہ اگر یہ آدمی اس کا ''سب کچھ لگتا تھا'' تو پھر اس نے بے چارے بھولے کو بھولپن میں کیوں رکھا تھا؟ جبکہ خود نادو کی منزل بھی راجن پور تھی۔

اگرچہ اس تمام عرصے میں نادو کے ساتھ بھی میرا ایک دوستی کا تعلق قائم ہوگیا تھا۔ دوستی بھی ایسی ویسی نہیں رہی تھی۔ اس میں ایک ایثار اور قربانی کی مثال تھی لیکن دوستی تو میری سلیم چھالیا، راجو بوری وغیرہ سے بھی تھی لیکن جیسے ہی میرے سامنے ان کی اصلیت آشکار ہوئی، میں ان سے دور ہوگیا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ دوستی اب جانی دشمنی میں بدل چکی تھی۔

بختیار دوبارہ نمودار ہوا۔ اب کے اس کے ہاتھ میں کھانے پینے کے برتن تھے۔ لسی، جوار کی روٹی، ساگ، مکھن اور ایک بڑی سی پلیٹ میں مرغی کے سالن کی بھری پلیٹ تھی۔

یہ شاید رات کا بچا ہوا سالن تھا۔ شوربے میں تین بڑی بوٹیاں ڈوبی ہوئی تھیں۔

ہم نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ نہ جانے کب سے بھوکے تھے۔ پیٹ بھرا تو نادو کے حوالے سے میرا غصہ بھی کچھ ٹھنڈا پڑا تھا۔ یہ فطری بات تھی۔ پیٹ خالی ہو تو غصہ بھی عروج پر ہوتا ہے۔ خمارِ گندم شے ہے ہی ایسی۔ دل ودماغ کو غنودہ سا بنا دیتی ہے۔

جیسا میں بتا چکا ہوں کہ راحیلہ کے مقابلے میں فوزیہ ایک عام سی لڑکی تھی۔ البتہ راحیلہ کو میں نادو کی ''ٹکر'' اور ''قبیل'' کی لڑکی ضرور سمجھتا تھا۔ اسی لیے میں نے فوزیہ کو آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ کیونکہ میرا ارادہ بختیار اور نادو سے راحیلہ کی تلاش اور دیگر معاملات سے متعلق سیر حاصل گفتگو کرنے کا تھا مگر بختیار نے ہم سب کو ہی آرام کرنے کا مشورہ دے ڈالا۔ اس کی وجہ شاید یہی رہی ہو کہ اس وقت رات آدھی بیت چکی تھی اور وہ بھی شاید آرام کے موڈ میں تھا۔ اس نے کہا کہ صبح ناشتے کے بعد آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے وغیرہ۔

ناچار فوزیہ اور مجھے دوسرے کمرے میں پہنچا دیا۔ یہاں ایک چارپائی اور ایک نواڑ والا پرانا سا مگر اچھی حالت میں پلنگ پڑا تھا۔ میں اس پر لیٹ گیا۔

ذرا دیر تک میں اور فوزیہ باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد جانے کب ہماری آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

اگلے دن اسی نوعمر لڑکی نے ہمیں نیند سے بیدار کیا۔ وہ ایک دبلی پتلی دیہاتی لڑکی تھی۔ اس نے عام سا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے ہنستے مسکراتے ہم سے کہا کہ ہم نہادھولیں۔ اس کے بعد وہ ہمارے لیے ناشتا لائے گی۔

اس نوعمر لڑکی کے بارے میں میرا خیال تھا کہ یہ بختیار کی بیٹی اور وہ بوڑھی عورت بختیار کی ماں ہوسکتی تھی۔

ہم نہادھولیے۔ اس بوڑھی عورت سے بھی ملے۔ وہ بھی ہم سے خوش اخلاقی سے ملی تھی۔ ہم کمرے میں آگئے تو وہ لڑکی بھی ہنستی مسکراتی کمرے میں ناشتے کے برتن اٹھائے داخل ہوئی۔

رات کے کھانے کی طرح ناشتا بھی خالصتاً دیہاتی اور پُرتکلف تھا۔ انڈوں کا آملیٹ، دیسی گھی کے پراٹھے، دہی اور چائے۔

فوزیہ اور میں نے ناشتا کیا۔ لڑکی کا نام سوہنی معلوم ہوا۔ میں نے اس سے عمومی نوعیت کی گفتگو کی تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔

بختیار واقعی اس کا باپ تھا اور بوڑھی عورت اس کی دادی تھی۔ سوہنی کی ماں کے بارے میں پوچھا تو لڑکی نے بغیر کسی مغموم لہجے کے بتایا کہ وہ مرچکی ہے۔

میں نے پھر اس سے بختیار اور نادو کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں چلے گئے؟

''خالہ اور ابا جی باہر گئے ہیں۔'' اس نے مختصراً بتایا۔
''کب تک آجائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔ سوہنی کا لہجہ پنجابی سرائیکی تھا۔ تاہم چونکہ میں اس سے اردو میں بات کر رہا تھا اسی لیے وہ بھی ملی جلی سرائیکی اور اردو میں ہی جواب دے رہی تھی۔
''کچھ پتا نہیں۔ یہ انہوں نے کہا تھا کہ وہ جلد آنے کی کوشش کریں گے۔'' سوہنی بار بار فوزیہ کو مسکراتی اور دلچسپ سی نگاہوں سے تکے بھی جاتی تھی۔ یوں جیسے اسے اشتیاق ہو کہ فوزیہ بھی اس سے بات کرے۔
ہم ناشتے سے فارغ ہوئے پھر اس کی دادی یعنی بختیار کی ماں آگئی۔ ہم چائے پی رہے تھے۔ وہ چائے کے مزید دو پیالے اٹھا لائی تھی۔ فوزیہ نے تو نہیں البتہ میں نے ضرور دوبارہ چائے پی۔ میں اسے سلام وغیرہ کر چکا تھا۔
''پتر! بختیارے نے کہا تھا کہ تم دونوں ان کے آنے تک گھر سے باہر مت نکلنا۔'' وہ ایک چائے کا پیالہ مجھے تھماتے ہوئے بولی اور فوزیہ کے انکار کے بعد دوسرے پیالے سے خود گھونٹ بھرنے لگی۔
عجیب بات تھی۔ میں نے دیہات میں اتنی رغبت سے چائے پیتے کم ہی لوگوں کو دیکھا تھا مگر شاید اب چائے کا چلن یہاں بھی عام ہو چکا تھا۔
''نہ ہی کسی سے تمہیں ملنے دوں۔'' اس نے کھڑے کھڑے پیالہ تھامے اپنی بات جاری رکھی۔ ''گھر میں کچھ ملنے والے آئے ہیں۔ انہیں میں نے کچھ نہیں بتایا۔ تم بھی ادھر کمرے میں ہی رہنا۔''
وہ یہ عجیب سی باتیں کر کے چلی گئی مگر میں سمجھتا تھا کہ ایسا احتیاط کے پیش نظر تھا۔ باہر صحن سے ذرا دیر پہلے مجھے آوازیں آتی سنائی دی تھیں۔
کافی دیر بیت گئی۔ میرے دل و دماغ کو بے چینی تھی۔ فوزیہ کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی۔ تھوڑی دیر بعد نادو کمرے میں داخل ہوئی۔
اس کمبخت کی بھی عجیب ذات تھی۔ اسے دیکھ کر دل کو تسلی بھی ہوتی مگر دماغ میں ایک ''خار'' کی چبھن کا بھی احساس ہوتا۔
''بڑی دیر سے غائب تھیں تم؟ کیا بختیار کے ساتھ کہیں گئی ہوئی تھیں؟'' میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔
''ہاں۔'' اس نے کہا اور مونڈھے پر بیٹھ گئی پھر فوزیہ پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد مجھ سے بولی۔
''تم دونوں نے ناشتا وغیرہ تو کر لیا ہے نا؟''
''ہاں، مگر تم......'' میں نے جواب دینے کے بعد کچھ کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹ دی۔
''ذرا سا سانس تو لینے دے، ابھی بتا دیتی ہوں۔'' وہ اپنی چادر سے چہرے کا پسینا پونچھتے ہوئے بولی۔ اتنے میں سوہنی جست کے ایک بڑے منہ والے گلاس میں اس کے لیے کچھ پینے کو لائی۔ وہ لسی تھی۔
غٹا غٹ سارا گلاس چڑھانے کے بعد اس نے سوہنی کو گلاس تھما دیا۔ ادھر وہ کمرے سے نکلی، اُدھر بختیار بھی اندر داخل ہوا۔
اس نے پہلے جیسی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے ساتھ سلام دعا کی اور وہی کچھ پوچھا جو نادو پوچھ چکی تھی۔
اس کے بعد وہ بھی نادو کے قریب بیٹھ گیا۔ میں ان دونوں کو گہری متانت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔
نادو نے ایک گہری سانس خارج کی اور مجھ سے بولی۔
''ہم وڈیرے سبزل خاں سے ملنے گئے تھے۔ اسے ہم نے ساری باتوں کی تفصیل بتا دی ہے۔ اس نے ہماری مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے لیکن وہ تم دونوں سے بھی ملاقات کرنا چاہتا ہے۔'' وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گئی۔
میں نے اس کی بات غور سے سنی اور بولا۔ ''کیا صرف میرا ملنا ہی کافی نہ ہوگا؟ میرا مطلب ہے فوزیہ......'' میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو اس بار بختیار نے مجھ سے کہا۔
''اس میں کوئی حرج نہیں۔ تم بھی مل سکتے ہو لیکن اگر اس نے تم دونوں کو اپنے پاس بلایا ہے تو اخلاقی اصول کے تحت تم دونوں کے جانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔''
بختیار اپنی گفتگو سے مجھے کچھ پڑھا لکھا محسوس ہوا۔ میں نے کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلایا اور کچھ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔
''کیا وڈیرے کو یہ سب بتانا ضروری تھا؟''
میری بات پر بختیار نے قدرے حیرت سے میری اور پھر نادو کی طرف دیکھا پھر وہ تو نہیں، نادو ہی مجھ سے بولی۔
''تو اور کیا کرتے پھر؟ اس وقت ہم اسی کی جاگیر میں ہیں۔ وہی ہماری داد رسی کرتا ہے۔ کوئی بھی مسئلہ ہو، پھڈا ہو، وہی سارے معاملات حل کرتا ہے۔ بہت اثر رسوخ والا اور اچھا آدمی ہے۔''
''میرے نزدیک اس وقت اہم مسئلہ راحیلہ کی تلاش ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ تم دونوں کو وڈیرے کے پاس جانے سے پہلے مجھ سے بات کر لینی

چاہیے تھی۔''

بختیار الجھ گیا۔ وہ بار بار نادو کی طرف تکنے جاتا تھا پھر نہ جانے نادو کے جی میں کیا آئی کہ اس نے بختیار کے کان میں کچھ کہا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میرے چہرے پر عجیب عجیب سی نظریں ڈالتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

''یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے سہراب؟'' بختیار کے کمرے سے نکلتے ہی نادو نے مجھ سے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تیرے ہی نہیں میرے پیچھے بھی پولیس پڑی ہوئی ہے۔ وہ یہاں بھی آسکتی ہے۔ تم یا میں کب تک ان سے چھپتے پھریں گے؟''

''تم شاید بھول رہی ہو کہ ہمارے پیچھے صرف پولیس ہی نہیں، دشمن بھی لگے ہوئے ہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے گویا یاد دلاتے ہوئے کہا۔

''ان کے بارے میں بھی میں نے وڈیرے کو تفصیل سے بتا دیا ہے۔'' وہ بولی۔

''وہ کیا اور کس طرح ہماری مدد کرے گا؟'' بالآخر کچھ سوچتے ہوئے میں نے سوالیہ نظروں سے نادو کی طرف دیکھا۔

''وڈیرا سبزل خاں بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ ''مجھ سے زیادہ بختیارا اور پورا گاؤں اس کے بارے میں جانتا ہے۔ بڑے اثر رسوخ والا آدمی ہے۔ اس نے ہمیں پوری تسلی دی ہے کہ ہمیں اس کی جاگیر میں پناہ لینے کے بعد کسی قسم کی فکر نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بہت جلد ایک وڈے پولیس آفیسر سے ہمارے سلسلے میں بات کرے گا بلکہ اسے اپنی بیٹھک میں بلوائے گا اور وہ ہمارا بیان لے گا۔ بہت وڈا وکیل بھی کر کے دے گا۔''

میں سوچتا بن گیا۔ میرا خود اپنا ذہن پریشان اور الجھا ہوا تھا۔ تاہم میرے ذہن میں یہی تھا کہ پولیس اور دشمنوں سے الجھے بغیر میں راحیلہ کو تلاش کرنے کے بعد خاموشی سے سیالکوٹ کی طرف نکل جاؤں اور سدرہ سے صلح مشورہ کروں۔ میں تو یہاں فقط ایک عارضی طور پر پناہ کے لیے آیا تھا۔

لہٰذا جب نادو نے یہ سوال کیا کہ آخر پھر میں چاہتا کیا تھا تو میں نے یہ بات اس کے گوش گزار کی تو وہ فوراً بولی۔

''سوں رب دی۔ میرے ذہن میں بھی یہی بات تھی۔ پر سہراب! میں نے اس سلسلے میں بختیار سے پہلے مشورہ کیا تھا اور اسی کی نصیحت پر وڈیرے......''

''تمہیں پہلے مجھ سے بھی مشورہ کرنا چاہیے تھا۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

میری بات پر نادو کچھ خفیف سی ہو گئی تو خاموشی سے ہماری باتیں سنتی ہوئی فوزیہ نے لب کشائی کی۔ میں اسے اب تک کے حالات کے بارے میں آگاہ کر چکا تھا۔ وہ بولی۔

''میرا خیال ہے نادو بہن نے صحیح قدم اٹھایا ہے لیکن بہرحال، اسے تم سے بھی پہلے بات کر لینی چاہیے تھی۔ معاملہ اتنا خراب ہو چکا ہے کہ کم از کم پولیس سے تم دونوں کی جان چھوٹنا ضروری تھا اور یہ کوئی بااثر شخصیت کے ذریعے ہی ممکن ہو سکتا تھا۔''

ہم دونوں نے فوزیہ کی طرف گردنیں موڑ کر دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''لیکن میرا اس بارے میں کچھ اور خیال تھا۔ چونکہ یہ بات کھل کے میرے سامنے عیاں ہو چکی تھی کہ صادق آباد کی پولیس چودھری جی برادران کا ہی ساتھ دے رہی تھی اور جہاں پولیس اور دشمن کی ملی بھگت ہو، وہاں ایسے معاملات کو دشمن شہرت دینے سے گریزاں ہی ہوتا ہے۔ انہیں میرا خوف اپنی جگہ لیکن نادو ان کے لیے سم قاتل ہے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اگر ہمیں وہاں کی پولیس گرفتار کر بھی لیتی تو ہم پر مقدمہ چلانے کے بجائے ہمیں فوراً جی برادران کے حوالے کر ڈالتی اور ہاتھ جھاڑ کر بولتی۔

''لو بھئی شالا جی! ہم نے اپنا فرض پورا کیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔ ہمیں اجازت دو۔'' یوں ہمارا کیس نہ کسی عدالت میں چلتا، نہ ہی اس کی کوئی پیشی ہوتی۔ اس وقت جی برادران ہی ہماری تقدیر کا فیصلہ کر رہے ہوتے۔''

''میرا خیال ہے میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔'' فوزیہ پُرغور لہجے میں بولی۔ میں نے نادو کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ایک ٹک میرا چہرہ تکے جا رہی تھی۔ میرے خاموش ہوتے ہی بولی۔

''تیرا خیال غلط نہیں ہے سہراب......! یہ ممکن ہے کہ پولیس اور قانون کے حوالے سے کہیں یہ سسرے جی برادران اس معاملے کی تشہیر نہ کریں اور اپنے طور پر اس معاملے کو ہاتھ میں لیے ہوئے ہوں۔''

''بالکل۔'' میں نے کہا۔ ''اس طرح اگر ہم قبل از وقت پولیس سے مدد کو پہنچے تو نہ صرف اس بات کی تشہیر ہو جائے گی بلکہ ہماری موجودگی کے بارے میں بھی انہیں فوراً علم ہو جائے گا۔ کیونکہ پولیس ان کے ساتھ بھی تو ملی ہوئی ہے۔''

''لگ پتا بھی جائے ہمارا تو کیا ہوگا؟'' وہ بولی۔ ''ہم اب یہاں وڈیرے سبزل خاں کی پناہ میں ہیں۔ جی برادران اور اس کے گرگے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اب۔''

''کچھ بھی سہی۔ وہ ہمارے بہرحال جانی دشمن ہیں۔ ہم کیوں وڈیرے سبزل خاں پر اس بات کا آسرا کریں۔

دشمن کو ہمارے خلاف گھات لگانے کا موقع مل جائے گا جو میں نہیں چاہتا۔''

میری بات نے شاید نادو کے دماغ پر ہی نہیں بلکہ دل پر بھی اثر کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے متوحش لہجے میں کہا۔

''ہائے، اس پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔''

''تو اب کرلو۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''کوشش کروا پنے اور میرے بارے میں کوئی بات مت پھیلاؤ۔''

''لیکن اب کیا ہوگا؟'' وہ تشویش تلے بولی۔ ''سبزل خاں تک تو ہماری بات پہنچ گئی۔''

''کوئی ضروری نہیں کہ اسے یہ معاملہ یاد رہے۔ دوبارہ اس سے اب اس سلسلے میں کوئی رابطہ نہ کیا جائے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن اب تم دونوں کیا کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے فوزیہ اور میری طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ کہا۔

اس کی بات پر میں نے بھی ایک نظر پاس خاموش سی بیٹھی فوزیہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''تم منزل پر پہنچ گئیں، یہ اچھا ہوگیا۔ رہے ہم، تو ہماری منزل ابھی آگے ہی لیکن راحیلہ کی تلاش کا معاملہ نہ ہوتا تو ہم فوراً یہاں سے نکل جاتے۔''

راحیلہ کے ذکر پر میں پھر فکرمند اور پریشان سا ہونے لگا تو نادو بڑی ملائمت آمیز رسانیت سے بولی۔

''تو فکر مت کر۔ ہم راحیلہ بہن کو ڈھونڈ نکالیں گے۔''

''یہ کام صرف مجھے کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہتے ہوئے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''تجھے کیوں کرنا پڑے گا؟ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں بلکہ یہ مشٹنڈا بختیارا بھی ہماری مدد کرے گا۔'' نادو ایک حوصلہ افزا مسکراہٹ تلے بولی۔

''نہیں نادو! تیری مہربانی۔ اب یہ کام صرف میرے کرنے کا ہے پر مجھے فوزیہ کی فکر ہے۔ اسے کس کی ذمے داری پر چھوڑوں اور کہاں؟''

''لو، یہ کیا بات کہہ دی تُو نے سہراب؟ میں جو ہوں۔ اس کی تُو کیوں فکر کرتا ہے۔ فوزیہ بہن یا تم ادھر بالکل محفوظ ہو۔ ایک ذرا آنچ نہیں آئے گی تم دونوں پر لیکن راحیلہ کی تلاش میں میرا تیرے ساتھ رہنا ضروری ہے۔''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''فوزیہ کو میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔'' وہ شاید میری بات کا مطلب سمجھ گئی۔ اسی لہجے میں بولی۔

''میں نے کہا نا، فوزیہ یہاں بالکل محفوظ ہے۔ کسی مائی کے لال میں طاقت اور جرأت نہیں کہ اس کا یہاں کوئی بال بھی بیکا کرے۔''

''بات سمجھنے کی کوشش کرو نادو!'' میں نے اس بار اس سے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے تم پر پورا بھروسا ہے۔ تم فوزیہ کا بالکل بہنوں سے بھی بڑھ کر خیال رکھوگی۔ اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ تم فوزیہ کو میری غیر موجودگی میں بالکل بھی اکیلا مت چھوڑنا۔ اس طرح میں اس کی طرف سے بے فکر ہوکر راحیلہ کو تلاش کرسکوں گا۔''

اسی وقت باہر بختیار کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ میں اور نادو چونک کر دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔

''ذرا ٹھہر، میں ابھی آئی۔ یہ بختیارا کچھ کہنا چاہتا ہے مجھ سے شاید۔'' کہتے ہوئے نادو اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ میں اور فوزیہ اندر اکیلے رہ گئے تو وہ بولی۔

''سہراب! تم کہاں جاؤ گے؟ مم...... میری فکر مت کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چل سکتی ہوں۔''

''میں کہیں نہیں جارہا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔ ''لیکن تمہارا میرے ساتھ ہونا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس طرح میں راحیلہ کو تلاش نہیں کرپاؤں گا۔ نادو کی بات اور تھی۔''

''میں سمجھ رہی ہوں۔'' وہ ہولے سے بولی۔ ''تو پھر کم از کم نادو کو ہی لے جاؤ اپنے ساتھ یا پھر...... اس کے ساتھی بختیارے کو...... کوئی تو ہو تمہارے ساتھ۔''

''یہ میرے لیے اور زیادہ مشکل ہوجائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''اکیلے رہتے ہوئے میں زیادہ بے فکری، احتیاط اور تسلی سے کام کرپاؤں گا۔''

تھوڑی دیر بعد نادو اندر آگئی۔ اس کے ہمراہ بختیار بھی تھا۔ نادو نے اسے ساری بات بتادی تھی۔ وہ بھی مجھے بھلا مانس آدمی لگا۔ اس نے اندر آتے ہی سب سے پہلے روایتی انداز میں فوزیہ کے سر پر اپنا دایاں ہاتھ رکھا اور مجھ سے بولا۔

''سہراب! یہ اب میری بہن ہے۔ سوہنا رب دی، اس پر ایک آنچ آنے سے پہلے یہ میرا سینہ آگے دیکھے گی۔''

اس کی بات پر میں بختیارے کا چہرہ تکتا رہ گیا۔ ادھر فوزیہ کو شاید اس کے بھائی ماجد (ماجا لکڑ) کی یاد آگئی جو میرے ہاتھوں حادثاتی طور پر مرچکا تھا۔ بے اختیار وہ رو پڑی۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی لہو ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

انگوٹھی

عتیق بخاری

سنسنی خیزی شاید اس کائنات کی مٹی میں شامل ہے... ہر لمحے کہیں نہ کہیں... کسی نہ کسی کے ساتھ عجیب و غریب واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ اس کے ساتھ بھی رونما ہوا... اور جو بھی ہوا وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا... جب اس کی ہنستی بستی زندگی شک کے بھنور میں الجھی تو جیسے موت نے اسے چاروں جانب سے گھیر لیا تھا مگر... اچانک وہ کچھ ہوگیا جس کے ہونے کا بھی کوئی امکان تھا اور نہ ہی گمان.....

ایک معمولی سی انگوٹھی کے غیر معمولی کردار کا دلچسپ احوال

'کیا واقعی کوئی میری نگرانی کر رہا ہے؟' البرٹ نے قدرے پریشان ہوکر اور کافی حیران ہوکر سوچا۔ 'لیکن کس لیے؟ میری نگرانی کوئی کیوں کرے گا؟ کوئی مجھ پر نظر کیوں رکھے گا؟' یہ سوال اس کے ذہن میں آکر اسے بے چین کر رہے تھے۔

البرٹ ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں منیجر تھا۔ دو سال قبل شادی کی تھی لیکن شادی چل نہ سکی اور محض سات ماہ چلنے کے بعد طلاق ہوگئی۔ اپنے فلیٹ میں وہ تنہا رہتا تھا۔ صبح اٹھ کر اپنے لیے ناشتا بنانے، آفس جانے سے لے کر رات کا کھانا بنانے تک اس میں کچھ ایسا خاص نہ تھا جو قابلِ نگرانی ہو۔

'میں تو عام سی زندگی گزار رہا ہوں۔ یہ میرے ساتھ معمول سے ہٹ کر کیا اور کیوں ہو رہا ہے؟' کھڑکی کے پاس

پڑی کرسی پر بیٹھا البرٹ سوچ رہا تھا۔ سابق بیوی سے تھوڑا سا تنازع ہوا تھا۔ 'کہیں وہ تو یہ سب نہیں کر رہی؟' اسے ایک بار یہ خیال بھی آیا تھا لیکن پھر اس نے سوچا کہ طلاق سے پہلے یا بعد میں کوئی بات ایسی نہیں ہوئی تھی جس کی بنا پر اس پر جاسوس مقرر کر کے اس کے شب و روز کے معمولات دیکھے جاتے۔

اپنی نگرانی کا احساس اسے چند دن پہلے پہلی بار ہوا تھا۔ وہ آفس سے واپس آ کر معمول کے مطابق کافی بنا کر فلیٹ کی کھڑکی کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھا تو چونک پڑا۔ سامنے گراؤنڈ میں اسے بلیک جینز اور بلیک ہی جیکٹ میں ملبوس شخص نظر آیا جو ٹکٹکی باندھے اس کی کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ البرٹ کو اپنی جانب دیکھتا پا کر وہ تیزی سے کھیلتے ہوئے بچوں کی جانب مڑ گیا۔

'یہ تو وہی سیاہ کار والا ہے جو آفس کے سامنے کھڑا تھا اور میرے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے مجھے دیکھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ کیا یہ محض اتفاق ہے کہ ایک شخص میرے آفس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ وہی اب میرے فلیٹ کے پاس کھڑا مجھے دیکھ رہا ہے؟' اس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے سیاہ جیکٹ والے کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ اسی دوران اس کے موبائل کی بیل بجی۔ موبائل فون چارجنگ پر لگا ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر وہاں تک گیا جہاں چارجنگ ہو رہی تھی۔ کال سن کر واپس آیا تو وہ شخص وہاں موجود نہیں تھا۔ البرٹ کافی پینے لگا۔ اس نے سوچا کہ خوامخواہ وہم نہ کرے۔ محض اتفاقاً ہی وہ یہاں کھڑا ہوگا۔

تیسرے دن وہ فلیٹ کی سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ کوئی اس سے زور سے ٹکرایا۔ ''اوہ سوری'' کہہ کر البرٹ تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ جب وہ سیڑھیوں کا موڑ مڑ رہا تھا تو اس کی نظر اوپر کے فلور پر پڑی۔ ریلنگ کے قریب ایک پچیس چھبیس سالہ نوجوان جو ابھی اس سے ٹکرایا تھا، اسے غور سے دیکھ رہا تھا اور البرٹ کے غور کرتے ہی بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا دوسری جانب دیکھنے لگا۔ البرٹ کو واضح طور پر گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ آفس میں اس سے کوئی کام ڈھنگ سے نہ ہوا۔ وہ بے چین سا رہا۔

'کیا واقعی کوئی اس پر نظر رکھے ہوئے ہے؟ اگر ہاں......تو اس کے پیچھے کیا وجہ ہے؟' وہ الجھا ہوا گھر واپس آیا۔ راستے میں اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پیچھے آنے والی گاڑیوں پر غور کیا لیکن اس دوران اسے کوئی مشکوک شخص یا گاڑی نظر نہیں آئی۔

'ہوسکتا ہے فلیٹ کی کھڑکی کے پاس کھڑا شخص اور سیڑھیوں پر ٹکرانے والا دونوں عام سے لوگ ہوں۔ میں نے ایسے ہی سیریس لے لیا۔' اس نے فلیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے سوچا اور ٹی وی آن کرتے ہوئے صوفے پر لیٹ گیا۔

دو دن گزرے تو اس نے پھر اسی سیاہ جیکٹ والے کو کھڑکی کی جانب دیکھتے پایا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کافی کا کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ وہ کرسی پر گر سا گیا۔ 'کیا واقعی کوئی میری نگرانی کر رہا ہے؟' وہ سوچ میں پڑ گیا۔ نظر اٹھا کر دوبارہ دیکھا تو وہ غائب تھا۔

اس عجیب سے وہم یا واقعی نگرانی نے اسے ہفتے بھر میں نڈھال کر دیا تھا۔ اس نے کافی کا کپ ٹیبل پر رکھا اور صوفے پر لیٹ گیا۔ بے چینی سے سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ تھکاوٹ دور کرنے کے لیے وہ نہایا اور پھر شام والی کافی اب پینے کا سوچا۔ کچھ دیر سونے اور نہانے سے وہ کافی پُرسکون ہو گیا تھا۔

''مجھے یقین ہے آج بھی مجھے وہم ہی ہوا ہے۔'' کافی کے گھونٹ لیتے گویا وہ خود کو تسلی دے رہا تھا۔ رات کا کھانا بنانے کے دوران اس نے تہیہ کیا کہ وہ اب بالکل نہیں غور کرے گا کہ اس کے فلیٹ کے آس پاس کون کھڑا ہے۔ ''جب میں کچھ غلط کر ہی نہیں رہا تو پھر میں کیوں ڈروں؟''

رات کا کھانا کھا کر وہ بیڈ پر نیم دراز ہو گیا اور معمول کے مطابق سائڈ پر پڑی کتابوں میں سے اوپر والی اٹھائی۔ یہ ایک جاسوسی ناول تھا۔ اپنا دھیان فضول وہم سے بچانے یا پھر خوف سے ہٹانے کے لیے اس نے اپنی پوری توجہ ناول پر مرکوز کر دی۔ ناول کی کہانی میں جرائم پیشہ گینگ کے باغی ممبر کا حال بتایا گیا تھا جسے اپنی غداری کی وجہ سے گینگ سربراہ کی جانب سے موت کی سزا سنا دی گئی تھی۔ وہ کچھ عرصہ بھاگ کر روپوش رہا لیکن پھر عقل مندی و ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوبارہ گینگ جوائن کر لیا۔ گینگ کے سربراہ نے بھی اسے کھلے دل سے معاف کر دیا۔

'عجیب سی اسٹوری ہے یہ مگر میں یہ کتاب کب لایا تھا؟'' وہ چھوٹی سی کتاب کو سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اسے واقعی یاد نہیں آرہا تھا کہ یہ اسٹوری اس نے کب خریدی اور کہاں سے خریدی؟ وہ وقتاً فوقتاً اپنے پڑھنے کے لیے جاسوسی و دیگر ناول و رسائل خریدتا رہتا تھا جو اسے

یقیناً یاد رہتے تھے لیکن یہ کتاب....؟ پھر وہ خود پر ہنس دیا کہ نگرانی سے ملنے والے ڈر اور بے چینی نے یادداشت متاثر کردی ہے۔

اس نے مزید سوچنا بند کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ آدھی رات کا وقت ہوگا کہ اس کی آنکھ ایک آواز سے کھلی۔ کوئی اس کی کھڑکی کو آہستگی سے بجا رہا تھا۔

''یہ اس وقت کھڑکی پر کون ہے؟'' اس نے مندی مندی آنکھوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ''ہوا سے پٹ ہلے ہوں گے۔'' وہ اٹھتے اٹھتے دوبارہ لیٹنے ہی والا تھا کہ ایک تہ شدہ کاغذ اندر آکر گرا۔ وہ شدید خوفزدہ ہوگیا۔ وہ کاغذ اسے خوفزدہ کرکے پاگل کررہا تھا۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں تہ شدہ کاغذ کو دیکھ کر اس کا دیواروں سے سر ٹکرانے کو جی چاہ رہا تھا۔ کچھ دیر بیٹھے رہنے کے بعد اس نے خود کو بہ مشکل اٹھایا، لائٹس آن کیں اور کانپتے ہاتھوں سے کاغذ اٹھایا۔ کچھ دیر تک تو اس سے کاغذ کھولا ہی نہ گیا پھر اس نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے کاغذ کو سیدھا کیا۔ لکھا تھا۔

''رسالہ پڑھ کر یقیناً تمہیں تھوڑی بہت سمجھ تو آگئی ہوگی کہ تمہیں اب کیا کرنا چاہیے۔ اب بھی وقت ہے، واپس آجاؤ۔ جو کہانی آج رات تم نے پڑھی ہے، وہ ہم نے ہی تمہاری پڑھنے والی کتابوں میں سب سے اوپر رکھی تھی۔ تم یہ چٹ پڑھ کر فوراً وہ کرو جو تمہیں کرنا چاہیے۔ تمہارے خیرخواہ۔''

البرٹ کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ششدر زیادہ ہے یا خوفزدہ۔ وہ بھاگ کر کھڑکی کے پاس آیا اور اِدھر اُدھر جھانکا لیکن اسے اس طرح کوئی جواب مل سکتا تھا؟ اس کا جی چاہا کہ رو دے۔

''اس کا مطلب ہے جو کچھ ہو رہا ہے وہ میرا وہم نہیں۔ واقعی مجھ پر نظر رکھی جا رہی تھی۔'' اس نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔ ''نہ جانے ایسا کیوں ہے؟'' اس صورتِ حال نے اس کا دماغ شل کرکے رکھ دیا۔

''یہ کون نامعلوم لوگ نامعلوم وجہ سے میرے پیچھے پڑ گئے ہیں'، یہ خیال اسے دہلا رہا تھا کہ کوئی اس کے کمرے میں ناول رکھ کر گیا تھا۔ کسی کی پہنچ اس کے کمرے تک ہے لیکن کس کی؟ اور کیوں؟

اس نے چیخنا چاہا۔ وہ اٹھا اور بجلی کی سی تیزی سے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کرکے گویا خود کو محفوظ کرلیا۔ رات کا باقی حصہ اسی طرح ڈرتے، جاگتے، سوتے گزرا۔ صبح اٹھا تو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ وہ اٹھا، ناشتا کیا، میڈیسن لی اور آفس چھٹی کا فون کرکے بیڈ پر لیٹ گیا۔ اب وہ پولیس کی مدد لینے پر غور کررہا تھا کیونکہ وہم والی بات تو رہی نہیں تھی۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ یقیناً بلڈنگ میں رہنے والا کوئی شریر یا اس کا کوئی دوست اسے جان بوجھ کر تنگ کررہا ہے۔ دن کے اُجالے میں رات والا خوف کافی کم ہوگیا تھا۔

'یقیناً یہ کوئی مذاق ہی ہے۔' سونے سے پہلے اس نے سوچا۔ میڈیسن لی ہوئی تھی اس لیے اس کی آنکھ لگ گئی۔ دوپہر کو لنچ کے دوران، اس کے بعد شام کی کافی پیتے ہوئے تمام وقت اس نے اپنی کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ فلیٹ کا دروازہ کھول کر راہداری میں جھانکا، سیڑھیوں تک گیا لیکن کوئی ڈرا دینے والی چیز نظر نہ آئی۔ اس چیز نے اس کا اعتماد کافی بحال کردیا اور وہ ''مذاق ہی ہوگا'' پر مکمل یقین کرکے پُرسکون ہوگیا۔ رات کو اس نے ڈنر میں اپنے لیے اپنی پسندیدہ چیزیں بنائیں اور بڑے سکون سے کھانا کھایا۔ اسی دوران اس نے سوچا کہ وہ دو دن مزید فلیٹ میں اسی طرح بند رہ کر ریسٹ کرے گا۔ آرام کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ شرارت ابھی مزید کتنی دیر ہوگی کیونکہ اس نے اردگرد پر نظر رکھنے کا پلان بنایا تھا۔

'میں خود ہی اپنا مسئلہ حل کرلوں گا۔' اس نے بھرپور اعتماد سے سوچا۔

☆☆☆

''کیا واقعی البرٹ کا پتا چل گیا ہے؟'' پال نے پوچھا۔ چہرے پر زخموں کے نشان اور حد سے زیادہ سختی نے اس کا چہرہ کافی خوفناک بنا دیا تھا۔

''ہاں باس!'' ٹونی نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

''ہونہہ...... تو سات سال کے عرصے کے بعد اس بھگوڑے کا پتا چل ہی گیا۔ اچھی بات یہ ہے کہ اس نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا اور اس بات پر مجھے شدید حیرت ہے کیونکہ گینگ چھوڑتے ہوئے اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ پولیس کو سب کچھ بتا کر ہمیں برباد کردے گا لیکن نہ جانے کیوں وہ خاموش رہا۔ شاید وہ بھی چاہتا ہے کہ اسے دوبارہ گروہ میں شامل کرلیا جائے۔'' پال نے کہا تو ٹونی نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

پال کا گینگ بہت بڑا تھا۔ اسمگلنگ، منی لانڈرنگ، قتل و غارت، ہر طرح کے غیر قانونی کام اس کی زیرِ نگرانی ہوتے تھے۔ کسی معاملے پر ایک بار اس کے انتہائی اہم کارندے البرٹ نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ یہ سات برس پہلے کی بات تھی۔ اتنا عرصہ گزر گیا تھا۔ دھمکی دینے کے باوجود البرٹ نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود پال کو

ایک بے چینی سی لگی رہتی تھی کہ نہ جانے کس وقت وہ اس کے راز اگل کر اسے پھنسوا دے۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی غصہ تھا کہ شاید البرٹ بُرے کام چھوڑ کر شریفانہ زندگی گزار رہا ہے اس لیے اسے دوبارہ جرم آلود زندگی میں واپس لانا چاہتا تھا۔ وہ کئی بار اپنے اہم بندوں کے سامنے یہ کہہ چکا تھا کہ کسی طرح البرٹ کا پتا چل جائے تو پتا بتانے والے کو بہت بڑا انعام دے گا۔ ٹونی بھی باس کا بہت قریبی تھا۔ وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتا کہ البرٹ کا پتا چلے اور وہ باس کو بتا کر اس کی نظروں میں نمبرون بن جائے۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے ماتحت لڑکوں کو کہہ رکھا تھا۔ اسے کچھ عرصہ پہلے پتا چلا کہ البرٹ نامی شخص اس شہر میں فلاں بلڈنگ میں رہتا ہے تو اس نے اپنے پاس موجود البرٹ کی تصویر اپنے لڑکوں کو دے کر کہا کہ وہ تصدیق کریں کہ واقعی وہی ان کا مطلوبہ البرٹ ہے؟

ٹونی کو البرٹ نے دیکھ رکھا تھا اس لیے وہ اس کے سامنے آکر اس کو چونکانا اور خبردار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات اس نے لڑکوں کو تصویر دے کر بتائی اور جلدی اطلاع دینے کا کہا۔ چند ہی دنوں میں اسے البرٹ کے بارے میں بتایا گیا کہ وہی ان کا مطلوبہ شخص ہے۔

ٹونی کے لڑکوں نے اس کو یقین دلاتے ہوئے کہا کہ وہ اسے اس کی خاص پہچان انگوٹھی سمیت جان چکے ہیں۔ پال نے اپنے خاص آدمیوں کو ایک مخصوص انگوٹھی دی ہوئی تھی۔ البرٹ اور ٹونی بھی ان خاص آدمیوں میں شامل تھے۔ یہ چھلا نما انگوٹھی تھی جس پر ایک نگینہ خاص انداز میں چمکتا تھا۔ ٹونی کو اسی وجہ سے یقین آیا تھا کہ لڑکے اسے ڈھونڈ چکے ہیں۔ جب انہوں نے اسے بتایا کہ البرٹ نامی شخص نے بالکل آپ جیسی انگوٹھی پہن رکھی ہے تو ٹونی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ وہ گروہ چھوڑ کر بھی جذباتی طور پر اسی سے وابستہ ہے۔

''یہی البرٹ ہمارا البرٹ ہے۔'' ٹونی نے کہا اور البرٹ اور اپنے گینگ کے حالات سے ملتا جلتا ناول منگوایا جو ڈھونڈنا ہرگز مشکل نہ تھا۔ جرائم و سزا کی کہانیوں میں اس قسم کی کہانیاں بہ آسانی مل جاتی ہیں۔ وہ رسالہ البرٹ کے کمرے میں رکھوایا اور پھر ایک خط بھی پھنکوا دیا تھا۔ اب وہ باس کو البرٹ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ پال بہت حیران و خوش ہوا۔

''باس! ہم نے خط کے نیچے نمبر بھی لکھ دیا تھا تا کہ وہ چاہے تو موبائل فون پر رابطہ کر لے۔'' ٹونی نے بتایا۔

''تو پھر کوئی فون آیا اس کا؟'' پال نے چونک کر سوال کیا۔

''نہیں باس! ابھی تک تو نہیں آیا لیکن......'' ٹونی اتنا ہی بولا تھا کہ پال نے تیزی سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اس نے خط پڑھ کر، فون نمبر دیکھ کر بھی ابھی تک رابطہ نہیں کیا تو وقت ضائع کیے بغیر اسے اٹھا لیا جائے۔ کہیں وہ کچھ غلط نہ کر ڈالے۔''

''او کے باس......! واقعی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ آپ تسلی رکھیں۔ میں بہت جلد آپ کو کامیابی کی خبر دوں گا۔'' ٹونی نے سر جھکا کر مؤدبانہ انداز میں کہا۔ پال نے سر ہلاتے ہوئے اسے جانے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

آفس سے چھٹی کے دو دن ختم ہو چکے تھے۔ ان دو دنوں میں کچھ بھی خلافِ معمول نہیں ہوا تھا۔

''آج آفس جانا چاہیے۔'' منہ صاف کر کے اس نے آئینے میں دیکھتے ہوئے گویا اپنے آپ سے کہا۔ آفس کے لیے سوٹ سلیکٹ کر کے وہ کچن میں جانے لگا تا کہ اپنے لیے ناشتا بنا سکے۔ وہ کمرے کے وسط میں تھا کہ ایک کاغذ کا گولہ کھڑکی میں سے اس کے قریب آکر گرا۔ وہ بری طرح چونکا اور کافی ڈر گیا۔ نیچے جھک کر کاغذ اٹھایا اور کھڑکی کی طرف دیکھتا ہوا اسے سیدھا کرنے لگا۔ کاغذ بالکل خالی تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

''کسی بچے نے کاغذ پھینکا اور میں ڈر گیا۔ ویسے مجھے آفس جانے سے پہلے پولیس اسٹیشن ضرور جانا چاہیے اور انہیں سارا معاملہ بتا دینا چاہیے۔ اگرچہ ان شرارتوں سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا لیکن میں کافی ڈسٹرب ہوا ہوں۔'' سوچتے سوچتے وہ ناشتا بنانے لگا۔ وہ فریج سے انڈے نکالنے ہی لگا تھا کہ فلیٹ کی بیل بج اٹھی۔ بیک وقت وہ چونکا اور لرز اٹھا۔ اس کے ہاتھ سے انڈا گر گیا اور ٹوٹ کر کچن کے فرش پر بکھر گیا۔ البرٹ کچن سے لاؤنج میں پہنچ کر بیرونی دروازے کو دور سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے دوسری جانب کوئی عفریت ہو۔ بیل وقفے وقفے سے بجائی جا رہی تھی۔ اس نے کی ہول سے جھانکا۔ وہ یکدم حیران اور بے حد خوش ہوا۔ صبح صبح اس کا نہایت قریبی دوست کارٹر تھا۔

''اوہ کارٹر تم......؟ آؤ، آؤ۔ تم نہیں جانتے، تمہارا آنا مجھے کتنا اچھا لگا ہے۔'' البرٹ خوشی سے بول رہا تھا۔ دوست کو دیکھ کر اسے حوصلہ سا ہوا تھا۔ وہ لاؤنج میں پہنچ چکے تھے۔

''بیٹھو کارٹر! میں بریک فاسٹ بنا رہا ہوں۔ تم بھی

کرو گے نا؟'' البرٹ نے سوال کیا۔

''آں...... ہاں، بنالو میرے لیے بھی...... کرلیتا ہوں۔'' کارٹر یوں بولا جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہو۔ البرٹ لاؤنج کے سامنے موجود کچن میں چلا گیا اور فرش پر پھیلا انڈا صاف کرنے لگا۔

''ارے، یہ کیا؟'' کارٹر نے پوچھا۔

''بس یار! لمبی کہانی ہے اس انڈے کے گرنے کے پیچھے۔ میں ناشتا کرتے ہوئے تمہیں سب بتاؤں گا۔ شاید اس معاملے میں تم میری کوئی مدد کرسکو۔'' البرٹ بول رہا تھا اور کارٹر خاموشی سے سن رہا تھا۔ البرٹ نے آملیٹ بنایا، توس نکالے اور پیالیوں میں چائے ڈال کر لاؤنج میں لے آیا۔

''کیا بات ہے جب سے آئے ہو، چپ چپ سے لگ رہے ہو اور تم نے یہ بھی نہیں بتایا کہ اتنی صبح تم کیسے ادھر آئے؟ آفس نہیں جانا کیا؟'' البرٹ نے ناشتا کارٹر کے سامنے رکھا اور خود بھی تیزی سے ناشتا کرنے لگا۔

کارٹر نے کرسی سے ٹیک لگائی اور بولا۔ ''ایک نہایت ضروری کام پڑ گیا ہے تم سے اس لیے صبح صبح ادھر آیا ہوں۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم میرے یہاں پہنچنے سے پہلے آفس کے لیے روانہ نہ ہو جاؤ۔''

''ضروری کام......؟ کیسا ضروری کام؟ اور تم ناشتا تو کرو۔'' البرٹ نے قدرے حیرت سے پوچھتے ہوئے کہا۔

''البرٹ! میں یہاں تمہارے پاس اپنی مرضی سے نہیں آیا۔'' کارٹر نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔ اس نے ابھی تک ناشتے کو چھوا تک نہیں تھا۔

''تو پھر...... کس کی مرضی سے آئے ہو؟'' البرٹ نے حیرانی سے پوچھا۔

کارٹر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولنے لگا۔ ''آج میرے دونوں بچے اسکول کے لیے نکلے تو ان کے جانے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد میرے گھر کا دروازہ بجا کر ایک چٹ پھینکی گئی جس پر لکھا ہوا تھا۔ ''تمہارے بچے ہمارے پاس ہیں۔ وہ بالکل خیریت سے ہیں اور...... اگر تم چاہتے ہو کہ وہ خیریت سے ہی تمہارے پاس واپس پہنچیں تو کسی طریقے سے اپنے دوست البرٹ کو جس جگہ ہم کہہ رہے ہیں، لے کر آؤ۔ ہم البرٹ کو لے کر تمہارے بچے تمہیں دے دیں گے۔ اگر تم نے پولیس کو اطلاع دی یا البرٹ کو اس بات کی بھنک پڑ گئی اور وہ چوکنا ہو گیا تو پھر تمہیں تمہارے بچے مردہ حالت میں ملیں گے۔ جلدی البرٹ کو فلیٹ سے نکالو اور ہمیں کال کرو۔'' ساتھ ہی نیچے نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ میں ان لوگوں کی مرضی سے یہاں آیا ہوں جنہوں نے صبح صبح میرے بچوں کو اغوا کرلیا۔''

البرٹ کی آنکھیں خوف کی شدت سے پھیل رہی تھیں۔ ''تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے۔'' اس کے منہ سے بہ مشکل نکلا۔ کارٹر نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کارٹر! اگر تمہیں مجھے کچھ بھی بتانے سے روکا گیا ہے تو تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟'' البرٹ نے کہا۔

''البرٹ! تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ مجھے بہت بُرا لگا کہ میں اپنے بچوں کی جان بچانے کی خاطر تمہیں کسی کے حوالے کردوں۔ میں نے تمہیں ساری بات اس لیے بتائی ہے تاکہ تم اور میں مل کر کوئی راستہ نکال لیں جس سے میرے بچے بھی واپس آجائیں اور تمہیں بھی ان کے حوالے نہ کرنا پڑے۔ ویسے تمہارے ایسے کون سے دشمن پیدا ہوگئے ہیں جو یہ سب کررہے ہیں؟'' البرٹ نے پریشانی سے پوچھا۔ دونوں کا ناشتا ایسے ہی پڑا تھا۔

''کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ خود مجھے ابھی پتا چلا ہے کہ جسے میں مذاق سمجھ رہا تھا، وہ ایک بھیانک حقیقت ہے۔ آخر میری کسی سے کیا دشمنی ہے جو میری نگرانی کرتے کرتے بات یہاں تک آگئی؟'' البرٹ شدید پریشان تھا۔

''کیا مطلب؟ کیسی نگرانی؟'' البرٹ پلیز! پوری بات بتاؤ۔'' کارٹر نے چونک کر بے تابی سے پوچھا۔ جواب میں اس نے پوری کہانی کارٹر کو سنادی جسے سن کر کارٹر کا منہ کھل گیا۔

''البرٹ! کیا تم پاگل اور احمق ہو۔ اتنے دن سے یہ سب ہورہا ہے اور تم نے کسی دوست یا پولیس کو نہیں بتایا۔ پولیس سے مدد نہیں لی۔ کمال ہے...... تم سے ایسی بے وقوفی کی توقع نہیں تھی مجھے۔'' کارٹر غصے میں بھی تھا اور پریشان بھی۔

''پہلے تو میں اسے وہم اور مذاق سمجھتا رہا۔ جب مجھے ڈر لگا تو اس وقت حالات اور طرح کے ہوگئے ہیں۔'' البرٹ نے بیچارگی سے کہا۔

''دیکھا اپنی سستی، کم عقلی کا نتیجہ؟ بات اب میرے گھر، میری فیملی تک پہنچ گئی ہے۔ اگر تم شروع میں ہی کچھ کرلیتے تو آج میں اور تم یوں بے بس اور پریشان نہ بیٹھے ہوتے۔'' کارٹر رو دینے کو تھا۔

''لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آرہی کہ وہ لوگ تم تک، تمہارے بچوں تک کیسے پہنچ گئے؟'' البرٹ کا سوال قدرے احمقانہ تھا جس پر کارٹر نے اسے باقاعدہ گھورتے ہوئے جواب دیا۔

''ظاہر ہے، ان کی چھان بین ایسی ہے کہ انہیں تمہارے قریبی دوست کا پتا چل چکا ہے جس کے ذریعے وہ تم پر قابو پا سکتے ہیں۔ دیکھ لیا تم نے وہ کتنے چالاک اور خطرناک لوگ ہیں۔''

البرٹ نے اسے وہ چٹ دکھانے کو کہا جو اسے آج صبح ملی تھی۔ چٹ دیکھ کر وہ رائٹنگ کا اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ شاید کسی جاننے والے کی ہو لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ لکھائی نہایت عجیب اور نہ جانے کس کی تھی۔

''البرٹ! خدا کے لیے جلدی کچھ کرو۔ ان منحوسوں کے پاس میرے بچے ہیں۔ میرا پل پل قیامت بن کر گزر رہا ہے۔ ہمیں جلد از جلد کوئی مناسب لائحہ عمل بنانا ہوگا۔'' تیز تیز بولتے ہوئے کارٹر نے کہا۔ البرٹ خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ میز پر تھے۔ مٹھیوں کا بند ہونا اور کھلنا اس کی اضطراری کیفیت کو ظاہر کر رہا تھا۔ کارٹر اسے غور سے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں کھلنے کا یوں انتظار کر رہا تھا جیسے اس کی آنکھیں کھلتے ہی یہ خطرناک مسئلہ حل ہو جائے گا۔ البرٹ نے آنکھیں یکدم کھولیں اور کھڑا ہو گیا۔

''البرٹ! پھر کیا سوچا تم نے؟'' کارٹر نے بے چینی سے پوچھا۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

''میں نے سوچ لیا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔'' البرٹ مضبوط لہجے میں بولا۔

''کیا؟ کیا کرنا ہوگا ہمیں؟'' کارٹر بولا۔

''میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔'' البرٹ ہلکا سا مسکرایا۔

''یعنی......؟'' کارٹر ششدر سا تھا۔

''یعنی...... یہ کہ میں اور تم ساتھ چلیں گے۔ تم ان کو ان کا مطلوبہ بندہ یعنی ''مجھے'' ان کے حوالے کر دو گے اور اپنے بچوں کو بہ خیر و عافیت لے کر اپنے گھر آ جاؤ گے۔'' البرٹ نے اتنے عام سے لہجے میں کہا جیسے یہ معمول کی بات ہو۔

''اور اس کے بعد تمہارا کیا ہوگا؟ میرا مطلب ہے، وہ تمہیں کوئی نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ تمہاری جان بھی لے سکتے ہیں۔ نہیں، نہیں البرٹ! پاگل مت بنو۔ کچھ اور سوچتے ہیں۔'' کارٹر نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے جذباتی انداز میں کہا۔

''کچھ اور نہیں بس یہی کرنا ہوگا کیونکہ ہمارے پاس کوئی اور آپشن ہے ہی نہیں۔'' البرٹ نے حتمی لہجے میں کہا۔

''اور تم؟'' کارٹر نے ابھی تک اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔

''وہ جو لوگ بھی ہیں میرے واقف یا ناواقف۔ ان کی جو بھی دشمنی ہے، مجھ سے ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے میرے دوست پر کوئی مصیبت آئے۔ ان کو مجھ سے مطلب ہے۔ میری جانب سے ان کو ڈھیل دینے کی وجہ سے معاملہ تمہاری فیملی تک پہنچ گیا ہے۔ اب میں ان کے پاس جاؤں گا۔ میں جانوں اور وہ...... میں نمٹ لوں گا ان سے۔'' البرٹ کا لہجہ بہت پُرسکون تھا۔ اتنا کہ اسے خود بھی اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ جو اتنے دنوں سے خوفزدہ و بے سکون تھا، اچانک کیسے نڈر و پُرسکون ہو گیا۔

''البرٹ پلیز! سنو ہم کچھ اور سوچ سکتے ہیں۔''

''کیا سوچ سکتے ہیں ہم؟ بتاؤ ذرا۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ تمہیں کہا گیا تھا کہ مجھے یا پولیس کو نہیں بتانا۔ مجھے تم بتا چکے ہو لیکن اس سے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا لیکن کیا ہم پولیس کو انفارم کریں اور بچوں کو مشکل میں ڈال دیں؟ کارٹر! شاید تمہیں اس بات کا اندازہ نہیں لیکن مجھے یقین ہے جن لوگوں کی رسائی تم اور تمہارے بچوں تک ہو چکی ہے، وہ اب تمہارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک ضرور آئے ہوں گے اور یقیناً باہر ہماری نگرانی ہو رہی ہوگی کہ کارٹر کب البرٹ کو باہر لے کر آتا ہے یا کچھ اور کرتا ہے۔'' البرٹ نے تیز لہجے میں کارٹر کو سمجھایا تو کارٹر کے ماتھے پر پسینا آ گیا۔ اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

''کیا واقعی باہر کوئی ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے؟'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''یقیناً...... تمہیں کیوں یقین نہیں۔ یہ جو نامعلوم لوگ نامعلوم وجہ کی بنا پر میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، انہوں نے میرے دوست کا گھر تلاش کر لیا۔ اسے دھمکی آمیز تحریر بھیجی۔ اب کیا وہ فلیٹ کے آس پاس نہیں ہوں گے۔ جب ان کے اہم مقصد کے پورا ہونے یعنی میرے فلیٹ سے باہر آنے کا وقت ہے۔'' البرٹ نے کہا۔ کارٹر اسے دیکھے جا رہا تھا۔ خوف کے مارے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔

''اور ہاں کارٹر! ہمیں یہاں سے باہر نکل کر جلدی ان سے رابطہ کرنا ہوگا۔ ایسا نہ ہو وہ سمجھیں کہ ہم فلیٹ کے اندر بیٹھے ان کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں اور وہ تمہارے بچوں کو کوئی نقصان......''

''چلو، چلو...... جلدی باہر نکلیں۔'' کارٹر بجلی کی سی تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ البرٹ بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس وقت بالکل بھول چکا تھا کہ اس کی کبھی کسی سے دشمنی رہی ہے یا نہیں .... نہ ہی کسی سے ایسا تعلق رہا ہے کہ اسے ان کے پاس واپس جانا چاہیے۔ وہ بالکل بھلا

بیٹھا تھا کہ اسے بلاوجہ تنگ کیا جارہا ہے۔ وہ تو بس اس وقت دو معصوم بچوں کی جان بچانے کے لیے اپنی جان داؤ پر لگانے جارہا تھا۔

☆☆☆

''وہ دونوں فلیٹ سے باہر نکلے یا نہیں؟'' ٹونی نے موبائل کان سے لگا رکھا تھا۔ اس کے انداز میں بے چینی تھی۔ وہ آج ہر حال میں البرٹ کو قابو کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد پال اس البرٹ کا کیا حشر کرتا ہے، اس سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو باس کی نظر میں اعلیٰ مقام حاصل کرنا چاہتا تھا۔

''نہیں باس! ابھی تک باہر نہیں آئے۔'' دوسری طرف نگرانی پر کھڑے جیکی نے جواب دیا۔

''باہر نہیں آئے......؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ہمارے خلاف کوئی پلان بنا رہے ہوں؟'' ٹونی چونکا۔

''باس! اسے سختی سے منع کیا گیا ہے کہ البرٹ کو کسی بات کا پتا نہ چلے اور وہ اسے باتوں میں لگا کر باہر لائے۔ اگر کارٹر اسے یہ بات بتا کر ہمارے خلاف کچھ کرنے کا سوچ بھی رہا ہے تو اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ اس کے کسی بھی غلط قدم کے اٹھانے کا نتیجہ اسے اپنے بچوں کے جسموں کے ٹکڑوں کی شکل میں ملے گا۔'' جیکی کے انداز میں بے رحمی تھی۔

''ہاں، ٹھیک کہا تم نے...... پھر بھی نظر رکھو ان پر اور جونہی کارٹر کی کال آئے، مجھے بتاؤ۔'' ٹونی نے ہدایت دے کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

البرٹ اور کارٹر دونوں فلیٹ کی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ البرٹ نے کارٹر کو سمجھا دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بالکل ایسے بات کرتا ہوا سیڑھیاں اترے جیسے واقعی اس نے اسے عام سی باتوں میں لگا رکھا ہے۔

''اب تم مجھ سے کچھ فاصلے پر جا کر انہیں کال کر کے پوچھو کہ مجھے کہاں لے جانا ہے۔'' البرٹ نے کارٹر کے کندھے پر ہاتھ مار کر ہنستے ہوئے کہا۔ دور سے دیکھنے والوں کو بھی لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی مذاق کرتے ہوئے دوست کے کندھے پر ہاتھ مار رہا ہے۔

جواباً کارٹر بھی ہنسا اور بولا۔ ''فاصلے پر جا کر کیوں؟ یہیں کر لیتا ہوں۔''

البرٹ ایک بار پھر کھل کر مسکرایا حالانکہ اس کا دل کارٹر کی بے وقوفی پر رونے کو کر رہا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا (حالانکہ اس وقت اس کا دل کارٹر کے جبڑے پر گھونسا مارنے کو کر رہا تھا) ''میرے احمق دوست! ہم جن لوگوں کو دکھانے کے لیے پاگلوں کی طرح ہنستے ہوئے انتہائی سنجیدہ بات کر رہے ہیں، ان سے فون پر میرے خلاف بات تم میرے ساتھ کھڑے ہو کر کر سکتے ہو؟''

''اوہ! واقعی میں احمق ہوں۔'' کارٹر نے تیزی سے کہا اور گراؤنڈ فلور پر البرٹ سے پہلے اتر کر اسے ذرا رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے سائڈ پر موجود شاپ پر چلا گیا جہاں وہ البرٹ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے کاغذ پر لکھا ہوا موبائل نمبر ملایا۔

☆☆☆

''باس! البرٹ کے دوست کارٹر کی کال آئی تھی۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ فلیٹ سے باہر میں اسے ذرا گھومنے پھرنے کا کہہ کر لایا ہوں۔ اب کہاں لے کر جاؤں؟ میں نے اسے کہا ہے کہ وہ اسے رش سے ذرا دور نسبتاً سنسان جگہ پر لے جائے۔ جونہی وہ ہماری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچیں گے، ہم انہیں گھیر کر البرٹ کو اٹھا لیں گے۔'' جیکی نے ٹونی کو بتایا۔

''اچھی طرح دیکھ لیا ہے، کسی گڑبڑ کا خدشہ تو نہیں؟'' ٹونی نے پوچھا۔

''ارے نہیں باس! میں نے اور میرے دو ساتھیوں نے ان پر کڑی نظر رکھی تھی۔ فلیٹ کے دروازے سے لے کر گراؤنڈ فلور تک وہ ہنستے ہوئے باتیں کرتے آئے تھے۔ دونوں کا انداز معمول کا تھا۔ میرے سامنے ہی کارٹر نے البرٹ کو ذرا ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور پھر ایک طرف چھپ کر مجھ سے رابطہ کیا۔ آپ بے فکر رہیں۔'' جیکی نے ٹونی کو تسلی دیتے ہوئے تفصیل بتائی۔

فون بند کر کے ٹونی نے میز پر رکھا اور ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر اسے ہلکے ہلکے حرکت دیتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ ''تو البرٹ! اب تم میرے شکنجے میں آ ہی چکے ہو۔'' اس کے چہرے پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

موبائل بند کر کے کارٹر نے البرٹ کو سامنے آ کر اشارہ کیا۔ البرٹ جلدی سے آیا اور دونوں کارٹر کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

''کیا کہا ان منحوسوں نے؟'' فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے البرٹ نے بے تابی سے پوچھا۔ جواب میں کارٹر نے جیکی سے ہونے والی گفتگو اسے بتا دی۔

''ہوں...... ٹھیک ہے، چلو۔'' البرٹ نے گہرا سانس

لیتے ہوئے کہا۔
''البرٹ! مجھے بہت شرمندگی ہو رہی ہے جو کچھ میں کرنے جا رہا ہوں۔''
''پلیز کارٹر! چپ رہو۔ اس سب میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تم بے فکر رہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یقیناً کوئی غلط فہمی یا مذاق ہے جو کچھ گھنٹوں میں سامنے آ جائے گا۔'' اس کے انداز میں بے خوفی اور سب ٹھیک ہو جانے کا یقین تھا۔
''اور اگر غلط فہمی، مذاق نہ ہوا، اگر انہوں نے تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیا تو؟'' کارٹر کا لہجہ شکستہ سا تھا۔
''کارٹر! ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اتنی کڑی نگرانی میں صرف ان کی بات ماننے کا ہی آپشن ہے۔ تم بس وہی کرو جو تمہیں انہوں نے اور میں نے کرنے کو کہا ہے۔ میری آج تک کسی سے دشمنی یا مخالفت نہیں رہی۔ مجھے یقین ہے شام سے پہلے پہلے حالات نارمل ہو جائیں گے۔'' البرٹ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بول رہا تھا۔ اب دونوں چپ تھے۔
چند منٹ بعد انہیں اپنے پیچھے جیکی کی گاڑی کے آنے کا پتا چل گیا۔ دونوں تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ آئندہ پیش آنے والی صورت حال کے بارے میں سوچ رہے تھے۔
کچھ ہی دیر میں جیکی کی دی گئی ہدایت کے مطابق کارٹر نے گاڑی کی اسپیڈ کافی کم کر دی اور جیکی کی گاڑی تیزی سے ان کے سامنے آ کر راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ چند ہی لمحوں میں تین گن بردار لڑکوں نے البرٹ کو گاڑی سے گھسیٹ کر اپنی گاڑی میں بٹھا لیا اور کارٹر کے بچے کارٹر کے حوالے کر دیے۔ کارٹر سہمے ہوئے دونوں بچوں کو خود سے لگائے ہوئے افسردہ نظروں سے البرٹ والی گاڑی کو جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

''ہیلو باس! ایک خوشخبری ہے۔'' ٹونی کے لہجے میں جوش تھا۔
''کیسی خوشخبری؟'' پال چونکا۔
''باس...... اس بھگوڑے البرٹ کو قابو کر لیا گیا ہے۔ ابھی میرے پاس جیکی کی کال آئی تھی۔ وہ اس وقت اس کی گاڑی میں ہے۔'' ٹونی نے خوشخبری سنائی۔
پال کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کیا واقعی؟ اگر یہ سچ ہے تو اسے وقت ضائع کیے بغیر میرے پاس لے آؤ۔'' پال نے تیزی سے کہا۔
''ٹھیک ہے باس! تقریباً پون گھنٹے بعد وہ آپ کے پاس ہوگا۔ میں اپنے لڑکوں سے کہہ دیتا ہوں کہ سیدھا باس کے اڈے پر لے جائیں۔ اس کی آنکھوں پر پٹی وغیرہ باندھنے کی تو ضرورت نہیں ہے نا؟'' ٹونی نے پوچھا۔
پال عجیب سے انداز میں ہنسا۔ ''ارے، اس کی ضرورت نہیں۔ پرانا بندہ ہے۔ تمام خفیہ راستوں، اڈوں اور مرکز کو جانتا ہے۔ بس تم اسے یہاں پہنچا دو اور ہاں...... تم بھی آ جاؤ۔'' پال نے حکم دیا۔
''یس باس! میں ذرا شہر سے باہر تھا۔ میں پہنچ رہا ہوں کچھ دیر میں۔'' ٹونی نے کہہ کر فون بند کر دیا اور واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ 'باس کم ہی کسی کو معاف کرتا ہے۔' اس نے سوچا، وہ اپنے سامنے البرٹ کی درگت بنتے دیکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

''کون ہو تم لوگ اور خدا کے لیے بتاؤ کہ کس وجہ سے مجھے اغوا کر کے لے جا رہے ہو؟'' البرٹ نے گاڑی میں زبردستی بٹھائے جانے کے چند منٹ بعد سوال کیا۔ وہ پچھلی سیٹ پر اس طرح بیٹھا تھا کہ دائیں بائیں بیٹھے دونوں لڑکوں کے پستول کی نال اس کی پسلیوں سے چبھ رہی تھی۔
''وجہ پوچھ رہے ہو۔ یہ نہیں پوچھو گے کہ ہم تمہیں کہاں لے جا رہے ہیں؟'' ڈرائیونگ سیٹ پر موجود غیر معمولی لمبے لڑکے نے کہا۔ البرٹ کے تن بدن میں گویا آگ لگ گئی۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ اس وقت گن پوائنٹ پر ہے۔
''لے جانے کی وجہ بتا دو پھر چاہے جہنم میں لے جانا، مجھے پروا نہیں۔'' وہ شدید غصے سے بولا۔ جواباً تینوں لڑکے ہنس دیے۔
''مسٹر البرٹ! آرام سے بیٹھے رہو۔ ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ بغیر کوئی نقصان پہنچائے تمہیں باس کے اڈے پر پہنچا دیا جائے۔ ہم حکم پورا کرنے کے پابند ہیں۔ کچھ دیر خاموش بیٹھو، جلد سارے سوالوں کے جواب جان جاؤ گے۔'' البرٹ کے دائیں طرف بیٹھے جیکی نے خشک لہجے میں کہا۔
''کون باس...... ؟ کون سا اڈا؟ خدایا میں پاگل ہو جاؤں گا۔'' البرٹ نے دانت کچکچائے۔
وہ تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

وسیع و عریض کمرے میں پال صوفے پر بیٹھا تھا۔ ایک سائڈ پر ڈبل بیڈ اور فریج پڑے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ کچھ کرسیاں ترتیب کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ پورا کمرا کارپیٹڈ تھا۔ صوفے کے قریب ایک بڑی سی کرسی پڑی تھی جو

البرٹ کا انتظار کر رہی تھی۔ پال کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جو بہت بڑی کامیابی حاصل کرنے کے بعد آتی ہے۔ اسے البرٹ کے یہاں داخلی گیٹ کے پاس پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی۔

''لے آؤ اسے میرے کمرے میں۔'' پال نے اپنے خاص کمرے میں اسے لانے کا کہا۔ چند منٹ بعد البرٹ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے دائیں بائیں گن بردار تھے۔ پال نے جان بوجھ کر منہ دوسری طرف کرلیا۔

''ہاں...... تو البرٹ! تم یہاں آنے پر مجبور کر ہی دیے گئے۔ تم نے شاید سوچا تھا کہ تم کبھی میری گرفت میں آؤ گے ہی نہیں لیکن تم دیکھو کہ تمہیں میرے چند ماہ پہلے آئے ہوئے ناتجربہ کار لڑکوں نے قابو کرلیا...... ہاہاہا۔'' پال نے زوردار قہقہہ لگایا اور بات جاری رکھی۔ ''تمہیں جس بھی طریقے سے لایا گیا ہو، بہرحال آئے تو تم اپنے ہی گھر ہو اس لیے تمہیں ویلکم تو کہنا چاہیے۔'' پال بڑے ڈرامائی انداز میں مڑا۔

''تو...... مسٹر البرٹ! ویل...... کم!'' آخری لفظ پال کے منہ میں ہی رہ گیا۔

''یہ کون ہے؟'' اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گن پوائنٹ پر کھڑے اجنبی چہرے کو دیکھ کر سوال کیا۔ لڑکے گھبرا گئے۔

''سر! یہ البرٹ ہے۔ وہی جسے آپ نے اور ٹونی سر نے لانے کا کہا تھا۔'' ایک نے جواب دیا۔ پال کے چہرے پر زلزلے کے سے اثرات تھے۔ اس کے سامنے اس کے مطلوبہ البرٹ کے بجائے کوئی اور ہی کھڑا تھا جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

''احمقو! یہ کسے اٹھالائے ہو؟ کس کے کہنے پر تم اسے البرٹ سمجھ بیٹھے؟'' وہ چیخا۔

''جناب! کیا آپ میری ...... بات سنیں گے؟'' البرٹ نے ڈرتے ڈرتے پہلی بار زبان کھولی۔ اس جگہ داخل ہونے سے لے کر اب تک اس پر کافی خوف طاری ہو چکا تھا۔ جو اعتماد یہاں آنے سے پہلے اس میں آیا تھا، وہ یہاں کا ماحول دیکھ کر اڑن چھو ہوگیا تھا۔ پال نے اس کی جانب گھور کر دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ ''بکو جلدی۔''

''سر! میں خود پچھلے اٹھارہ، بیس دن سے شدید پریشان ہوں۔ یہ لوگ میری خوامخواہ نگرانی کر رہے تھے۔ مجھے مختلف طریقوں سے اور خط بھیج کر مجھے ڈرا رہے تھے۔ واپس آجانے کا کہہ رہے تھے اور اب میرے ایک قریبی دوست کو بلیک میل کیا اور مجھے زبردستی اٹھالائے۔ برائے مہربانی مجھے جانے دیں۔ میں نہایت عام اور بے ضرر سا انسان ہوں۔ یہ تو مجھے سمجھ آچکی ہے کہ یہ لوگ مجھے کسی اور کے دھوکے میں لے آئے ہیں۔ مجھے جانے دیجیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں، سب کچھ بھول جاؤں گا اور کبھی بھی کسی سے آپ کا ذکر نہیں کروں گا۔'' البرٹ نے طویل بات کرتے ہوئے گویا درخواست کی حالانکہ اسے خدشہ تھا کہ یہ غنڈے اسے یوں نہیں جانے دیں گے پھر بھی اپنی زندگی بچانے کی اپنی سی کوشش کی۔ پال نے اسے کوئی بھی جواب دیے بغیر موبائل پر کوئی نمبر ملایا اور البرٹ کو سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ البرٹ خوفزدہ سا بیٹھ گیا۔ اتنا تو اس کی توقع کے عین مطابق ہوا تھا کہ یہ سب ایک غلط فہمی تھی لیکن آگے کیا ہوگا؟ کا سوال اس کے ذہن میں کئی خدشات جگا رہا تھا۔

☆☆☆

ٹونی، پال کے اڈے سے کچھ فاصلے پر تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ موبائل اسکرین پر ''باس'' دیکھ کر اس نے نہایت خوشی سے کال ریسیو کی۔ ''یس باس! بس پہنچنے ہی والا ہوں چند منٹ میں۔''

''ہاں، آؤ جلدی اور ملو البرٹ سے۔'' پال کا لہجہ بہت سرد اور روکھا تھا جس پر ٹونی کو شدید حیرت ہوئی۔ کال ختم ہوگئی تھی۔ ٹونی البرٹ سے ملنے اور پال کے لہجے کی وجہ جاننے کے لیے بے چین ہوگیا۔ اس نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھادی۔

☆☆☆

پال سخت چہرہ لیے شدید غصے میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ قہر اور آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ سامنے کرسی پر بیٹھا البرٹ اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے لانے والے لڑکے ایک طرف سہمے کھڑے تھے۔ ٹونی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر پال کی غراہٹ بھری آواز ابھری۔

''ٹونی! لو تم بھی مل لو البرٹ سے۔'' لہجہ لرزا دینے والا تھا۔

ٹونی نے کرسی پر بیٹھے اجنبی چہرے کو دیکھا۔ ''یہ...... یہ کون ہے؟'' وہ ہکلایا۔

''وہی البرٹ جسے تم نے تلاش کروایا ہے۔'' پال کا لہجہ طنزیہ اور غصے میں بھرا ہوا تھا۔ ٹونی گھبرا گیا۔

''یہ تو...... یہ تو کوئی اور ہے۔ میں نے تو انہیں کہا تھا کہ......'' ٹونی بول رہا تھا کہ باس نے اس کی بات کاٹ دی۔

''یہ ہے وہ البرٹ جس کے لیے تم اتنا اچھل رہے

تھے۔ مجھے اتنے دن سے خوشخبری سنا رہے تھے۔ میرا اتنا ٹائم ضائع کیا۔'' پال دھاڑا۔ ٹونی تیزی سے اپنے لڑکوں کی جانب مڑا۔

''یہ کیا ہے؟ میں نے تو تمہیں اس کی تصویر، نام، نشانیاں، سب بتا دیا تھا پھر کیوں غلط بندے کو اٹھا لائے ہو؟'' وہ اب ان پر غصہ نکال رہا تھا۔

''وہ دراصل بات یہ ہے کہ ہمیں البرٹ نامی شخص کا پتا چلا تو ہم اس کے آس پاس گئے۔ ہمارے پاس تصویر تھی۔ ہم نے تصویر دیکھنا چاہی تو پتا چلا کہ نہ جانے کیسے وہ ڈیلیٹ ہو گئی ہے۔ ہم گھبرا گئے۔ آپ کی ناراضگی کا ڈر تھا اس لیے آپ سے دوبارہ تصویر نہ مانگی اور پھر جیکی نے مجھے تسلی دی کہ اسے ایک ہی بار موبائل فون میں اس کی شکل دیکھ کر کافی یاد ہے۔ ہم اسے ڈھونڈ سکتے ہیں۔ اسی دوران ہمارے ایک ساتھی نے کال کی جو البرٹ کے فلیٹ کی نگرانی پر مقرر تھا اور بتایا کہ البرٹ باہر آ رہا ہے۔ جب البرٹ باہر آیا تو اس نے ماسک پہن رکھا تھا۔ چہرہ اتنا واضح نہیں تھا۔ ہم مایوس سے ہو گئے کہ اچانک میری نظر اس کی انگلی پر پڑی۔ اس میں وہی انگوٹھی تھی جیسی آپ اور چند اور لوگوں کے پاس ہے۔ جیکی نے بھی میرے کہنے پر انگوٹھی دیکھی اور کہا کہ یہی ہے وہ جس کی ہمیں تلاش ہے۔ چنانچہ ہم اسے اٹھا لائے اور چہرہ دیکھنے کی فکر چھوڑ دی کیونکہ ہمیں یقین تھا ہم ٹھیک بندہ لے جا رہے ہیں۔'' جیکی کے جونیئر نے بڑی تیزی سے سارا سچ سامنے رکھ دیا۔

ٹونی، پال کے ڈر اور لڑکوں پر غصے سے کانپ رہا تھا۔ وہ تیزی سے سکتے کے سے عالم میں بیٹھے البرٹ کے پاس گیا اور جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر انگلی میں موجود انگوٹھی بغور دیکھنے لگا پھر اپنی انگوٹھی دیکھی۔ معمولی سے فرق کے ساتھ دونوں ایک جیسی لگتی تھیں۔

''احمق ہو تم۔'' ٹونی چیخا۔ ''میں نے کہا بھی تھا کہ اچھی طرح چیک کر لینا۔ تم نے مجھ سے دوبارہ تصویر کیوں نہیں مانگی اور...... اور جیکی! تمہیں تو شکل یاد تھی نا...... پھر پہچانا کیوں نہیں یہاں لانے تک؟'' وہ پھنکار رہا تھا۔

''وہ...... باس! مجھے لگا کہ یہ وہی ہے۔ دراصل......'' اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ البرٹ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔

''پلیز سر! مجھے اب تو جانے دیں۔ میرا آپ کے معاملات سے کچھ لینا دینا نہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔'' اس نے ایک بار پھر وہاں سے جانے کی درخواست کی۔

پال نے اسے غور سے دیکھا۔ ''ٹونی! تم اور تمہارے احمق ساتھی جاؤ اسے لے کر۔ اسے اس کے ٹھکانے پر دھیان سے چھوڑ آؤ۔'' پال، البرٹ کو وہاں سے جانے کی اجازت دے رہا تھا۔ نہ جانے کیوں البرٹ کو اس کا انداز سفاکانہ سا لگا۔

ٹونی نے چونک کر باس کی طرف دیکھا اور بولے بغیر البرٹ اور اپنے لڑکوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اس طرح جان چھوٹ جانے پر البرٹ شدید حیران تھا۔ وہ پھر سے دو بندوں کے درمیان بیٹھا تھا لیکن اب وہ پُرسکون تھا کیونکہ وہ اپنے گھر واپس جانے والا تھا۔

گاڑی اڈے سے کافی فاصلے پر آ چکی تھی کہ البرٹ بولا۔ ''تمہارا باس بہت رحم دل ہے۔ مجھے زندہ واپس جانے دیا ہے ورنہ میں تو ڈر رہا تھا کہ نہ جانے کیا ہوگا۔''

ساتھ بیٹھے ٹونی نے عجیب انداز میں قہقہہ لگایا۔ ''تم نے ہمارا اڈا دیکھ لیا ہے۔ سارے بیرونی و اندرونی راستے دیکھ لیے۔ اپنا بندہ سمجھ کر ہم نے تمہاری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی تھی اور ہماری اس غلطی کی وجہ سے تم ہمارے کافی راز جان چکے ہو۔ تمہیں زندہ رکھنے کی غلطی ہم کر سکتے ہیں؟'' اس کے ٹھکانے پر دھیان سے چھوڑ آؤ'' کا مطلب ہے، اسے اس کی رہائش گاہ کے آس پاس یا فلیٹ پر اس طرح ٹھکانے لگا کر آؤ کہ سب کو یہ خودکشی یا حادثہ لگے۔ سمجھے تم مسٹر البرٹ؟''

البرٹ کا پورا جسم خوف کے مارے پسینے میں بھیگ گیا۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔ بچاؤ کی کوئی صورت اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ کوئی انہونی ہونے کی دعا کر رہا تھا کہ اچانک گاڑی رک گئی۔

''کیا ہوا؟'' ٹونی نے پوچھا۔

''پیٹرول ختم ہو گیا ہے۔'' جیکی نے جواب دیا پھر بولا۔ ''قریب ہی پیٹرول پمپ ہے۔ دھکا لگا کر بہ آسانی وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔'' ٹونی کچھ نہیں بولا۔ وہ دانت بھینچے ان نکموں کو دیکھ رہا تھا جنھوں نے پیٹرول چیک نہیں کیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں گاڑی پیٹرول پمپ تک پہنچ گئی۔

''کوئی چالاکی نہ کرنا کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہم محفوظ راستہ نہ پا کر تمہیں یہیں گولی مار کر پھینک جائیں گے۔'' ٹونی نے دھمکایا۔

البرٹ ویران آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ غلط فہمی کسی کو ہوئی اور مارا وہ جا رہا تھا۔ عجیب بات تھی۔ اس کی نظر اپنی اس انگلی پر پڑی

جس میں وہ انگوٹھی تھی جس نے اسے موت کی سزا سنوائی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اس منحوس انگوٹھی کو اتار کر دور پھینک دے۔

پیٹرول ڈالنے والا لڑکا پیٹرول ڈال رہا تھا۔ چند ماہ پہلے ایسے ہی خرید کر پہنی گئی انگوٹھی پر وہ غور کر رہا تھا کہ ایک گاڑی وہاں آ کر رکی۔ اس میں سے ایک شخص جو پیٹرول پمپ کا مالک تھا، پیٹرول ڈالنے والے لڑکے کے قریب آیا۔

''اسمتھ چلا گیا کیا؟'' اس نے پوچھا۔ البرٹ کی نظر اس کی انگلی میں موجود انگوٹھی پر پڑی جو کافی قیمتی لگ رہی تھی۔ اس میں بہت بڑا قیمتی پتھر تھا۔

''جناب! کیا میں یہ انگوٹھی دیکھ سکتا ہوں؟'' اس نے پیٹرول پمپ کے مالک سے اچانک سوال کر ڈالا۔ ٹونی اور دوسرے لڑکے چونک کر اسے گھورنے لگے۔ وہ چونکنے سے ہوگئے۔

''دراصل مجھے انگوٹھیوں اور قیمتی پتھروں کا شوق ہے۔ کیا جڑا ہے اس میں؟ دکھایئے ذرا۔'' البرٹ نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ اسے انگوٹھیوں کا شوق تھا نہ ہیرے، موتی، پتھر کا کچھ علم تھا۔ بس اس کی شدید خواہش تھی کہ انگوٹھی نہایت قیمتی ہو اور ایسا ہی ہوا۔

''جی ہاں، دکھاتا ہوں۔ اس میں میرا خاندانی ہیرا جڑا ہے جس کی قیمت کسی کی سوچ سے بھی زیادہ ہے۔'' کہتے ہوئے پیٹرول پمپ کے مالک نے انگوٹھی اتار کر البرٹ کو تھما دی۔ اس کو شاندار گاڑی میں بیٹھے شخص پر اعتبار تھا۔

'تم اب ذرا پرے ہٹ جاؤ۔' دل میں سوچتے ہوئے وہ انگوٹھی کو ہتھیلی پر رکھ کر غور سے دیکھنے لگا۔ مالک تو کہیں ادھر ادھر گیا لیکن قدرت اس پر مہربان تھی۔ ہوا یہ کہ پیٹرول پمپ کا مالک اچانک دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ادھر گاڑی اسٹارٹ ہو رہی تھی۔ ٹونی اسے دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو ''واپس کر دو انگوٹھی۔'' اس نے جلدی سے اصلی مالک کے بجائے وہاں کھڑے لڑکے کو انگوٹھی تھما دی۔ ''یہ لو، دے دو انہیں۔''

گاڑی پیٹرول پمپ سے روانہ ہو رہی تھی۔ لڑکا انگوٹھی مالک کو پکڑا رہا تھا۔ ٹونی کی گاڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ البرٹ تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ جو میں نے ابھی کیا ہے کیا اس کا مثبت نتیجہ ملے گا؟ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو گود میں دبائے بیٹھا تھا۔ گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ وہ اپنے پیچھے آنے والی ہر گاڑی کی آواز پر غور کرتا اور اس کے پاس سے گزر جانے پر مایوس ہو جاتا۔

یہ سب چند منٹ میں ہی ہوا۔ اچانک چند گاڑیاں شور مچاتی ان کے قریب آ گئیں۔ ٹونی حیرت سے پیچھے آنے والی ان گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا جن میں سے ایک تیزی سے ان کی گاڑی کے سامنے آ کر راستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور انہیں اچانک بریک لگانے پر مجبور کر دیا۔ اسی دوران دوسری گاڑی سے چار مستعد لڑکے پستول لیے نکلے اور البرٹ والی گاڑی کے چاروں شیشوں والی سائڈ پر بیٹھے افراد پر تان لیے۔ یہ اتنی جلدی ہوا کہ ٹونی اینڈ کمپنی کو سمجھنے یا کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اتنے بڑے گینگ کے تجربے کار لوگ بے خبری میں قابو آ گئے۔ وہ بالکل بے بس بیٹھے تھے۔ جس گاڑی نے راستہ روکا تھا، اس میں سے پیٹرول پمپ کا مالک ایلن اترا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ان لوگوں کے پاس آ گیا۔ اس کے چہرے پر شدید اشتعال تھا۔

''تو یہ ہے طریقہ تمہارے لوٹنے کا، ذلیل لوگو!'' ایلن کے لہجے میں غصہ اور نفرت دونوں تھے۔ اس کے پمپ پر موجود سیکیورٹی والے لڑکے سب کو گن پوائنٹ پر گاڑی سے نکال چکے تھے۔ جیکی نے تیزی دکھانے کی کوشش کی لیکن گرفت میں آئے ٹونی نے حالات کی نزاکت سمجھتے ہوئے اسے اشارے سے روک دیا۔ ان کا اسلحہ چھین لیا گیا تھا اور اتنے رش میں باقی لوگ انہیں پیٹتے تو آ سکتے تھے، ان کی مدد کرنے نہیں۔ وہ بری طرح پھنسے ہوئے تھے۔ البرٹ کے چہرے پر پُرسکون مسکراہٹ تھی۔

''میں نے تمہاری شکل اور گاڑی دیکھ کر تم پر اعتبار کر لیا لیکن نیچ انسان تم نے ایک قیمتی ہیرے والی انگوٹھی ہتھیا کر لڑکے کو یہ چند ڈالر کی معمولی سی انگوٹھی تھما دی۔ کیا سمجھا تھا تم نے کہ تم اور تمہارا گروپ واردات کر کے نکل جاؤ گے اور ہم بے وقوف بن کر بیٹھے رہیں گے؟ میرے پمپ پر موجود میرے گن مین نہیں دیکھے تھے کیا تم نے؟'' ایلن، البرٹ کا کالر پکڑے اسے خوب جھنجوڑتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''جی، دیکھے تھے گن مین۔ اسی لیے تو واردات کی۔'' البرٹ نے سکون سے کہا۔ اس کی مسکراہٹ مزید بڑھ گئی تھی۔ ٹونی اور اس کے ساتھی البرٹ کی ہوشیاری کو سمجھ چکے تھے اور اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔

'یہ بہت خطرناک ہو چکا ہے۔ اگر اسے ختم نہ کیا تو باس ہماری فیملیز تک کو ختم کروا دے گا۔' ٹونی نے سوچا۔ اس نے یکدم خود کو چھڑوایا اور البرٹ کی گردن دبوچ لی۔ قریب تھا کہ وہ گردن دبا تا، ایلن کے گارڈ نے اس کی پسلی میں زوردار ٹھوکر مار کر اسے کراہنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اس بات پر حیران تھے کہ مجرم نے اپنے دوسرے ساتھی پر کیوں حملہ کیا۔ اتنے میں پولیس پہنچ گئی جسے ایلن نے پیٹرول پمپ

سے روانہ ہوتے ہی مطلع کر دیا تھا۔ خود کو بری طرح شکنجے میں جکڑے دیکھ کر ٹونی چیخ اٹھا۔

''شاطر آدمی! تم نے خوب طریقہ نکالا اپنی جان بچانے کا لیکن یاد رکھو، زندہ پھر بھی نہیں بچ پاؤ گے۔''

ایلن، اس کے گارڈز اور پولیس والے چونکے۔ وہ البرٹ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''آفیسر! میں ان کا ساتھی یا مجرم نہیں ہوں بلکہ میں تو ان کے ہاتھوں کچھ دیر میں قتل ہونے والا تھا کہ اچانک قدرت مجھ پر مہربان ہوگئی اور آپ لوگوں نے آکر مجھے بچالیا۔'' البرٹ نے بتایا۔ ٹونی کے چیخ کر اسے کہے گئے جملے نے اس کی پوزیشن پولیس اور ایلن کے سامنے بالکل صاف کر دی تھی۔ وہ اب مجرم کے طور پر نہیں دیکھا جا رہا تھا۔

تفصیل جاننے کے لیے ایلن اور اس کے ساتھیوں سمیت سب کو پولیس اسٹیشن لے جایا گیا۔ البرٹ نے نگرانی، رسالہ، چٹ، کارٹر کے بچوں کے اغوا سے لے کر پیٹرول ختم ہونے تک ساری کہانی سنائی اور سانس لے کر بولا۔ ''جونہی میں نے سر ایلن کی انگوٹھی کو دیکھا تو میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر میں یہ انگوٹھی اڑا لے جاؤں تو یقیناً یہ پولیس سے رابطہ کریں گے اور ہمیں پکڑ کر میرے بچانے کا ذریعہ بن جائیں گے پھر میری نظر وہاں کھڑے ان کے گن بردار لڑکوں پر پڑی تو مجھے خوشی ہوئی کہ مجرموں کا تعاقب جلد ہوکر جلد معاملہ حل ہو جائے گا۔ انگوٹھی لے کر میری خواہش تھی کہ ایلن کہیں سائڈ پر ہو جائے تاکہ میں اس کے لڑکے کو دوسری چھلا نما اپنی انگوٹھی دے سکوں۔ ایسا تو نہ ہوا لیکن چند سیکنڈ کے لیے ایلن کی توجہ ہٹی اور اتنی ہی دیر میں، میں نے ''واردات'' کر ڈالی اور خوش قسمتی سے یہ لوگ اور آپ ہم تک نہ صرف پہنچ گئے بلکہ ہمیں قابو بھی کر لیا۔'' البرٹ نے تفصیل بتائی۔

پال کا گینگ اپنے والے البرٹ کے ہاتھوں تو نہ سہی لیکن غلط فہمی والے البرٹ کی وجہ سے پولیس کی گرفت میں آنے والا تھا۔ البرٹ، ٹونی کے بولے گئے جملے کی وجہ سے بے قصور تو ثابت ہو ہی چکا تھا۔ اب تفصیل بتا کر وہ بالکل ہر مسئلے سے آزاد ہو گیا تھا۔ پولیس نے اسے اور ایلن کو جانے کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

کارٹر سوچوں میں الجھا اداس بیٹھا تھا۔ ''نہ جانے میرے دوست کے ساتھ کیا ہو رہا ہوگا؟'' وہ شدید افسردہ تھا کہ انجان نمبر سے کال آئی۔ اس نے دیکھا اور بے دلی سے کال ریسیو کرتے ہوئے ''ہیلو'' کہا۔

''رات کا کھانا تم، تمہاری بیوی اور بچے میرے ساتھ میرے فلیٹ میں کھاؤ گے۔ آج میں اپنی اور تمہاری فیورٹ ڈشز بنانے والا ہوں۔'' البرٹ کی خوب چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ کارٹر حیرت کی شدت اور خوشی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''البرٹ تم؟ تم ٹھیک تو ہو؟ ان منحوسوں نے تمہیں کیسے چھوڑا؟ بتایا کچھ انہوں نے؟ اور ہاں......'' پورا سوال نامہ وہ فون پر ہی حل کرنا چاہتا تھا۔

''رکو...... رکو...... رات کے کھانے پر سارے جواب لے لینا۔ تمہاری تسلی کے لیے اتنا بتا دیتا ہوں کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور کچھ دیر میں اپنے گھر پہنچنے والا ہوں اور ہاں...... یہ کسی اور کا موبائل ہے۔ اب تم کال کر کے تنگ مت کرنے لگ جانا پلیز۔'' اس کا لہجہ ہلکا پھلکا اور خوشگوار تھا۔

کارٹر نے سکون کی سانس لیتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

البرٹ، ایلن کی گاڑی میں دوبارہ اس کے پیٹرول پمپ پہنچ چکا تھا۔

''پلیز! ٹیکسی تو منگوا دیجیے۔'' اس نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا جو ابھی اس کے لیے منگوائی گئی تھی۔ وہ ایک ضروری کام کا کہہ کر ایلن کے ساتھ آیا تھا اور وہ ضروری کام تھا اس کی چھلا نما سستی سی انگوٹھی کی واپسی کا۔ وہ انگوٹھی کسی دراز میں رکھ دی گئی تھی جو جلد ہی اسے مل گئی۔

''تم اس معمولی سی انگوٹھی کو لے کر کیا کرو گے؟'' ایلن نے انگوٹھی تھما کر ہنستے ہوئے کہا۔

''معمولی؟ ارے تم اسے معمولی کہہ رہے ہو۔ اس نے میری جان بچائی اور ایک خطرناک گینگ کو قابو کرنے میں مدد دی۔ میں جسے منحوس سمجھ رہا تھا، وہ میرے اور کئی لوگوں کے لیے لکی ثابت ہوئی۔ یہ تو بہت خاص ہے میرے دوست!'' البرٹ نے سمجھایا تو ایلن اس سے مصافحہ کرتے ہوئے مسکرا دیا۔ اسے اس ''معمولی'' انگوٹھی کے ''قیمتی'' بن جانے کی سمجھ آ گئی تھی۔

البرٹ نے انگوٹھی پکڑی اور اسے پیار و عقیدت سے دیکھتے ہوئے انگلی میں پہنا اور مسکراتے ہوئے اس ٹیکسی میں بیٹھ گیا جو اس کے فلیٹ تک اسے پہنچانے کے لیے منگوائی گئی تھی۔ ٹیکسی کی پچھلی نشست پر خوب پھیل کر بیٹھتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور رات کو بنائی جانے والی ڈشز کے بارے میں سوچنے لگا۔

×××

خراسان میں مرو اور نیشاپور کے درمیان سرخس نامی ایک شہر آباد تھا۔ اس شہر میں تاریخ کی نامی گرامی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ لوگ شہر کا نام تو بھول سکتے ہیں مگر اس شہر کی نامی گرامی ہستیوں کو نہیں فراموش کر سکتے۔ ابوالفضل حسن سرخسی چوتھی صدی ہجری کے عالم باعمل صوفی تھے۔ شیخ مرتعش کے مرید اور ابوسعید ابوالخیر کے مرشد تھے۔ آپ کی خانقاہ میں آنے جانے

دو صوفی

ضیاء تسنیم بلگرامی

شیخ ابوالفضل بن حسن سرخی اور شیخ لقمان مجنون، ایران کے شہر سرخس کے دو صوفی تھے۔ ایک ہی دور کے، ایک دوسرے کے ہم عصر۔ اول الذکر فرزانہ اور عالم باعمل تھے۔ روحانی اور ظاہری علوم میں کمال رکھنے والے۔۔۔ ان کی انہی خصوصیات اور اوصاف کا ہر کوئی قائل اور مداح تھا۔ دوسرے لقمان مجنون تھے۔ مجنون ان کے نام کا جزو بن گیا۔ وہ ہر بات سے آزاد تھے۔ ان کا باطن روشن تھا۔ انہوں نے آزادی چاہی، انہیں آزاد کر دیا گیا۔ دونوں صوفی دور دور بھی رہتے اور یکجا بھی ہوجاتے۔ ان میں نوک جھونک بھی ہوتی اور ایک دوسرے کا ادب واحترام بھی کرتے۔ دونوں کے دلچسپ حالات کو کتابوں نے انہیں محفوظ کرلیا اور تذکرہ نویسوں نے انہیں اپنے قلم کا موضوع بنایا۔ صوفیاء نے ان کا ذکر احتراماً اور لازماً کیا اور یہ سلسلہ جاری ہے، جاری رہے گا۔

ایک دیوانہ، دوسرا فرزانہ...... دو صوفیوں کے حالات زندگی
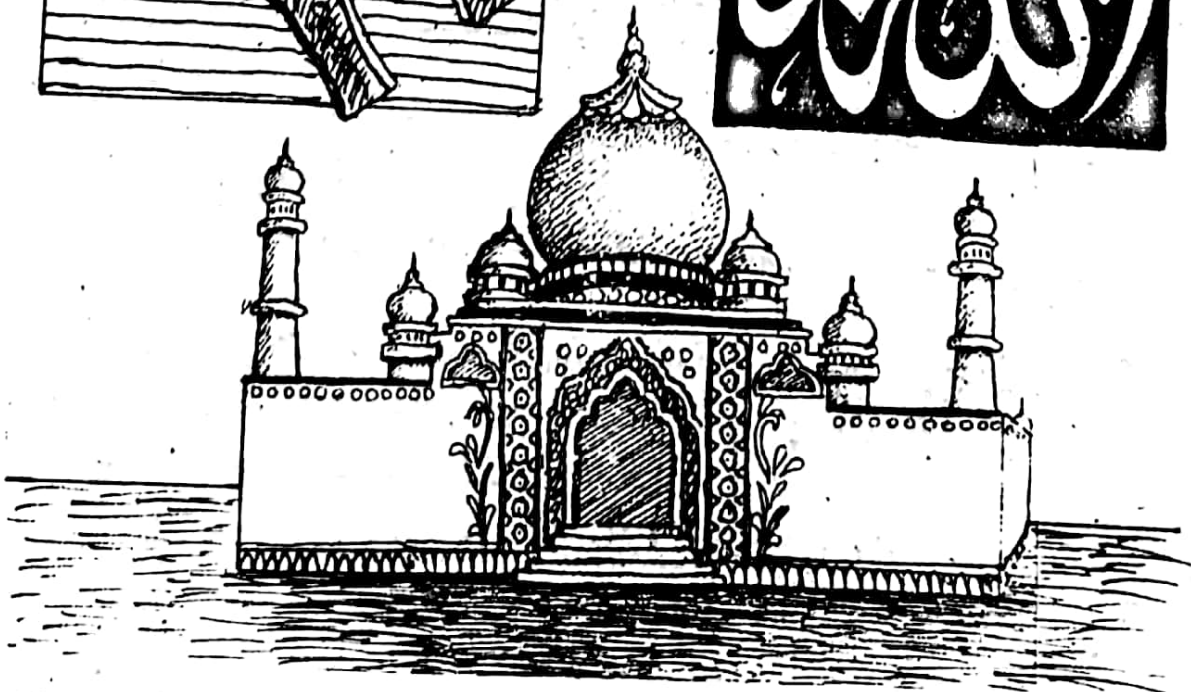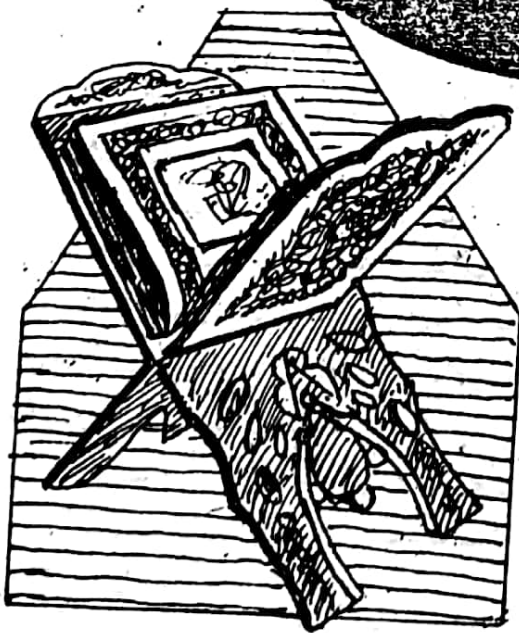
والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ آپ بذاتِ خود اپنے حجرے سے کم نکلتے تھے۔

اس شہر میں راکھ کا ایک تودہ تھا، اس تودے کے پاس ایک دیوانہ بیٹھا رہتا تھا۔ یہ دیوانہ باتیں بہت اچھی کرتا تھا۔ باتیں ایسی ہوتی تھیں کہ کبھی کسی کی سمجھ میں آجاتیں اور کبھی بالکل نہ آتیں۔ عام لوگ اس دیوانے کی عزت بھی کرتے تھے اور کبھی کبھی مجنوں کہہ کر مذاق بھی اڑا دیتے تھے۔ صوفی اس دیوانے کی عزت کرتے تھے۔ ان عزت کرنے والوں میں ابوالفضل سرخسی بھی شامل تھے۔ یہ دیوانہ کبھی کبھی ابوالفضل سرخسی کے پاس پہنچ جاتا اور ان سے علمی، عقلی اور نقلی علوم پر مباحثہ شروع کر دیتا۔ اس دیوانے کا نام لقمان تھا اور عوام میں لقمان مجنون کہلاتا تھا۔

آپ اگر یہ چاہیں نہ ابوالفضل سرخسی کا ذکر کریں اور لقمان کا نام نہ لیں تو ناممکن ہو جائے گا۔ ایک ہی عہد اور ایک ہی شہر کے یہ دونوں بزرگ لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔ ایک کا دوسرے سے ایسا واسطہ اور رابطہ ہے کہ ذکر ہوگا تو دونوں کا، کسی ایک کا نہیں۔

ابوالفضل سرخسی سے جب لقمان مجنون کا ذکر کیا جاتا کہ وہ تو خود اپنے حواس میں نہیں، ان سے کسی کو کیا ملے گا؟

ابوالفضل جواب دیتے۔ ”اس نے بہت کچھ حاصل کر کے دیوانگی اختیار کی۔ اس کے پاس بہت کچھ ہے۔ آخر اس کی ہوس اور مایوسی نے اسے اس حال کو پہنچا دیا۔“

آپ سے سوال کیا گیا۔ ”وہ کس طرح؟“

ابوالفضل نے پوچھا۔ ”تم لوگ لقمان مجنون کا ماضی دیکھنا چاہتے ہو؟“

لوگوں نے بیک زبان جواب دیا۔ ”ہاں، ہم اس دیوانے کا ماضی دیکھنا چاہتے ہیں۔“

ابوالفضل سرخسی نے کہا۔ ”اپنے اپنے گھر جاؤ۔ اللہ نے چاہا تو لقمان مجنون کا ماضی بھی دیکھ لو گے۔“

وہ لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

انہوں نے عالم رویا میں ایک نوجوان کو دیکھا، نوجوان لقمان۔ اس نے اپنے حجرے کو زہد و طاعت سے آراستہ کر رکھا تھا۔ فجر کی نماز ادا کی اور تلاوتِ کلام پاک میں مشغول ہو گیا۔ جب سورج ذرا بلند ہوا تو نوجوان لقمان محنت مزدوری میں مشغول ہو گیا۔ کسی نے رحم کھا کے نوجوان لقمان کی مدد کرنا چاہی تو اس نے اس سے انکار کر دیا۔

شہر کے خوشحال، نوجوان لقمان پر مہربان تھے۔ وہ اس کے زہد و تقوے کے پیش نظر اس کی مدد کرنا چاہتے تھے۔

ایک رئیس نے نوجوان لقمان کو پیشکش کی۔ ”آپ چاہیں تو میں آپ کا روزینہ مقرر کر دوں۔ آپ عبادت و ریاضت میں مشغول رہیں۔“

لقمان نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں کوئی ایسی رقم نہیں قبول کر سکتا جس میں میری محنت شامل نہ ہو۔“

رئیس نے کہا۔ ”آپ جو عبادت کرتے ہیں، آپ میری دی ہوئی رقم کو اس کی اجرت سمجھ لیں۔“

نوجوان لقمان کو یہ بات بہت بری لگی۔ ”اے شخص! تو نے میری عبادت کو مزدوری سمجھ لیا ہے۔ افسوس کہ میں تیری اس بات کا اس کے سوا کیا جواب دے سکتا ہوں کہ میری ریاضت اگر مزدوری ہے تو میں اپنے رب کی مزدوری کر رہا ہوں اور وہی میری مزدوری کی اجرت بھی دے گا۔“

رئیس نے کہا۔ ”آپ ضدی ہیں۔ آپ کو میری پیشکش پر غور کرنا چاہیے۔“

لقمان نے جواب دیا۔ ”غور کرنے کے لیے اور بھی چیزیں ہیں اور ان پر غور بھی کرتا رہتا ہوں۔ تیری اس فضول پیشکش پر کیا غور کروں۔“

آپ نے اس رئیس سے گریز اختیار کیا۔ اگر کہیں آمنا سامنا بھی ہو جاتا تو آپ منہ پھیر کر آگے چلے جاتے۔

سرخس میں نوجوان لقمان کی خودداری کا چرچا ہونے لگا۔

نوجوان لقمان نے مزدوری کے اوقات میں کمی کر دی اور زہد و مجاہدے میں اضافہ کر دیا۔ ان کی ضرورتیں بہت محدود تھیں۔

ایک امیر نے آپ کو مشورہ دیا۔ ”میں درویشوں اور عابدوں کا قدر دان ہوں اور اس پر میرا ایمان ہے کہ ہمیں اللہ نے جو کچھ دیا ہے اس میں اللہ کے دوسرے بندوں کا بھی حصہ ہے۔ کیا آپ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، اس پر میرا بھی ایمان ہے۔“

امیر نے کہا۔ ''پھر آپ آج سے اپنا حجرہ چھوڑ دیں اور میرے محل کے ایک حصے کو اپنے حجرے کے طور پر قبول فرمالیں۔''

نوجوان لقمان نے پوچھا۔ ''آخر کیوں؟ میں ایسا کیوں کروں؟ اس سے ہم دونوں کو کیا فائدہ پہنچے گا؟''

امیر نے جواب دیا۔ ''میں نے آپ کو بتایا نہیں کہ اللہ نے مجھ کو جو کچھ دیا ہے اس میں دوسروں کا حصہ بھی شامل ہے اور ان دوسروں میں آپ بھی شامل ہیں۔''

نوجوان لقمان نے پوچھا۔ ''یہ تمہیں کس نے بتایا کہ تمہارے مال میں میرا حصہ بھی شامل ہے؟''

امیر نے جواب دیا۔ ''مجھ کو اس بات کا خود احساس ہے، میں جو کہہ رہا ہوں۔''

لقمان نے کہا۔ ''لیکن میرا دل اس بارے میں خاموش اور لاعلم ہے اور اس کو تیری باتوں پر یقین نہیں آرہا۔''

امیر کو غصہ آگیا۔ ''کیا میں جھوٹا ہوں؟''

لقمان نے جواب دیا۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ دلوں کا حال اللہ جانتا ہے۔''

امیر نے اصرار کیا۔ ''اے لقمان! میں خیر و برکت کا خواہاں ہوں۔ میں آپ کو اپنے محل کے ایک حصے میں رکھ کر خیر و برکت چاہتا ہوں۔''

لقمان نے جواب دیا۔ ''اس کے لیے بھی کافی ہے کہ میں تیرے لیے دعا کرتا رہوں گا۔''

امیر نے پوچھا۔ ''اچھا حضرت! یہ تو بتائیں کہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میرے مال میں آپ کا بھی حصہ ہے اور آپ اس سے انکار کر رہے ہیں پھر اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ کس کی سوچ میں سچ ہے اور کس کی سوچ میں کھوٹ ہے؟''

لقمان نے جواب دیا۔ ''تیرے وسوسوں کا میرے پاس جواب ہے۔ تیرے مال میں اگر میرا بھی حصہ ہوتا تو وہ کسی نہ کسی طرح مجھ کو مل جاتا اور جب تُو نے مجھے پیشکش کی تھی تو اس وقت اللہ میرے دل کو تیری پیشکش کی قبولیابی پر قائل یا مجبور کر دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اس لیے اب تُو خود فیصلہ کر لے کہ کس کی سوچ میں کھوٹ ہے اور کس کی سوچ میں سچ۔''

امیر نے کہا۔ ''آپ بھی زندہ ہیں اور میں بھی موجود ہوں۔ کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ آج کا انکار کل اقرار میں بدل جائے؟''

لقمان نے جواب دیا۔ ''ایسا ممکن ہے اور کسی بھی دن اگر میرا دل تیری پیشکش پر قائل ہوگیا تو، تُو سچا ٹھہرے گا۔''

نوجوان لقمان نے اپنے حجرے میں مصلے پر سجدہ کیا اور اللہ سے عرض کیا۔ ''الہٰ العالمین! میں تیرا کمزور بندہ ہوں۔ مجھے آزمائش میں نہ ڈال۔ میں معاملات میں محتاط اور پاک رہنا چاہتا ہوں۔ تو میری مدد کر۔ اے اللہ! میں تنکا ہوں، مجھے آزمائش کے سمندر میں ڈوب جانے سے بچالے۔''

آپ پر دنیا تنگ ہوتی چلی گئی۔ آپ نے امراء اور رؤساء سے نظریں چرانا شروع کر دیں اور جنگل کا رخ کیا۔ وہاں لکڑ ہاروں کو دوست بنایا اور کہا۔ ''میں لکڑیاں کاٹ کاٹ کر یا چن کر تمہیں دے دیا کروں گا اور تم انہیں بیچ کر میرا حصہ مجھے دے دیا کرو۔''

ایک شریف لکڑ ہارے نے آپ کی پیشکش قبول کرلی اور آپ کی جمع کی ہوئی لکڑیاں فروخت کر کے آپ کا حصہ آپ کو دے دیتا۔

نوجوان لقمان نے سوچا کہ یہ کام تو زیادہ اچھا ہے اور لکڑ ہارا آپ کا احسان مند ہوگیا کہ اسے لکڑیاں کاٹنے یا چن کر جمع کرنے کی محنت سے نجات مل گئی تھی۔ اس کے علاوہ لکڑ ہارے کی لکڑیاں بازار میں بڑی آسانی سے بک جاتی تھیں۔

لکڑ ہارے کی بیوی اس پر حیران تھی کہ اس کا شوہر دیر میں گھر سے نکلتا تھا اور جلد ہی گھر واپس آجاتا تھا اور پیسے بھی معقول لاتا تھا۔

آخر ایک دن بیوی نے پوچھ ہی لیا۔ ''آپ سے ایک بات پوچھوں؟''

لکڑ ہارے نے جواب دیا۔ ''پوچھ، کیا پوچھتی ہے؟''

بیوی نے پوچھا۔ ''آپ گھر سے دیر میں نکلتے ہیں اور پھر جلد ہی واپس بھی آجاتے ہیں۔ خالی ہاتھ بھی نہیں آتے۔ اجرت بھی معقول لاتے ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟''

لکڑ ہارے نے جواب دیا۔ ''تیری جستجو درست ہے لیکن میں اس کا جواب آج نہیں دوں گا۔''

بیوی نے پوچھا۔ ''آج نہیں تو کب دو گے جواب؟''
لکڑہارے نے جواب دیا۔ ''دو ایک دن میں اجازت حاصل کر کے۔''
بیوی نے پوچھا۔ ''دو ایک دن میں کیوں اور اجازت کس سے لینی ہے؟''
لکڑہارے نے سختی سے کہا۔ ''تو مجھ سے فضول قسم کے سوال جواب مت کر۔''
بیوی نے کہا۔ ''آپ جب چاہیں میری باتوں کے جواب دے دیں۔ میں آپ کو پریشان نہیں کروں گی۔''
دوسرے دن لکڑہارے نے بیوی کا مسئلہ نوجوان لقمان کے سامنے رکھ دیا اور پوچھا۔ ''میں اسے کیا جواب دوں؟''
نوجوان لقمان نے جواب دیا۔ ''تو اس کو وہی جواب دے جو سچ ہے لیکن کچھ دن ٹال مٹول سے کام لے ورنہ میں آزمائش میں ڈال دیا جاؤں گا۔''
دوسرے دن بیوی نے اپنے سوال کا جواب مانگا تو لکڑہارا اس پر گرم ہو گیا اور کہا۔ ''تو پھل کھا، درخت مت گن۔ ابھی میرے پاس تیرے کسی سوال کا بھی جواب نہیں۔ تو ذرا صبر وسکون سے کام لے۔''
بیوی کی جستجو میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔
کئی دن بعد بیوی نے پھر وہی سوال کیا تو لکڑہارے کو غصہ آ گیا اور کہا۔ ''اری نیک بخت! مجھے پریشان نہ کر۔ اس کا جواب میں تیرے اصرار کے بغیر ہی دے دوں گا۔''
بیوی نے پوچھا۔ ''مگر کب؟''
لکڑہارے نے جواب دیا۔ ''جس دن مجھے جواب دینے کی اجازت مل جائے گی۔''
بیوی نے شک وشبہے سے پوچھا۔ ''اور آپ کو یہ اجازت کون دے گا؟''
لکڑہارے نے جواب دیا۔ ''میں کہتا ہوں مجھے پریشان نہ کر۔''
بیوی خاموش ہو گئی مگر اس نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے شوہر سے چھپ کر اس کے پیچھے پیچھے جنگل خود جائے گی اور وہاں دیکھے گی کہ یہ معاملہ کیا ہے۔
چنانچہ لکڑہارا جنگل گیا تو اس کی بیوی بھی اس کے پیچھے پیچھے چھپ کر جنگل پہنچ گئی۔ نوجوان لقمان نے لکڑیاں تیار رکھی تھیں۔ لکڑہارے نے انہیں سر پر رکھا اور آبادی کی طرف چل دیا۔ بیوی اس سے پہلے ہی گھر پہنچ گئی۔
لکڑہارا گھر میں جیسے ہی داخل ہوا، عورت نے پوچھا۔ ''وہ کون ہے جو آپ کے لیے لکڑیاں اکٹھی کرتا ہے؟''
لکڑہارے نے پوچھا۔ ''تجھے کس نے بتایا؟''
بیوی نے جواب دیا۔ ''میں نے اسے جنگل میں دیکھا۔ میں پیچھے پیچھے آپ کے ساتھ گئی تھی۔''
لکڑہارے نے کہا۔ ''وہ ایک عبادت گزار نوجوان ہے اور شب و روز کا زیادہ وقت عبادت میں گزارنا چاہتا ہے۔''
بیوی نے شوہر کو مشورہ دیا۔ ''آپ اس نوجوان کو اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھ لیتے۔ وہ ساتھ رہے گا تو آپ کو بھی آسانی ہو گی اور وہ بھی عبادت کے لیے زیادہ وقت نکال سکے گا۔''
دوسرے دن لکڑہارے نے بیوی کی تجویز نوجوان لقمان کے سامنے رکھ دی۔
نوجوان لقمان دم بخود رہ گیا اور کچھ دیر بعد پوچھا۔ ''تیرے ساتھ اور کون کون رہتا ہے؟''
لکڑہارے نے جواب دیا۔ ''میں اور میری بیوی۔ صرف دو فرد۔''
نوجوان لقمان نے کہا۔ ''جس گھر میں ایک مرد اور ایک عورت ہو، وہاں نوجوان لقمان کا کیا کام؟''
لقمان نے لکڑہارے کا ساتھ بھی چھوڑ دیا اور جنگل کی بود و باش اختیار کی۔ یہاں جنگل میں جڑی بوٹیوں اور پھلوں پر گزر بسر ہونے لگی اور دن رات کا بیشتر حصہ عبادت میں گزرنے لگا۔ وہ عبادت میں جتنا وقت صرف کرتے تھے اس میں یہ دکھ کارفرما رہتا تھا کہ اے کاش میں اس سے زیادہ عبادت کر سکتا۔
نوجوان لقمان نے اس حال میں نوجوانی گزار دی پھر انہیں احساس ہوا کہ وہ اللہ کے بندوں کے ساتھ تو کچھ بھی نہیں کر رہے اور یہ بھی عبادت و ریاضت کا ایک حصہ ہے۔ وہ پھر آبادی میں واپس گئے اور لوگوں کی خدمت بھی کرنے لگے۔
جوانی رخصت ہونے لگی اور ان کے شوق میں کوئی کمی نہ واقع ہوئی۔ عبادت اور انسانی خدمت کا شوق ہوس کی حد تک بڑھ گیا اور انہیں یہ دکھ اندر ہی اندر کھانے لگا کہ افسوس میں حسب خواہش وہ سب نہیں کر پا رہا جس کا مجھے شوق ہے۔

اس فکر اور سوچ میں انہوں نے چوبیس گھنٹے گزار دیے۔ ان کا سر بھاری ہو گیا اور دل پر غیر معمولی بوجھ سا محسوس ہونے لگا۔

صبح ہوتے ہوتے وہ سجدے میں گر گئے اور رو رو کر اللہ سے عرض کیا۔ ”اے اللہ! تُو خوب جانتا ہے کہ میں نے اپنے معاملات میں ہمیشہ غیر معمولی احتیاط سے کام لیا ہے اور یہ کہ میں نے تیری جتنی عبادت کی ہے اس سے زیادہ کی خواہش اور حسرت دل میں باقی رہی اور تُو یہ بھی جانتا ہے کہ جب دنیا کے بادشاہوں کے غلام بوڑھے ہو جاتے ہیں تو بادشاہ انہیں آزاد کر دیتے ہیں اور اے اللہ! تُو، تو سب سے بڑا بادشاہ ہے۔ شہنشاہوں کا شہنشاہ، میں تیرا حقیر اور ادنیٰ غلام تیری بندگی میں بوڑھا ہو چکا ہوں اس لیے تُو مجھے آزاد کر دے۔“

ابھی وہ دعا سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ کانوں میں آواز آئی۔ ”اے لقمان! ہم نے تمہیں آزاد کر دیا۔“

اس آواز کے ساتھ ہی لقمان نے محسوس کیا کہ ان کی عقل ان سے چھن چکی ہے اور وہ جنون میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

☆☆☆

ابوالفضل سرخسی نے لقمان مجنون کا ماضی بسط کے ذریعے لوگوں پر واضح کر دیا اور انہیں بسط میں کمال حاصل تھا۔ لوگوں نے لقمان کو لقمان مجنون کہنا شروع کر دیا۔

ابوالفضل سرخسی سے پوچھا گیا۔ ”کیا لقمان کے ساتھ لفظ مجنون لگانا مناسب ہے۔ اللہ اس سے ناراض تو نہیں ہوگا؟“

شیخ نے جواب دیا۔ ”لقمان کا جو حال ہے وہ اس کا اپنا مانگا ہوا حال ہے۔ اس نے عقل و خرد کو خود ضائع کر دیا اس لیے اسے مجنون بنا دیا گیا۔“

لقمان، ابوالفضل سرخسی کے پاس خود گئے تو شیخ نے کہا۔ ”آپ نے ناحق تکلیف کی۔ آپ چاہتے تو میں خود حاضر ہو جاتا۔“

لقمان نے جواب دیا۔ ”آپ فرزانہ میں دیوانہ۔ دیوانے کے پاس فرزانہ کیوں جائے؟ فرزانہ کے پاس دیوانہ چلا آیا۔“

شیخ ابوالفضل نے کہا۔ ”یہاں اس قسم کی باتیں مت کریں۔“

لقمان نے جواب دیا۔ ”یہیں تو یہ باتیں زیب دیتی ہیں۔ آپ ہی تو لوگوں کو میرے بارے میں دیوانگی کی سند دیتے ہیں۔“

شیخ نے کہا۔ ”سند میں نہیں، اللہ دیتا ہے۔ کیا آپ سے عقل و خرد چھن نہیں گئی؟ ہاں روحانیت کا بلند مقام ضرور حاصل ہو گیا۔“

لقمان نے پوچھا۔ ”کیا میں باتوں سے پاگل لگتا ہوں؟“

شیخ نے جواب دیا۔ ”نہیں، نہ پاگل لگتے ہیں نہ عاقل۔ بس اب بحث ختم بھی کریں۔“

لقمان منہ بسورتے چلے گئے اور جاتے جاتے کہا۔ ”شیخ صاحب! میرے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے اور یہ عزت ہمیشہ قائم رہے گی۔“ لقمان نے ان سے شکایت کی۔ ”اے شیخ ابوالفضل! اللہ نے آپ کو بسط کی غیر معمولی خوبی عطا کی ہے اور آپ اسے عام کرتے پھر رہے ہیں۔“

شیخ سرخسی نے جواب دیا۔ ”لوگ آپ کا ماضی اور آپ کے اس حال کا سبب جاننا چاہتے تھے۔ میں انہیں یہ ساری تفصیل کس طرح بتاتا۔ آخر بسط کا سہارا لیا اور ان سب کو تمہارے ماضی سے آگاہ و خبردار کر دیا اور ایسا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب اللہ کی نوازشیں اپنے بندے پر عام ہوتی ہیں۔“

لقمان چلے گئے تو آپ کے مریدوں نے پوچھا۔ ”حضرت! اس شخص کا ہم میں کیا مقام ہے؟“

شیخ نے جواب دیا۔ ”یہ روحانیت کے بہت بڑے مقام پر فائز ہیں لیکن ان کے پاس علم کی کمی ہے اور میں علم کو بڑی اہمیت دیتا ہوں۔“

شہر سرخس والے دونوں جگہ جاتے۔ لقمان مجنون کے پاس بھی اور شیخ ابوالفضل کے پاس بھی۔

وہ لوگ جو نوجوان لقمان سے واقف تھے، انہیں لقمان کا جنون پسند نہیں تھا۔ وہ ان کے حال پر افسوس کرتے تھے۔

شیخ ابوالفضل سے لوگوں نے کہا۔ ”یا شیخ! اگر آپ لقمان مجنون کے حق میں دعا فرمائیں تو کیا یہ اس سے اپنی پچھلی

حالت میں واپس نہیں چلے جائیں گے؟"
آپ نے فرمایا۔ "لیکن میں ایسی دعا کیوں کروں۔ میری دعا ان کے حق میں بددعا ثابت ہوگی کیونکہ لقمان کی حالت ان کی دعا کے سبب ہے اور میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی دعا کیوں کروں؟"
لوگوں نے کہا۔ "حضرت! لقمان مجنون کی آپ خبر گیری کرتے رہیں۔ وہ اس کے حقدار ہیں۔"
آپ نے جواب دیا۔ "بے شک، لیکن اللہ سے زیادہ خبر گیری کون کرسکتا ہے اور وہ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔"
شیخ ابوالفضل اپنی خانقاہ سے نکل کر کہیں جارہے تھے۔ خلافِ معمول آپ کو سرِ راہ گزرتے دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوئی۔
کسی نے آپ سے پوچھا۔ "حضرت! کہاں کا قصد ہے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "لوگو! میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اللہ کے برگزیدہ بندے بھی اپنے اللہ سے کیسی حقیر چیزیں طلب کرتے ہیں۔"
آپ کی بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن ان کا اندازہ یہ تھا کہ شاید شیخ کا اشارہ لقمان مجنون کی طرف ہے۔
آپ نے اپنی صفتِ بسط سے ان کا سوال اور تذبذب معلوم کرلیا اور فرمایا۔ "آؤ، میرے ساتھ ساتھ آؤ۔ میں تمہیں نادر شے دکھاؤں۔"
وہ لوگ آپ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ یہاں تک کہ آپ ایک شہتوت کے پاس سے گزرے۔
شہتوت کے درخت پر ایک بچہ چڑھا ہوا تھا۔ یہ بچہ بھی مستقبل کا ایک بڑا انسان تھا اور تاریخ تصوف میں اسے امام خرامی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔
اس بچے نے آپ کو جاتے ہوئے دیکھا تو خوش ہوا کہ اس شہتوت کے طفیل ان کی زیارت نصیب ہوگئی۔
شیخ ابوالفضل نے کسی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "اے اللہ! ایک سال سے زیادہ ہوگیا ہے کہ تو نے مجھے اتنے پیسے بھی نہیں دیے کہ میں اپنے بال بنواؤں۔ کیا دوستوں کے ساتھ ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ ایسی بے نیازی، اتنا بے رحمی کا رویہ۔"
ابھی آپ کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ بچے نے دیکھا درخت، اس کی شاخیں، اس کی پتیاں سنہری سونے جیسی ہوچکی ہیں۔ لوگوں نے بھی یہ منظر دیکھا اور سراپا حیرت بن گئے۔
شیخ ابوالفضل نے دوبارہ اللہ کو مخاطب کیا۔ "واہ صاحب واہ! دل کی کشادگی کے لیے اب تجھ سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔" آپ نے اس درخت کی طرف دیکھا تک نہیں۔

☆☆☆

لقمان مجنون راکھ کے تودے پر بیٹھے اپنی پوستین خود سی رہے تھے۔ سرخس کے لوگ ان کے پاس کم ہی جاتے تھے۔
ایک پردیسی نوجوان ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے لقمان مجنون کو ٹیلے پر اس طرح بیٹھے دیکھا تو لوگوں سے پوچھا۔ "یہ کون بزرگ ہیں؟"
لوگوں نے جواب دیا۔ "لقمان مجنون۔"
نوجوان نے پوچھا۔ "یہ مجنون ہیں یا کچھ اور بھی؟"
جواب ملا۔ "یہ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں اور یہ ہماری رائے نہیں، مقتدر اہلِ علم اور صاحبانِ روحانیت کی رائے ہے۔"
نوجوان نے پوچھا۔ "اگر میں ان کے پاس جاؤں تو ناراض تو نہیں ہوں گے؟"
جواب دیا گیا۔ "شاید نہیں۔ کیونکہ وہ اپنے حال میں مست رہتے ہیں۔"
یہ نوجوان راکھ کے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ لقمان مجنون نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔
نوجوان نے دیکھا، وہ پوستین سینے میں مشغول ہیں۔ وہ پوستین میں پیوند لگا رہے تھے۔ نوجوان ان کے پاس اس طرح کھڑا ہوگیا کہ اس کا سایہ لقمان مجنون پر پڑنے لگا۔ کچھ دیر بعد لقمان مجنون نے پوچھا۔ "ابوسعید! ابوالخیر کے بیٹے! کیا تو جانتا ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں؟"
نوجوان کا نام واقعی ابوسعید تھا اور یہ اپنے والد کا نام بھی اپنے نام کے ساتھ لگاتے تھے اور ابوسعید ابوالخیر کہلاتے تھے۔
نوجوان ابوسعید نے حیرت سے کہا۔ "تو آپ کو میرا نام بھی معلوم ہے۔"

لقمان نے جواب دیا۔ ”مجھ سے میری فرزانگی چھن گئی ہے اور اس کے بدلے میں مجھے جو کچھ ملا ہے وہاں روشنی ہی روشنی ہے۔ مجھ پر سب کچھ عیاں ہے اور عقل کا اندھیرا دور ہو چکا ہے۔ اس روشنی میں، میں نے تجھے پہچانا ہے۔“

نوجوان ابوسعید نے پوچھا۔ ”آپ کیا کر رہے ہیں؟“

لقمان نے جواب دیا۔ ”پوستین میں پیوند لگا رہا ہوں اور اس کے ساتھ ہی تجھے بھی ٹانک دیا ہے۔“

ابوسعید نے حیرت سے پوچھا۔ ”مجھ کو ٹانک دیا ہے، کس کے ساتھ؟“

لقمان نے جواب دیا۔ ”سرخس کے اس عالم صوفی کے ساتھ جو میری طرح دیوانہ نہیں، فرزانہ ہے۔ میں نے باطن کی روشنی میں تجھے اس صوفی عالم سے وابستہ دیکھا ہے۔“

ابوسعید کے تجسس میں اضافہ ہوا۔ ”مگر وہ صوفی عالم ہے کون؟ اس سے ملاقات کس طرح اور کہاں ہوگی؟“

پوستین میں پیوند لگا چکنے کے بعد لقمان مجنون اسے اپنے جسم پر ڈال کر کھڑے ہو گئے اور کہا۔ ”ابوالخیر کے بیٹے ابوسعید! آ، میرے ساتھ چل۔ میں تجھے اس کے پاس پہنچا دوں گا کیونکہ یہ میرا فرضِ منصبی ہے۔“

لقمان مجنون، ابوسعید کو شیخ ابوالفضل کی خانقاہ میں لے گئے اور دور ہی سے شیخ کو مخاطب کیا۔ ”شیخ ابوالفضل! دیکھیں میں آپ کے لیے کیا لایا ہوں۔“

اس وقت شیخ ابوالفضل اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کو علم کی تلقین کر رہے تھے۔ انہوں نے دونوں پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر ابوسعید کو خاص نظروں سے دیکھا اور لقمان مجنون سے پوچھا۔ ”لقمان! تم کو تمہاری خواہش کے مطابق اللہ نے آزاد کر دیا۔ ہماری محفل میں آزادوں کا کیا کام؟“

لقمان نے جواب دیا۔ ”شیخ! آپ سے کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ آپ اس نوجوان کے بارے میں اچھی طرح جان گئے ہوں گے کہ یہ ہم میں سے ہے اور اسے اللہ نے آپ کے لیے ہمارے پاس بھیجا ہے۔ میں جو کہہ رہا ہوں، آپ اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔“

شیخ ابوالفضل نے ابوسعید کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ”صاحبزادے! میں تو تمہارا کافی دنوں سے انتظار کر رہا تھا۔“

لقمان مجنون نے کہا۔ ”میں نے اس نوجوان کو آپ کے سلسلے میں سی دیا ہے۔ میرا کام ختم۔ اب آپ جانیں اور ابوسعید جانے۔“

شیخ نے ابوسعید کو اپنے پاس بٹھالیا اور پوچھا۔ ”کیا تم یہاں میرے پاس رہ سکو گے؟“

ابوسعید نے جواب دیا۔ ”اگر آپ چاہیں گے تو میں آپ کے پاس ضرور رہوں گا۔“

لقمان جا چکے تھے۔ شیخ نے پوچھا۔ ”ابوسعید! تم لقمان کے پاس کیوں گئے تھے؟“

ابوسعید نے جواب دیا۔ ”میرے قدم خود بخود ادھر اٹھ گئے اور میں راکھ کے تودے پر چڑھ گیا۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”تم نے کتنا علم حاصل کیا؟“

ابوسعید نے جواب دیا۔ ”کچھ زیادہ نہیں۔ بہت تھوڑا۔“

شیخ نے اپنی کتابوں میں سے کسی کتاب کا ایک جز و نکالا اور اس کو پڑھنے لگے۔

ابوسعید کو جستجو ہوئی کہ شیخ کیا پڑھ رہے ہیں۔ وہ شیخ پر قدرے جھک کر اسے پڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔

شیخ نے اسے چھپالیا اور پوچھا۔ ”اے ابوسعید! یہ تم کیا پڑھنا چاہتے ہو؟“

ابوسعید نے جواب دیا۔ ”یہ کہ آپ کیا پڑھ رہے تھے؟“

شیخ نے کہا۔ ”اے ابوسعید! ہمیں نہیں معلوم کہ تم نے کیا پڑھا ہے اور تم کو کتنا اور پڑھنا چاہیے۔ میں جس جز و کو پڑھ رہا ہوں، اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے اور ان سب نے بندگانِ خدا سے کہا تھا کہ اللہ کہو۔ جن لوگوں نے یہ کلمہ کہا وہ اس میں مستغرق ہو گئے۔ اس جز و میں بھی یہی بات ہے۔“

ابوالفضل صفہ پر بیٹھے تھے۔ ابوسعید دم بخود تھے۔ وہ اس کے بعد کوئی سوال بھی نہ کر سکے۔

شیخ نے کہا۔ ”تم تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔ جاؤ آرام کرو۔ اب کل بات ہوگی۔“

ابوسعید چلے گئے۔ وہ شیخ کی بات پر غور کر رہے تھے کہ آخر شیخ نے اس مختصر سی بات میں جواب کیا دیا ہے؟ رات کو بستر پر کروٹیں بدلتے رہے اور سوچتے رہے۔ پوری رات اسی طرح گزار دی۔ صبح ہوتے ہوتے بات سمجھ میں

آ گئی۔

شیخ اپنے صفہ (تعلیم دینے کا چبوترہ) پر بیٹھے تھے۔ ابوسعید ان کے پاس گئے اور کہا۔ ''شیخ محترم! میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

شیخ خوش ہوئے اور جواب دیا۔ ''علم کے بغیر ہر چیز بیکار ہے۔ یہ تصوف بھی۔ علم ضرور حاصل کرو۔''

ابوسعید نے مشورہ چاہا۔ ''علم کس سے حاصل کیا جائے؟''

سرخس میں شیخ ابوعلی فقیہہ کا بڑا نام تھا۔ شیخ نے ان کا نام لیا اور کہا۔ ''ان سے بہتر استاد نہیں ملے گا۔''

ابوسعید، ابوعلی فقیہہ کے پاس گئے اور اپنا مدعا بیان کیا۔

ابوعلی فقیہہ نے جواب دیا۔ ''میں حاضر ہوں اور تعلیم کا آغاز تفسیر سے کروں گا۔''

ابوسعید نے رضامندی ظاہر کی تو ابوعلی فقیہہ نے کہا۔ ''پڑھو (ترجمہ) کہو اللہ۔ پھر ان کو چھوڑ دے کہ وہ اپنے بے ہودہ پن میں کھیلتے رہیں۔''

ابوسعید کی حالت غیر ہوگئی اور وہ اپنے سینے میں کشادگی اور روشنی محسوس کرنے لگے۔

ابوعلی فقیہہ نے پوچھا۔ ''اے ابوسعید! کل تم کہاں تھے؟''

ابوسعید نے جواب دیا۔ ''پیر ابوالفضل کے پاس۔''

ابوعلی فقیہہ نے فرمایا۔ ''تم دوبارہ ان کے پاس جاؤ۔ میرا کام ختم ہوا اور اب جو کچھ تمہیں ملے گا وہیں سے ملے گا۔ وہاں طریقت اور معرفت ہے اور اسے چھوڑ کر میرے پاس آنا حرام ہے۔''

ابوسعید، ابوالفضل کے پاس واپس آگئے اور ان کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا، کہہ سنایا۔

شیخ نے کہا۔ ''اے ابوسعید! جو کچھ تمہیں عطا ہوا ہے، اسے ضائع نہ کر دینا۔''

ابوسعید نے عرض کیا۔ ''اے شیخ! کیا ارشاد ہے؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''میں کیا ارشاد کروں گا۔ اب تم اس کلمے کے ہو رہو۔ یہ زندگی بھر تمہارے کام آئے گا۔''

☆☆☆

شیخ ابوالفضل اپنے صفہ پر تشریف فرما تھے اور ابوسعید سے دوسرے فقراء کی موجودگی میں معرفت کی باتیں کر رہے تھے۔ مسئلہ مشکل تھا اور اس کا بیان اسی قدر دشوار۔ فقراء کہہ رہے تھے۔ ''یا شیخ! وضاحت میں مزہ نہیں آرہا۔ بات تشنہ رہ جاتی ہے۔''

شیخ ابوالفضل نے جواب دیا۔ ''معرفت کا مسئلہ جتنا دشوار ہے اس کی وضاحت اور بیان اسی قدر مشکل۔ میں بیان کا آسان پیرایہ تلاش کر رہا ہوں مگر وہ ہاتھ نہیں آرہا۔ اللہ ہم پر رحم فرمائے۔''

اس اندھیری رات میں چراغ کی مدھم روشنی ماحول کو گمبھیر بنائے ہوئے تھی۔

اچانک ان میں ایک شخص کا اضافہ ہوگیا۔ یہ شخص کہاں سے اور کس طرح آیا، کوئی نہیں جانتا تھا لیکن اس شخص سے واقف بھی تھے۔ یہ لقمان مجنون تھے۔ انہوں نے حاضرین سے پوچھا۔ ''تم لوگ پریشان کیوں ہو؟''

ابوسعید نے جواب دیا۔ ''یہاں معرفت کا ایک مسئلہ درپیش ہے۔ اس کی وضاحت اور بیان آسان لفظوں میں دشوار ہوگیا ہے، بس اس بات نے ہمیں پریشان کر دیا ہے۔''

لقمان مجنون نے شیخ ابوالفضل سے کہا۔ ''شیخ! آپ تو عالم بھی ہیں۔''

شیخ نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کی وضاحت اور بیان کا تعلق میرے عالم ہونے سے قطعی نہیں۔''

لقمان مجنون نے کہا۔ ''تب پھر اپنے تصوف کا سہارا لیں۔''

شیخ ابوالفضل نے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ تو محرم راز ہیں اور اس نکتے سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہمیں وہی معلوم ہوتا ہے جو اللہ ہمیں بتانا جتانا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا۔''

لقمان مجنون نے کہا۔ ''ہاں، یہ بات تو ہے اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ میں معرفت کے اس نکتے کے بارے میں تم سب سے زیادہ جانتا ہوں۔''

فقراء نے درخواست کی۔ ''حضرت! ارشاد۔ ہم سننے کے لیے بے قرار ہیں۔''

لقمان مجنون نے معرفت کے موضوع پر جو تقریر شروع کی تو حاضرین جھومنے لگے۔ بقیہ رات اسی میں گزر گئی۔
شیخ ابوالفضل نے انہیں داد دی۔ ''لقمان! تمہیں مجنون کون کہتا ہے۔ تم تو عالم بھی ہو۔''
لقمان مجنون نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''شیخ! یہ آپ کی عزت افزائی ہے ورنہ من آنم کہ من دانم!''
لقمان مجنون باتیں کرتے کرتے اچانک غائب ہو گئے جیسے وہ وہاں تھے ہی نہیں۔
ابوسعید نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ کہاں چلے گئے؟''
فقراء کو بھی بڑی حیرت تھی۔ ''یہ کدھر سے اور کس طرح آئے تھے۔ ابھی یہی سوال ذہنوں میں تازہ تھا کہ وہ اسی طرح چلے بھی گئے۔ یہ معاملہ کیا ہے؟''
شیخ ابوالفضل نے جواب دیا۔ ''اللہ نے لقمان کو آزاد کر دیا ہے۔ وہ کسی بات، کسی چیز، کسی وسیلے یا کسی ذریعے کے پابند نہیں ہیں۔''
ابوسعید نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں شاید سب سے زیادہ حیران ہوں۔''
شیخ نے جواب دیا۔ ''یہ لقمان کا مقام اور مرتبہ ہے۔ اسے تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔''
ابوسعید نے عرض کیا۔ ''جی پیر مرشد! میں نے ان کا مقام اور مرتبہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔''
شیخ نے جواب دیا۔ ''اے ابوسعید! لقمان کی پیروی نہیں کرنا چاہیے۔''
ابوسعید نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''
شیخ نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ ان کے پاس علم نہیں ہے۔''
کافی عرصے بعد لقمان مجنون اچانک شیخ ابوالفضل کے پاس پہنچے۔ اس وقت شیخ کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔
لقمان نے پوچھا۔ ''یا شیخ! آپ کے ہاتھ میں جو کچھ ہے اس سے حاصل کیا ہوگا؟''
شیخ نے جواب دیا۔ ''میں اس سے حاصل کیا کروں گا، میں نے تو سب کچھ اس کے لیے ترک کر دیا۔''
لقمان مجنون نے کہا۔ ''شیخ! جب آپ ترک کے قائل ہیں تو پھر اس جزو کو ہاتھ میں کیوں پکڑ رکھا ہے؟''
شیخ نے فرمایا۔ ''لقمان! جو کچھ تم دیکھ اور سمجھ رہے ہو اس میں تمہاری بصیرت اور فہم دھوکا کھا رہے ہیں۔ تم نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا چاہتا ہوں اور میں یہ کہتا ہوں کہ جس نے سب کچھ ترک کر دیا ہو، وہ کیا چاہے گا اور یاد رکھو کہ مستی اور مستی سے ہوشیاری اور ہوشیاری سے بیداری ضروری ہے اور جب تم کو یہ مقام اور یہ کیفیت حاصل ہو جائے گی تو باہمی اختلاف سوال جواب بھی جاتا رہے گا اور اس وقت ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم دونوں کیا چاہتے ہیں۔''
لقمان مسکرانے لگے اور کہا۔ ''شیخ! آپ عالم بھی ہیں۔''
ابوسعید نے اپنے دل میں سوچا کہ ان کے شیخ ابوالفضل عالم بھی تو ہیں لیکن انہیں لقمان مجنون جیسا مقام اور مرتبہ حاصل نہیں ہے۔
ابوسعید ایک دن لقمان مجنون کے پاس ان کے راکھ والے تودے پر گئے۔ اس وقت وہاں دوسرے کئی جوان بھی موجود تھے اور لقمان مجنون سے الٹے سیدھے سوال کر رہے تھے۔ لقمان مجنون ایک ہی جواب دے رہے تھے۔ ''بھائی! اس شہر سرخس میں ایک ہی ایسا عالم ہے جو تمہیں تمہارے سوالوں کے جواب دے سکتا ہے۔''
ایک جوان نے پوچھا۔ ''وہ کون؟''
لقمان نے جواب دیا۔ ''شیخ ابوالفضل سرخسی!''
ابوسعید نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ بات ان پر کیوں ڈالتے ہیں۔ آپ کا اپنا ایک مقام ہے۔''
لقمان مجنون کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ''اے ابوسعید! تم پہلی بار میرے پاس آئے تھے۔''
ابوسعید نے جواب دیا۔ ''بے شک میں پہلی بار آپ ہی کے پاس آیا تھا۔''
لقمان نے کہا۔ ''کیا میں نے تمہیں شیخ ابوالفضل سرخسی کے دامن میں نہیں ٹانک دیا تھا؟''
ابوسعید نے جواب دیا۔ ''شاید یہی بات درست ہو۔''
لقمان نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''جو میں کہہ رہا ہوں یہ درست ہے۔ میں نے تمہیں اپنے پاس نہیں رکھا۔''
ابوسعید نے عرض کیا۔ ''حالانکہ آپ چاہتے تو اپنے پاس بھی رکھ سکتے تھے۔''
لقمان نے جواب دیا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ شیخ ابوالفضل جو کچھ ہیں یہ میں جانتا ہوں۔''

ابوسعید نے عرض کیا۔ ''اور آپ جو کچھ ہیں یہ میں جانتا ہوں۔''
لقمان نے کہا۔ ''تو اپنے شیخ، ہم سب کے شیخ ابوالفضل کو سمجھنے کی کوشش کر۔''
لقمان مجنون کی آنکھوں میں جو چمک پیدا ہو چکی تھی، ابوسعید اس کی تاب نہیں لا سکے اور آنکھیں بند کر لیں۔
کچھ دیر بعد انہیں ابوالفضل کی آواز سنائی دی۔ ''یہاں مسئلہ زیر بحث کیا ہے؟''
ابوسعید نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ شیخ ابوالفضل ان کے پاس بیٹھے تھے۔
ابوسعید کو بڑی حیرت تھی کہ یہ اچانک کہاں سے اور کس طرح آ گئے؟
شیخ نے ان سے پوچھا۔ ''اے ابوسعید! مسئلہ زیر بحث کیا ہے؟''
ابوسعید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دیں۔
لقمان مجنون نے جواب دیا۔ ''مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ آپ صاحب علم تو ہیں مگر آپ میری طرح اچانک کہیں پہنچ نہیں سکتے، اس طرح جس طرح میں پہنچ جاتا ہوں۔''
ابوسعید بہت شرمندہ تھے۔ ''میں غلطی پر تھا، میری سوچ غلط تھی۔''
شیخ نے ابوسعید کو علیحدہ لے جا کر پوچھا۔ ''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم میں یہ قوت پیدا ہو جائے کہ جہاں بھی جانا چاہو، پلک جھپکتے میں اچانک پہنچ جاؤ؟''
ابوسعید خاموش ہو گئے۔
شیخ نے زور دے کر پوچھا۔ ''میری بات کا جواب دو۔ میں کیا پوچھ رہا ہوں۔''
ابوسعید نے جواب دیا۔ ''یہ قوت کون حاصل کرنا نہیں چاہے گا؟''
شیخ نے کہا۔ ''لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ یہ خواہش اپنے دل سے نکال دو۔ تب یہ چیز حاصل ہو جائے گی۔ لقمان مجنون یا مجھ کو یہ جو کچھ ملا ہے، ہم نے اس کی خواہش نہیں کی تھی۔''
ابوسعید پر رقت طاری ہو گئی۔ وہ دیر تک زار و قطار روتے رہے۔
شیخ نے فرمایا۔ ''کل تم کیا تھے اور کل کیا ہو گے، کون جانے۔ میں تو تمہارے آج کو جانتا ہوں، تم بھی آج ہی کی فکر کرو۔''
ابوسعید نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ بولتے رہیں، میں سنتا رہوں گا۔ اس طرح میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے۔''
شیخ نے مزید فرمایا۔ ''ابوسعید! ماضی کا ذکر نہ کرنا، مستقبل کا انتظار بے سود ہے۔ زمانہ حال قابل اعتبار ہے، اس پر خیال قائم رکھو۔ یہی عبودیت کی صفت ہے اور عبودیت کی صفت دو چیزیں ہیں۔ ایک تو اللہ سے احتیاج رکھی جائے۔ یہ بڑی عظیم عبودیت ہے اور دوسری چیز ہے پیروی رسولِ مقبول ﷺ۔ اس طرح کہ اس سے اپنے نفس کے لیے راحت یا کوئی حصہ مقصود نہ ہو۔''

☆☆☆

سرخس میں ایک بے نمازی اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا تھا۔ لوگوں کو اس کی بڑی فکر تھی کہ وہ نماز کیوں نہیں پڑھتا۔ آپ سے اس کی شکایت کی گئی تو آپ نے اس پر کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ لوگوں نے بازار میں اس بے نمازی کو پکڑ لیا اور پوچھا۔ ''تو نماز کیوں نہیں پڑھتا؟''
اس نے جواب دیا۔ ''میں نماز کس طرح پڑھوں، میں تو بے وضو ہوں۔''
لوگوں نے کہا۔ ''تو وضو کر لے۔ اس میں رکاوٹ یا دشواری کیسی؟''
اس نے جواب دیا۔ ''میں وضو تو کر لوں لیکن وضو کے لیے پانی تو ہو۔''
لوگوں کو ہنسی آ گئی۔ وہ اسے ایک کنوئیں تک لے گئے اور کہا۔ ''یہ کنواں ہے۔ اس میں پانی ہی پانی ہے۔''
بے نمازی نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا اور کہا۔ ''ہاں اس میں پانی تو ہے مگر ڈول کہاں ہے؟''
لوگوں نے ڈول بھی فراہم کر دیا اور کہا۔ ''یہ لے ڈول اور کنوئیں سے پانی نکال، وضو کر اور نماز پڑھ۔''
بے نمازی نے پوچھا۔ ''اور رسی؟ رسی کے بغیر ڈول سے پانی کس طرح نکالا جائے گا؟''
لوگوں نے رسی بھی مہیا کر دی اور کہا۔ ''اب بھر پانی، وضو کر اور نماز پڑھ۔''
بے نمازی رسی پکڑ کر کنوئیں پر بیٹھ گیا اور کئی دن تک اسی طرح بیٹھا رہا۔
اتفاق سے ادھر سے آپ بھی گزرے اور اس شخص کو رسی پکڑے بیٹھے دیکھا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ ''کیا

ہو رہا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''کچھ بھی نہیں۔ لوگ مجھ کو اس حال میں بٹھا کر چلے گئے۔ انہیں میری فکر تھی لیکن ان کی نہیں جو ان کے پڑوسی ہیں اور فاقے کر رہے ہیں۔ اب میں ان سے کیا کہوں؟''

شیخ نے کہا۔ ''میں تم سے نماز پڑھنے کے لیے نہیں کہوں گا کیونکہ تم شاید پوری طرح اپنے ہوش میں نہیں ہو۔''

اس نے جواب دیا۔ ''انہوں نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں زندہ کس طرح ہوں اور کہاں سے کھاتا پیتا ہوں۔''

شیخ نے پوچھا۔ ''میں آپ کے لیے کھانا لاؤں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''نہیں، اس لیے کہ میں جس کی نماز نہیں پڑھتا، وہی مجھے کھانا پہنچاتا ہے۔''

شیخ پر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی اور آپ نے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''یہ لوگ آپ کو نہیں پہچان سکتے۔''

لوگوں نے شیخ پر پھر دباؤ ڈالا کہ اس دیوانے پر نماز کے لیے دباؤ ڈالیں۔

شیخ نے جواب دیا۔ ''میں اسے مجبور نہیں کر سکتا کیونکہ وہ پوری طرح اپنے ہوش میں بھی نہیں اور جو شخص پوری طرح اپنے ہوش میں نہ ہو اسے فرض کی ادائیگی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔''

اب لوگوں کو ہوش آیا اور اسے آزاد چھوڑ دیا۔

ایک ایسا سال بھی آیا کہ سرخس میں بارش نہیں ہوئی۔ لوگوں نے لقمان مجنون سے کہا کہ پانی کے لیے دعا فرمائیں۔

لقمان مجنون نے جواب دیا۔ ''میں صاحبِ اختیار نہیں ہوں اس لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ تم لوگ شیخ ابوالفضل کے پاس جاؤ۔ وہ چاہیں گے تو بارش ہو جائے گی۔''

اب یہی لوگ شیخ کے پاس پہنچے اور درخواست کی۔ ''حضرت! دعا فرمائیں کہ بارش ہو جائے۔''

شیخ نے جواب دیا۔ ''بارش کا میری ذات سے کیا تعلق؟''

لوگوں نے جواب دیا۔ ''آپ کا تعلق بارش سے ہے۔ لقمان مجنون نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''جو کام لقمان خود کر سکتا ہے، اس کے لیے بھی مجھے تکلیف دیتا ہے۔''

اسی روز رات کو آپ نے خوب جی بھر کے ٹھنڈا پانی پیا اور لوگوں سے کہا۔ ''اب تم لوگ اپنے اپنے گھر جاؤ۔ اللہ نے چاہا تو کل تک بارش ہو جائے گی۔''

لوگوں کو اپنے اپنے گھر جانے میں تامل ہوا اور عرض کیا۔ ''حضرت! آپ نے دعا تو کی ہی نہیں پھر بارش کس طرح ہو جائے گی؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''میں نے اللہ کو یہ بتا دیا ہے کہ لوگ پانی کے بغیر تپ رہے ہیں۔ انہیں ٹھنڈک درکار ہے۔ اللہ میری اس بات کا پاس کرلے گا۔''

لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے تو گئے لیکن آپ کی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔

دوسرے دن اول پہر اس زور سے بارش ہوئی کہ پورا سرخس گرمی سے نجات پا گیا۔

لوگ آپ کے پاس پھر گئے اور پوچھا۔ ''حضرت! بارش تو ہوگئی لیکن ہم سب حیران ہیں کہ آپ نے بارش کی دعا تو کی ہی نہ تھی۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''لوگو! میں نے جی بھر کے ٹھنڈا پانی اس لیے پیا تھا کہ کارکنانِ قضا و قدر کو یہ معلوم ہو کہ اہلِ سرخس کیا چاہتے ہیں چنانچہ سرخس والوں کو گرمی سے نجات دلا دی گئی۔''

ابوسعید نے آپ کے بارے میں لوگوں کو بتایا کہ ہمارے شیخ اس عہد کے قطب ہیں۔ ان سے کچھ بھی سرزد ہو سکتا ہے۔

سرخس والوں نے ابوسعید سے پوچھا۔ ''آپ تو شیخ ابوالفضل اور لقمان مجنون سے اچھی طرح واقف ہی نہیں، ان دونوں کے محرمِ راز بھی ہیں۔ اب آپ ہمیں یہ بتائیں کہ ان دونوں میں دانا کون ہے؟''

ابوسعید نے جواب دیا۔ ''ہمارے شیخ ابوالفضل کی اگر بات نہ کرو تو پورے سرخس میں لقمان مجنون سب سے زیادہ دانا ہیں۔''

لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی اور انہوں نے ابوسعید کے جواب پر اعتراض کیا۔ ''خوب! لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ آج سرخس میں لقمان مجنون سے زیادہ خستہ حال اور غضب ناک دوسرا کوئی نہیں۔ ہم آپ کی بات کس طرح مان لیں؟''

ابوسعید نے جواب دیا۔ ''میں یہ کب کہتا ہوں کہ تم میری بات مان ہی لو۔ تم نے مجھ سے ایک سوال کیا اور میں نے دیانت داری سے اس کا جواب دے دیا۔ میں پھر یہی کہوں گا کہ تم لوگوں نے لقمان کو سمجھا ہی نہیں۔ وہ پاکیزہ ہیں اور پاکیزہ دانا ہوتا ہے۔''

یہ خاموش ہو گئے لیکن یہ محسوس کیا کہ لوگ ان کی باتیں غور سے سن رہے ہیں۔

ابوسعید نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''تم پوچھو گے کہ یہ پاکیزہ کون ہوتا ہے۔ تو سنو، پاکیزہ وہ ہے جس کا دنیا کی کسی شے سے تعلق نہ ہو۔ ایک بے نیاز انسان اور میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے شیخ لقمان سے زیادہ بے نیاز اور بے تعلق کسی اور کو نہیں پایا۔ وہ نہ تو دنیا سے غرض اور تعلق رکھتے ہیں، نہ عقبیٰ سے اور نہ ہی اپنے نفس سے۔ اسی لیے میں ان کو سرخس کا سب سے دانا انسان سمجھتا ہوں۔''

دن کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ شیخ ابوالفضل، ابوسعید سے معرفت کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ ابوسعید سے بہت خوش تھے اور انہیں بشارت دے رہے تھے کہ اللہ نے دنیائے تصوف میں ان کا درجہ بہت زیادہ بلند کر دیا ہے۔

اس دوران ایک اجنبی ان دونوں کے پاس آ کے کھڑا ہو گیا۔

ابوسعید نے اس سے پوچھا۔ ''اے شخص! تو یہاں کس سے ملنے آیا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں آپ دونوں سے ملنے آیا ہوں۔''

شیخ ابوالفضل نے زور زور سے سانسیں لیں اور کہا۔ ''اس اجنبی کے پاس سے بوئے دوست آ رہی ہے۔''

اجنبی نے بے ساختہ عرض کیا۔ ''اے شیخ! آپ نے بجا فرمایا۔ لقمان مجنون سخت علیل ہیں۔ تین دن پہلے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے سرخس کی سرائے میں پہنچا دو چنانچہ انہیں سرائے پہنچا دیا گیا۔ اس دوران میں ان کے پاس ہی موجود رہا۔ آج انہوں نے مجھ سے کہا کہ شیخ ابوالفضل کے پاس جاؤ اور انہیں بتا دو کہ لقمان مر رہا ہے چنانچہ میں آپ کے پاس چلا آیا۔''

شیخ ابوالفضل کھڑے ہو گئے۔ ''ابوسعید! چلو لقمان کے پاس چلیں۔''

دوسرے مریدوں نے سنا تو ان دونوں کے ساتھ وہ بھی ہو لیے۔

یہ لوگ سرائے میں پہنچے تو دیکھا لقمان دراز ہیں۔ شیخ ابوالفضل ان کے سرہانے کھڑے ہو گئے۔

لقمان نے انہیں دیکھا اور مسکرا دیے۔

شیخ ابوالفضل نے پوچھا۔ ''لقمان! کیسے ہو؟''

لقمان کی نظریں شیخ کے چہرے پر گڑی تھیں۔ جواب میں ایک سرد آہ بھری۔

کسی مرید نے لقمان کو مشورہ دیا۔ ''حضرت! اللہ کو یاد کریں۔''

کسی اور نے بہ آوازِ بلند لا الٰہ الا اللہ کہا۔

لقمان کو ہنسی آ گئی اور کہا۔ ''اے شخص! تو نہیں جانتا کہ ہم خراج کبھی کا ادا کر چکے اور پروانۂ آزادی حاصل کر لیا ہے۔ اللہ نے ہمیں توحید پر زندہ و باقی رکھا ہے۔''

اس شخص نے پھر وہی مشورہ دیا۔ ''حضرت! اس وقت آپ کو اللہ اللہ کرنا چاہیے۔''

لقمان نے اس سے کہا۔ ''اے شخص! تو ہم سے درگاہِ حق پر لڑ رہا ہے۔''

شیخ ابوالفضل نے اس شخص سے کہا۔ ''لقمان نے جو کچھ کہا وہ درست ہے۔''

پھر سبھی نے یہ محسوس کیا کہ لقمان کی سانس رک چکی ہے۔ ان کی نظریں شیخ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

کسی نے بہ آوازِ بلند اعلان کر دیا۔ ''شیخ لقمان وفات پا گئے۔''

دوسرے نے اس کی تردید کر دی۔ ''یہ غلط ہے۔ شیخ لقمان ابھی زندہ ہیں اور شیخ ابوالفضل کو مسلسل دیکھے جا رہے ہیں۔''

شیخ ابوالفضل نے اعلان کیا۔ ''شیخ لقمان واقعی وفات پا چکے ہیں لیکن ہم جب تک ان کے پاس ہیں، یہ اپنی آنکھیں بند نہیں کریں گے۔''

اس کے بعد شیخ نے ابوسعید سے کہا۔ ''آؤ ابوسعید! چلیں۔ کچھ دیر بعد پھر آ جائیں گے۔''

چنانچہ یہ دونوں جیسے ہی وہاں سے ہٹے، لقمان نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں۔

لقمان مجنون کی وفات نے پورے سرخس کو افسردہ و آزردہ کر دیا۔

شیخ ابوالفضل نے بھی ابوسعید سے کہا۔ ''اے ابوسعید! اب ہم بھی چلے جائیں گے۔''
مریدوں کو اس بات سے صدمہ پہنچا اور ابوسعید نے اس کا دوسروں سے زیادہ اثر لیا۔
ابوسعید نے عرض کیا۔ ''حضرت! یوں تو یہاں جو آیا ہے، جائے گا ضرور لیکن آپ کے بارے میں دل ایسی ویسی باتیں نہیں مانتا۔''
شیخ نے فرمایا۔ ''دیکھو ابوسعید! میں جو کہہ رہا ہوں اس پر یقین کرو اور مجھ سے جو کچھ پوچھنا چاہو، پوچھ لو۔ اس وقت کو غنیمت جانو۔''
ابوسعید کو رونا آ گیا، پوچھا۔ ''آپ کی آخری رسوم کس قبرستان میں ادا کی جائیں گی۔ وہاں، جہاں دوسرے بزرگ آسودۂ خواب ہیں یا کہیں اور۔''
شیخ نے جواب دیا۔ ''میں ان بزرگوں میں دفن ہونا پسند نہیں کروں گا۔''
ابوسعید نے پوچھا۔ ''آخر کیوں؟''
شیخ نے جواب دیا۔ ''جس گورستان میں حضرات، خواجہ، امام اور دوسرے بزرگ دفن ہوں وہاں اپنا کیا کام۔''
ابوسعید نے کہا۔ ''پھر آپ ہی بتائیں، آپ کو کون سی جگہ پسند ہے؟''
شیخ نے جواب دیا۔ ''مجھے اپنے لیے وہ ٹیلا پسند ہے جہاں جواری، شرابی، رندِ بے مشرب اور ٹھگ دفن ہیں۔ مجھ کو ان کے درمیان دفن کر دینا۔ ہم دنیا میں انہی لوگوں کے درمیان رہے ہیں اور مرنے کے بعد بھی انہی میں رہنا پسند کریں گے کیونکہ رحمتِ خداوندی سے یہی لوگ قریب ہیں۔''
ابوسعید کی افسردگی میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ عرض کیا۔ ''آپ کے بعد میں کیا کروں گا۔ یہ سوچ کر پریشان ہوتا ہوں۔''
شیخ نے جواب دیا۔ ''اے ابوسعید! قبض و بسط کے معاملے میں، میں نے ہمیشہ راہنمائی کی ہے۔ میرا فیضان میرے بعد بھی جاری و ساری رہے گا۔''
آپ کا انتقال ہوا تو سرخس میں کہرام برپا ہو گیا۔ مریدوں اور ارادت مندوں نے آپ کے سوگ میں ہنسنا بولنا ترک کر دیا۔
ابوسعید جو بعد میں ابوسعید ابوالخیر کے نام سے مشہور ہوئے، پریشان حال کھوئے کھوئے اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔
جب آپ کی تجہیز و تکفین کی رسوم ادا کی جا رہی تھیں تو کسی مرید نے کسی غیر شخص کی گدڑی بھی اس میں شامل کر دی۔
ابوسعید کو اس کا علم ہوا تو اس شخص سے ناراضی کا اظہار کیا اور کہا۔ ''شیخ کو یہ بات ناگوار گزری ہوگی۔''
اس شخص نے معذرت کی اور کہا۔ ''افسوس کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ میں قبر کھود کے تو وہ گدڑی واپس لانے سے رہا۔''
دوسرے دن مسجد میں بھی یہی باتیں ہو رہی تھیں۔
ابوسعید کہہ رہے تھے۔ ''میرے دل پر اس کا بڑا بوجھ ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کروں؟''
دوسروں نے تسلی دی۔ ''آپ کیا کر سکتے ہیں اور آپ اس میں براہِ راست شامل بھی نہیں اس لیے آپ خوامخواہ سوگوار ہو رہے ہیں۔''
ابوسعید نے جواب دیا۔ ''آخری رسوم کی نگرانی میرے ذمے تھی اس لیے یہ غفلت اور کوتاہی بھی میرے ہی نامۂ اعمال میں لکھی جائے گی۔''
کسی مرید نے پوچھا۔ ''پھر اس کی تلافی کس طرح ممکن ہے؟ آپ مراقبہ فرمائیں۔ شاید کچھ معلوم ہو جائے۔''
ابوسعید نے جواب دیا۔ ''میں آج رات نمازِ عشا کے بعد مراقبے میں چلا جاؤں گا اور اللہ سے استعانت چاہوں گا۔''
ابھی یہ باتیں جاری تھیں کہ ابوسعید پر حالتِ قبض طاری ہو گئی۔ یہ پریشان ہو کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بے چینی میں ٹہل کر حالتِ بسط حاصل کرنے میں گزار دی لیکن طبیعت پر ایک گھٹا سی چھا گئی تھی۔ ابوسعید کا گویا سب کچھ چھن چکا تھا۔
ابوسعید بسط کی کیفیت پیدا کرنا چاہتے تھے مگر یہ بات ان کے اختیار میں نہ تھی۔ جب تک شیخ ابوالفضل زندہ رہے، ابوسعید کو یہ مشکل نہیں پیش آتی تھی۔ وہ شیخ کے مزار پر گئے اور ان سے عرض کیا۔ ''حضرت! طبیعت میں قبض نے گھر کر لیا ہے۔ جب تک آپ موجود رہے، میں بسط کے لیے پریشان نہیں ہوتا تھا لیکن اس وقت میں پریشان ہوں۔'' وہ مزار کے ایک طرف

بیٹھ گئے اور شیخ کے روحانی فیضان کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ہی قبض کی کیفیت آہستہ آہستہ دور ہونے لگی اور اس کی جگہ بسط نے لے لی۔

جب وہ حالت بسط میں آ گئے تو عرض کیا۔ ''حضرت! میری دوسری پریشانی بھی دور فرمائیں۔ آپ کے ساتھ ایک غیر کی گدڑی قبر میں دفن ہو گئی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اس کا کیا تدارک کیا جائے؟''

ابوسعید مسجد میں واپس آئے اور اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ شیخ کا فیضان جاری ہے۔ ان کے مزار پر حاضری دینے سے حالت قبض جاتی رہی اور بسط کا انشراح ہوا۔

ابھی یہ باتیں جاری تھیں کہ کسی نے مسجد کے در پر دستک دی۔ ابوسعید نے دروازہ کھولا اور پوچھا۔ ''کون؟''

باہر کوئی بھی نہ تھا اس لیے جواب بھی نہیں ملا لیکن اسی وقت ایک ہاتھ اندر داخل ہوا۔ اس ہاتھ میں وہی گدڑی تھی جس نے ابوسعید کو ذہنی خلفشار میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ گدڑی ابوسعید کے قدموں میں ڈال دی گئی۔ ابوسعید نے اس ہاتھ پر غور کیا تو شیخ کا ہاتھ محسوس ہوا۔

ان واقعات کو زمانہ گزر گیا۔ ابوسعید ابوالخیر نے نہایت بلند مقام حاصل کر لیا۔ ان کا بیٹا ابو طاہر جوان ہو گیا۔ شیخ ابوالفضل کے مزار پر حاضری کا سلسلہ جاری رہا۔ ابوسعید ابوالخیر کے مریدوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ آپ ان کے سامنے اپنے مرشد کا ذکر بڑی عقیدت سے کرتے تھے۔

ابوسعید کے فرزند ابو طاہر نے مجلس میں دیکھا کہ سبھی رو رہے ہیں۔ ان کے والد ابوسعید سب سے زیادہ رو رہے تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ حضرت! آپ کا یہ حال کیوں ہے؟

ابوسعید نے جواب دیا۔ ''ایک عرصے بعد مجھ پر حالتِ قبض شدت سے طاری ہوئی ہے۔ بس اس نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا ہے۔''

ابو طاہر نے عرض کیا۔ ''جب آپ کے پاس اس کا علاج موجود ہے تو آپ پریشان کیوں ہیں اور ناحق آنسو بہا رہے ہیں۔''

ابوسعید نے بیٹے کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ ''تُو درست کہہ رہا ہے۔ ہم اسی وقت شیخ کے مزار پر جائیں گے۔''

گھوڑے منگوائے گئے اور ابوسعید اپنے فرزند ابو طاہر اور مریدوں کے ساتھ شیخ کے مزار پر تشریف لے گئے۔ وہاں قوال کوئی کلام سنا رہا تھا۔ ابوسعید کی حالت قبض رفع ہوئی اور بسط و انشراح کا نزول شروع ہو گیا۔

آپ نے قوال سے کہا۔ ''یہ شعر پڑھ۔''

معدنِ شادیست ایں یا معدن جود و کرم
(میں اسے معدنِ شادی کہوں یا جود و کرم کا معدن)
قبلۂ ماروئے یار و قبلۂ ہر کس حرم
(ہر کسی کا قبلہ حرم ہے اور میرا قبلہ اپنے محبوب کا چہرہ)

آپ نے قوال کا ہاتھ پکڑ کے چھوڑ دیا۔ آپ پر بسط کا وافر نزول شروع ہو گیا۔ دوسروں کی بھی یہی حالت تھی۔ کسی پہلو کسی کو قرار ہی نہ تھا۔ ابو طاہر نے بھی اس روحانی فیض کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔

ابوسعید نے اپنے بیٹے ابو طاہر اور مریدوں سے کہا۔ ''آؤ، اس دن کو یادگار بنائیں کیونکہ یہ دن دوبارہ میسر نہیں آئے گا۔''

ان سب نے مزار کے اطراف چکر لگائے اور کئی دن تک عبادت میں مشغول رہے کیونکہ ابوسعید کو یاد تھا کہ ایک بار شیخ ابوالفضل نے فرمایا تھا۔ ''خود کو اللہ تعالیٰ کا محتاج تصور کرو کیونکہ یہی عبودیت کی بنیاد ہے۔ دوسرے اتباعِ سنت کرتے رہو کہ اس میں راحتِ نفس نہیں ہے۔ راحتِ نفس سے بچتے رہو۔''

ماخذات

نفحات الانس، مولانا جامی۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار۔
کشف المحجوب، داتا گنج بخش۔ سرِّ دلبراں، سید ذوقی شاہ

انہونی

عمران قریشی

اکثر تن کے اُجلے لوگ من کے اُجلے ثابت نہیں ہو پاتے... ان کے دل میں کہیں نہ کہیں کھوٹ چھپا ہوتا ہے... جیسے کہ اس کے دل میں تھا مگر اس نے مجال ہے جو کسی کو خبر ہونے دی ہو... یہ تو خدا کی لاٹھی کی ہی طاقت ہے جو ایسے کھوٹ کو نہ صرف سامنے لاتی ہے بلکہ زور کی ٹھوکر بھی لگاتی ہے۔

قربان ہونے والوں کے خلوص و وفا کو ٹھکرانے والوں کا دلخراش قصہ

سن پینتالیس کی ہجرت سے چند دن قبل میری شادی عائشہ سے ہوئی۔ کھولہ گاؤں سے بھگوان پورہ زیادہ دور نہیں تھا۔ دونوں گاؤں میں گھروں کی تعداد پچاس پر مشتمل تھی۔ شادی میں تمام گھرانوں نے شرکت کی۔ یوں سمجھیے پچاس گھروں پر مشتمل یہ شادی اردگرد کے گاؤں کے لیے مثالی شادی بن گئی جس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے علاوہ سکھوں اور کرسچیئنوں نے بھی شرکت کی۔ میں عاشی کو بیاہ کر کھولہ لے آیا۔ اس کے حسن کے چرچے تمام گاؤں میں مشہور تھے اس لیے گاؤں کی عورتیں اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے جوق در جوق ہماری حویلی کا رخ کر رہی تھیں۔ میری ماں نے عاشی کی نظر اتارنے کے لیے گاؤں کے مولوی کو اس کے ساتھ بٹھا دیا۔ وہ کوئی سورۃ پڑھتا اور

عاشی پر دم کرتا۔ رات کے آخری پہر عورتیں اپنے گھروں کو چلی گئیں تب مجھے کمرے میں جانے کا موقع ملا۔ ہماری حویلی میں بجلی نہیں تھی اس لیے چراغوں کی روشنی میں، میں نے عاشی کے حسن کا دیدار کیا۔ وہ واقعی بہت خوبصورت تھی۔ میں یہاں اس کے حسن کے قصیدے بیان نہیں کروں گا۔ بس آپ یوں سمجھ لیجیے کہ تمام عالم کا حسن یکجا ہو کر اس میں سما گیا تھا۔ تاہم وہ بہت کم گو اور سنجیدہ طبیعت کی مالک تھی۔ میں نے اپنی مختصر ازدواجی زندگی میں اسے بہت کم بولتے ہوئے سنا۔ وہ بغیر وجہ کے بات چیت نہیں کرتی تھی۔

آپ یقین جانیے، شادی کی پہلی رات ہمارے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی اور صبح منہ اندھیرے میں اباجی کے ساتھ کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ گاؤں کی شادیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ایک دن شادی کی تقریب اور دوسرے دن کھیتوں میں کام۔

ان دنوں فصلوں کی بوائی ہو چکی تھی اور اب پانی لگانے کا کام زور و شور سے شروع تھا۔ میں نے آدھا دن بے دلی کے ساتھ کام کیا بلکہ دماغ عاشی کی سوچوں میں گم تھا۔ گاؤں کی روایت کے مطابق اسے دوپہر کا کھانا لے کر کھیتوں کی طرف ایک مٹیارن کی طرح آنا تھا۔ اگر آپ نے پگڈنڈی پر چلتی ہوئی مٹیارن کو نہیں دیکھا تو پھر میرے خیال میں آپ نے کچھ نہیں دیکھا۔ میں آپ کو اس کے متعلق بتاتا ہوں۔ اس کے سر پر سرسوں کے ساگ والی دیگچی جس کے اوپر مکئی کی روٹی کپڑے میں لپٹی ہوتی ہے۔ دائیں ہاتھ والی بغل میں چھاچھ کی لسی سے بھری ہوئی گھڑونچی اور بائیں ہاتھ میں پنکھا ہوتا ہے جسے وہ جھلتی ہوئی پگڈنڈی پر لہراتی، بل کھاتی کھیتوں کی طرف آتی ہے۔

میری نگاہیں صبح سے اس پگڈنڈی پر مرکوز تھیں جہاں سے اسے نمودار ہو کر کھیتوں کی طرف آنا تھا لیکن ڈھائی بج گئے اور وہ نہیں آئی۔ اباجی کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات پیدا ہوئے۔ انہوں نے مجھے حویلی کی طرف جا کر وجہ معلوم کرنے کے لیے کہا۔ میں نے کنوئیں کے پانی سے منہ ہاتھ دھویا اور پگڈنڈی کی طرف آ گیا۔

ابھی کچھ ہی آگے گیا تھا کہ میں نے اسے سرخ شلوار قمیص میں ملبوس سامنے سے آتے ہوئے دیکھا۔ میں جہاں تھا، وہیں جھبوت ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا قد لمبا اور چال میں وقار تھا۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ گاؤں کی دو عورتیں اور بھی تھیں جو اس کی راہنمائی کے لیے ساتھ آئی تھیں ورنہ ہر عورت اپنے شوہر کے لیے کھانا لے کر کھیتوں میں اکیلی آتی ہے۔ قریب آنے پر جب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ ساتھی عورتوں نے رکنے کی وجہ دریافت کی پھر اس کی نگاہوں کے زاویے کو دیکھ کر معاملے کی تہ تک پہنچ گئیں۔ عاشی بھاگ کر پگڈنڈی سے نیچے اتری اور مخالف کھیتوں کے درمیان میں سے ہوتی ہوئی کنوئیں کی طرف چلی گئی۔ دونوں عورتیں ہنستی ہوئی میری طرف آ گئیں۔

ان میں سے ایک بولی۔ ''تیری مٹیارن بہت شرمیلی ہے۔ تجھے دیکھ کر راستہ بدل کر بھاگ کھڑی ہوئی۔''

دوسری عورت بولی۔ ''جلد ہی اس کی شرم ختم ہو جائے گی اور خود ہی تیری طرف آ جائے گی۔ تو کچھ دن صبر کر۔''

عورتیں ہنستی ہوئی واپس گاؤں کی طرف چلی گئیں اور میں کنوئیں کے قریب رکھی ہوئی چارپائی کی طرف آ گیا۔ اباجی منہ ہاتھ دھونے کے لیے کنوئیں کی طرف چلے گئے تھے اور عاشی چارپائی پر بیٹھی ہوئی لسی گلاس میں ڈال رہی تھی۔ میں قریب آیا تو اس نے فوراً گلاس میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔

''کسی کی زبان کو بند کرنے کا اس سے اچھا اور طریقہ نہیں ہو سکتا۔ تو مجھ سے بات کرنے سے کیوں ہچکچاتی ہے؟ میں تیرا شوہر ہوں، کوئی غیر نہیں ہوں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور پاؤں کے پاس نیم گیلی زمین کو دیکھتی رہی۔ اباجی نے کچھ دیر پہلے وہاں پانی کا چھڑکاؤ کیا تھا اور میں نے برگد کے درخت کے نیچے چارپائی ڈال دی تھی۔

''گاؤں کی عورتوں کی وجہ سے مجھے ہانڈی پکانے میں دیر ہو گئی۔ کل سے وقت پر آؤں گی۔'' اس نے آہستہ لہجے میں بتایا۔

''اگر دوبارہ دیر کی تو سزا ملے گی۔'' میں نے ہنستے ہوئے تنبیہ کی۔ اباجی چارپائی کی طرف آ گئے۔ عاشی نے انہیں سلام کیا۔

''خوش رہو اور شوہر کو بھی خوش رکھو۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ وہ شرما کر چھوئی موئی کے پودے کی طرح سمٹ سمٹا کر چارپائی کے کنارے بیٹھ گئی۔ میں نے گلاس میں لسی بھری اور اباجی کے ہاتھ میں گلاس تھما دیا۔ عاشی نے شرمسار ہوتے ہوئے پنکھا اٹھایا اور اباجی کو جھلنے لگی۔

''اب تیری ذمے داریوں میں ایک کا اضافہ اور ہو گیا ہے۔ غلام حسین کا بہت خیال رکھنا۔ اس کی خوشی میں

خوش رہنا اور غم میں ساتھ دینا۔'' اباجی مسکراتے ہوئے بولے پھر اباجی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کل دوہٹی میں میلا لگنے والا ہے۔ تو عاشی کو لے کر وہاں چلے جانا۔ میں دین محمد کو کہہ دوں گا۔ وہ تانگا تجھے دے دے گا۔ میلے میں خرچ کرنے کی رقم اپنی ماں سے لے لینا اور عاشی کو خوب گھمانا پھرانا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کھانا کھانے لگا۔ عاشی ہم دونوں کو پنکھا جھل رہی تھی۔ جب ہم دونوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچے تو وہ برتن سمیٹ کر پگڈنڈی پر چلتی ہوئی گاؤں کی طرف چلی گئی اور مجھے کھیت ویران معلوم ہونے لگے۔

☆☆☆

دوسری صبح اماں نے چند روپے میری شلوار کے نیفے میں ڈال دیے۔ دین محمد کا تانگا حویلی کے باہر کھڑا تھا اور آسمان گہرے بادلوں کی لپیٹ میں تھا۔ ٹھنڈی اور معطر ہوا ماحول کو خوشگوار بنا رہی تھی۔ میں بہت خوش تھا۔ مجھے عاشی کے ساتھ اکیلے گھومنے پھرنے کا موقع مل رہا تھا اور مجھے کیا چاہیے تھا۔ دراصل یہ سب اباجی اور اماں کی سازش تھی۔ وہ ہم دونوں کو دوہٹی کے میلے میں بھجوا کر گھلنے ملنے کا موقع دینا چاہتے تھے۔ یہ میلا گاؤں کے پاس کھیتوں میں لگتا تھا۔ میں صرف دوہٹی تک گیا تھا اور مجھے امرتسر جانے کا بہت شوق تھا۔ میں نے وہاں جانے کا بھی ارادہ کرلیا۔ ہم دس بجے کے قریب کھولہ سے باہر آگئے۔ بادل چھٹنے لگے تھے اور نیلا آسمان بہت بھلا دکھائی دے رہا تھا۔ عاشی حسبِ معمول خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے خاموشی کو توڑنے کے لیے اس سے پوچھا۔

''میرے خیال میں پہلے بھگوان پورہ چلتے ہیں۔ ابھی دن کا بہت حصہ باقی ہے۔ دوہٹی بعد میں چلے جائیں گے۔''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں...... میں وہاں نہیں جانا چاہتی۔ میری سوتیلی ماں نے ابھی تو اپنے کاندھے کا بوجھ اتار کر سکون کا سانس لیا ہے۔ میں اس کے سکون کو غارت نہیں کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کی سوتیلی ماں اور بہن بھائی اس سے نفرت کرتے تھے۔ اپنے کاندھے کا بوجھ اتارنے کے لیے انہوں نے شادی دھوم دھام سے کی تھی ورنہ انہیں عاشی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے کاندھے اچکاتے ہوئے تانگے کا رخ دوہٹی کی طرف کردیا۔

مہینے کی آخری تاریخوں میں اردگرد کے تمام گاؤں سے کسان اور تاجر دوہٹی میں جمع ہوتے تھے۔ وہ اپنے جانور اور خوردونوش کا سامان ساتھ لاتے تھے۔ پہلے پہل خریداری صرف جانوروں اور فصلوں کی خرید و فروخت تک محدود ہوتی تھی لیکن جب گاؤں کے رہائشیوں نے بھی دوہٹی کا رخ کرنا شروع کیا تو یہاں میلا لگا دیا گیا۔ اب یہاں کھانے پینے کی دکانیں، جھولے، مداری کے کرتب اور کتوں کی لڑائی کے علاوہ اور بہت کچھ دیکھنے کو مل جاتا تھا۔

کھولہ سے دوہٹی کا فاصلہ آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھا اور بادل دوبارہ جمع ہونے لگے تھے۔ تانگے پر چھت موجود تھی اس لیے مجھے بھیگنے کا اندیشہ لاحق نہیں تھا لیکن دوہٹی سے کچھ آگے کا علاقہ ایسا تھا جہاں سڑک نہیں تھی۔ بارش کے دنوں میں وہاں کیچڑ اور دلدل کی صورت نمایاں ہوجاتی تھی اور تانگا یا پھر بیل گاڑیاں وہاں پھنس جایا کرتی تھیں۔ مجھے اس علاقے کے متعلق دین محمد سے معلوم ہوا تھا تاہم میں دل میں تہیہ کرچکا تھا کہ عاشی کے ہمراہ امرتسر ضرور جاؤں گا کیونکہ اس کے بعد مجھے دوبارہ موقع نہیں مل سکتا تھا۔

ساڑھے دس بجے ہم نے دوہٹی کے میلے میں قدم رکھا۔ وہاں بہت سے لوگ خریداری کررہے تھے اور بہت سے جانوروں کی فروخت کے لیے گاہکوں کے منتظر تھے۔ جھولے اور چوڑیوں کی دکانوں پر لڑکیوں کا رش تھا۔ میں نے عاشی کو کالے رنگ کی چوڑیاں خرید کر دیں اور دونوں ہاتھوں میں پہنا دیں۔ یہ رنگ میرے علاوہ بہت کم ہی کسی کو پسند تھا۔ زیادہ تر لوگ سرخ رنگ کو پسند کرتے تھے لیکن عاشی کی سفید کلائیوں میں سیاہ رنگ کی چوڑیاں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ دکاندار نے بتایا کہ سیاہ چوڑیاں لینے کے لیے اسے خاص طور پر امرتسر جانا پڑا کیونکہ بنارس میں حالات کشیدہ تھے۔

''ابھی کل تو دین محمد بنارس سے ہوکر آیا ہے۔ اس نے تو حالات کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کل وہاں حالات بہتر تھے۔ آج صبح کشیدگی پیدا ہوئی، انگریز ہندوستان کو چھوڑ کر جارہا ہے اور ہندو مسلمان علیحدہ وطن کا تقاضا کررہے ہیں۔ یہی تقاضا حالات کی خرابی کا باعث بن رہا ہے۔'' دکاندار بولا۔ وہ کچھ پڑھا لکھا دکھائی دیتا تھا۔ شاید اسی لیے اسے حالات سے کسی حد تک آشنائی تھی لیکن یہ بات میرے لیے ناقابلِ فہم تھی کہ انگریز ہندوستان کو کیوں چھوڑ رہا ہے؟ حکومت اس کی تھی، علاقے

بھی اس کے تھے پھر اسے چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت تھی؟
دکاندار خاموش ہوگیا اور میں عاشی کا ہاتھ تھام کر اسے جھولوں کی طرف لے آیا۔ میں نے لاکھ جتن کیے کہ وہ میری خاطر جھولے پر بیٹھ جائے لیکن وہ نہیں مانی۔ مجبوراً ہم کھانے پینے کی دکانوں کی طرف آگئے۔ دودھ جلیبی کی دکان پر ریڈیو رکھا ہوا تھا اور اس کے گرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ میں نے اور عاشی نے دودھ جلیبیاں کھائیں۔ اس دوران ریڈیو پر خبریں نشر کی جانے لگیں۔ لوگوں کے شور میں کچھ بھی پلے نہیں پڑ رہا تھا لیکن چہ میگوئیاں اور دبی دبی سرگوشیوں کے درمیان جو کچھ مجھے معلوم ہوا، اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا کہ بڑے شہروں میں فسادات شروع ہوگئے ہیں اور ان کا سلسلہ قصبوں سے ہوتا ہوا گاؤں کا رخ کر رہا ہے۔ فیروزآباد کے قریب بہت سے گاؤں نذرِ آتش کردیے گئے تھے اور حالات دن بہ دن ناساز ہوتے چلے جارہے ہیں۔ حکومت برائے نام اقدامات کرتی دکھائی دے رہی ہے۔

اس خبر کا اثر یوں ہوا کہ میلے میں رش کم ہونے لگا۔ بونداباندی نے بھی بارش کی صورت اختیار کرلی اور میں عاشی کو لے کر تانگے کی طرف آگیا۔ دوپہر کا ایک بجنے والا تھا۔ بادلوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ زور کا طوفان آنے والا ہے لیکن تانگے میں بیٹھتے ہی بارش کی رفتار میں کمی واقع ہونے لگی۔ میں نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ جب تک بارش برس رہی تھی، تب تک میں نے امرتسر جانے کا ارادہ ملتوی کیے رکھا لیکن بارش رکنے کے بعد میں نے دوبارہ تہیہ کرلیا کہ امرتسر ضرور جاؤں گا۔ چوڑیوں والے دکاندار کا کہنا تھا کہ وہاں حالات بہتر تھے اور پھر میرے پاس تانگا تھا جس میں جتے ہوئے گھوڑے کے متعلق مشہور تھا کہ وہ عربی نسل کا بہترین گھوڑا ہے۔ دین محمد نے اسے فیروزآباد کی مویشی منڈی سے خریدا تھا۔ وہ اسے گھڑدوڑ میں بھی دوڑا چکا تھا۔ جب میں نے تانگے کا رخ کھولہ کے بجائے امرتسر جانے والے راستے کی طرف کیا تو عاشی پریشان لہجے میں بولی۔

”ہمیں امرتسر نہیں جانا چاہیے۔ موسم کے تیور خطرناک ہیں اور حالات کے متعلق بھی بری خبریں گردش کررہی ہیں پھر امرتسر دوہٹی سے کافی دور ہے۔“

”عربی گھوڑے کے سامنے فاصلے اہمیت نہیں رکھتے اور امرتسر میں حالات کشیدہ بھی نہیں ہیں۔ ہم وہاں جاکر واپس آسکتے ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو وہ چپ ہوگئی۔

بارش نے دوبارہ برسنا شروع کردیا۔ دوہٹی سے کچھ آگے جانے کے بعد کچی اور ریتیلی پگڈنڈی کا آغاز ہوا۔ بارش کی بدولت ہمیں کچھ دشواری پیش آئی لیکن کھینچ تان کر تانگا اس علاقے سے باہر نکل ہی گیا۔ اس سے آگے بھی سڑک بہتر نہیں تھی لیکن کیچڑ کم تھا اور پتھر زیادہ تھے۔ مجھے بہرحال احتیاط کے دامن کو تھام کر رکھنا پڑا۔

شام کے پانچ بجے ہم امرتسر پہنچ گئے۔ وہاں حالات واقعی معمول کے مطابق تھے لیکن لوگوں کے چہروں پر خوف و ہراس پایا جاتا تھا۔ میں نے تانگا چھوٹے سے ہوٹل کے ساتھ روکا اور کھانا لینے کے لیے ہوٹل میں آگیا۔ اس کے مالک نے مجھے پریشان لہجے میں بتایا کہ ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے ہیں، خصوصاً ان علاقوں میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ وہاں حالات اختیار سے باہر ہوچکے ہیں۔ متعدد علاقوں میں مسلمانوں کے مکانوں کو نذرِ آتش کردیا گیا ہے اور حکومت بےبسی کی مورت بنی تماشا دیکھ رہی ہے۔ ہوٹل کے مالک نے مجھے نصیحت کی کہ شام کا اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے کھولہ واپس چلا جاؤں لیکن بارش اب کھل کر برسنے لگی تھی۔ اس طوفانی بارش میں سفر کرنا مناسب نہیں تھا اس لیے مجھے اس کے رکنے کا انتظار کرنا پڑا۔

کھانا ہم نے تانگے کے اندر بیٹھ کر کھایا۔ میں نے عاشی کو ہوٹل والے کی گفتگو کے متعلق نہیں بتایا۔ وہ خوامخواہ پریشان ہوجاتی لیکن مجھے پریشانی لاحق ہوگئی تھی۔ کھولہ جاتے ہوئے راستے میں چند ایسے گاؤں آتے تھے جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور شام کا اندھیرا بھی ہونے والا تھا۔ اندھیرے میں سفر کرنا دل گردے کا کام تھا۔

آدھے گھنٹے بعد بارش ہلکی ہوگئی۔ میں نے دیر کیے بغیر تانگے کا رخ کھولہ کی طرف کردیا۔ عاشی سیاہ چادر میں ملبوس میرے قریب خاموش بیٹھی تھی اور راستے ویران تھے۔ امرتسر سے باہر نکلتے ہی اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ مجھے صحیح راستہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کی باگ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ واپسی کے راستوں سے واقف تھا اس لیے اندھیرا ہونے کے باوجود بھی کھولہ جاسکتا تھا۔ تاہم مجھے دوہٹی کے قریب واقع ریتیلی پگڈنڈی سے خوف محسوس ہورہا تھا۔ وہاں سے بغیر حادثے کے نکلنا آسان نہیں تھا۔ میں نے سوچوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے عاشی سے بات چیت کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ میری ہر بات کا جواب ہوں، ہاں میں دینے کے بعد چپ ہوجاتی تھی۔ جب میں نے اندھیرے راستے

پرنگاہ ثبت کردی اور آنے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔

فیروز آباد تک امن رہا اور تانگا ہندوؤں کی اکثریت والے علاقے میں داخل ہوگیا۔ آسمان کھلنے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد بادلوں کی اوٹ سے چاند نمودار ہوگیا۔ تاریکی میں کمی واقع ہونے لگی تو خوف و ہراس کی لہر کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ ماحول کچھ سازگار ہوا تو میں ترنگ میں آکر گنگنانے لگا لیکن فوراً مجھے خاموش ہونا پڑا۔ کھیتوں کے درمیان میں لوگوں کا ہجوم ہاتھوں میں مشعلیں تھامے کھڑا تھا۔ ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ کچھ سکھ بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی توجہ ہماری جانب نہیں تھی۔ وہ مسلمانوں کے کسی گاؤں پر حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کررہے تھے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ جہاں جمع تھے، کھولہ کا راستہ ان کے پیچھے سے ہوکر جاتا تھا۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز انہیں بہ آسانی ہماری جانب متوجہ کرسکتی تھی۔ ہمارے پاس صرف دو راستے تھے۔ یا تو ہم ان کے وہاں سے چلے جانے کا انتظار کرتے یا پھر میں تانگے سے نیچے اتر کر گھوڑے کی باگ کو پکڑ کر اس کے آگے چلتا ہوا ہندوؤں کے جمگھٹے کے پیچھے سے ہوکر آگے بڑھ جاتا۔ اس صورت میں گھوڑے کے سموں کی آواز کم پیدا ہوتی۔

چند لمحے کی سوچ بچار کے بعد میں نے دوسری صورت پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ جیسے جیسے رات گہری ہوتی جارہی تھی، ویسے ویسے خطرات بھی بڑھتے چلے جارہے تھے۔ اگر میں ہندوؤں کے وہاں سے ہٹ جانے کا انتظار کرتا تو فیروز آباد کی طرف سے بھی مجھے خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔

میں تانگے سے نیچے اتر آیا۔ عاشی نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں اس کا ہاتھ جھٹک کر گھوڑے کی طرف آگیا۔ پگڈنڈی پر کیچڑ بہت زیادہ تھا۔ میرے پاؤں کیچڑ میں لت پت ہونے لگے۔ یہاں پکا راستہ برائے نام تھا اور جہاں تھا وہاں بھی دلدلی کیچڑ اسے ڈھانپے ہوئے تھی۔

میں نے گھوڑے کی باگ پکڑی اور محتاط قدموں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ ہندوؤں نے نعرے بازی شروع کردی۔ مجھے اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہونے لگے۔ وہ مسلمانوں کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے آیت الکرسی پڑھ کر اپنے چاروں جانب پھونک ماری اور دوبارہ آگے بڑھنا شروع کیا۔

سڑک کے دونوں اطراف درختوں کی لمبی قطار تھی۔

باتوں سے خوشبو آئے

☆ اگر آپ خود کو بہتر بنانا چاہتے ہو تو غصے کو شہد سمجھ کر پی جاؤ۔

☆ ایسی عمارت تعمیر کرو جو آئندہ نسل کی تعمیر کرسکے۔

☆ دولت مند ہونے سے انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے... اور دولت نہ ہونے سے لوگ اسے بھول جاتے ہیں۔

☆ زندگی کے دکھ ہی آدمی کو انسان بناتے ہیں اس لیے دکھ کا مقابلہ آنسوؤں سے نہیں، حوصلے سے کیا جائے۔

☆ کانٹوں سے بھری ٹہنی کو ایک پھول پرکشش بنادیتا ہے۔

مہکتی کلیاں

☆ یہ مت دیکھو کہ بات کس نے کہی ہے بلکہ یہ دیکھو کہ کہنے والے نے کیا کہا ہے۔

☆ آسمان کی طرف دیکھنے سے پہلے جو انسان زمین کی طرف دیکھ لے، وہ ہمیشہ خوش رہتا ہے۔

☆ اگر اللہ نے تمہیں نوازا ہے تو اس کا شکر ادا کرو۔ اگر نہیں نوازا تو تب بھی حرفِ شکایت زبان پر مت لاؤ۔

☆ میانہ روی کا سنہری اصول اپنانے سے انسان کسی کا محتاج نہیں رہتا۔

☆ اپنی غلطیوں سے غافل رہنے والا انسان دوسروں کی غلطیاں تلاش کرتا ہے۔

☆ کسی کا دل جیتنے کے لیے خوب صورت رویے کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆ وہ انسان نادان ہے جو دوسروں کی کمزوریوں پر مسکرائے۔

☆ زندگی ایک الجبرا کا سوال ہے جس کا جواب ''ضد'' ہے۔

☆ امیدوں کے سہارے جینا خود کو دھوکا دینا ہے۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم۔ حویلی لکھا، اوکاڑہ)

اس قطار کے آگے نشیبی ڈھلان نیچے کھیتوں کی طرف جا رہی تھی۔ اگر یہ ڈھلان نہ ہوتی تو میں ضرور سڑک سے اتر کر کھیتوں کے درمیان آگے بڑھنے کی کوشش کرتا۔ ایک صورت یہ بھی تھی کہ میں اور عاشی گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر آگے سفر کرتے لیکن عاشی گھوڑے پر سواری نہیں کر سکتی تھی۔ اگر وہ نیچے گر جاتی تو ہڈی پسلی ایک بھی ہو سکتی تھی۔

میرے پاس پگڈنڈی پر آگے بڑھنے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ ہندوؤں نے نعرے بازی شروع کر دی اور اچانک ہی اپنا رخ پھیر کر پگڈنڈی کی طرف دیکھنے لگے۔ پگڈنڈی پر اندھیرا طاری تھا۔ درختوں کی قطار نے چاندنی کی روشنی کو روک رکھا تھا اس لیے انہیں پگڈنڈی پر چلتا ہوا تانگا دکھائی نہیں دیا۔ میں وقتی طور پر اپنی جگہ پر جم کر کھڑا ہو گیا۔ ہندو بات چیت میں مصروف رہے۔ کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد میں نے دوبارہ قدم آگے بڑھائے اور ان کے بالکل سامنے سے ہو کر آگے نکل آیا۔

ابھی میں تھوڑا ہی آگے گیا تھا کہ نہ جانے کیوں گھوڑا زور سے ہنہنایا۔ میرے پاؤں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ ہندوؤں نے حیرت بھری نگاہوں سے پگڈنڈی کی طرف دیکھا۔ میں دوڑ کر تانگے پر سوار ہو گیا۔ ہندوؤں نے بھاگ کر ڈھلوان پر چڑھنے کی ناکام کوششیں کیں۔ ڈھلوان بارش کی وجہ سے کیچڑ سے بھری ہوئی تھی۔ وہ سب ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو کر نیچے گرے اور مجھے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔

میں نے گھوڑے کو چابک لگایا۔ وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے عاشی کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا کیونکہ اندھا دھند بھاگنے کی وجہ سے تانگے کے اندر بھونچال کی کیفیت نمایاں ہونے لگی تھی۔ کچی پگڈنڈی پر گڑھے بہت زیادہ تھے۔ گھوڑے کو بھاگنے میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی۔ مجھے اندیشہ لاحق تھا کہ کہیں پہیہ نہ ٹوٹ جائے۔

عاشی نے ہچکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور متواتر گھوڑے پر چابک برساتا رہا۔ گھوڑا بدحواسی کے عالم میں بھاگ رہا تھا۔ کچھ آگے جانے کے بعد میں نے گردن موڑ کر پیچھے نگاہ ڈالی۔ وہاں گھپ اندھیرا طاری تھا۔ ہندو دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے گھوڑے پر چابک برسانا بند کر دیے اور رفتار بھی کم کر دی۔ کچھ دیر بعد گھوڑا پکی سڑک پر چڑھ گیا اور بھونچال کی کیفیت ختم ہو گئی۔ میں نے سکھ کا سانس لیا۔ عاشی نے اب اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اسے دلاسا دینے کے لیے بتایا کہ اب ہم ہندوؤں کی اکثریت والے علاقے سے نکل کر مسلمانوں کی آبادی تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ چپ ہو گئی۔

دوہٹی کا گاؤں سنسان پڑا تھا۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ہمیں چند مسلمان ملے۔ وہ نوحہ کناں تھے اور کھولہ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے تانگا ان کے قریب روکا تو وہ پیچھے بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے روتے ہوئے بتایا کہ کچھ دیر پہلے ہندوؤں نے اس کے گاؤں کو آگ لگا دی ہے اور وہ بہ مشکل تمام جان بچا کر فرار ہوا ہے۔ دوسرے دونوں کی کہانی بھی اس سے مختلف نہیں تھی اور ان سب کا تعلق مختلف گاؤں سے تھا۔

یعنی فسادات شروع ہو گئے تھے۔ کھولہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی بلکہ اردگرد کے بہت سے گاؤں میں ان کی تعداد زیادہ تھی۔ ہندو نہ ہونے کے برابر تھے اس لیے وہاں حالات موافق تھے لیکن شدت پسند اب ان علاقوں کا رخ کر رہے تھے۔ میں نے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی۔

☆☆☆

رات کے نہ جانے کس پہر ہم کھولہ پہنچے، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تمام گاؤں والے اباجی کے ہمراہ گاؤں سے باہر ہمارے منتظر تھے۔ میں نے جب انہیں حالات کے متعلق بتایا تو فوراً ان تینوں افراد کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا جنہیں میں دوہٹی سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ کھانے کے بعد ان تینوں نے بتایا۔

''ہندو مشتعل ہیں کیونکہ پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا ہے لیکن انہیں علیحدہ ملک نہیں دیا گیا۔ وہ آپے سے باہر ہو رہے ہیں اور کسی وقت بھی کھولہ کا رخ کر سکتے ہیں۔ ان کے آنے سے قبل آپ کو تیاری کر لینا چاہیے۔''

اباجی بولے۔ ''میرے پاس دو رائفلیں کمرے میں رکھی ہوئی ہیں۔ انہیں استعمال کرنے کی کبھی نوبت نہیں آئی اس لیے زنگ آلود ہو گئی ہیں۔ کچھ کارتوس بھی پیٹی میں رکھے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ دونوں رائفلوں کو اگر صاف کر کے تیل دے دیا جائے تو استعمال کے قابل ہو جائیں گی۔''

''میرے پاس پستول ہے لیکن مجھے معلوم نہیں کہ چلتا ہے یا نہیں۔ یہ مجھے جنگل سے ملا تھا۔ غالباً سلطانہ ڈاکو کا ہے جسے چند دن پہلے انگریز سرکار نے جنگل سے گرفتار کیا تھا۔'' ایک اور گاؤں والے نے بتایا۔

اباجی بولے۔ ''ٹھیک ہے، تم ریوالور لے آؤ، ہم اس کا معائنہ کریں گے۔ اس کے علاوہ درانتی اور چاقو سب

کے پاس ہیں۔ اگر ان چاقوؤں کو لکڑی کے کنارے پر باندھ دیا جائے تو اچھا ہتھیار بن سکتا ہے۔'' پھر میں اور اباجی رائفلیں لے آئے اور گاؤں والوں کے ساتھ مل کر انہیں صاف کرنے لگے۔ اس اثنا میں پندرہ آدمیوں اور دس عورتوں پر مشتمل ایک قافلہ کھولہ میں داخل ہوا۔ ان سب کی حالت نہایت ابتر تھی۔ کسی کا بازو کٹا ہوا تھا اور کسی کی آنکھ سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے ایک بوڑھے کو دیکھا جس نے اپنے پیٹ کو پگڑی کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ ہندوؤں نے چاقو مار کر اس کا پیٹ پھاڑ دیا تھا۔ قافلے والون کے کہنے کے مطابق انتڑیاں باہر آگئی تھیں۔ انہیں اندر کر کے پگڑی کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ وہ چند گھنٹے زندہ رہا پھر اس نے ہمارے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔ قافلے والوں نے مزید بتایا کہ حالات کی چپقلش کافی عرصے سے چل رہی تھی تاہم چھوٹے موٹے گاؤں حالات کی غیر متوقع کروٹ سے ناواقف تھے اس لیے لاعلمی میں ہندوؤں سے مار کھا گئے ورنہ منہ توڑ جواب دیتے۔

اس لٹے پٹے قافلے کے پاس ایک رائفل اور چند کارتوس تھے۔ انہوں نے رائفل ہمارے حوالے کر دی۔ میں نے اور اباجی نے اپنے گھر سے لائی ہوئی دونوں رائفلوں کو تیل دینے کے بعد استعمال کے قابل کر لیا۔ وہ بہ خوبی کام کرنے لگیں لیکن پستول کی گولیاں ہمارے پاس نہیں تھیں اس لیے وہ ہمارے لیے بیکار تھا۔

حالات کی گمبھیرتا کو محسوس کرتے ہوئے اباجی نے چند آدمیوں کو گاؤں سے باہر درختوں پر بٹھا دیا تاکہ وہ گاؤں کے داخلی اور خارجی راستوں پر نظر رکھ سکیں۔ قافلے والوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے کھولہ سے قریب چند گاؤں کو آگ کی نذر ہوتے دیکھا ہے اور مشتعل ہندو کسی بھی وقت کھولہ کی طرف آسکتے ہیں۔

اباجی کے اس مؤثر اور بروقت اقدام کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ رات کو ڈیڑھ بجے کے قریب درختوں پر بیٹھے آدمیوں نے اطلاع دی کہ کچھ افراد گاؤں کی طرف آرہے ہیں۔ ان کے تیور خطرناک نہیں ہیں تاہم ہاتھوں میں رائفلیں پکڑے ہوئے ہیں۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ ان کا تعلق بلوچ رجمنٹ سے ہو۔ اس اطلاع کے فوراً بعد تمام گاؤں والے قریبی میدان میں جمع ہو گئے۔ رائفلوں کو تین ایسے افراد کے حوالے کر دیا گیا جو انہیں چلانا بہ خوبی جانتے تھے۔ باقی مردوں نے درانتیاں اور چاقو سنبھال لیے۔ کچھ دیر بعد دس کے قریب افراد درختوں کے درمیان میں سے نکل کر میدان میں آگئے۔ وہ نارنجی رنگ کی پگڑیاں باندھے ہوئے تھے اور ان کی ڈاڑھیاں اس بات کی نشاندہی کر رہی تھیں کہ وہ سکھ ہیں۔ اباجی نے ان سے آنے کا مقصد پوچھا تو ان میں سے ایک بولا۔

''ہمارا تعلق دیال پور سے ہے اور کھولہ سے چند کوس پیچھے رام پور گاؤں میں ہندوؤں نے خون کی ہولی کھیلی ہے۔ ہم بروقت وہاں نہیں پہنچ سکے ورنہ انہیں بچا لیتے۔ سرکش ہندوؤں کا اگلا ہدف آپ کا گاؤں ہے۔ آپ لوگ تیاری کر لیجیے۔ ہم آپ کو سرحد پار چھوڑ آئیں گے۔''

''کون سی سرحد......؟ ہم کھولہ کو نہیں چھوڑیں گے، چاہے ہمیں اپنی جان کا نذرانہ ہی کیوں نہ دینا پڑے۔'' اباجی نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

گاؤں والوں نے اباجی کو بتایا کہ بات چیت کرنے والے اس سکھ کا نام امبر سنگھ ہے اور اس نے عاشی کی شادی میں بھی شرکت کی تھی۔ اس کا تعلق واقعی بھگوان پورہ کے قریب واقع دیال پور گاؤں سے ہے۔ میں نے امبر سنگھ کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ مجھے شادی میں بڑھ چڑھ کر کام کرتا ہوا دکھائی دیا تھا۔

''اس کے باوجود بھی ہم اپنے گھروں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے پاس کچھ اسلحہ ہے اور ہم ہندوؤں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔'' اباجی بولے۔

''ہندوؤں نے انگریز سرکار سے ساز باز کر کے ٹینک حاصل کر لیے ہیں۔ میں نے انہیں اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کے گھروں پر گولے برساتے ہوئے دیکھا ہے۔ تمہاری رائفلیں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ پاکستان کی سرحد یہاں سے دور نہیں۔ ہم تمہیں وہاں تک بہ آسانی پہنچا سکتے ہیں۔ اگر میری باتوں پر تمہیں یقین نہیں تو عائشہ سے میرے متعلق پوچھ لو۔ وہ تمہیں بہتر بتائے گی۔'' امبر سنگھ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

عائشہ کے نام پر میں چونک گیا۔ امبر سنگھ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''اس کی سوتیلی ماں اور بہن بھائی میرے گھر میں ہیں۔ بھگوان پورہ کو بھی کچھ دیر پہلے جلا دیا گیا ہے۔'' مجھے اس خبر پر شدید حیرت ہوئی۔ اباجی نے مجھے عاشی کو باہر لانے کے لیے کہا۔ میں بھاگ کر اسے لے آیا۔

اباجی نے اس سے امبر سنگھ کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا۔ ''اماں نے اسے منہ بولا بیٹا بنایا ہوا تھا اور یہ ہمارے گھر میں ہی پلا بڑھا ہے۔''

شک کی جو دیوار ہمارے اور امبر سنگھ کے درمیان

حائل تھی، وہ یکدم گر گئی اور سکھ نوجوانوں کے لیے بیٹھک کے دروازے کھول دیے گئے۔ آؤ بھگت کا سلسلہ صبح تک چلا۔ اس دوران دو قافلے اور کھولہ کی طرف آئے۔ انہوں نے بتایا کہ کچھ دیر پہلے دو بھٹی گاؤں کو بھی نذرِ آتش کردیا گیا ہے اور کھولہ کے متعلق ہندوؤں کے خیالات اچھے نہیں ہیں۔

اب گاؤں نہ چھوڑنے کی کوئی مناسب وجہ ہمارے پاس موجود نہیں تھی اس لیے امبر سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی راہنمائی میں کھولہ کو چھوڑنے کی تیاریاں کی جانے لگیں۔ ضروری سامان اکٹھا کیا گیا۔ چند بیل گاڑیوں پر انہیں لادا گیا۔ دین محمد کے تانگے میں عاشی اور بوڑھی عورتوں کو بٹھایا گیا پھر فجر کی نماز کے بعد کھولہ سے ہجرت کی گئی۔

☆☆☆

مجھے شادی راس نہیں آئی۔ گھر بھی چھوٹ گیا اور زمینوں کو بھی خیر باد کہنا پڑا۔ ہم نے تین دن پیدل سفر کیا۔ اس دوران ہندوؤں سے جھڑپ ہوئی۔ متعدد افراد ہلاک ہوئے، ہزاروں زخمی ہوئے۔ کتنے قافلے ہمارے ساتھ آگے بڑھے، کتنوں نے راستے میں ہی ہمارا ساتھ چھوڑ دیا اور کتنے حالات کی نذر ہو گئے۔

برسات کے موسم کا آغاز ہو رہا تھا۔ بارش کا سلسلہ ہمیں علیحدہ تنگ کر رہا تھا۔ ہمارے سروں پر چھت نہیں تھی اس لیے ہمیں درختوں کے نیچے پناہ لینا پڑتی تھی۔ ایک ادھ جلے گاؤں کے پاس سے گزرتے ہوئے ہمیں خستہ حالت... میں ٹینٹ مل گیا۔ بوڑھے مردوں اور عورتوں کے لیے یہ کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ عاشی اور امی تانگے میں مستقل ڈیرا ڈالے ہوئے تھیں۔ وہ شاذ و نادر ہی نیچے اترتی تھیں۔ کھانے پینے کا سامان بھی ختم ہونے والا تھا۔ اس تمام صورت حال کے دوران امبر سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ وہ قریبی سکھ گاؤں سے کھانے کا سامان لے آئے تھے۔ یہ سامان افراد کی تعداد کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے آٹے میں نمک کے برابر تھا لیکن نہ ہونے سے بہرحال بہتر تھا۔

تیسرے دن ہم سرحد کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں درختوں کی بہتات تھی۔ امبر سنگھ نے قافلے کو آگے جانے سے روک دیا۔ اباجی نے وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا۔

''سرحدوں کا تعین ہو گیا ہے لیکن ابھی تک فوج تعینات نہیں ہوئی اس لیے یہاں ہندو، مسلمانوں کے قافلوں کا شکار کھیلتے ہیں۔''

اباجی کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھرے تو امبر سنگھ دلاسا دیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن آپ فکر نہ کیجیے۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ان کی سرگرمیوں کے متعلق سب کچھ معلوم ہے۔ رات کو تین بجے کے بعد سرحدیں سنسان ہوتی ہیں۔ میں حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد آپ سب کو سرحد پار کروادوں گا۔''

اباجی نے ممنون نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا پھر بے اختیار اسے گلے سے لگالیا اور رندھے ہوئے لہجے میں بولے۔

''تم نے اس مختصر سفر کے دوران ہمارا جتنا ساتھ دیا ہے، اتنا ساتھ ہمارا کوئی قریبی رشتے دار بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو تم رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ۔''

''میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں۔ آپ اسے بچا کر رکھیں۔ سرحد پار آپ کے کام آئے گا۔'' اس نے جواب دیا۔ وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''انہوں نے آج صبح کچھ راشن کا انتظام کیا ہے۔ یہ کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن اگر اسے احتیاط کے ساتھ استعمال کیا گیا تو چند دنوں کے لیے ضرور کام آئے گا۔''

''ہم تمہارا احسان زندگی بھر بھلا نہیں پائیں گے۔ ہو سکے تو پاکستان ضرور آنا۔ اگر ہم سے ملاقات نہ بھی ہو سکی تو ہم جیسے اور ضرور خوش دلی کے ساتھ تمہارا خیر مقدم کریں گے۔'' اباجی گلوگیر لہجے میں بولے۔

امبر سنگھ مڑ کر اپنے آدمیوں کی طرف چلا گیا اور اباجی تانگے کی طرف آ گئے۔ وہ تمام رات ہم نے جاگتے ہوئے گزاری۔ تین بجے کے قریب ہم نے قریبی نہر پر وضو کیا اور باجماعت تہجد کی نماز پڑھنے کے بعد صدقِ دل سے خیر و برکت کے لیے دعا کی پھر چاندنی رات میں رختِ سفر باندھا۔ درختوں کے جھنڈ سے کچھ آگے میدانی علاقہ تھا۔ یہاں چند ٹیلے بھی تھے۔ ان ٹیلوں کے قریب پہنچنے کے بعد امبر سنگھ کے ساتھیوں نے ہمیں الوداع کہا اور واپس جانے کے لیے مڑنے لگے۔ ان کے پاس سیاہ رنگ کے چند گھوڑے تھے۔ اباجی نے ان ساتھیوں سے امبر سنگھ کے بارے میں پوچھا تو ان میں سے ایک نے بتایا کہ وہ واپس دیال پور چلا گیا ہے۔

''تعجب ہے، ہم سے مل کر نہیں گیا۔ شاید جلدی میں ہوگا۔'' اباجی حیرت بھرے لہجے میں بولے۔

میں اباجی کے قریب کھڑا تھا۔ نہ جانے میرے دل میں کیا سمائی۔ میں بھاگ کر ٹیلے کے اوپر چڑھنے لگا۔ اس کے اختتام پر پہنچنے کے بعد میں نے تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے میدان کی طرف دیکھا جہاں میدان کا اختتام ہو رہا تھا اور

جہاں درختوں کے جھنڈ کا آغاز تھا وہاں گھڑسوار پوری رفتار کے ساتھ دیال پور کی طرف جارہا تھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے پیچھے کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ چودھویں کے چاند کی روشنی میں سرخ رنگ کی شلوار قمیص اور سیاہ رنگ کی چادر کو میں نے بہ آسانی پہچان لیا۔ یہ لباس صبح عاشی نے زیب تن کیا ہوا تھا۔

امبر سنگھ احسان جتانے کے بجائے میری کل متاع کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں جب ٹیلے سے نیچے اترا تو امبر سنگھ کے ساتھی واپس جارہے تھے اور قافلے والے میدان میں کھڑے انہیں جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ میں دین محمد کے تانگے کی طرف چلا آیا۔ عاشی وہاں نہیں تھی اور اماں تمام رات جاگتے رہنے کے بعد سیٹ سے ٹیک لگائے سورہی تھیں۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی بہو انہیں دھوکا دے کر ایک سکھ نوجوان کے ساتھ فرار ہوگئی ہے۔

میں نے انہیں جگانا مناسب خیال نہیں کیا اور ابا جی کی طرف آگیا۔ انہوں نے میرے چہرے پر پریشانی کے تاثرات دیکھ کر وجہ دریافت کی تو میں نے انہیں عاشی کے متعلق بتادیا۔ وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر زمین پر بیٹھ گئے۔ میں نے انہیں سہارا دیا اور ٹیلے کے پاس پڑے ہوئے پتھر پر بٹھادیا۔

''تو امبر سنگھ اپنی خدمات کا صلہ وصول کرکے واپس دیال پور چلا گیا۔ ٹھیک ہے، پاکستان حاصل کرنے کی کچھ تو قربانی ہمیں دینا ہی تھی۔ اچھا ہوا سستے میں جان چھوٹ گئی۔'' ابا جی نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ میں خاموش رہا۔

ہم پاکستان آگئے۔ مہاجر کیمپ میں بہ مشکل تمام جگہ ملی۔ رش بہت زیادہ تھا۔ ابا نے کلیم بنایا تو چند دنوں کی کوششوں کے بعد ہمیں گورنمنٹ کی طرف سے کچھ زمین اور چھوٹا سا گھر مل گیا۔ زندگی ڈگر پر آئی تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بیدار ہوئی۔ عاشی مجھے بہت یاد آتی تھی لیکن میرے خیال میں امبر سنگھ کا قصور نہیں تھا۔ وہ اسے بھگا کر بھگوان پورہ نہیں لے گیا تھا بلکہ اس کی مرضی سے لے کر گیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی میری زندگی میں ایک خلا پیدا ہوگیا تھا جسے بھرنا ممکن نہیں تھا۔

وقت تیزی کے ساتھ گزرنے لگا۔ ابا جی اور اماں میری دوسری شادی کرنے پر زور دے رہے تھے لیکن میں کچھ عرصہ تنہا رہنا چاہتا تھا یا پھر شاید مجھے کچھ امید تھی کہ وہ نادم ہوکر واپس آجائے گی۔ ایک سال گزر گیا۔ ہمارے حالات کافی حد تک بہتر ہوگئے تھے تاہم اماں بیمار رہنے لگی تھیں۔ ان کے تقاضے نے بھی شدت اختیار کرلی تھی کہ میں شادی کرلوں۔

انہی دنوں میری ملاقات احمد علی سے ہوئی۔ وہ ہندوستان سے سبزیاں اسمگل کرکے پاکستان لاتا تھا۔ پاکستان اور ہندوستان کے بارڈر پر بعض علاقوں میں اتنی سختی نہیں تھی۔ بہت سے علاقے کھلے پڑے تھے۔ وہاں باڑھ لگانے کے وسائل حکومت کے پاس نہیں تھے اس لیے ہندوستان جانا مشکل نہیں تھا۔ میں نے احمد علی کے ساتھ دیال پور جانے کا ارادہ کیا۔ میں امبر سنگھ سے ملنا چاہتا تھا۔ میرے دماغ میں کچھ خاص لائحہ عمل نہیں تھا۔ میں صرف دل کو مطمئن کرنے کے لیے سب کچھ کررہا تھا۔ ابا جی اور اماں کو میں نے جھوٹ بولا کہ میں بارڈر سے کھاد لینے کے لیے احمد علی کے ساتھ جارہا ہوں۔ شہر کی نسبت وہاں کھاد سستی ہے۔ ابا نے معاملے کو فوراً جانچ لیا اس لیے پریشان لہجے میں بولے۔

''سراب کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دے۔ وہ امبر سنگھ کے ساتھ اپنی مرضی سے گئی ہے۔ واپس نہیں آئے گی۔ میری مان اور شادی کرلے۔ زبیدہ بہت اچھی اور سگھڑ لڑکی ہے۔ تیرا بہت خیال رکھے گی۔''

''اگر عاشی نے انکار کردیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ زبیدہ سے شادی کرلوں گا۔ صرف دو تین دنوں کی بات ہے۔ میں جلد واپس آجاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا تو ابا جی خاموش ہوگئے۔

☆☆☆

دوسری صبح ہم احمد علی کی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر بارڈر کی طرف آگئے۔ میں پہلے بتاچکا ہوں کہ اس وقت دونوں ممالک کے حالات مناسب نہیں تھے اس لیے بارڈر پر سختی نہیں تھی۔ یہ وہ چند ماہ و سال تھے جن کے دوران دونوں ملک ایک دوسرے کے تعاون سے مالیاتی اور ترقیاتی کام کررہے تھے اس لیے حالات بھی خوشگوار تھے۔ ہم نے بارڈر کے قریب تانگے کو چھوڑ دیا اور دو گھوڑوں پر سواری کرتے ہوئے شام کو امرتسر پہنچ گئے۔ یہاں ہمارا قیام احمد علی کے چند سکھ دوستوں کی بیٹھک میں ہوا۔ انہوں نے ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ رات گئے تک محفل جمی رہی۔ میں نے ان سے دیال پور کے امبر سنگھ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے بتایا۔ ''دیال پور کبھی جانا نہیں ہوا۔ غالباً چھوٹا سا قصبہ ہے۔ وہاں جاکر کرنا بھی کیا ہے۔ آپ امرتسر کے مزے لو۔ اگر کچھ وقت بچا تو آپ کو بنارس کی بھی سیر کروائیں گے۔''

میں چپ ہوگیا۔ رات کو ہم دیر سے سوئے اس لیے

صبح آنکھ بھی تاخیر سے کھلی۔ ناشتا کرنے کے بعد میں نے ان سے اجازت لی اور تانگا پکڑ کر دیال پور آگیا۔ سب علاقے جانے پہچانے تھے لیکن اب وہاں اجنبیت کی فضا پائی جاتی تھی۔ احمد علی میرے اکیلے دیال پور جانے کے خلاف تھا لیکن میرے پاس وقت کم تھا اور اس کے پاس کام زیادہ تھا اس لیے اس کے منع کرنے کے باوجود بھی میں دیال پور آگیا۔ امبر سنگھ کی حویلی تک پہنچنا قطعاً مشکل ثابت نہیں ہوا۔ اس کا شمار دیال پور کی مشہور شخصیت میں ہوتا تھا۔ میں نے حویلی کے پاس کام کرتے ہوئے نوکروں کو اپنا نام بتایا تو وہ مجھے حویلی کے اندر لے آئے۔

مجھے یقین نہیں تھا کہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہوجائے گا لیکن اصل مشکل تو بات چیت کے دوران پیدا ہونا تھی۔ میں لڑنے جھگڑنے کی نیت سے دیال پور نہیں آیا تھا۔ ایک امید تھی جو مجھے وہاں کھینچ لائی تھی کہ شاید وہ لڑائی جھگڑے کے بجائے افہام و تفہیم سے مجھے میری امانت واپس لوٹادے۔ امید پر دنیا قائم ہے۔ میری بھی قائم تھی۔ کچھ دیر بعد امبر سنگھ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ میں کرسی چھوڑ کر اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثرات نہیں تھے۔ مجھ سے ہاتھ ملانے کے بعد اس نے اباجی کے متعلق پوچھا۔

”وہ ٹھیک ہیں لیکن حالات و واقعات نے انہیں کمزور کردیا ہے تاہم اماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ انہیں دل کا عارضہ لاحق ہوگیا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”عاشی کو یاد کرتی ہوں گی؟ تو بھی شاید اس سے ملاقات کے لیے دیال پور آیا ہے؟“ امبر سنگھ بولا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”میں تجھے نراش نہیں کروں گا لیکن یہ ملاقات آخری ہوگی۔ دوبارہ یہاں نہیں آنا ورنہ اگلی دفعہ میں لحاظ نہیں کروں گا۔“ وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے ہکا بکا چھوڑ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

مجھے اتنی آسانی سے ملاقات کی توقع نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ سب کسی سازش کے تحت ہو رہا ہو۔ مجھے اپنی غلطی کا بھی احساس ہونے لگا تھا۔ میں اس کی حویلی میں تنہا آگیا تھا۔ اگر وہ مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے قتل کردیتا تو کسی کو اس کے متعلق معلوم بھی نہیں ہو پاتا۔ احمد علی اکیلا کیا کرلیتا لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر جب اوکھلی میں سر دیا تو پھر موسلوں کا کیا ڈر...... میں سینہ سپر ہوکر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور عاشی، امبر سنگھ کے ہمراہ اندر داخل ہوئی۔ وہ سیاہ چادر میں ملبوس بظاہر مطمئن دکھائی دے رہی تھی تاہم جب میں نے اسے قریب سے دیکھا تو حقیقت آشکار ہوئی کہ اس کا حسن پانی نہ ملنے والے پودے کی طرح سوکھ کر ختم ہوگیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے، ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی تھی، گالوں کی ہڈیاں ابھر کر باہر آگئی تھیں۔ مجھے یہ جان کر نہ جانے کیوں خوشی محسوس ہوئی کہ وہ مطمئن نہیں تھی۔

”جو گلے شکوے کرنے ہیں، جلدی کرلے۔ تیرے پاس وقت کم ہے۔ میں باہر انتظار کر رہا ہوں۔ ملاقات کے بعد تجھے بارڈر پر چھوڑ آؤں گا۔“ امبر سنگھ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا اور جواب سنے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں نے عاشی کی طرف دیکھا۔ وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ دل کا غبار ہلکا ہونے کے بعد وہ بہتر طریقے سے بات چیت کرسکے گی لیکن میرے پاس وقت کم تھا۔ اگر امبر سنگھ اندر آجاتا تو بات چیت کا موقع نہیں ملتا۔

عاشی کو بھی موقع کی نزاکت کا احساس تھا اس لیے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”اباجی اور اماں کیسے ہیں؟“

”تیرے جانے کے بعد اماں بہت بیمار ہوئیں۔ انہوں نے تیری بے وفائی کو دل پر لے لیا۔ اباجی بھی خوش نہیں ہیں۔ وہ تجھے بہت یاد کرتے ہیں......“ میں نے جواب دیا۔

”اور تُو...... کیا مجھے یاد نہیں کرتا؟“ عاشی بات درمیان میں کاٹتے ہوئے بولی۔

میری آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ میں نے آستین کے ساتھ انہیں پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر یاد نہ کرتا تو سرحد پار کرکے یہاں کیوں آتا؟ پاکستان میں شادی نہ کرلیتا۔“

”تُونے شادی نہیں کی......؟ لیکن کیوں؟ کیا میری بے وفائی نے تجھے اس کے لیے اکسایا نہیں یا پھر تُو شادی سے ہی بدظن ہوگیا ہے؟“ اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”شادی تو میری ہوگئی تھی تیرے ساتھ...... میں بھلا دوسری کیوں کرنے لگا...... اور اگر کرنا بھی ہوتی تو تجھ سے اجازت ضرور لیتا۔“ میں نے رقت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

”تو پھر میں تجھے اجازت دیتی ہوں کہ تو شادی کرلے۔ اباجی بھی خوش ہوجائیں گے اور اماں بھی مطمئن ہوجائیں گی۔“ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”تو پھر تجھے بتانا ہوگا کہ تُو امبر سنگھ کے ساتھ اپنی

مرضی سے دیال پور آئی تھی یا پھر وہ تجھے مجبور کر کے لایا تھا۔ اگر سچ بتائے گی تو میں وعدہ کرتا ہوں، پاکستان جاتے ہی شادی کرلوں گا۔'' میں نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں بچپن سے اس سے محبت کرتی تھی۔ میری سوتیلی ماں بھی اسے پسند کرتی تھی تاہم وہ چاہتی تھی کہ امر سنگھ شادی سے قبل اسلام قبول کرلے اور امر سنگھ اس کے لیے آمادہ نہیں تھا اس لیے میری ماں نے میری شادی تجھ سے کردی۔ وہ شادی کے بعد مجھ سے ملنے کھولہ آیا تھا۔ تجھے اچھی طرح یاد ہوگا، میں دوپہر کا کھانا لے کر کھیتوں میں دیر سے آئی تھی۔ میرے ساتھ گاؤں کی عورتیں بھی تھیں۔ میں نے ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے رفع حاجت کا بہانہ کیا اور درختوں کے جھنڈ میں آگئی۔ وہ وہاں موجود تھا۔ ہمیں زیادہ بات چیت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مجھے دیال پور جانے سے پہلے دہلی لے جائے گا اور جامع مسجد میں نکاح کرنے کے بعد مجھ سے شادی کرلے گا۔ میں مطمئن ہوگئی لیکن اس نے مجھے دھوکا دیا اور دیال پور جانے کے بعد اسلام قبول نہیں کیا بلکہ مجھے بھی مجبور کیا کہ میں سکھ ہوجاؤں۔ میں نے صاف انکار کردیا۔ اس نے مجھے مارا پیٹا، گالیاں دیں لیکن میں نہیں مانی، اب میں زندہ ہونے کے باوجود بھی مرچکی ہوں۔ خدا کے واسطے واپس چلا جا ورنہ وہ تجھے بھی ماردے گا۔'' اس نے دوپٹے سے اپنی آنکھوں کو پونچھا پھر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تیری سوتیلی ماں اور بہن بھائی کہاں ہیں؟ ان کے ساتھ تیرا رابطہ ہے کہ نہیں؟'' میں نے بے تابانہ لہجے میں پوچھا۔

''وہ پاکستان چلے گئے۔ مجھے نہیں پتا کہ وہ کہاں ہیں لیکن مجھے اب ان کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں نے اپنے متعلق فیصلہ کرلیا ہے۔'' اس نے دروازے کی جانب جاتے ہوئے جواب دیا۔

''تیرا ارادہ کیا ہے؟ تُو یہاں اکیلی رہ گئی ہے اور امر سنگھ تیرے ساتھ مخلص نہیں ہے۔ اگر کہتی ہے تو میں اس سے بات کرتا ہوں۔ اباجی اور اماں اب بھی پاکستان میں تیرے منتظر ہیں۔'' میں نے عجلت میں پوچھا۔

وہ میری جانب مڑتے ہوئے تاسف بھرے لہجے میں بولی۔ ''میں نے ان کے اعتماد کا خون کیا ہے۔ ان کا سامنا بھلا کیسے کروں گی لیکن اب میں یہاں بھی نہیں رہوں گی۔ یہ میری اور تیری آخری ملاقات ہے۔ اللہ تجھے میرے حصے کی بھی خوشیاں دے دے۔'' وہ دوبارہ دروازے کی طرف مڑی۔

''تو کیا کرنے والی ہے۔ مجھے تیرے ارادے ٹھیک معلوم نہیں ہوتے۔ کوئی غلط قدم نہیں اٹھانا۔'' میں نے چیختے ہوئے کہا۔

اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔ ''میں خودکشی کرنے والی ہوں۔ شاید اب تک کر بھی چکی ہوتی لیکن مجھے یقین تھا کہ تو ضرور دیال پور آئے گا۔ میں تجھ سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ اماں اور اباجی کو بھی کہنا کہ مجھے معاف کردیں۔'' وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

میں ہکا بکا کمرے میں اکیلا کھڑا رہ گیا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہوگئی تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ امر سنگھ کب کمرے میں داخل ہوا اور کب میں اس کے ہمراہ تانگے میں بیٹھ کر امرتسر آیا اور وہاں سے کیسے احمد علی کے ساتھ پاکستان گیا۔ ہوش و حواس اباجی اور اماں کے سامنے جانے کے بعد بیدار ہوئے۔ انہوں نے عاشی کے متعلق پوچھا تو میں نے بتایا کہ وہ وہاں امر سنگھ کے ساتھ خوش ہے اس لیے میں بھی زبیدہ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ دونوں خاموش ہوگئے۔

اگلے ماہ میری شادی ہوگئی۔ زبیدہ پڑھی لکھی سگھڑ بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے وقتی طور پر مجھے عاشی کی یادوں سے غافل کردیا لیکن کچھ عرصے بعد جب دوبارہ یادوں نے مجھے گھیرا تب میں نے احمد علی سے درخواست کی کہ وہ دیال پور جائے اور عاشی کے متعلق معلوم کر کے مجھے بتائے۔ اس نے ہامی بھرلی۔ میرے دل میں اب بھی امید تھی کہ شاید وہ پاکستان آنے کا فیصلہ کرلے، تب میں اسے واپس لے آؤں گا اور اگر اس نے انکار کردیا تب اسے منانے کی کوششیں کروں گا لیکن اگلے ہفتے احمد علی نے مجھے روح فرسا خبر سنائی کہ اس نے مجھ سے ملاقات کرنے کے فوراً بعد نہر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی تھی اور امر سنگھ دیال پور والی حویلی کو چھوڑ کر امرتسر چلا گیا ہے۔

امید کا دامن چھوٹا تو محبت کرنے والی بیوی کا خیال دل میں بس گیا اور احمد علی کے گھر سے واپس جاتے ہوئے میں نے قریبی دکان سے جلیبیاں خریدیں۔ زبیدہ کو جلیبیاں بہت پسند ہیں...... اور گھر کی طرف آگیا۔ وہ میری منتظر تھی۔

✱✱✱
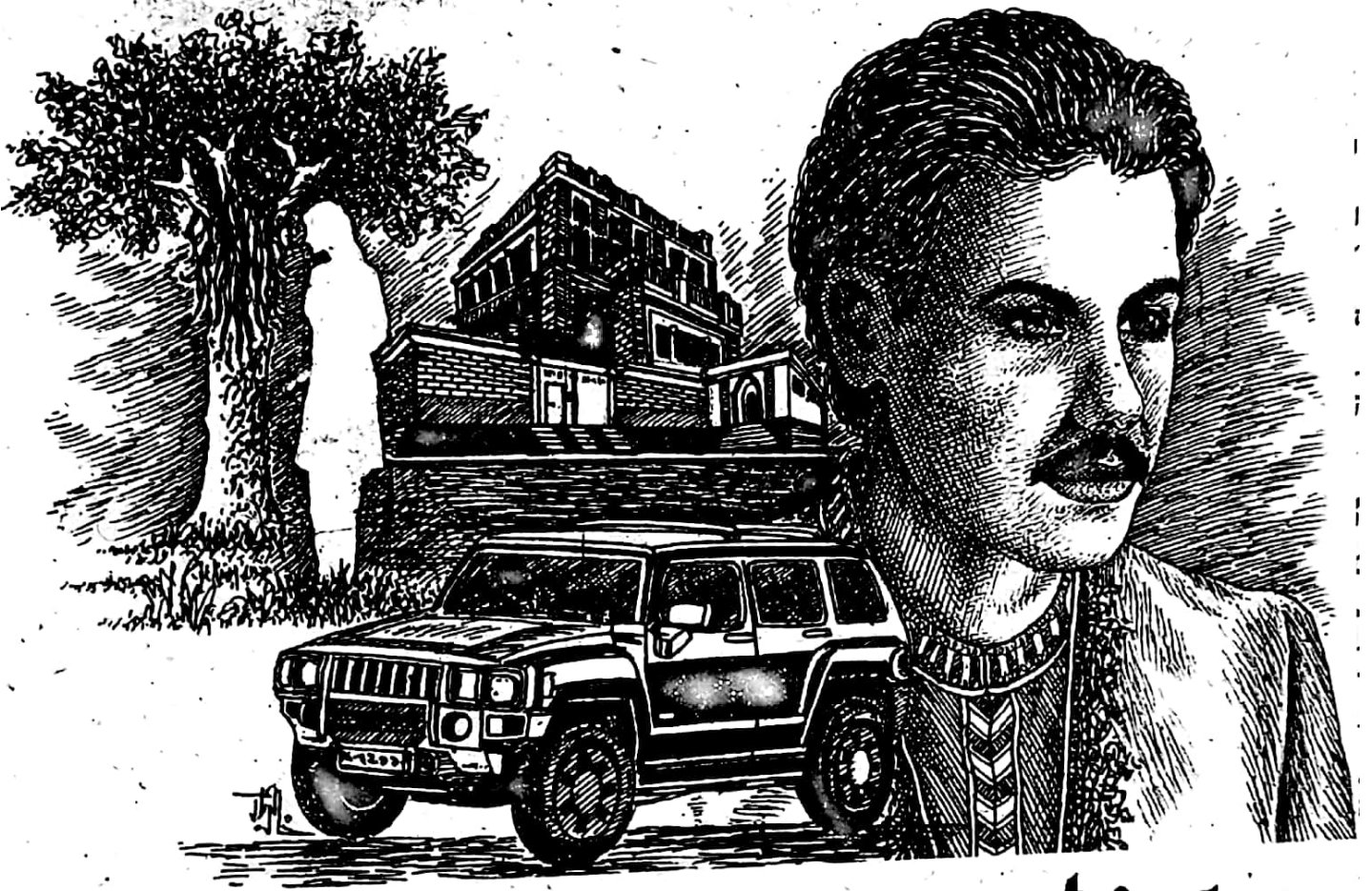
مجھے چاندنی نوازدو

کاوش صدیقی

چاند اور زمین کا بھیدوں بھرا ساتھ کبھی کسی کی سمجھ میں نہ آسکا... اور چاندنی کا طلسماتی حسن بھی ہمیشہ سے عقل کو حیران کرتا آیا ہے... انہی چاندنی راتوں میں دو مختلف مزاجوں کے انسان انتہائی مختلف ماحول میں ملے اور پھر جانے کیسے خاموشی کی چادر اوڑھے ایک مقام پر یوں یکجا ہوئے کہ دو دلوں کی دھڑکن پر ایک ہی دھن رقص کرنے لگی۔ نگاہوں کے زاویے کیا بدلے کہ دیکھتے ہی دیکھتے منزل کے فیصلے بھی بدل گئے... یہ اور بات کہ پیروں تلے بچھے رستوں نے ان مسافروں کو خود سے دور جانے ہی نہ دیا لیکن ... آخر کب تک... سفر جاری رہ پاتا... بالآخر ایک نہ ایک دن اسے تمام ہونا تھا... سو ہوا... اور پھر منزل خود چل کر سامنے آگئی۔

آنکھوں کے رستے دلوں میں اتر جانے والے ایک پریمی جوڑے کی ادھوری مگر دلچسپ اور انوکھی داستان

''کتوں کو راتب نہ دینا۔'' کمدار نے میری طرف دیکھ کے کہا۔
''اچھا۔'' میں نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔
''پتا نہیں کیوں سمجھ میں نہیں آتا ان کو۔'' کمدار نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''ساری حیاتی دیکھتے رہتے ہیں پھر بھی مت ماری جاتی ہے۔''
میں چپ ہی رہا۔ کمدار نے میری طرف دیکھا اور بولا۔
''دیکھتا ہے نا۔ سب دیکھ رہا ہے۔ دور رہنا۔ یہ آگ ہے آگ۔ جل جاتا ہے سارا بدن اور پیچھے رہنے والے خوف سے نہ یاد کر سکتے ہیں نہ ذکر کر سکتے ہیں۔''
میں نے کہا۔ ''مجھے چریا سمجھا ہے کیا؟''
کمدار ہنسنے لگا۔
میں نے پوچھا۔ ''اب اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔''
''ہونی تو ہو کے رہتی ہے۔ وہ بھی یہی کہتا تھا پر جوانی کی گرمی، آنکھوں کی چنگ مٹک اور دل کی آگ بندے کو اندر باہر چونچال کر دیتی ہے پھر......'' کمدار کہتے کہتے چپ ہو گیا۔
میں نے کچھ کہنے سے گریز کیا۔ کمدار بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔
میں نے ایک گہری سانس لی اور آسمان کی طرف دیکھا۔ گہرا نیلا آسمان بڑی بے نیازی سے نیچے ہونے والی واردات کو دیکھتا رہتا تھا۔ کمزور اور طاقت ور کا ازلی کھیل۔ نہ آسمان کا جی بھرتا تھا اور نہ ہی نیچے والے اپنے معاملات میں کمی بیشی کرتے تھے۔
کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ اس گاؤں سے باہر، سائیں کی لمبی چوڑی اونچی حویلی کی دنیا سے باہر کی دنیا، زمینوں سے دور کی دنیا کیسی ہو گی؟
یہ بات نہیں تھی کہ میں نے شہر نہیں دیکھا تھا۔ کئی بار شہر گیا تھا۔ لیکن یوں جیسے حویلی سے شہر تک ایک طویل سرنگ بنی ہو۔ شیشے کی لمبی سرنگ جس سے باہر نہیں نکل سکتے بس سائیں کے ساتھ آنا، سائیں کے ساتھ جانا۔ شہر کی حویلی جس کو وہ لوگ بنگلا کہتے تھے۔ اِدھر سے اُدھر۔ بس جیسے چابی والے گڈے اٹھا کے اِدھر سے اُدھر رکھ دیے جائیں اور چابی دے دی جائے اور پھر جب تک فولادی باریک پٹی کس کس کر کے چلتی رہے ہم بھی چلتے پھرتے بولتے رہیں اور جیسے ہی وہ فولادی پٹی اپنا چکر مکمل کرے ہم چپ چاپ اپنی جگہ کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔
گوٹھ والی حویلی کی دیواریں بہت اونچی اور شہر والے بنگلے کی دیواریں اتنی نیچی تھیں کہ اگر اچک کے دیکھو تو باہر کی دنیا دکھائی دے مگر اس کے باوجود دیوار پھلانگی نہیں جا سکتی تھی۔ گاؤں میں پتھر کی دیواریں اور شہر میں خوف کی دیواریں اتنی اونچی تھیں کہ ان کو پھلانگنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔
میں کیا، ہم سب خوف کی ان دیکھی جکڑ بندیوں میں بندھے ہوئے تھے۔
''نوازے! کدھر گم ہو؟'' برکت نائی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔
''کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''خیر تو ہے۔ اتنے غصے میں کیوں ہو؟'' برکتے نائی نے پوچھا۔
''میں کیوں غصہ کرنے لگا؟'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''بولو کیا بات ہے؟''
''میں بڑی دیر سے کھڑا دیکھ رہا ہوں تم بس ٹکٹکی باندھے سامنے دیکھے جا رہے ہو۔ اُدھر کوئی جنی نظر آتی ہے؟'' برکتے نائی نے کہا اور ہنسنے لگا۔
جدھر وہ اشارہ کر رہا تھا اس طرف بڑا سا برگد کا پیڑ تھا۔ بہت گھنا اور بہت بڑا۔ لوگ کہتے تھے اس پر جنات کا بسیرا ہے۔ اکثر کتے بھی اس کی طرف دیکھ کے بھونکا کرتے تھے۔
''مجھے کیا جنی دکھائی دے گی؟'' میں نے ہنس کے کہا۔ ''یہ تو تیرا کام ہے۔ سنا ہے تیرے ابے نے کسی جن کی ڈاڑھی بنائی تھی؟''
''ہاں وہ۔'' برکتے نائی نے جلدی سے کہا۔ ''ابا بتاتے تھے ایک مرتبہ ایک بوڑھا آدمی اپنا خط بنوانے آیا تھا۔ ابا نے اس کا خط بنایا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک دم غائب ہو گیا۔''
''بغیر پیسے دیے؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔
''نہ جی نہ۔'' برکتے نائی نے دونوں ہاتھ اپنے کلّوں کو لگائے اور بولا۔ ''جن بے ایمان نہیں ہوتے۔ وہ تو جی غائب ہو گیا پر وہ جہاں بیٹھا تھا وہاں چاندی کا ایک سکہ پڑا ہوا تھا۔''
''اچھا۔'' میں نے کہا۔ ''پھر تو تیرے ابا کے وارے نیارے ہو گئے ہوں گے۔ جنات لائن لگا کے خط بنوانے آتے ہوں گے اور چاندی کے سکے ہی سکے۔''
''کدھر؟'' برکتے نائی نے تاسف سے سر ہلایا اور بولا۔
''ابا تو بڑے چھوٹے دل کا نکلا۔ بری طرح ڈر گیا۔ ہل ہلا کے ایسا بخار چڑھا کہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔ بڑے دنوں بعد ٹھیک ہوا پر خط بنانا چھوڑ دیا۔ سائیں کے

بھٹے پر کام کرنے لگا اور ایک دن بھٹی میں جل گیا۔'' برکتے نائی نے بتاتے بتاتے میری طرف دیکھا اور چپ ہوگیا۔

میں نے پوچھا۔''میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟''

برکتے نائی نے کہا۔''کیا تجھے کوئی ملی؟''

''کون؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کے پوچھا۔

''چڑیل، بھوتنی، جنی، پچھل پیری کوئی بھی؟'' برکتے نائی پھر ہنسنے لگا۔

میں نے جواب دیا۔''مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''ہو جاتی ہے۔'' برکتے نائی نے سیان پنے کا مظاہرہ کیا۔''آپ ہی آپ ہو جاتی ہے۔''

''اچھا بک بک مت کر۔'' میں نے اسے جھڑکا۔

برکتے نائی ہمیشہ عجیب وغریب باتیں کیا کرتا تھا۔ باتوں سے وہ کبھی بڑا سیانا اور کبھی ایک دم جھلا لگتا تھا۔

''تو اتنا سوہنا، گبرو جوان ہے۔ چوڑی چھاتی، اونچی لمبی ناک، گہرے کالے بال، لمبا قد اور یہ موٹے موٹے کسرتی بازو اور پھر تیری تانبے جیسی چمکتی رنگت۔ مانو جیسے ابھی ابھی قلعی لگی ہو۔ آنچ سے بن کے نکلا ہو۔''

''بکواس بند کر۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''پر تو اتنا غصیل، اتنا ادکھا کیوں ہو رہا ہے؟'' برکتے نائی نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بولا۔''میں تو تیری تعریف کر رہا ہوں۔''

''رہنے دے۔'' میں نے الجھن سے کہا۔

''تو اندر سے لڑ رہا ہے؟'' برکتے نائی ہنسنے لگا۔

''اب یہ کیا نئی بات نکالی تم نے؟ اندر کوئی میدان لگا ہے۔ کشتی ہو رہی ہے کیا؟''

مجھے واقعتاً غصہ آ رہا تھا مگر مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے غصہ کیوں آ رہا ہے۔

برکتے نائی نے میری طرف دیکھا اور بولا۔''میں بتاؤں۔ تجھے غصہ کیوں آ رہا ہے؟''

''بتا۔'' میں نے کہا۔''بڑا سیانا بنتا ہے تو بول مجھے غصہ کیوں آ رہا ہے؟''

''تجھے غصہ آ رہا ہے کہ سائیں نے کتوں کو راتب ڈالنے سے منع کر دیا ہے۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور چپ ہوگیا۔

تب بالکل اچانک......

مجھے معلوم ہو گیا کہ برکتے نائی سچ کہہ رہا ہے۔ صبح جب میں نے لسی پی تھی، جب بیلوں کو چارا ڈالا تھا تب ہوا ہلکی ہلکی چل رہی تھی۔ مجھے اچھی لگ رہی تھی اور میں بڑے مزے میں تھا۔

تب مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے آج کا چمکتا ہوا روشن دن ہو۔ گہرا نیلا آسمان اور کہیں کہیں آسمان کے بیچ سفید سفید سے روئی کے گالے جیسے بادل تیر رہے تھے۔ تب جیسے میں اور آسمان، بادل، ہوا سب بڑے مزے میں تھے۔

مگر جب سات بجے جمالے کمدار نے آکے کہا۔''کتوں کو راتب نہ ڈالنا۔'' تب سے میرا اندر باہر سب الجھ گیا۔

میں برکتے نائی کی شکل دیکھنے لگا۔

برکتے نائی نے پوچھا۔''میں نے صحیح کہا نا؟''

''تجھے پتا ہے؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''ہاں۔'' برکتے نائی نے سر ہلایا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔''پھر بھی تو ہنس رہا ہے۔ وہ تیرا بھی تو بیلی تھا نا۔''

''جب تُو نے بھی اسے تھا، نا سنجھ لیا تو میں کیا کروں؟'' برکتے نائی نے منہ پھیر کے کہا۔''یہ کوئی نئی بات ہے کیا؟''

میں چپ ہی رہا۔

برکتے نائی بھی چپ رہا۔ پھر ذرا دیر کے بعد کہنے لگا۔''برسوں ہو گئے ہیں یہ تماشے دیکھتے ہوئے پر ڈر یہی لگتا ہے کہ......'' وہ پھر چپ ہوگیا۔

''کیا ڈر لگتا ہے؟'' میں نے فوراً پوچھا۔

''یہی کہ یہ سلسلہ کبھی نہ ختم ہونے کا۔ جب سے ہوش سنبھالا تو بس یہی دیکھ رہا ہوں پر کچھ بھی نہیں بدلا۔ جیسے ہر سال محرم میں قبر تازہ کرنے جاتا ہوں ابا کی، اماں کی، دادے کی تو یوں لگتا ہے جیسے وہ آرام میں ہیں، سکون میں ہیں۔ بے خوف مزے سے لیٹے پڑے ہیں اور ہم ادھر زندہ، مُردہ ہیں۔''

''بڑی مشکل باتیں کرتا ہے تُو۔'' میں نے کہا۔

''تجھے کچھ نہیں ہوا؟'' ذرا دیر کی خاموشی کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔

''کیا ہوتا؟''

''تُو تو شہر جاتا ہے۔ ادھر ہی کسی کام شام میں لگ جا۔'' برکتے نائی نے کہا۔

''اچھا۔'' میں نے تعجب سے برکتے نائی کو دیکھا۔

''اور اماں اور چھوٹے کو کس کے سہارے چھوڑ جاؤں؟''

''ہاں۔'' برکتے نائی نے سر ہلایا۔''مو جو بھی چلا گیا

تھا شہر نوکری کرنے پھر اس کی لاش آئی تھی۔ ایکسیڈنٹ میں کچلا گیا تھا وہ۔"

"ہاں سنا تو یہی تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"بڑے سائیں نے کہا تھا کیا ادھر دانے کم پڑ گئے تھے جو شہر دانے چگنے چلا گیا تھا۔ پر ہمارے دانے دور تک پیچھا کرتے ہیں، بندے کو اپنی تھاں لے آتے ہیں۔"

"ہاں۔ ادھر ایک پتا بھی سائیں کی مرضی کے بغیر نہیں ہلتا۔" برکتے نائی نے برگد کی طرف دیکھا جس کا پتا، پتا ساکن تھا۔ پتا نہیں ہوا بند تھی یا سائیں کا خوف تھا۔

"اسے دیکھا؟" برکتے نائی کے لہجے میں بڑی لپک تھی۔ "کیا اس کو پتا ہے؟"

"نہ پوچھ۔" میں نے کہا۔

"کیا گٹ پٹ کر رہے ہو تم دونوں؟" اچانک شریف ڈرائیور نے ہمیں آ کے چونکا دیا۔

برکتے نائی نے کہا۔ "میں تو سائیں کے حکم کا انتظار کر رہا ہوں، خط بنانے کے لیے۔"

"میں جیپ تیار کر رہا ہوں۔" شریف ڈرائیور نے ہم دونوں سے کہا اور نظر گڑا کے کوٹھری کی طرف دیکھا اور چل دیا۔

کتے نائی نے کہا۔ "جا اس کو پانی شانی تو دے دے۔ روٹی ٹکڑ کچھ تو کھا لے۔"

"پھر کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا اور اس کی طرف دیکھا۔

اسی وقت مائی جیناں ایک پوٹلی پکڑے چلی آئی۔ "یہ دے دے اس کو۔"

اس نے مجھے پوٹلی پکڑائی۔

"اس میں گڑ والی میٹھی روٹی ہے۔ ساتھ میں مرچوں والا اچار۔ شوق سے کھاتا ہے وہ۔"

"تم آپ دے دو اسے۔" برکتے نائی نے کہا۔

"نہ۔ میری ہمت نہیں۔" مائی جیناں نے کہا اور وہیں زمین پر بیٹھ گئی اور اپنی میلی چادر میں منہ چھپا کے سسکیاں بھرنے لگی۔

"میں نے پالا ہے اس کو۔" وہ رونے لگی۔

"چھ مہینے کا تھا جب ماں مری تھی اور پانچ سال کا تھا جب باپ کو ہیضہ ہوا تھا۔ تب سے اب تک سینے سے لگا کے جوان کیا۔ کتنا منع کیا تھا پتر نہ پڑ اس کام میں، سوہنیا چھوڑ دے یہ چکر مگر اس کے سر پہ تو زینو کا بھوت سوار تھا۔ نہیں مانا میری بات۔" مائی جیناں سسکتی رہی۔

ہم دونوں چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔

میں نے اٹھ کے پوٹلی اٹھائی اور کمرے کی طرف بڑھا۔ لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی سے جھانک کے دیکھا، وہ زمین پر بچھی چٹائی پر لیٹا دیوار کی طرف منہ کیے ہوئے تھا۔ میں نے اسے آواز دی۔ "نذر...... نذرے......"

وہ دو تین آوازوں کے بعد ہی کسمسایا۔ کروٹ بدلی اور لیٹے لیٹے میری طرف دیکھنے لگا پھر بولا۔ "کیا ہے؟"

میں کوٹھری میں داخل ہو گیا۔

"روٹی کھا لے۔"

"اچھا۔" وہ اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر چوکڑی مار کے بیٹھا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ اونچے کر کے ایک طویل انگڑائی لی۔ اس کا لمبا قد اور لمبے لمبے ہاتھوں نے کوٹھری کی چھت کو جیسے چھو لیا۔

"لے آ یار! بڑی بھوک لگ رہی ہے۔" اس کے انداز میں بڑی بے پروائی تھی۔

"تجھے پتا ہے کہ میں بھاگوں گا نہیں پھر بھی مجھے تالے میں رکھتا ہے۔" نذرے نے میرے ہاتھ میں لٹکے ہوئے تالے کو دیکھ کے قہقہہ لگایا اور کہا۔ "میں کوئی چور ہوں؟"

اس نے کہتے ہوئے کوٹھری کے کونے میں رکھے ہوئے گھڑے میں سے مٹی کے آب خورے میں پانی نکالا، کلی کی اور باقی پانی غٹ غٹ کر کے پی گیا۔

میں نے پوٹلی چٹائی پر رکھ دی۔

"آ تو بھی بیٹھ جا۔" اس نے پوٹلی کھولی اور دیکھتے ہی بولا۔ "اماں جیناں لائی ہے۔"

اس کی آواز میں بچوں جیسی چہکار تھی۔

میں نے تعجب سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ "تجھے ڈر نہیں لگتا؟"

"ڈر؟" نذرے نے تعجب سے مجھے دیکھا۔ "بھلا کیسا ڈر؟"

"کیا پتا آج کا دن ہی آخری ہو؟" میں نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"جب پیار کیا تو ڈرنا کیا؟" اس نے اچار کی لمبی سرخ مرچ اٹھائی اور منہ میں ڈال کے چبانے لگا پھر اس نے روٹی کا بڑا سا لقمہ توڑا اور آہستگی سے منہ چلانے لگا۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

"کیا بات ہے۔ تو مجھ سے ناراض ہے۔" نذرے نے پوچھا۔

"تو کیوں اتنا بے پروا ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''یار! تُو نے کبھی پیار ہی نہیں کیا۔'' نذرے نے اطمینان سے کہا۔ ''تو نے کبھی نشہ نہیں کیا۔ جیسے بندہ پی کے ٹن ہوجاتا ہے، بے سدھ ہوجاتا ہے، ہلکا ہوجاتا ہے، بدن چھوڑ دیتا ہے۔ پیار کا نشہ اس سے بھی گہرا ہوتا ہے۔ ایسا ڈوبتا ہے بندہ کہ پھر خوف کے سمندر کی بڑی سے بڑی لہر بھی اسے گھبرانے نہیں دیتی۔''

میں نے تاسف سے نذرے کو دیکھا۔

اس کے چہرے پر بڑی چمک تھی۔ وہ مجھے دیکھنے لگا، اس کی آنکھیں جیسے میرے چہرے پر گڑ گئیں۔ مجھے بے چینی ہونے لگی۔

نذرے نے پوچھا۔ ''تو کچھ بدلا بدلا لگ رہا ہے۔ بات کیا ہے؟''

''پتا نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''بھلا بات کیا ہونی ہے۔ سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا ہونا ہوتا ہے۔''

''اچھا۔'' نذرے نے کہا اور چپ ہوگیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔ ''وہ کیسی ہے؟''

''تجھے اس کی اب بھی فکر ہے؟'' میں نے چڑ کے کہا۔

نذرے نے حیرت سے پوچھا۔ ''اب تجھے کیا ہوگیا؟''

''کیا پتا آج آخری دن ہو تیرا اور تجھے اس کی پڑی ہے۔'' میں نے غصے میں کہہ دیا۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا، اس کے ہاتھ میں نوالہ تھا جو میری بات سن کے بیچ میں ہی معلق رہ گیا تھا۔ پھر اس نے لقمہ منہ میں رکھا۔ چبایا اور دھیرے سے بولا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے؟''

میں چپ رہا۔

وہ خاموشی سے روٹی کھانے لگا پھر اس نے اچار ختم کیا۔ روٹی ختم کی۔ گھڑے سے دو کٹورے پانی نکال کے پیا اور لمبی سی ڈکار لے کر بولا۔

''اچھا۔ تُو ایک بات کا گواہ بن جا۔'' اس نے بڑے سکون سے کہا۔

''گواہ۔ کیسا گواہ...... کس بات کا گواہ......؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''تیرے سامنے کلمہ پڑھ لیتا ہوں۔ پتا نہیں پھر موقع ملے یا نہ ملے، درد بھی تو بہت ہوتا ہے۔ بعض اوقات حواس ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ زخم کہاں ہے، بازو کہاں ہے، ٹانگ کدھر ہے۔ پیٹ، پیٹھ سب برابر ہو جاتے ہیں۔''

''بس کر۔'' میں چلّایا۔

''ہاں۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''میں نے دیکھا ہے۔ کئی بار دیکھا ہے۔ تُو نے نہیں دیکھا ہوگا۔ پر میں نے تو کئی بار دیکھا ہے۔''

میں چپ رہا۔

''نذرے......'' برکتے تائی نے کھڑکی کی سلاخیں پکڑے پکڑے اسے پکارا۔

''اچھا تو بھی ہے۔'' نذرے نے ہنس کے کہا۔

''آ...... اندر آجا۔''

''تُو نہیں مانا نا۔ دیکھ لیا نتیجہ۔'' وہ کھڑکی سے لگے لگے بولا۔

''کیا کرتا یار! بس دل کا زور تھا۔ عقل کی مت ماری گئی تھی۔ پر کوئی اس کو ہاتھ لگائے یہ مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ بھلا اپنی روٹی کوئی جھوٹی ہونے دیتا ہے۔''

''چپ ہوجاتا۔'' برکتے تائی نے دھیرے سے کہا۔

''بس نہیں ہوا۔'' نذرے نے بے پروائی سے کہا۔

''جب کبھی تجھے دل کی لگے گی تو، تو بھی یہی کرے گا جو میں نے کیا۔'' نذرے بلند آواز سے ہنسنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''تُو بھاگ جاتا۔''

''اپنی جان بچا کے تینوں جانوں کو داؤ پر لگا دیتا؟'' نذرے نے چونک کے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''اتنا مطلبی، اتنا بزدل تو نہیں ہوں میں۔''

میں چپ ہوگیا۔

واقعی اس کے بھاگ جانے کا مطلب یہی ہوتا کہ تینوں بہنوں کو اس کے کیے کی سزا بھگتنی پڑتی۔ اس لیے وہ بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔

''اگر ایک بار چائے مل جائے تو مزہ آجائے۔'' نذرے نے کہا اور منہ پھیر کے دیوار کی طرف دیکھنے لگا۔

میں اٹھ کے باہر آگیا۔ میں نے اس کو چائے لا کر دی اور وہ چائے پینے لگا۔

سامنے والی کوٹھری میں بندھے کتے بے چین ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اشرف ڈرائیور نے ان کی زنجیریں کھولیں اور انہیں ڈالے میں ڈال کے باہر نکل گیا۔ سدھائے ہوئے شکاری کتے لمبی لمبی زبانیں نکالے ڈالے میں بھر کے چلے گئے۔

دن چڑھے دوپہر کے قریب جیپ میں بڑے سائیں باہر نکلے اور زمینوں کی طرف چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد مختار نے آکے کوٹھری کا دروازہ کھولا اور نذرے کا بازو پکڑے پکڑے باہر لے گیا۔

نذرے نے جاتے جاتے مجھے دیکھا۔ آنکھ میچ کے سیٹی ماری اور ہنستا ہوا مختار کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

مغرب کے قریب گاؤں کے قبرستان میں ایک نئی قبر کا اضافہ ہوگیا۔ سنتے ہیں کہ نذر کو کچے کے علاقے میں پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان مقابلے میں گولی لگ گئی اور وہ موقع پر ہی مر گیا۔

کسی نے یہ نہیں دیکھا، کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ اتفاقی گولی نے نذرے کو بھنبھوڑا کیسے، نوچا کیسے، پیٹھ پر، پیٹ پر خون آشام دانتوں کے نشان کیسے، بھلا گولیاں نہ ہوئیں کتے ہوگئے جو آدمی کو پھاڑ کھائیں۔

شام کو حسب معمول علاقے کا تھانیدار گشت پر آیا ہوا تھا۔ اس کے لیے دیسی مرغ اور دنبے کی سجی بنی۔ رپورٹ لکھی گئی اور وہ رات گئے رخصت ہوگیا۔ اس کی جیپ کی پچھلی سیٹ پر گٹھڑی بنی زینو پڑی ہوئی تھی۔

اس کی سوگ کی رات زبردستی کی سہاگ رات بن رہی تھی۔ ہفتے بھر میں وہ واپس آجائے گی مگر نذرا واپس نہیں آئے گا۔

خوف کی اَن دیکھی دیوار پر نذرے کی لاش کا رڈا چڑھا کر دیوار اور اونچی کر دی گئی تھی۔

☆☆☆

ہمارا گوٹھ سائیں کے گوٹھ کے نام سے مشہور تھا۔ بڑے سائیں اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ سیکڑوں ایکڑ زرعی زمین تھی۔ مویشی، فصلیں کوئی ٹھکانا نہیں دولت کا اور پھر ایک گمنا مل میں سنا تھا کہ حصے دار بھی تھے۔ مزاج میں شعلہ اور شبنم تھے۔ کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ سائیں کب حالتِ جمال میں ہیں اور کب حالتِ جلال میں۔

ان کے تینوں بیٹے بھی انہی کا پرتو تھے۔ ہزاروں کی آبادی تھی اور سب ہی ان کی رعایا۔ آس پاس کوئی ایسا نہیں تھا جو ان کا مقروض نہ ہو۔ ہر شخص ان کا نسل در نسل مقروض تھا۔ ہر گھر ان کی ملکیت۔ کوئی شادی، کوئی خرید و فروخت ان کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ گاؤں میں غربت اور بچے بہت تھے۔

ایک مرتبہ محکمۂ آبادی والے آئے تھے۔ بڑے سائیں نے ان کے لیے کئی کمروں کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ لوگ کچھ دن رہ کر واپس چلے گئے کیونکہ گاؤں کے مولوی صاحب نے بتا دیا تھا کہ اولاد کو روکنا بہت بڑا ناقابلِ معافی جرم ہے۔ اس لیے کوئی بھی ان کے قریب نہیں پھٹکا۔ ان کے جانے کے بعد وہ جگہ سائیں کے گھوڑوں کا اصطبل بن گئی۔ جب بہبودِ آبادی والی ڈاکٹرنی نے کہا۔

''سائیں! یہاں عورتوں کی حالت بہت خراب ہے اور عورتیں خون کی شدید کمی کا شکار ہیں اور صحت کی اس مخدوش حالت میں بچہ پیدا کرنا بہت بڑا خطرہ ہے۔ گاؤں کی عورتیں زچگی میں اسی لیے مر جاتی ہیں کیونکہ ان کی صحت کا خیال نہیں رکھا جاتا۔''

بڑے سائیں نے بڑے اطمینان سے ڈاکٹرنی کی بات سنی اور کہا۔ ''اب عورتیں بچے نہیں پیدا کریں گی تو کیا گندم پیدا کریں گی؟''

ہم لوگ صدیوں سے اس ماحول میں رہتے بستے آئے تھے اور ہم پر دنیا میں آنے والی کسی بھی تبدیلی کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

نذر میرا بہت اچھا دوست تھا اور زینو اس کی پسند تھی مگر ایک دن وہ بڑے سائیں کے سب سے چھوٹے بیٹے راشد سائیں کی نظر میں آگئی اور پھر جس پر سائیں کی نظر ہو اس پر کوئی نظر نہیں رکھ سکتا۔ مگر نذر بے چارہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا اور زینو اس کی بچپن کی دوست تھی۔ یہ دوستی چاہت میں کب بدلی پتا ہی نہیں چلا۔ اور ویسے بھی دل کی وارداتوں کا پتا تو اکثر واردات ہو جانے کے بعد ہی چلتا ہے۔ وہ سولہ برس کی تھی، دبلی پتلی نازک سی، گندمی رنگت اور موٹی آنکھیں۔ پھر ایک دن چھوٹے سائیں نے اسے طلب کر لیا۔

نذر آڑے آگیا۔ زینو نے بہانہ کر دیا مگر فاختہ کب تک شکرے سے بچ سکتی تھی۔ چھوٹے سائیں میں انتظار کی تاب نہیں تھی اور پھر ایک دن انہوں نے حویلی کی پچھلی طرف زینو اور نذر کو سرگوشیاں کرتے دیکھ لیا اور پھر بات کھل گئی۔

بات کھل جائے تو بہت دور تک جاتی ہے۔ حویلی سے نکل کر زمینوں تک اور زمینوں سے شکارگاہ تک چلی جاتی ہے۔ یہاں حکم عدولی کا مطلب موت ہوتا ہے۔ اور جب موت مقصود ہو تو پھر اس کو عبرت ناک بنانا سائیں کا دل پسند مشغلہ ہوتا تھا۔

بڑے سائیں اور تینوں چھوٹے سائیں سب ہی کو کتوں سے شکار کرنا پسند تھا اور اکثر شکار معتوب ہوتے تھے۔

چوری سے بڑا جرم پیار تھا اور اس کی سزا موت تھی۔

اب ایسا بھی نہیں تھا کہ گوٹھ میں پیار محبت کی کمی تھی۔ سب ہی پیار سے مل جل کے رہتے تھے مگر پیار کا پیمانہ سائیں کی منشا کے مطابق ہوتا تھا۔ قطرہ قطرہ، جرعہ جرعہ یا سیر ہو، یہ سب ان کی خوشنودی پر منحصر تھا۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ سائیں کے کمدار کو لال دین کمہار کی لڑکی پسند آگئی تھی مگر وہ سمجھدار تھا۔ اس نے سائیں سے عرض کی، سائیں نے لڑکی ملاحظہ کر کے اس کو شادی کی اجازت دے دی۔

ان کی محبت بھی قائم رہی، گھر بس گیا۔ سال کے دانے مل گئے۔ بس اس کا پہلا لڑکا سائیں سے ملتا جلتا تھا اور یہ بات تو عام ہی تھی کہ جب سائیں کا نمک کھاتے ہیں تو پھر اس کا اثر کہیں نہ کہیں تو ہوگا۔

مگر نذر، کمدار جتنا عقلمند نہیں تھا۔ وہ سیدھا سادہ محبت رسیدہ تھا اور بقول سائیں نافرمانی کے گناہ میں پیوندِ خاک ہوا اور یقیناً جہنم رسید ہو گیا ہوگا۔

کچھ دنوں میں سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا۔ کچھ ہونے کے بعد اور کچھ اور ہونے کے درمیان کے وقفے میں بس ایسا ہی ہوتا تھا۔ سکون سا، سکوت سا۔ بس جیناں مائی کی سسکیاں کبھی کبھی سکوت کے گہرے سمندر میں ہلکورے ڈال دیتی تھیں۔

☆☆☆

برکتے نائی نے کہا۔ ”سنا ہے شہر سے مہمان آرہے ہیں؟“

”یہ کوئی نیا کام ہے کیا؟“ میں نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور دوبارہ بکھرا ہوا چارا سمیٹنے لگا۔

”لگتا ہے کہ کوئی خاص مہمان ہے۔“ برکتے نائی نے کہا۔ ”بڑے سائیں چھوٹے سائیں سے کہہ رہے تھے کہ تم دیکھ لو مگر میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”لے۔ تو بھی پاگل ہے۔“ برکتے نائی نے کہا۔ ”اب تو چھوٹے سائیں کی باری ہے، باقی کون ہے۔ بڑی باجی کا تو پچھلے سال ہی بیاہ ہو گیا تھا اور وہ باہر کے ملک چلی گئی تھیں۔“

”اچھا تو ہمیں کیا؟“ میں نے کندھے اچکائے۔

”عجیب ہی بندہ ہے تو...... کسی کام میں تیری کوئی دلچسپی ہی نہیں۔“

”اس سے میرا کیا کام؟“ میں نے جواب دیا۔ ”شادی چھوٹے سائیں کی ہوگی۔ ہم تو ان کی خوشی میں خوش، ان کے غم میں غمگین اور بھلا اپنا کام کیا ہے؟“

”کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ تو بڑے فائدے میں ہے۔“ برکتے نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ کیسے بھلا؟“

”تو سوچتا جو نہیں۔ بس کوک بھرے گڈے کی طرح رہتا ہے۔ چابی بھری تو چلنے لگا، چابی ختم تو چپ چاپ۔ کھیت کے ڈراوے کی طرح۔“

”پتا نہیں۔“ میں نے کندھے اچکائے۔ ”میں تو بس اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔“

”اچھا تو کیا تجھے نذر یاد نہیں آتا؟“ برکتے نے پوچھا۔ ”تیرا تو بڑا بیلی تھا۔ دو چار سال کا ہی فرق ہوگا تجھ میں اور اس میں۔ بڑا سخت دل ہے تو۔“ برکتے نائی کو غصہ آگیا۔

”یار ...... کمہار کے برتن ٹوٹ جائیں تو کیا وہ کام چھوڑ دیتا ہے؟“

”یہ کیا بات ہوئی؟“

میں نے جواب دیا۔ ”لال دین کمہار کہتا ہے کہ ہم سب مٹی کے ہیں۔ نہ کبھی مٹی ختم ہوتی ہے نہ کبھی برتن ختم ہوتے ہیں۔ ٹوٹتے جائیں گے نئے بنتے جائیں گے۔ ہم بھی تو مٹی کے برتن ہیں۔ بس لال دین کمہار آوے پر بناتا ہے اور ہم ادھر سائیں کے اشارے پہ بنتے بگڑتے ہیں۔ ہیں تو سب ہی مٹی۔“

”بعض دفعہ تو بڑی سیانی باتیں کرتا ہے۔“ برکتے ہنسنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ”آج ادھر صبح ہی صبح۔ خیر تو ہے نا؟“

”رات ہی پیغام آگیا تھا کہ صبح ہی پہنچوں۔ مہمان آرہے ہیں نا شہر سے۔“ برکتے نے جواب دیا۔ ساتھ ہی سوال کیا۔ ”تمہیں نہیں پتا؟“

”نہیں۔“ میں نے کندھے اچکائے۔ ”میں کون سا زمیندار لگا ہوا ہوں کہ ہر بات مجھے بتائی جائے۔ میں کس میں تین میں نہ تیرہ میں۔“

”تیری باتیں بڑی اچھی ہوتی ہیں۔ آخر کو پڑھا لکھا ہے نا۔“ برکتے نے تعریف کی۔

میں آٹھویں پاس تھا۔ نویں اس لیے آدھی رہ گئی تھی کہ اسکول بند ہو گیا تھا۔ بھلا ادھر تعلیم کا کیا کام۔ ہم نے تو وہی سوچنا، کرنا ہوتا ہے جو بڑے سائیں چاہیں۔

☆☆☆

میں اپنے کاموں میں مصروف تھا کہ قمرو باورچی نے آکر کہا۔ ”ایک اچھا سا بکرا ذبح کر کے صاف کر کے جلدی سے باورچی خانے میں پہنچا دو اور ساتھ میں چھ دیسی مرغیاں بھی۔“

”کوئی بڑی دعوت ہے کیا؟“ میں نے پوچھا۔

قمرو باورچی نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر دھیرے سے بولا۔ ”سنا ہے چھوٹے سائیں کی منگ آرہی ہے۔ اس کے ماں باپ بھی ساتھ ہیں۔ شاید دن تاریخ پکی کرنے آرہے ہیں۔“

”اچھا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”لڑکی آپ آرہی ہے اپنی شادی کی تاریخ پکی کرنے۔“

”تو کیا ہوا؟“ قمرو باورچی نے کہا۔ ”زمانہ بڑا بدل گیا ہے۔“

”ہاں جی۔“ میں نے کہا اور بکری کو دودھ دھو کے ہنکا دیا۔ بڑی اماں صرف بکری کے دودھ کا ایک گلاس صبح شام پیتی تھیں جس میں بادام پیس کے ملائے جاتے تھے۔ گائے یا بھینس کا دودھ انہیں ہضم نہیں ہوتا تھا۔

میں نے دودھ قمرو باورچی کو پکڑایا اور بکریوں کے باڑے کی طرف چلنے لگا۔ میں نے ایک مضبوط بکرے کا کان پکڑا اور اس کو کھینچ کر اللہ اکبر کہہ کر اس کی گردن پر چھری پھیر دی۔ چند منٹوں پہلے بکریوں پر والہ وشیفتہ بکرا ذرا دیر میں اپنی ہی کھال سے جدا بکھرا پڑا ہوا تھا۔

گھنٹے بھر میں، میں نے گوشت کاٹ کے قمرو باورچی کو پہنچایا پھر چھ مرغیاں ذبح کر کے انہیں بھی قمرو باورچی کے حوالے کر دیا۔

قمرو باورچی نے مجھے ہاتھ بٹانے کو کہا مگر مجھے کھیت پر جا کے ٹیوب ویل کی موٹر کا پٹا بدلنا تھا۔ اس لیے میں صاف انکار کر کے ٹیوب ویل کی طرف چل دیا۔ ٹیوب ویل پر چھوٹے چھوٹے دو چار کام اور بھی نکل آئے۔ وہ سب نمٹاتے نمٹاتے شام ہو گئی۔ مجھے زور کی بھوک لگنے لگی۔

میں واپس حویلی آگیا۔

حویلی کے پچھلے حصے میں ہمارے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ گائے بھینس، بکریوں کے باڑے تھے۔ ایک طرف مرغیوں کے دڑبے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ لائن سے آٹھ دس کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ کوٹھریاں دہری تھیں۔ ہر کوٹھری کے اندر ایک چھوٹی کوٹھری تھی جس کی مضبوط دیواریں بہت موٹی تھیں۔ ان میں کوئی روشن دان یا کھڑکی نہیں تھی۔ یہ کوٹھریاں سائیں کے معتوب افراد کی اذیت گاہیں تھیں۔ جہاں پر نافرمان، فرمانبردار بنائے جاتے تھے۔ عموماً ان کوٹھریوں میں دو چار لوگ ضرور موجود ہوتے تھے۔ قصور معمولی بھی ہوتا تب بھی ان کو خاطر تواضع کے لیے مہمان بنا لیا جاتا تھا اور پھر دو چار مہینوں کے بعد جب بڑے سائیں کی طبیعت چاہے تو آزاد کر دیا جاتا تھا۔

اس سارے وسیع وعریض رقبے پر بڑے سائیں کی حکمرانی تھی۔ وہ اسمبلی کے ممبر تو تھے ہی، اس مرتبہ سائیں کے بڑے بیٹے بڑی اسمبلی کے ممبر بھی بن گئے تھے۔ اس سے ان کے رعب اور دبدبے میں اضافہ ہو گیا تھا۔

میں نے آکے ڈونکی پمپ سے غسل کیا۔ بنیان اور دھوتی پہن کے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت قمرو باورچی کا لڑکا نصرو آیا اور پوچھنے لگا۔ ”ابا پوچھ رہے ہیں کھانا کھاؤ گے؟“

”ہاں لے آ۔ بھوک لگ رہی ہے بڑے زور کی۔“ میں نے جواب دیا۔

ذرا دیر بعد ہی نصرو چاول، روٹی اور سالن لے آیا۔ سالن میں مرغی اور بکرے دونوں کی بوٹیاں پڑی ہوئی تھیں۔ بڑے سائیں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی تھی کہ ہم کیا کھاتے پیتے ہیں۔ حویلی میں رہنے والوں کو کھانے پینے کی کوئی روک ٹوک نہیں تھی مگر باہر کے لوگوں کے لیے حویلی میں بغیر اجازت قدم رکھنا سنگین جرم تھا۔

ذرا دیر بعد قمرو بھی چائے کے دو پیالے لے آیا اور میرے پاس پڑی دوسری منجھی پر بیٹھ گیا۔

”بڑی دیر لگا دی تم نے؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”بس کام پہ کام نکل آیا۔ مہمان آ گئے کیا؟“

”ہاں جی۔“ قمرو باورچی نے کہا۔ ”وہ تو دو بجے ہی آ گئے تھے۔ تین لڑکیاں ہیں، تین مرد ہیں دو عورتیں ہیں۔ دو بڑی بڑی گاڑیوں میں آئے ہیں۔ لڑکیاں تو جیسے پریاں ہیں۔“ قمرو باورچی نے تفصیل بتاتے ہوئے لڑکیوں کی تعریف کی۔

”کیا بکواس کر رہا ہے۔“ میں نے اسے ٹوکا۔ ”کسی نے سن لیا تو شامت آ جائے گی۔ اتنے جوتے پڑیں گے کہ گن بھی نہ پائے گا۔“

”بھلا ادھر کون سنے گا۔ گائے بھینس یا بکریاں مرغیاں۔“ وہ ہنسنے لگا پھر بولا۔ ”اور میں نے بھی تو تعریف ہی کی ہے۔ برائی تو نہیں۔“

”پھر بھی احتیاط تو کرنی چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”تو اتنا بڑا گبرو ہو گیا پھر بھی تیرا دل رہا بچے کا بچہ ہی۔“ قمرو باورچی نے کہا۔ ”ذرا اس بدن کے اندر دل کو بھی جگا۔ ورنہ بھری جوانی کس کام کی۔ چندا کہتی ہے تو تو بالکل مٹی کا مادھو ہے۔“

”پاگل ہے وہ۔ بلاوجہ چپکنے کے بہانے ڈھونڈتی ہے۔ مجھے ذرا بھی نہیں پسند اس کی حرکتیں۔“

”اتنی سوہنی تو ہے۔“ قمرو باورچی نے آنکھیں مٹکائیں۔ ”کیسا بھرا بھرا جسم ہے اور موٹی موٹی ہرنی جیسی آنکھیں، کاجل ڈال کے جب دیکھتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس میں ڈوب جاؤں۔“

''تو ڈوب مرو۔ روکا کس نے ہے۔'' میں نے فوراً کہا۔

''وہی لائن نہیں دیتی۔ وہ تو تجھ پر مرتی ہے اور تو ٹھہرا ٹھنڈا ٹھار۔'' قمرو باورچی نے اٹھتے ہوئے کہا اور میرے گال پر ایک زوردار چٹکی لی۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' میں نے اپنا گال سہلاتے ہوئے غصے سے کہا۔

''اگر میں چندا ہوتا تو زبردستی تیرے اندر گھس جاتا۔'' قمرو باورچی ہنسنے لگا اور برتن سمیٹ کے چلا گیا۔

ذرا دیر بعد وہ حقہ لے آیا اور میرے سامنے بیٹھ کے گڑگڑانے لگا۔

''لے دو چار کش لگا لے۔'' اس نے حقے کی نے میری طرف کی۔

''دل نہیں چاہ رہا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھے نیند آ رہی ہے۔'' میں نے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کرلیں۔

جب میری آنکھ کھلی تو چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ صرف باورچی خانے سے ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ میں نے اٹھ کے ایک زوردار انگڑائی لی۔ ہینڈ پمپ چلا کے پیٹ بھر کے پانی پیا اور اپنی چارپائی پر آ بیٹھا۔

اچانک مجھے بے چینی سی محسوس ہوئی۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا مگر کوئی دکھائی نہیں دیا۔ میں سر جھٹک کے دوبارہ لیٹ گیا اور سر کے نیچے دونوں بازو موڑ کے رکھ لیے اور چت لیٹا آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ صاف اور شفاف آسمان پر دور تک کچھ مدھم، کچھ روشن تارے پھیلے ہوئے تھے۔ مجھے پھر بے چینی سی ہوئی، مجھے لگا کہ جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہو۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کوئی بھی نہیں تھا۔

ذرا دیر بعد قمرو باورچی خانے کی طرف سے آتا ہوا دکھائی دیا۔

''تم تو ایسے گھوڑے بیچ کے سوئے کہ دیکھو رات کے دس بج گئے ہیں۔''

''اچھا۔'' میں نے کہا۔ ''پتا ہی نہیں چلا وقت کا۔''

''بھری جوانی میں یوں ہی نیند آتی ہے۔ مستی بھری۔ بےفکری والی۔ سو جاؤ تو چاہے سرہانے ڈھول بھی بجیں تو آنکھ نہ کھلے۔''

''میں اتنی گہری نیند بھی نہیں سوتا۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہاں جی تو، تو بڑے گنوں والا ہے۔ بیکار تو ہم ہیں۔'' قمرو نے غصے سے کہا۔

''کچھ کھانے کو ملے گا یا صرف باتوں سے ہی کام چلائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''تیری روٹی رکھی ہے، جا کے کھا لے۔ میں ذرا کمر سیدھی کرلوں۔'' قمرو نے کہا اور فوراً ہی لیٹ گیا۔

میں نے جواب دیا۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔''

''جب کھانا کھا لینا تو دروازہ اچھی طرح سے بند کر دینا۔ کوئی بلی، شلی اندر نہ چلی جائے۔'' قمرو کے لہجے میں نیند بھری ہوئی تھی۔

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے باورچی خانے کا رخ کیا۔ باورچی خانے کا ایک دروازہ پچھلے صحن میں کھلتا تھا اور ایک دروازہ اندر حویلی میں کھلتا تھا۔ اکثر رات میں، میں کھانا وغیرہ خود ہی لے لیتا تھا۔

میں نے سالن کی پتیلی میں سے سالن نکالا اور چھوٹے برتن میں گرم کرنے لگا۔ میں نے دوسرے چولہے پر چائے کے لیے دودھ رکھا اور گرم سالن اتار کے نیچے پیڑھی پر بیٹھ کے کھانا کھانے لگا۔

ادھر گیس کے چولہے تھے اور سیلنڈر کے ذریعے جلائے جاتے تھے۔ میں نے پیٹ بھر کے روٹی کھائی اور دودھ پتی کھولا کے چائے نکالنے لگا۔ میں نے دو پیالے چائے بنائی تھی، ایک اپنے لیے اور ایک قمرو کے لیے۔

میں پانی پی رہا تھا کہ اچانک اندر والے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے آہٹ پر پلٹ کے دیکھا۔ وہاں ایک لڑکی کھڑی تھی اور مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''آ......آپ......'' میں گڑبڑا گیا۔ مجھے اس وقت یہ توقع نہیں تھی کہ کوئی اس وقت باورچی خانے میں آ جائے گا کیونکہ حویلی میں کوئی باورچی خانے کا رخ شاذونادر ہی کرتا تھا۔

وہ بغیر جواب دیے میری طرف دیکھتی رہی۔

میں نے نگاہیں جھکا لیں اور خاموش کھڑا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں جاؤں یا یہیں کھڑا رہوں۔

چند لمحے گزر گئے۔ میں نے دھیرے سے سر اٹھا کے دروازے کی طرف دیکھا تو وہ وہیں کھڑی تھی اور میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''جی کہیے۔'' میں نے بمشکل کہا۔

''کیا کہوں؟'' مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

نرم سی میٹھی سی۔ میں نے ایسی آواز پہلے نہیں سنی تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ گول تھا۔ چاند کی طرح اور رنگت جیسے روپہلی چاندنی۔ چھوٹی سی ستواں ناک جس میں نتھلی پڑی تھی اور اس میں ایک لال رنگ کا موتی۔

اس کی بھویں تیکھی، پلکیں دراز اور آنکھیں بے حد سفید اور سیاہ تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کا وجود ایک لمحے میں تصویر بن کے میری آنکھوں میں اتر گیا ہو۔

میں نے سر جھٹکا۔

اس نے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟''

''میں......'' میں نے گڑبڑا کے کہا۔ ''نوازا......''

''نوازا......'' اس نے دھیرے سے، شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ ''کس نے نوازا؟''

''نواز......مم......میرا مطلب ہے کہ نواز۔ سب نوازا کہتے ہیں یا نوازے......'' میں نے جلدی سے کہا۔

''اور آپ؟'' بے ساختہ میں نے پوچھ لیا۔

''ہمیں چاندنی کہتے ہیں۔'' وہ دھیرے سے ہنسی۔

میں نے اس کی ہنسی سن کے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ واقعی اس چاند چہرے اور روپہلی چاندنی جیسی رنگت والی پر چاندنی نام ہی سجتا تھا۔

''آپ کو کچھ چاہیے تھا؟''

''میں ادھر آئی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''میرا جی چائے پینے کو چاہ رہا تھا۔ سب تھکے ہوئے سو رہے تھے میں نے سوچا کہ کسی کو کہنے کے بجائے خود ہی باورچی خانہ ڈھونڈ کے چائے بنا لوں۔''

''آپ چائے پئیں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''کیوں......کیا اس وقت چائے پینا منع ہے؟'' اس نے فوراً کہا۔ اس کی آواز میں شوخی اور شگفتگی کا عجیب سا امتزاج تھا۔

''چائے ابھی بنائی ہے میں نے۔'' میں نے بتایا اور پوچھا۔ ''اگر آپ کہیں تو......''

''وہ تو آپ نے اپنے لیے بنائی ہوگی۔'' اس نے تیزی سے میری بات کاٹی۔

''نہیں دو پیالے بنائے ہیں۔'' میں نے بتایا۔

''اچھا۔'' اس نے پوچھا۔ ''آپ کو کیسے پتا کہ میں چائے پینے آ رہی ہوں؟'' اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

مجھے بے چینی سی ہونے لگی۔ پتا نہیں اس کے انداز میں، اس کے دیکھنے میں کیا تھا کہ مجھے الجھن ہونے لگی۔

بڑی عجیب سی نگاہیں تھیں اس کی۔

''پتا نہیں آپ کو اچھی لگے یا نہیں۔ ہم تو ادھر دودھ پتی پیتے ہیں۔ پانی نہیں ڈالتے چائے میں۔''

''چلیں پلائیں تو سہی۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے چائے کا ایک پیالہ اس کی طرف بڑھایا پھر تیزی سے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے اپنا بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے کیا۔

''میں دوسرے کپ میں دیتا ہوں۔ یہ پیالے تو ہم لوگوں کے لیے ہیں۔ آپ لوگوں کے پیالے دوسرے ہوتے ہیں۔'' میں نے وضاحت کی۔

''ارے کچھ نہیں ہوتا۔'' اس نے کہا اور آگے بڑھ کے چائے کا پیالہ اٹھا لیا۔ اس نے چائے کا گھونٹ بھرا اور بولی۔ ''بہت اچھی بنی ہے۔''

''اچھا ہوا کہ آپ کو اچھی لگی۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ بولی۔ ''اتنی اچھی چائے وہاں نہیں ملتی۔''

''آپ شہری لوگ دم والی چائے پیتے ہیں۔ چائے کا پانی الگ، دودھ الگ، چینی الگ۔ ہم تو سب کچھ ملا کر اچھی طرح پکا لیتے ہیں اور اوپر سے دو چٹکی نمک......''

''اچھا، جب ہی ذائقہ کچھ مختلف سا ہے !'' اس نے چائے کا گھونٹ بھر کے کہا۔

''آپ......'' اس نے آپ کہہ کر بات کو اپنے ہونٹوں میں دبا لیا اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''جی ادھر ہی رہتا ہوں۔ بڑے سائیں کے پاس۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا......'' اس نے ایک بار میری طرف پھر غور سے دیکھا اور خالی پیالہ چولہے کی سلیب پر رکھ دیا۔ کپ رکھتے ہوئے وہ میرے بہت قریب آ گئی۔

''چائے بہت اچھی تھی۔ دوبارہ کب پلائیں گے؟'' اس نے میری طرف دیکھا۔

اس کا چہرہ میری تھوڑی تک آ رہا تھا۔

اس کا سر میرے چہرے سے بہت قریب تھا۔ اس کے بالوں میں سے عجیب سی مہک اٹھ رہی تھی۔ وہ ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوئی اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دروازے میں ٹھہر کے مجھے دیکھا اور چند لمحے کھڑی دیکھتی رہی۔

وہ دروازوں کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ دروازے کی چوکھٹ کے درمیان میں۔ اس کے کتھئی فریم میں۔ ایک تصویر کی طرح۔ اس کے پیچھے سے بلب کی ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ جس میں اس کے بال چمک رہے تھے۔

وہ چند لمحے بنا پلک جھپکائے کھڑی مجھے دیکھتی رہی پھر پلٹ کے چلی گئی۔

میں چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔ دروازے کا فریم خالی

ہو گیا تھا، وہ تصویر مجسم چلی جو گئی تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ اس کے بالوں کی خوشبو ابھی تک میرے نتھنوں میں لہک رہی تھی۔

میں نے باہر نکل کے باورچی خانے کا دروازہ اچھی طرح بند کیا اور آ کے اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں نے قمرو باورچی کی طرف دیکھا، وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے ہلکے ہلکے خراٹے گونج رہے تھے۔ میں ذرا دیر پاؤں لٹکائے بیٹھا رہا پھر لیٹ گیا۔

میں نے اپنے بازو موڑ کے سر کے نیچے رکھ لیے اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے پھر بے چینی سی ہوئی۔ مجھے لگا کہ جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔

میں نے گردن گھمائی اور باورچی خانے کی طرف دیکھا۔ میری نظریں سرکتی ہوئی اوپر کی طرف بڑھنے لگیں، اوپر دوسری منزل کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اس میں سے کوئی جھانک رہا تھا۔ جونہی میری نظر اس کھڑکی پر پڑی، پردہ تیزی سے ہلا اور جیسے کوئی پیچھے ہو گیا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور کھڑکی پر سے نظریں ہٹا لیں۔

آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ سارے صحن میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں چاند کو دیکھنے لگا، وہ چمک رہا تھا۔ ہلکے ہلکے بادل جب کبھی اس کے سامنے سے گزرتے تو لمحے بھر کو اس کی روشنی ماند پڑ جاتی۔ ملگجی سی ہو جاتی اور پھر روشنی ہو جاتی۔ نقرئی چاندنی ہر سو پھیل جاتی۔

میں چاند کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً مجھے یوں لگا کہ جیسے چاند میرے بے حد قریب ہو گیا ہو۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹ مسکرانے لگے ہوں۔ تیکھی بھویں اور خم دار پلکیں جھپک رہی ہوں۔ ناک میں پڑی تھلی کا سرخ موتی چمک رہا ہو اور چاند آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے پاس آ گیا ہو۔ اتنے قریب کہ میں اس کو چھو سکتا ہوں۔ اس کی ٹھنڈک، نرماہٹ کو محسوس کر سکتا ہوں۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور دھیرے سے کہا۔
"چاند تمہاری چاندنی اتنی اچھی ہے۔"

"میں ادھر ہوں......" جیسے کسی کی سرگوشی سنائی دی۔

میں نے گردن موڑی اور کھڑکی کی طرف دیکھا۔ پردہ ہٹا ہوا تھا اور کھڑکی کے فریم میں چاندنی تھی۔

ایک طرف چاند تھا۔ ایک طرف چاندنی تھی۔

ایک آسمان پہ تھا۔ ایک زمین سے بلند اور دوسری منزل پر اور میں...... نیچے زمین پر تھا۔

مجھے لگا جیسے چاند کی روشنی مجھ پر پڑ کر چاندنی تک منعکس ہو رہی ہو۔ ہم تینوں ایک تکون کی طرح ایک دوسرے سے منسلک ہو گئے تھے مگر ہم تینوں کے درمیان فاصلے تھے۔ دوری تھی اور خلا ہی خلا تھا۔

چاند اور چاندنی۔

کون کس کو نوازے گا؟

بدلے میں کس کو کیا ملے گا؟

پتا نہیں کن، کن خیالوں میں، خوابوں میں، میں گم ہو گیا۔ خواب میں مجھے بہت سارے کتے چاند کی طرف منہ کر کے روتے، بھونکتے دکھائی دیتے رہے۔ پتا نہیں وہ کتے تھے یا بھیڑیئے۔

☆☆☆

کسی نے میرے پیر کو ہلایا۔ میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا، قمرو باورچی کا لڑکا نصرو میرے پاس کھڑا تھا۔

"ابا کہہ رہے ہیں جلدی سے اٹھ جاؤ، جانا ہے۔"

میں نے انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ اجالا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔

قمرو نے باورچی خانے کے دروازے سے منہ نکال کے کہا۔ "جلدی سے نہا دھو کر لے پھر جانا ہے۔"

"کدھر؟" میں نے پوچھا۔

"شہر والی بیبیاں زمین کو جائیں گی سیر کرنے۔ جیپ تیار کر لو۔" اس نے جواب دیا۔

میں تیزی سے اٹھ گیا۔ حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کے میں نے ڈونکی پمپ چلایا، غسل کیا اور قمیص شلوار پہن کے کھڑا ہو گیا۔ ابھی میں بالوں کو خشک کر ہی رہا تھا کہ دوسری طرف سے وہ آ گئی۔

چاندنی آ گئی۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ میں نے تولیا چارپائی پر ڈالا اور اپنی کوٹھری میں جا کے کنگھا کیا اور باہر نکل آیا۔ اتنی دیر میں ڈرائیور اشرف آ گیا۔

"مجھے کچہری جانا ہے، تم جا کے بیبیوں کو سیر کرا لاؤ۔" اس نے کہتے ہوئے جیپ کی چابی میری طرف اچھالی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔

بڑے سائیں تو صبح جلدی اٹھ جاتے تھے مگر باقی لوگ دس بجے سے پہلے نہیں اٹھتے تھے۔ چھوٹے سائیں کی تو صبح ہی ظہر کے بعد ہوتی تھی۔

ایک بڑا سا ناشتے دان، چائے کا تھرماس، ایک ٹوکری میں کچھ برتن لا کے قمرو باورچی نے پلنگ پر رکھے۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''چائے...... ناشتا۔'' قمرو باورچی نے جواب دیا۔ ''چلیں پھریں گی تو بھوک تو لگ آئے گی نا۔''
میں نے گردن ہلا دی اور ناشتے دان اور ٹوکری اٹھا لی۔ چاندنی دھیرے سے آگے بڑھی اور اس نے تھرماس اٹھالیا۔
''آپ رہنے دیجیے میں اٹھالوں گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔
''یہ کون سا بہت زیادہ وزنی ہے۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔
میں چپ رہا اور صحن میں کھڑی جیپ کی طرف چل دیا۔
میں نے جیپ اسٹارٹ کی، قمرو باورچی نے بڑا دروازہ کھولا۔ دونوں لڑکیاں پچھلی سیٹ پر بیٹھیں اور چاندنی آگے بیٹھ گئی۔
''آپ ادھر؟''
''کیوں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا یہاں بیٹھنا منع ہے؟''
''ارے کیوں تنگ کر رہی ہو؟'' پیچھے سے ایک نے کہا۔
میں نے گیئر بدل کے جیپ آگے بڑھا دی۔ پیچھے بیٹھی دونوں میں سے ایک لڑکی جس کے خدوخال چاندنی سے ملتے جلتے تھے اس کا نام شبنم تھا اور دوسری لڑکی اس کی خالہ زاد تھی، اس کا نام شازیہ تھا۔ ان کے نام ان کی آپس کی گفتگو سے مجھے پتا چلے تھے۔
میں نے جیپ کو پچھلی سمت سے لیا اور گاؤں کے اندر کے بجائے دوسری طرف پگڈنڈی سے کھیتوں کی طرف نکل آیا۔
''اللہ کتنا خوبصورت لگ رہا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی سی ہوا اور خوشبو سی فضا۔'' شبنم نے کہا اور پوچھا۔ ''کیوں چاندنی؟''
''ہونہہ۔'' چاندنی نے دھیرے سے کہا اور رخ پھیر کے میری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بڑا دھلا دھلا سا صاف صاف سا لگ رہا تھا۔
شازیہ نے کہا۔ ''چاندنی! چپ کیوں ہو؟''
دونوں ہنسنے لگیں۔ انہیں بات، بات پر ہنسنے کی عادت تھی۔
چاندنی نے پوچھا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''
''آپ کو باغوں کی طرف لے جا رہا ہوں۔ تھوڑے دنوں میں آم پکنے لگیں گے، ابھی تو کچے ہیں۔''
''اللہ...... کچے کچے آم۔ کیریاں۔ میں تو توڑ توڑ کے کھاؤں گی۔'' شازیہ نے چلا کے کہا۔
''اچھا بابا کھالینا۔'' شبنم نے کہا۔ ''مگر میرے کان تو نہ پھاڑو۔''
دونوں پھر ہنسنے لگیں۔
میں نے ذرا سی گردن موڑ کے چاندنی کی طرف دیکھا۔ اس کے بال بندھے ہوئے تھے مگر کچھ بال اس کے چہرے پر اڑ رہے تھے۔ وہ سامنے کی طرف دیکھ رہی تھی۔
میں نے پوچھا۔ ''آپ کو یہاں کیسا لگ رہا ہے؟''
''اچھا لگ رہا ہے۔'' اس نے دھیرے سے جواب دیا۔
''باغ میں ڈیرا بنا ہوا ہے۔ وہاں گھوم پھر لیجیے گا اور ناشتا بھی کر لیجیے گا جو ہم لوگ ساتھ ہی لائے ہیں۔''
''کیا چائے آپ نے بنائی ہے؟'' اس نے فوراً پوچھا۔
''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''رات میں تو میں نے اتفاقاً بنالی تھی جب قمرو سو رہا تھا۔''
''اچھا۔ میں سمجھی کہ آپ نے بنائی ہے۔'' اس نے دھیرے سے کہا اور پھر بولی۔
''کیا یہاں سب بہت دیر تک سوتے ہیں؟ میں نے تو سنا تھا کہ گاؤں میں لوگ صبح تڑکے اٹھ جاتے ہیں؟''
''ہاں جی ایسا ہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''گاؤں میں سب فجر ویلے اٹھ جاتے ہیں۔ کچھ تو پانی لگانے کے لیے رات ڈھائی تین بجے ہی اٹھ جاتے ہیں......''
''مگر حویلی میں تو سب سو رہے ہیں۔'' چاندنی نے بات کاٹی۔
''وہ تو جی سائیں ہیں۔ انہیں اتنی صبح صبح اٹھنے کی کیا ضرورت؟'' میں نے کہا۔ ''وہ تو مالک ہیں۔''
''اچھا۔'' چاندنی نے کہا اور میری طرف دیکھا۔
اس کے انداز میں کچھ عجیب سی بات تھی۔
''وہ...... وہ......'' وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی اور پیچھے کی طرف دیکھا۔ شازیہ اور شبنم اپنی باتوں میں مگن تھیں۔
میں نے آہستہ سے پوچھا۔ ''آپ کچھ کہنے والی تھیں؟''
''ہاں...... وہ......'' وہ کہہ کر پھر چپ ہوگئی۔
باغات شروع ہوگئے تھے۔ کچے آموں کی مہک فضا میں گھلی ہوئی تھی۔ شوکا کمدار ڈیرے پر موجود تھا۔ اس نے جیپ کو دور سے ہی آتا دیکھ لیا تھا۔ اس نے دو تین چارپائیاں بچھا دی تھیں اور ساتھ ہی پلاسٹک کی میزیں رکھی ہوئی تھیں۔
ہمارے پہنچتے ہی اس نے سامان نیچے اتارا۔ تیزی سے میزوں پر رکھا اور پھر فوراً ہی چلا گیا۔
''یہ کدھر گیا؟'' شازیہ نے پوچھا۔
''اس کا بس اتنا ہی کام تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''جب

مہمان آتے ہیں تو وہ سامان لگا کے چلے جاتے ہیں۔''
میں نے ناشتے دان کھولا۔
چاندنی نے کہا۔ ''رہنے دیں، میں نکالتی ہوں۔''
اس نے بڑے سلیقے سے ناشتا پلیٹوں میں نکالا۔ پھر دونوں لڑکیوں کو آواز دی جو ذرا دور آم کے درختوں کے نیچے کھڑی تھیں اور آم توڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔
''آ جاؤ۔ ناشتا کر لو۔'' چاندنی نے آواز دی۔
''تم لوگ کرو۔ ہمیں تو کیریاں کھانی ہیں۔'' شازیہ نے جواب دیا۔
چاندنی نے ایک سینکا ہوا ڈبل روٹی کا ٹکڑا اور ابلا ہوا انڈا پلیٹ میں رکھ کے میری طرف بڑھایا۔
''یہ لیجیے۔''
''نہیں..... نہیں..... آپ لیجیے.....'' میں نے جلدی سے کہا۔
''اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ جب ہم کھا سکتے ہیں تو آپ کیوں نہیں کھا سکتے؟''
میں چپ رہا۔
وہ بولی۔ ''ایک بات پوچھوں؟''
''جی۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔ ''کیا پوچھنا ہے؟''
''راشد کیسے ہیں؟''
''راشد؟'' میں نے دہرایا۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ چاندنی چھوٹے سائیں کے متعلق پوچھ رہی ہے۔
''آپ چھوٹے سائیں کے متعلق پوچھ رہی ہیں؟''
''ہاں.....'' اس نے میری طرف دیکھا۔ ''وہ کیسے ہیں؟''
''اچھے ہیں.....'' میں نے فوراً جواب دیا۔
''اچھے ہیں سے کیا مطلب؟'' اس نے جرح کی۔
''اچھے تو اچھے ہی ہوتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔
''وہ ہمارے سائیں ہیں، ہمارے لیے تو اچھے ہی اچھے ہیں۔''
اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ خاموش رہی پھر ذرا دیر بعد بولی۔ ''میں نے بچپن میں راشد کو دیکھا تھا۔ میں ان کے متعلق کچھ نہیں جانتی۔ کیسے ہیں، کیا کرتے ہیں، کیا پسند ہے، کیا ناپسند ہے؟''
''وہ تو آپ کو پتا ہی چل جائے گا۔''
''وہ کیسے؟'' اس نے تعجب سے پوچھا۔
''بھلا شادی کے بعد کوئی چیز چھپی رہتی ہے؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
''کیا مطلب۔ کسی کی عادت واطوار جاننے اور سمجھنے کے لیے پہلے شادی کرنا ضروری ہوتا ہے کیا؟''

''پتا نہیں۔ یہاں تو بس شادی ہو جاتی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''اگر شادی کے بعد پتا چلے عادتیں اچھی نہیں ہیں..... مزاج نہ ملے تو پھر؟''
''ادھر تو ان باتوں میں کوئی نہیں پڑتا جی۔ بس شادی ہو جاتی ہے۔ بچے ہو جاتے ہیں۔ کبھی لڑائی ہوتی ہے، کبھی مار پیٹ ہوتی ہے پھر دونوں اکٹھا ہی رہتے ہیں۔ صلح ہو جاتی ہے۔''
''صلح ہو جاتی ہے..... کیا دل سے؟'' اس نے میری طرف دیکھ کے پوچھا۔
''ہونے والے بچے تو یہی بتاتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔
''یعنی دل کی، احساس کی، تعلق کی کوئی اہمیت نہیں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔
میں چپ ہی رہا۔ اب بھلا اس کی ان باتوں کا کیا جواب دیا جا سکتا تھا۔ فیصلہ تو اس نے ماننا ہی تھا کیونکہ فیصلہ اس کے بڑوں نے کر لیا تھا۔
اس نے اپنی انگلیاں چٹخائیں، موڑیں، سیدھی کیں اور پھر ایک دوسرے میں پھنسالیں۔ وہ کسی الجھن میں مبتلا تھی۔
دفعتاً اس نے کہا۔ ''مجھے تو وہ اچھے نہیں لگے۔''
وہ تیزی سے بول گئی اور پھر چپ ہو گئی اور اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔ کبھی ایک دوسرے میں پھنسانے لگی۔
میں چپ رہا۔
چھوٹے سائیں قدرے فربہ تھے۔ ان کے چہرے پر کرختگی تھی۔ قد تو ان کا ساڑھے پانچ فٹ کے قریب تھا مگر موٹا ہونے کی وجہ سے کم لگتا تھا۔ چہرے کے نقوش بھی دونوں بڑے بھائیوں کے مقابلے میں دبتے ہوئے تھے اور تعلیم بھی بس میٹرک تھی۔ انہیں ویسے بھی تعلیم کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی سب سے بڑی پہچان اور ڈگری بڑے سائیں کا بیٹا ہونا اور ہزاروں ایکڑ زرعی رقبہ تھا۔
''میں نے انگلینڈ سے ماسٹر کیا ہے۔'' اس نے ذرا دیر بعد کہا۔
''آپ تو ان کے بچپن کی منگ ہیں۔'' میں نے جواب دیا اور اس کی طرف دیکھا۔
چاندنی نے میری طرف غور سے دیکھا اور پوچھا۔
''تم مجھے یاد دلا رہے ہو؟''
''نن..... نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''
''یہاں گاؤں میں کیا کوئی محبت نہیں کرتا؟'' اچانک اس نے پوچھا اور میرے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔

میں نے گہری سانس لی اور کہا۔ ''جب آپ یہاں رہنے لگیں گی تو یہاں کی ہوائیں اور یہاں کی مٹی آپ کو اپنا رازدار بنا لے گی۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

''محبت کوئی اتنی اچھی چیز تو نہیں......'' میرے سامنے نذرے اور زینو کے چہرے آ گئے۔ ''وہ کام کرنا ہی نہیں چاہیے جس کے انجام کا پہلے ہی سے پتا ہو۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو؟'' اس کے انداز میں اچانک بے تکلفی آ گئی۔ ''مجھے بتاؤ، سنا ہے گاؤں میں بڑی کہانیاں ہوتی ہیں۔''

''اگر انسان سوچے نا...... دل کے پیچھے بھاگے نا تو پھر اس کے آگے پیچھے صرف کہانیاں ہی ہوتی ہیں۔''

''اور اگر ان میں کھو جائے تو پھر؟'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوتا ہے؟''

''پھر خود بھی کہانی بن جاتا ہے۔ دردناک، عبرت ناک۔ اسی لیے لوگ محبت نہیں کرتے۔ بس شادی کر لیتے ہیں۔ ضرورت پوری کرتے ہیں۔ محبت تو عید کی عیدی ہے۔ ملی تو ملی، نہ ملی تو کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی سب کو عیدی دینے والے ہوتے بھی کہاں ہیں؟''

چاندنی خاموش رہی پھر اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور گھونٹ بھرا۔

میں اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہا۔

شبنم اور شازیہ بہت سارے پکے آم لے آئیں۔ شازیہ بولی۔ ''کیا بات ہے۔ بڑی خاموشی ہے۔''

وہ چارپائی پر بیٹھ گئیں اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے اٹھتا دیکھ کے شبنم نے کہا۔ ''ارے آپ کیوں اٹھ گئے۔ بیٹھ جائیے نا۔''

''جی میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور پھر ٹہلتا ہوا ان سے قدرے دور چلا گیا۔

شازیہ نے چاندنی سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے اتنی چپ کیوں ہو؟''

''کوئی خاص بات نہیں۔'' چاندنی نے جواب دیا اور پھر خاموش ہو کے زمین کو گھورنے لگی۔

شبنم نے شازیہ سے کہا۔ ''شاید چاندنی کسی کی سوچ میں گم ہے۔''

شازیہ ہنسنے لگی پھر بولی۔ ''جب دن قریب آتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور ویسے بھی اپنی سسرال میں تو خود کو سنبھالے رکھنا پڑتا ہے۔''

شبنم نے پوچھا۔ ''تمہیں راشد بھائی کیسے لگے؟''

شازیہ نے بلا تاخیر جواب دیا۔ ''اپنی چاندنی کے پاسنگ بھی نہیں۔''

''امی کہتی ہیں کہ مردوں کی صورت شکل نہیں ان کی کمائی دیکھنی چاہیے۔'' شبنم نے جواب دیا۔

''ان کی کمائی بھی کیا ہے؟ بس زمینوں کی سالانہ آمدنی، گھوڑے دوڑانا، کتوں کا شکار اور بس۔'' شازیہ نے فوراً کہا۔

''دیکھا نہیں رات کتنے اطمینان سے کہہ رہے تھے۔ تعلیم میں کیا رکھا ہے۔ ڈگری تو بس کاغذ کا ٹکڑا ہے جو نوکری کی بھیک مانگنے کے لیے ہاتھ پھیلانے کے بجائے آگے بڑھائی جاتی ہے۔ لو بھلا ہم راتوں کو جاگ جاگ کر سمسٹر بھگتیں اور وہ حضرت اسے ردی کا ٹکڑا اور بھکاری کا کاسہ بنا دیں۔'' شبنم نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، اس کا لہجہ و انداز سخت متنفر تھا۔

''تو پھر؟'' شازیہ نے پوچھا۔

''تو پھر کیا؟'' شبنم نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا ہماری کوئی چلتی ہے، کیا ہم سے پوچھ کے فیصلے ہوتے ہیں؟''

وہ بے دھڑک تیز تیز آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔ ان کی ساری آوازیں مجھ تک بہ آسانی پہنچ رہی تھیں۔

ان کی باتیں سن کر میں نے سوچا۔ 'پھر شہر اور گوٹھ میں فرق کیا رہا۔ فیصلے کا اختیار نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ رہنا تو سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے۔'

چاندنی دونوں کو باتوں میں معروف دیکھ کے اٹھی اور آہستہ آہستہ قدموں سے اس طرف آ گئی جہاں میں کھڑا ہوا تھا۔

میں اس کو قریب آتا دیکھ کے کسمسا سا گیا۔

پتا نہیں۔ اس کے اندر کیا بات تھی جو مجھے بے چین کر دیتی تھی حالانکہ اس کو دیکھے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی تھی۔ رات کی بات تو تھی اور رات گئی کو بھلا دیر ہی کتنی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا یہ بات بھی کتنی جھوٹی ہے کہ رات گئی، بات گئی۔ کبھی کبھی نہ رات جاتی ہے۔ نہ بات جاتی ہے۔ سب کچھ جیسے تصویر کی طرح اپنی جگہ کھڑا رہتا ہے۔ ساکت بالکل ٹھہرے ہوئے منظر کی طرح۔

''نواز جی۔'' چاندنی نے مجھے دھیمے سے مخاطب کیا۔

مجھے اس کے منہ سے اپنا نام سن کے بہت اچھا لگا۔ اتنا اچھا کہ میں سننے کے باوجود یوں بن گیا جیسے میں نے سنا

ہی نہ ہو۔

وہ دوبارہ بولی۔ ''نواز جی۔''

اس کی نرم سی، میٹھی سی آواز میں اپنا نام سن کے مجھے یوں لگا کہ جیسے میرا نام آج پہلی بار بولا گیا ہو۔ پہلی بار پکارا گیا ہو۔

''جی۔'' میں نے سر جھکا کے کہا۔

''وہ......'' وہ کہتے کہتے پھر رک گئی اور تذبذب میں مبتلا ہوگئی یوں جیسے کہے یا نہ کہے۔

میں نے پوچھا۔ ''جی بی بی جی! آپ کچھ کہہ رہی تھیں؟''

''کیا آپ کبھی شہر گئے ہیں؟'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''ہاں جی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کئی بار گیا ہوں۔ بڑے سائیں کا بنگلا شہر میں ہے۔ کبھی کبھی جاتے ہوئے مجھے بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔''

''اچھا۔'' چاندنی اچھا کہہ کے پھر چپ ہوگئی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ جو پوچھنا چاہ رہی ہے وہ پوچھ نہیں پا رہی ہے۔

''سنا ہے کہ گاؤں، دیہات کے لوگ بہت محبتی، بڑا خیال رکھنے والے ہوتے ہیں۔'' ذرا دیر بعد اس نے کہا اور میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''ہاں جی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ ہمارے پاس ہوتا بھی کیا ہے۔''

''اور بہت......'' وہ کہتے کہتے پھر چپ ہوگئی۔

''اور بہت کیا جی؟'' میں نے پوچھا۔

''اور......'' چاندنی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا۔ اس کی سیاہ پتلیاں جیسے میرے اندر اترنے لگیں۔

''اور بہت وفادار بھی ہوتے ہیں؟'' چاندنی نے اپنی بات مکمل کی۔

''وفادار تو ہونا چاہیے جی۔ بھلا جس کے ساتھ رہیں، جس کا کھائیں پئیں، اس سے وفاداری نبھائیں نہ تو پھر یہ تو گناہ ہے جی......اور گناہ کی معافی بھلا کہاں ملتی ہے۔''

''تو کیا وفاداری یہ نہیں کہ کسی کو کھائی میں گرنے سے بچایا جائے؟'' اس کا لہجہ بڑا کٹیلا تھا۔

''کھائی؟'' میں نے چاروں طرف دیکھا، آس پاس ہموار زمین تھی۔

''بھلا یہاں کھائی کہاں؟ آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟''

''نہیں سمجھو گے۔'' وہ دھیرے سے بولی اور آم کی جھکی ہوئی شاخ کا ایک پتا کھینچ لیا اور اس کو ہاتھوں میں مسلنے لگی۔

میں چپ ہی رہا۔ بھلا اس کی باتوں کا میرے پاس جواب بھی کیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم واپس آگئے۔ راستے بھر چاندنی نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ شازیہ اور شبنم کی باتوں پر بھی بس ہوں ہاں کرتی رہی۔

حویلی پہنچ کے وہ اندرونی حصے کی طرف چلی گئیں اور میں اپنے پچھلے حصے کی طرف آگیا۔ چارپائی پر کپڑا سر پر ڈالے قمرو بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جاتے ہی کہا۔

''خیر تو ہے، یوں منہ چھپا کے کیوں بیٹھا ہوا ہے؟''

یہ کہتے ہوئے میں نے کپڑا کھینچ لیا۔ وہ قمرو نہیں تھا۔ زینو تھی۔

''زینو۔'' میں نے کہا۔

دبلی پتلی زینو بالکل پیلی زرد سرسوں ہوگئی تھی۔ اس نے خالی خالی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر مجھے دیکھتی رہی۔

''زینو۔'' میں نے اس کا کندھا ہلایا۔

اچانک زینو اٹھی اور مجھ سے چمٹ گئی اور چیخ چیخ کے رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا۔

''وہ چلا گیا......وہ چلا گیا......'' زینو روتے ہوئے بار بار کہہ رہی تھی۔

قمرو باورچی خانے سے نکل آیا تھا اور ہمارے پاس کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا۔ زینو مسلسل میرے کندھے سے لگی روئے جا رہی تھی۔

''اب بس کر۔'' قمرو باورچی نے ڈانٹا۔ ''بند کر یہ سیاپا۔ جو ہونا تھا ہوگیا۔ اب بھول جا۔''

''کیسے؟'' زینو نے پلٹ کے قمرو باورچی کی طرف دیکھا۔

''بیٹھ جا۔'' میں نے زینو کا ہاتھ پکڑ کے چارپائی پر بٹھا دیا۔

قمرو باورچی بولا۔ ''تمہارے جانے کے ذرا دیر بعد ہی آئی تھی۔ میں نے چائے روٹی کا پوچھا مگر اس نے منع کر دیا۔ بس ادھر چارپائی پر کپڑا اوڑھ کے بیٹھ گئی۔''

''جا چائے، روٹی، سالن کچھ بھی لے آ۔'' میں نے قمرو باورچی سے کہا پھر پانی کا جگ پکڑا اور ڈونگی پمپ سے بھر لایا۔ میں نے پلاسٹک کے گلاس میں پانی بھر کے زینو کو دیا۔ اس نے گلاس تھاما اور غٹا غٹ پانی پی لیا۔

''چھوڑ دے سب۔'' میں نے کہا۔

''کیسے چھوڑ دوں۔ کیسے بھول جاؤں؟'' زینو نے

کہا۔ اس کی آواز میں گہرا کرب تھا۔
میں نے کہا۔ ”میں نے کب کہا کہ بھول جا۔ بھولی تو کوئی چیز جا ہی نہیں سکتی، بس چھوڑ دے۔ پچھلے دنوں کو گٹھڑی میں باندھ کے یاد کی کوٹھری میں ڈال دے۔ سب چھوڑ دے ادھر اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔“
زینو نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا، یوں جیسے پوچھ رہی ہو۔ ”میں کیا چھوڑ دوں، سب کچھ تو مجھ سے چھین لیا گیا۔“
میں نے اس کی طرف سے نظریں پھیر لیں اور گردن موڑ کے برگد کی طرف دیکھنے لگا۔ چند دن پہلے حویلی کا پچھلا حصہ نذرے، زینو، چندا، قمرو اور میری باتوں سے، ہنسی سے گونجتا رہتا تھا اور برگد پتے ہلا ہلا کے سنتا رہتا تھا مگر آج......
اچانک بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کتے بے چین ہو رہے تھے۔ ان کے راتب کو دیر ہو رہی تھی۔
قمرو باورچی نے کہا۔ ”ادھر ان کا راتب پڑا ہے، جا کے دے دے۔“
میں نے سر ہلایا اور اس طرف بڑھ گیا جہاں روز صبح ہی صبح راتب تیار کر کے سدو قصائی رکھ جاتا تھا۔ میں نے کھجور کی بڑی سی ٹوکری ٹرالی میں رکھی اور کتوں کو راتب ڈالنے لگا۔ وہ کچھ زیادہ ہی بھوکے تھے۔ فوراً ہی راتب پر ٹوٹ پڑے۔ چند ہی منٹوں میں انہوں نے راتب صاف کر دیا اور اطمینان سے فرش پر بیٹھ گئے۔
بھوکے کا پیٹ بھر جائے تو وہ دوسری بھوک جاگنے تک آسودہ ہو جاتا ہے۔
تھوڑی دیر کے بعد زینو کا باپ آ کے اسے خاموشی سے لے گیا۔ میں نے پہلی مرتبہ کسی اکیلے آدمی کو جنازہ اپنے پیروں پر لے جاتے دیکھا تھا۔
قمرو باورچی نے تاسف سے کہا۔ ”زینو کی تو زندگی تباہ ہو گئی۔“
میں چپ ہی رہا۔ بات کرنے کو تھا بھی کیا؟
سارا دن یوں ہی گزر گیا۔ قمرو سب سے زیادہ مصروف رہا۔ لوگ حویلی کے اندر کچھ اور ہوتے تھے اور حویلی کے باہر کچھ اور...... مگر دونوں ہی جگہ یکساں چیز خوف تھی۔ بس یہ تھا کہ حویلی کے اندر رہنے والوں کی رسی محدود اور باہر والوں کی قدرے دراز تھی مگر دونوں کی حرکت کا ہر ضلع بڑے سائیں کے کھونٹے سے بندھا ہوا تھا۔

☆☆☆

برکتے نائی نے بتایا کہ سب لوگ شہر والے بنگلے میں چلے جائیں گے۔
”کیوں خیر تو ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔
قمرو باورچی نے کہا۔ ”پوری بات کا پتا نہ ہو تو بولا مت کر۔“
”اچھا۔“ برکتے نائی جھینپ گیا اور بولا۔ ”چل تو بتا دے۔“
قمرو باورچی نے کہا۔ ”جو باہر والے مہمان ہیں، وہ چلے جائیں گے بنگلے میں۔ باقی ادھر ہی رہیں گے۔ چھوٹے سائیں کی برات شہر جائے گی۔ پھر ولیمہ ادھر بھی ہوگا اور شہر میں بھی۔“
”اچھا۔“ برکتے نائی نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”صبح خط بنانے آیا تھا تب تو سائیں نے کچھ بولا نہیں؟“
”ہاں تو بڑا بزرگ، سگا لگا ہوا ہے نا۔ گاؤں کا سرپنچ ہے، مکھیا ہے۔“ قمرو باورچی نے اس کے لتے لے ڈالے۔
میں نے کہا۔ ”یعنی کہ چاندنی کی شادی طے ہو گئی۔“
”چاندنی۔“ قمرو باورچی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔
”چاندنی۔“ برکتے نائی نے سر کھجایا، کان میں انگلی گھمائی اور میری طرف دیکھ کے بولا۔ ”تجھے نام بھی پتا ہے اور تو نام لیتا بھی ہے؟“
میں نے سٹپٹا کے کہا۔ ”وہ بس ایسے ہی منہ سے نکل گیا۔“
برکتے نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا۔ ”میں تو چلا۔ چھوٹا جلیبی لانے کی ضد کر رہا تھا، گامو حلوائی کی دکان ابھی کھلی ہوگی لیتا جاؤں گا۔“ وہ اٹھ کے چلا گیا۔
قمرو باورچی نے مجھ سے پوچھا۔ ”روٹی کھاؤ گے؟“
”نہیں۔“ میں نے بے دلی سے کہا۔ ”جی نہیں چاہ رہا۔“
”خیر تو ہے نا؟ بجھا ہوا کیوں ہے؟“ قمرو باورچی نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”کوئی بات تو نہیں؟“
”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بات کیا ہونی ہے۔ بس کبھی کبھی بولنے کا، کچھ کہنے کا دل نہیں بھی کرتا۔“
”اچھا۔“ قمرو باورچی اٹھ کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔
میں بے دلی سے چارپائی پر لیٹ گیا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ کوٹھری کے دروازے کے اوپر لگا ہوا بلب اپنی دھندلی سی پیلی روشنی بکھیر رہا تھا۔ کبھی کبھی کتوں کے غرانے کی آواز آ جاتی، کبھی کوئی بھینس ڈکراتی، کوئی گائے ....زور سے گردن ہلاتی تو گھنٹیاں سی بج اٹھتیں۔ کسی وقت بکریوں کی میں میں سے خاموش فضا مرتعش ہو جاتی یا کبھی مرغیوں کے دڑبے سے ذرا دیر کو کڑکڑانے کی آوازیں آتیں اور پھر فضا میں خاموشی چھا جاتی۔

پتا نہیں میں کیوں ایک دم سے بے دل ہو گیا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ کالی کیسیو کی گھڑی جو نمبروں میں وقت بتاتی تھی اور جس کا چھوٹا سا بٹن دبانے سے ہندسے روشن ہو جاتے اور وقت دیکھنے میں آسانی ہو جاتی تھی۔ میں نے وقت دیکھا، دس بج رہے تھے۔

''بات سن۔'' قمرو باورچی نے میرے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے آواز دی۔

''میں گھر جا رہا ہوں، گھر والی کی طبیعت اوپر ہے۔ کل رات بھی نہیں گیا تھا۔ سب کو روٹی پانی پورا کر دیا ہے۔ صبح تڑکے ہی آ جاؤں گا۔ تو دروازہ کھول دینا۔''

''پوچھ لیا؟'' میں نے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''تو کیا پوچھے بغیر جا سکتا ہوں۔ اماں جی سے پوچھ لیا ہے۔'' قمرو باورچی نے کہا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں چارپائی پر لیٹ کے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ کوٹھری کی بیرونی دیوار پر لگا بلب اپنی زرد روشنی پھیلا رہا تھا۔ چاروں طرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ مجھے لگا کہ جیسے بلب کی زرد روشنی چاندنی کا روپ خراب کر رہی ہے۔ میں نے اٹھ کے بٹن بند کر دیا۔

روشنی بند ہو گئی۔

چاندنی میں گھلنے والی پیلاہٹ ختم ہو گئی۔

میں دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مجھے الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ کیوں؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے برگد کی طرف دیکھا، اس کے نیچے تاریکی تھی۔ اس کے گھنے پتوں میں سے چاندنی گزر نہیں پا رہی تھی۔ تب ہی اس کے نیچے اندھیرا تھا۔

ہوا بالکل ساکت تھی۔

میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا کوئی نہیں تھا۔ میں اٹھ کے باورچی خانے کی طرف چلا آیا۔ میں نے پتیلیوں میں جھانکا۔ گوشت کا سالن، آلو گوبھی کی سبزی، مرغی کا قورمہ، سوجی کا حلوا موجود تھا۔ ایک طرف مٹھائیوں کے کئی ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ڈبا کھولا، اس میں گلاب جامن تھے۔

میں نے ایک گلاب جامن منہ میں رکھا۔ وہ مجھے کڑوا لگا۔ نہ خوشبو نہ مٹھاس۔ مجھے حیرت ہوئی میں نے سوچا لو بھلا گلاب جامن بھی کڑوے بننے لگے ہیں یا میرے منہ کا ذائقہ خراب ہے۔

میں نے چائے کا پانی چڑھا دیا اور اندر کھلنے والے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور خاموشی سے پتیلی کے نیچے سے نکلنے والی آنچ کو دیکھنے لگا۔ ذرا دیر میں چائے بن گئی۔ میں نے دو پیالوں میں چائے نکال لی۔

دو پیالے؟ میں نے غور سے چولہے کی سلیب پر دیکھا۔ وہاں واقعی چائے کے دو پیالے بھرے رکھے تھے۔ قمرو تو نہیں تھا پھر میں نے کس کے لیے دوسرا کپ بنایا ہے؟

مجھے حیرت ہوئی۔ کیا میں غائب دماغ ہو گیا ہوں یا پاگل؟ بھلا مجھے یاد کیوں نہ رہا کہ ابھی تو ذرا دیر پہلے ہی قمرو باورچی گھر چلا گیا ہے اور اس کے جانے کے بعد دروازہ بھی میں نے ہی بند کیا تھا۔ مجھے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ میں چائے کے پیالوں کو گھورنے لگا۔

اچانک آہٹ سی ہوئی۔ دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا اور وہاں چاندنی کھڑی ہوئی تھی۔

اس نے مجھے دیکھا اور پھر سلیب پر رکھے ہوئے چائے کے پیالوں کی طرف۔ اس نے بنا کچھ کہے آگے بڑھ کے چائے کا پیالہ اٹھا لیا۔

اچانک جیسے میری جھنجلاہٹ، الجھن اور بے نام سی اداسی دور ہو گئی۔

چاندنی نے چائے کا گھونٹ بھر کے کہا۔ ''مجھے معلوم تھا کہ آپ چائے بنائیں گے۔''

''مجھے...... بھلا کیسے معلوم تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''بس پتا تھا۔'' چاندنی نے میری طرف غور سے دیکھا اور ہنسی۔ باورچی خانے کی محدود فضا اس کی ہنسی سے جیسے لبالب بھر گئی۔

میں چپ رہا پھر اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے پیالے کی طرف دیکھنے لگا۔

چاندنی نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، آپ چائے کیوں نہیں پی رہے؟''

''اچھا۔'' میں نے چونک کے کہا اور جلدی سے اپنا پیالہ اٹھا لیا۔

چاندنی مسکرائی۔ اس کے ہونٹ بھرے بھرے تھے۔ گلابی گلابی سے اور وہ میرے اتنے قریب تھی کہ اس کے ہونٹوں پر پڑی عمودی لکیریں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

''آپ کچھ بولتے نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

گالوں سے جیسے چاندنی پھوٹ رہی تھی۔

تھوڑی دیر ہمارے درمیان خاموشی رہی۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔''

''ہاں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''آپ شہر میں رہیں گی یا یہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' اس نے چائے کا پیالہ سلیب پر رکھ دیا۔

''آپ کو اچھا نہیں لگا؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا؟'' اس نے میری طرف دیکھ کے پوچھا۔ ''کیا

''جی؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں زبردست چمک تھی اور لبوں پر ہنسی۔ چائے پیتے ہوئے میں نے کسی کو یوں مسکراتے پہلی بار دیکھا تھا۔

''جی...... ہاں...... اچھا......'' چاندنی نے کہا۔ ''کیا اس کے علاوہ بھی کچھ اور بولنا آتا ہے آپ کو؟''

''وہ......'' میں کہہ کے چپ ہوگیا۔

''وہ کیا؟'' چاندنی نے فوراً پوچھا۔

''وہ......بس آپ کے سامنے بولا نہیں جاتا۔'' میں نے کہہ ہی دیا۔ واقعتاً ایسا ہی تھا۔ اس کے سامنے بس اس کو دیکھنے کی چاہ رہ جاتی تھی۔ بات گم ہو جاتی تھی۔

''اچھا تو کیا میں اتنی خوفناک ہوں؟'' وہ ہنسی۔

''نہیں جی! آپ تو بہت اچھی ہیں۔'' میں نے فوراً کہا اور چپ ہو کے نظریں جھکا لیں۔

''تو جو آپ کو اچھا لگتا ہے آپ اس سے بولتے نہیں۔ ہے نا؟'' وہ مسکرائی اور میری طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگی پھر ذرا دیر بعد بولی۔ ''اچھا تو یہ بتائیے کہ یہ دوسرا کپ آپ نے کس کے لیے بنایا تھا؟''

''پتا نہیں......'' میں نے جواب دیا۔ ''بس بے دھیانی ہوگئی تھی۔ حالانکہ قمر تو کہہ کے گیا تھا کہ وہ اب صبح ہی آئے گا۔ پر مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں نے دو پیالے چائے بنالی ہے۔''

''اچھا......'' اس نے مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں نہ جانے کیا تھا کہ میرے سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ ایک عجیب سی سنسناہٹ کا احساس ہونے لگا۔

''کیا آپ نے دوسرا کپ میرے لیے بنایا تھا؟ آپ کو کیسے پتا کہ میں آؤں گی؟'' اس نے پوچھا۔

اچانک...... بالکل اچانک جیسے اس کے سوال نے میرے ذہن کی بند گرہ کھول دی۔ میری الجھن اور بے چینی دور ہوگئی۔

تو مجھے اس کا انتظار تھا۔

نہ جانے کہاں سے میرے اندر ہمت آگئی اور میں نے کہا۔ ''ہاں...... مجھے آپ ہی کا انتظار تھا۔'' میں چپ ہوگیا۔

''اچھا۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔

میں نے چور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چاند چہرہ جیسے دن نکلنے کی طرح اجیالا ہوگیا تھا۔ اس کے

مجھے اچھا نہیں لگا؟''

''معلوم نہیں۔ شاید میرے منہ سے غلط بات نکل گئی۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

اس نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا اور اچانک سوال کیا۔ ''بعض لوگ غلط وقت پر کیوں ملتے ہیں؟''

اس کا سوال سن کے میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ نظریں جما کے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کون سا غلط وقت؟''

''گاؤں میں تو کم عمری میں شادی ہو جاتی ہے؟'' اچانک جیسے اس نے بات پلٹ دی۔

''ہاں جی......'' میں نے جواب دیا۔ ''میری دونوں بہنوں کی شادی ہوگئی۔ ایک کی چودہ برس میں اور ایک کی تیرہ برس میں۔''

''تو ان کی شادیاں بھی تو لڑکوں ہی سے ہوئی ہوں گی۔'' اس نے پوچھا۔

''ظاہر ہے، لڑکی کی شادی لڑکے ہی سے ہوگی۔'' مجھے اس کے عجیب سوال پر ہنسی آگئی۔

اس نے میری ہنسی کی آواز سن کے میری طرف غور سے دیکھا اور پوچھا۔ ''جب لڑکیوں کی شادی اتنی کم عمری میں ہو جاتی ہے تو لڑکے بھی تو کم عمر ہی ہوتے ہوں گے؟''

''نہیں، یہ ضروری نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''دس بارہ برس تو بڑے ہی ہوتے ہیں اکثر۔''

''کیوں؟'' اس نے جرح کی۔

''بس یہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔'' میں نے بحث سے جان چھڑانا چاہی۔

''آپ کی شادی ہوگئی؟'' اس نے فوراً پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''جب اماں چاہے گی تب کرے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا۔'' وہ ہنسی۔ ''آپ ہر کام اماں سے پوچھ کے کرتے ہیں؟''

میں خاموش رہا۔

وہ ذرا دیر کو چپ رہی پھر بولی۔ ''آپ کو بُرا تو نہیں لگا؟''

''نہیں...... بھلا اس میں بُرا ماننے کی کیا بات؟''

''میں چلتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''آپ نے بتایا نہیں؟''

''کیا؟'' اس نے گردن موڑ کے مجھے دیکھا۔

تب میں نے دیکھا اس کی گردن لمبی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگا جیسے مورنی مڑ کے پیچھے دیکھ رہی ہو۔

''آپ شہر میں رہیں گی یا پھر ادھر؟''

''بتایئے؟'' اس نے پوچھا۔ ''آپ کیا چاہتے ہیں۔ شہر میں رہوں یا ادھر ہی؟''

''میں؟'' میں نے کہا۔ ''پتا نہیں۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور بولی۔ ''کچھ پتا بھی ہے آپ کو یا نہیں۔ انسان کو اتنا کسی سے بے خبر بھی نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ تیز تیز قدم اٹھا کے باورچی خانے سے باہر نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی مجھے یوں لگا کہ باورچی خانہ ایک دم سنسان ہوگیا ہو بلکہ باورچی خانہ ہی کیا ساری حویلی ......سارا پنڈ......سارا عالم ویران ہوگیا ہو۔

میں چند لمحے وہیں کھڑا رہا پھر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا باہر آگیا اور اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف چاندنی روشن تھی۔ میں سیدھا لیٹ گیا اور چت پڑا آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

چاند روز کی طرح چمک رہا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا، بظاہر کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔

اچانک مجھے برگد کی طرف سے ہنسنے کی آواز آئی، میں نے چونک کے دیکھا۔ وہاں کوئی کھڑا تھا۔ میں نے آنکھیں میچ کے دیکھا۔ وہاں کوئی اور نہیں، نذرا کھڑا تھا۔ اچانک برگد کے عقب سے ایک سایہ نکلا اور آتے ہی نذرے کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ دونوں سائے چند لمحے کھڑے رہے پھر انہوں نے بانہیں پھیلائیں اور ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

وہ نذر تھا اور دوسرا سایہ زینو کا تھا۔

چند لمحے وہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے کھڑے رہے پھر میری طرف آنے لگے۔ دونوں لمحوں میں میرے پاس پہنچ گئے۔ نذر میری چارپائی کے پاس کھڑا ہوگیا اور مجھے دیکھنے لگا۔

''نذرے! تو، تو مر گیا تھا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ مجھے اس سے ڈر نہیں لگا بلکہ یہ بات سچی ہوگئی کہ برگد پر بھوت ہوتے ہیں مگر نذرا تو بھوت نہیں بن سکتا تھا۔ وہ تو پکا پکا مسلمان تھا پھر یہ کون تھا؟

''دل چاہ رہا تھا تجھ سے ملنے کو۔'' نذرے نے کہا۔ ''میرا مذاق اڑاتا تھا نا۔ آج پھنس گیا تو بھی۔'' وہ ہنسنے لگا۔

''پھنس گیا...... کدھر پھنس گیا؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

"کتے...... کتے پہلے دوڑاتے ہیں پھر کبھی ٹانگوں پر، کبھی کولہے پر دانت گڑاتے ہیں۔ پہلی مرتبہ ان کے نکیلے دانت صحیح طریقے سے گوشت پکڑ نہیں پاتے کیونکہ بھاگنے کی رفتار تیز ہوتی ہے اس لیے کپڑے تو پھٹ جاتے ہیں۔ گہری خراشیں پڑ جاتی ہیں۔ خون رسنے لگتا ہے۔ پر اس وقت دوڑنے اور جان بچانے کی خواہش اتنی شدید ہوتی ہے کہ درد کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ پھر دوڑاتے ہیں۔ لمبی لمبی چھلانگیں لگا کر دانت گاڑتے ہیں اور پورے وزن سے بدن سے ٹکراتے ہیں۔ بندہ لڑکھڑا جاتا ہے، ڈگمگا جاتا ہے۔ پھر وہ بڑے بڑے ناخنوں والے پنجوں سے، کمر سے، کولہے سے دبوچ لیتے ہیں اور پھر جیسے ہی بندہ گر جاتا ہے اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں...... پر یار...... اس وقت اتنی وحشت، اتنی دہشت اور اس شدت کی مایوسی ہوتی ہے کہ درد کا پتا ہی نہیں چلتا۔ بس یار...... بندہ نا...... مرجاتا ہے......" نذرا گہری سانس لے کے خاموش ہوگیا۔

اس کی باتیں ایسی تھیں کہ میں پوری جان سے کانپ گیا۔ میرا سارا بدن پسینے میں بھیگ گیا۔ میرا حلق خشک ہوگیا اور زبان پر کانٹے اگ آئے۔

"یہ...... یہ...... سب تو مجھے کیوں سنا رہا ہے؟" میں نے گھبرا کے کہا۔ "اس سے میرا کیا مطلب؟"

"پیچھے ہٹ جا۔" نذرے نے کہا۔ "ہاں...... چھوڑ دے رستہ۔ مجھے سمجھاتا تھا پر خود اسی پگڈنڈی پر قدم دھر دیے۔"

"بھائی نہ جا اس پاسے......" زینو نے کہا۔

"کہاں...... کدھر کو؟" میں نے جھنجلا کے پوچھا۔

نذرے نے میری طرف جھک کے کہا۔ "نہ جا اس پاسے...... ادھر چاندنی آگ بن جائے گی۔ چھوڑ دے یہ رستہ۔"

میں بن سا رہ گیا۔ میں نے بہ مشکل کہا۔ "کیا بول رہا ہے؟"

"سنبھل جا۔" نذرے نے کہا۔

"بھاگ جا۔" زینو نے کہا۔

پھر دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا، پلٹے اور دوڑتے ہوئے برگد کے درخت میں گھس گئے۔ ہاں۔ سچ مچ وہ برگد کے تنے میں گھس گئے تھے۔

میں اٹھ کے بیٹھ گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے برگد کے درخت کو دیکھنے لگا جو اپنی جگہ بالکل ساکت کھڑا تھا۔ چپ چاپ۔ اتنا چپ کہ اس کا کوئی پتا شور تک نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی ہوا کی سرسراہٹ سے ہل رہا تھا۔

کیا نذرا مرنے کے بعد بھوت بن گیا؟ مگر زینو...... زینو تو زندہ ہے پھر وہ کیسے ادھر آئی اور کیسے برگد کے اندر گھس گئی؟

میں نے گھڑی دیکھی۔ بارہ بج رہے تھے۔

مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں نے اٹھ کے ہینڈ پمپ سے پانی پیا، منہ پر چھینٹے مارے اور واپس آ کے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

'یہ کیا کہہ رہا تھا نذرا؟' میں نے سوچا۔ 'بھلا میرا چاندنی سے کیا تعلق؟ بھلا چاندنی کا اور میرا کیا مقابلہ؟'

"کچھ تو ہے جو نذرے نے کہا۔" کسی نے کہا۔ میں نے چونک کے ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی نہیں تھا آس پاس۔ پھر یہ آواز کس کی تھی؟ میں کپکپا سا گیا۔ میں چپ چاپ لیٹ گیا اور چمکتے چاند کو دیکھنے لگا۔

پتا نہیں کب مجھے نیند آ گئی۔ رات بھر میں خواب میں نذرے کے پیچھے دوڑتے بھاگتے کتے دیکھتا رہا مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ جب کتے نذرے کو کاٹتے، بھنبھوڑتے تو مجھے اپنے بدن میں ٹیسیں اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

صبح جب میں اٹھا تو میرا سارا بدن درد سے چُور چُور تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے دروازہ کھولا جو نہ جانے کب سے قمرو باورچی پیٹے جا رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟ بڑی گہری نیند تھی تیری۔" اس نے چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "کچھ سنا تو نے؟"

"کیا؟" میں نے پوچھا اور چارپائی پر جا بیٹھا۔ میرے سر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سر درد سے پھٹ جائے گا۔

"یعنی تجھے پتا ہی نہیں۔" قمرو باورچی کے لہجے میں تعجب بھرا ہوا تھا۔ "سارے گوٹھ میں خبر پھیلی ہوئی ہے۔ ذرا دیر پہلے ہی تو نکالی ہے۔"

"ادھر رات میں کون آ کے مجھے خبر دیتا؟" میں نے پوچھا۔ "مگر تمہارے منہ پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟"

"اچھا جی......" قمرو باورچی نے حیرت سے کہا۔ "تجھے کچھ خبر ہی نہیں۔ ارے اپنی زینو مر گئی۔"

"کیا؟" مارے حیرت کے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"کب...... کیسے......؟" میں نے بمشکل پوچھا۔

"رات میں زینو کا ابا اٹھا تو دیکھا زینو نہیں ہے۔ اس نے گھر میں ڈھونڈا۔ تجھے تو اس کا گھر پتا ہی ہے۔ دو کمروں میں بھلا کون چھپ سکتا ہے۔ لالٹین لے کے صحن میں نکلا تو دیکھا۔ کنوئیں کے پاس زینو کی جوتیاں پڑی ہوئی تھیں۔ زینو نے کنوئیں میں کود کے خودکشی کر لی۔ ہائے بے چاری

زینو۔'' قمرو نے افسردگی سے کہا۔

''یہ کب کی بات ہے؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''رات دس گیارہ بجے کی۔'' قمرو باورچی نے بتایا اور کہنے لگا۔ ''وہ نذرے کا غم سہار نہ سکی۔ دیکھو اس نے جان دے دی۔''

''پتا نہیں......'' میں نے گہری سانس لی اور کہا۔ ''وہ دکھ سہار نہ سکی یا اپنی بے عزتی سہار نہ سکی؟''

''بھلا اس کی کس نے بے عزتی کی؟'' قمرو باورچی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''پہلے ان سے اس کا نذرا چھین لیا پھر اس سے اس کی آزادی چھین لی۔ نہ رو سکتی تھی نہ کہہ سکتی تھی۔ ایک لڑکی کے لیے اس سے بڑی ذلت کیا ہوگی کہ اس کو اس شخص سے تعلق پر مجبور کیا جائے جس کو وہ دل و جان سے اپنے محبوب کے قاتلوں میں سے ایک سمجھتی ہو۔''

''اچھا چپ رہ۔'' قمرو باورچی نے کہا۔ ''معلوم ہے تو بڑا پڑھا لکھا ہے پر بچے، ہر پڑھا لکھا سمجھدار نہیں ہوتا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کیسی سمجھداری؟''

''بچے، سمجھداری یہ ہے کہ بندے کو معلوم ہو کہ کب اور کہاں منہ کھولنا ہے۔ ادھر کچھ بھی بدلنے کا نہیں اور بے بسی مایوسی کا یہ عالم یوں ہی باقی رہے گا۔''

''تم ڈرتے ہو۔'' میں نے قمرو باورچی کی طرف دیکھا۔

قمرو باورچی میری بات سن کے ہنسنے لگا پھر ذرا چپ رہا اور کہنے لگا۔ ''یار! تو بڑا ہی جھلا ہے۔ تجھے پتا ہی نہیں کہ زندگی سب سے ضروری چیز ہے۔ یہ ساری دنیا، یہ سارے مسئلے مسائل جب ہی الجھتے، سلجھتے ہیں جب زندگی ہوتی ہے۔ دیکھو نا اگر آج نذرا... ہوتا تو پھر زندگی کتنی مختلف... ہوتی، زینو بھی ہوتی۔ پھر برگد بھی اداس نہ ہوتا۔''

''برگد۔'' میں نے زیرِ لب کہا اور برگد کی طرف دیکھا۔

رات ہی تو اس کے تنے میں زینو اور نذرے سما گئے تھے۔

تب میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ زینو نہیں رہی۔ وہ مری نہیں، روپ بدل کے میرے سامنے آگئی۔ وہ پیاسی روح اپنے محبوب کے ملن سے سیراب ہوگئی۔

''کیا سوچ رہا ہے؟'' قمرو باورچی نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''رات میں نے دیکھا کہ نذرا زینو کے ساتھ آیا ہے۔''

''اچھا؟'' قمرو باورچی نے تعجب سے پوچھا۔ ''کیا واقعی؟''

''ہاں۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے برگد کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہاں سے آئے تھے دونوں۔''

''پاگل ہوگیا ہے کیا؟'' قمرو باورچی نے غصے سے مجھے گھورا اور تیز تیز قدموں سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔

میں اسے چپ چاپ جاتا دیکھتا رہا۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے کچھ میری پیٹھ پر چبھ رہا ہو۔ میں نے پلٹ کے دیکھا، دائیں بائیں کوئی نہیں تھا۔ دھوپ سے آنگن بھرنے لگا تھا۔ میں نے اوپر کی طرف دیکھا، کھڑکی کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور اس میں چاندنی کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

میں چند لمحے اوپر دیکھتا رہا۔

اچانک پیچھے سے کسی نے کچھ کہا۔ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے چاندنی نے پیچھے کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی کھڑکی خالی ہوگئی۔ میں نظر گھما کے کوٹھریوں کی قطار کی طرف دیکھنے لگا۔

''آجاؤ چائے کا پیالہ پی لو۔'' قمرو باورچی نے مجھے پکارا۔

میں اس کی طرف چل دیا۔ وہ باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھا ہوا پراٹھے کے بڑے بڑے لقمے لے رہا تھا۔

''بڑی زوردار بھوک لگ رہی تھی۔ ابھی تو کوئی اٹھا ہی نہیں، میں نے سوچا پہلے پیٹ پوجا پھر کام دوجا۔'' وہ کہتے ہوئے ہنسنے لگا۔

میں اس کے سامنے پیڑھی پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت اندر والا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔

''بی بی جی آپ۔'' میرے سامنے بیٹھا ہوا قمرو باورچی اٹھ کھڑا ہوا۔

''چائے بنا دیجیے۔'' اس نے کہا۔

میں ایک لمحے میں آواز پہچان گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا، چاندنی کھڑی تھی۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے کہا۔ ''آپ بھی یہاں ہیں۔''

''جی۔''

''تو پھر آج کی صبح آپ کے ہاتھ کی چائے سے ہو جائے۔ ویسے آپ صرف رات میں ہی چائے بناتے ہیں یا دن میں بھی؟'' اس کے انداز میں، اس کی آواز میں بے حد شوخی تھی۔

قمرو باورچی حیرت سے ہم دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''میں ابھی بنا دیتا ہوں۔''

''بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کو ہے؟'' چاندنی نے پوچھا۔

قمرو باورچی جلدی سے بولا۔ ''بس چند منٹوں میں انڈے پراٹھے بنا دیتا ہوں۔ جب تک آپ یہ حلوا چکھیں۔ خالص دیسی گھی، بادام، مکھانے ڈالے ہیں، ساتھ میں اخروٹ کی گری۔'' قمرو نے کہتے ہوئے بڑی پھرتی سے ایک چھوٹی سی نقشین طشتری میں حلوا نکالا اور فوراً ہی..... اسے.... گرم کیا اور پیش کر دیا۔

''میں باہر صحن میں جا رہی ہوں۔'' اس نے حلوے کی طشتری پکڑی اور صحن کی طرف نکل گئی۔ ''واہ! کتنی اچھی دھوپ ہے۔ یہاں ہر چیز کتنی اجلی اجلی ہے۔'' چاندنی کی آواز آئی۔

''تو جا میں ناشتا لے کر آتا ہوں۔'' قمرو باورچی نے مجھ سے کہا۔

میں باورچی خانے سے باہر آ گیا۔

چاندنی باہر چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھی اور حلوے میں سے بادام چن چن کے کھا رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے طشتری چارپائی پر رکھی اور بولی۔ ''حلوا بڑے مزے کا ہے۔''

''قمرو کھانے بہت اچھے بناتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اور آپ......اور آپ کیا کیا اچھا کر لیتے ہیں؟'' چاندنی کے انداز میں بڑی شوخی تھی۔ صبح صبح اس کا مزاج بہت خوشگوار لگ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''پتا نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' وہ تیکھے انداز میں بولی۔ ''اپنی اچھائیوں کا پتا نہیں آپ کو؟''

میں کیا جواب دیتا، خاموش کھڑا رہا۔

چاندنی نے برگد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کتنا بڑا، کتنا گھنا پیڑ ہے۔ اس کی موٹی موٹی شاخوں میں جھولا ڈال کے جھولو تو کتنا مزہ آئے گا۔''

''نہیں جی۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس پیڑ پر کبھی جھولا نہیں پڑتا اور نہ ہی کوئی اس پر چڑھتا ہے۔''

''کیوں؟'' چاندنی نے فوراً سوال کیا۔

''پتا نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا۔'' چاندنی کہہ کے چپ ہو گئی۔ ہمارے بیچ خاموشی چھا گئی۔

ذرا دیر میں قمرو باورچی ایک ٹرے میں پراٹھے، تلے ہوئے انڈے اور رات کا قورمہ لے آیا۔ گرم گرم پراٹھوں کی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی۔

''میں ہاتھ دھولوں۔'' چاندنی اٹھی۔

''آیئے۔'' میں نے کہا اور ہینڈ پمپ کی طرف چلنے لگا۔

چاندنی نے ہاتھ دھوئے، کلی کی اور پھر اس نے چلو میں پانی بھرا اور میرے اوپر اچھال کے ہنسنے لگی۔

اس کی بچگانہ حرکت پر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک عجیب قسم کی مسرت تھی۔ آنکھوں میں شوخی بھری تھی۔ لب مسکرا رہے تھے اور سارے بدن سے جیسے مقناطیسی کشش پھوٹ رہی تھی۔

میں نے باورچی خانے کی طرف دیکھا، قمرو باورچی دروازے میں کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

''ہاں چلیں ناشتا کریں۔'' اس نے کہا اور چارپائی پر رکھی ہوئی ٹرے کی جانب بڑھ گئی۔

میں خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا چارپائی کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔

''آؤ تم بھی ناشتا کر لو۔'' اس نے بے تکلفی سے کہا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ''مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔''

''چلو ایک نوالہ ہی سہی۔'' اس نے پراٹھے کا لقمہ توڑا، اس میں انڈا لیا اور میری طرف بڑھایا۔

''نہیں جی۔'' میں تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔

''تو پھر میں بھی نہیں کھاتی۔'' اس نے نوالہ پلیٹ میں رکھ دیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

''اچھا۔'' میں نے بے بسی سے کہا اور ٹرے میں رکھا ہوا نوالہ اٹھا کے منہ میں ڈال لیا۔

''یہ کیا۔ مجھے کھلانا تھا نا۔'' وہ بچوں کی طرح ٹھنکی۔

''نوازے۔'' قمرو باورچی نے مجھے آواز دی۔

میں قمرو کی طرف بڑھ گیا۔

''اندر آ۔'' اس نے باورچی خانے میں جاتے ہوئے کہا۔

میں اندر چلا گیا۔

وہ چائے نکالنے لگا۔ اس نے چائے کپ میں ڈالی اور ایک چھوٹی ٹرے میں رکھ کے باہر چلا گیا۔ وہ چائے دے کے واپس آیا۔

میں نے پوچھا۔ ''تم نے مجھے کیوں بلایا تھا؟''

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، اندرونی دروازے سے شبنم نے جھانکا اور پوچھا۔ ''چاندنی کہاں ہے؟''

قمرو نے جواب دیا۔ ''بی بی صاحبہ باہر ناشتا کر رہی ہیں۔''

''اچھا۔'' شبنم نے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور ہمارے پاس سے گزر کے باہر چلی گئی۔

میں نے دوبارہ پوچھا۔ ''ہاں بتایا نہیں۔ کیوں بلایا تھا؟''

قمرو باورچی نے مجھے غور سے دیکھا پھر بولا۔ ''کیا نذرے کو بھول گیا؟ کیا زینو تجھے یاد نہیں رہی؟ یہ تو اس سے بھی بڑا جرم ہے...... ناقابلِ معافی۔ کیوں اپنی جان کا دشمن ہو رہا ہے؟'' اس کی آواز میں غصہ بھی تھا اور خوف بھی۔

''لیکن میں نے کیا، کیا ہے؟'' میں نے پوچھا اور قمرو کی طرف دیکھا۔

''آنکھیں چغلی کھاتی ہیں مگر چہرے کا رنگ سچ بولتا ہے۔'' قمرو نے کہا۔ ''مارا جائے گا۔ یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ تُو اس کی سزا بھی سوچ نہیں سکتا۔''

''پتا نہیں کیا، کیا بولے جا رہا ہے۔'' میں نے اکتاہٹ سے پوچھا۔ ''صاف صاف بول نا کیا کہنا چاہتا ہے؟''

''چاندنی بی بی چھوٹے سائیں کی منگ ہیں۔ اب تو شادی کی تاریخ بھی طے ہوگئی ہے۔ پھر تو کیوں سیاپے میں پڑ رہا ہے۔ چھوڑ دے یہ رستہ۔''

''پتا نہیں تیرے ذہن میں کیا کیا آجاتا ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''ہمارے بیچ کوئی بات نہیں۔''

''ہمارے بیچ؟'' قمرو باورچی نے حیرت سے دہرایا۔

''یہ تو اور چاندنی بی بی ہم کب سے ہوگئے؟ کچھ تیرا مغز تو نہیں پھر گیا۔ تو چریا تو نہیں ہوگیا؟'' قمرو باورچی نے دانت پیس کے مجھے گھورا۔

میں خاموش کھڑا رہا۔

قمرو باورچی نے کہا۔ ''یہ جو دل کی چوری ہوتی ہے نا یہ نظر سے پکڑی جاتی ہے۔ بڑے سائیں تو کیا کوئی بھی یہ غلطی معاف نہیں کرے گا۔ خود کو عذاب میں نہ ڈال۔''

دفعتاً میں جیسے پھٹ پڑا۔ میں نے غصے سے کہا۔ ''پھر میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ بھاگ جاؤں؟ میں نے خود سے کچھ نہیں کیا۔ میں نے کچھ نہیں کہا بس......''

''بے بس نہ بن۔'' قمرو باورچی نے کہا۔ ''تجھ سے بڑا ہوں۔ تیرے بھلے کو کہہ رہا ہوں۔ جو میں نے دیکھا ہے جو میں نے سنا ہے...... وہ سب نے دیکھ لیا، سن لیا تو قیامت آجائے گی۔''

''کیا دیکھ لیا تُو نے؟'' میں نے زچ ہو کے پوچھا۔

''رات میں تو چائے بنا کے انہیں پلاتا ہے اور ابھی جب وہ تیرے چہرے پر پانی اچھال رہی تھیں اور تو ہنس رہا تھا تو وہاں تم دونوں نہیں تھے۔'' وہ رک گیا اور مجھے دیکھنے لگا۔

''پھر کون تھا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ چاندنی بی بی نہیں تھیں۔ وہ زینو تھیں اور وہاں نوازے نہیں نذرا تھا۔ میں تو ڈر گیا۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔'' قمرو باورچی نے کہا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔

''زینو اور نذرے کا انجام ابھی چند دن پہلے ہی تو ہوا ہے اور تُو بھی وہی سب کرنے چلا ہے۔''

میں یک ٹک اسے دیکھنے لگا۔

قمرو باورچی نے دوبارہ کہا۔ ''آگے تُو سمجھدار ہے۔''

اس نے چولہے کی گیس کھولی، تیلی جلائی اور چولہا شوں شوں جلنے لگا۔

میں تھوڑی دیر کھڑا جلتی ہوئی آگ کو دیکھتا رہا پھر باہر آگیا۔

چارپائی خالی تھی۔ وہ دونوں دوسری طرف سے گھوم کے اندر حویلی میں چلی گئی تھیں۔ ناشتا چارپائی پر ایسے ہی پڑا ہوا تھا۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور پراٹھا توڑنے لگا۔ وہاں سے جہاں سے چاندنی نے لقمہ توڑا تھا۔ پراٹھا ٹھنڈا ہوگیا تھا مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے جہاں چاندنی کی انگلیاں لگی تھیں وہ حصہ گرم گرم سا ہو۔ میں نے لقمہ توڑا اور منہ میں ڈال لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے چاندنی مجھے نوالے بنا بنا کے کھلا رہی ہو۔

اچانک مجھے ہنسی کی آواز سنائی دی۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ ہنسی کی آواز دوبارہ آئی۔ میں نے سر اٹھا کے اوپر کی طرف دیکھا۔ کھڑکی میں چاندنی کا مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ہنسی اور پھر وہاں سے ہٹ گئی۔

میں نے چائے کی طرف دیکھا۔ چائے کا کپ آدھا تھا۔ میں نے کپ اٹھا لیا اور اندازے سے جہاں سے چاندنی نے چائے پی ہوگی، وہاں سے چائے کا ننھا سا گھونٹ بھرا۔ چائے کے کپ کا کنارہ چاندنی کے نرم ہونٹ بن گیا ہو۔ میں نے بچا کھچا ناشتا ختم کیا اور ٹرے ایک طرف سرکا کے چارپائی پر لیٹ گیا اور بازو کو موڑ کے آنکھوں پر رکھ لیا۔

'کیا میرے اور چاندنی کے درمیان کوئی رشتہ ہے؟' میں نے سوچا۔

'کہاں وہ...... کہاں میں۔ وہ آسمان...... میں زمین۔ وہ اونچی بلند...... میں تھلے۔ نیچے ہی نیچے۔'

''کتوں کو راتب نہیں ڈالا پھر سو گیا؟''

مجھے قمرو باورچی کی آواز سنائی دی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اسی طرح چپکا پڑا رہا۔ قمرو باورچی کتوں سے ڈرتا تھا اس لیے وہ کبھی کتوں کو راتب ڈالنے نہیں جاتا

تھا۔ حالانکہ میں نے اس سے کئی بار کہا تھا کہ کتے بندھے ہوتے ہیں، کچھ نہیں کرتے اور پھر جب تک سائیں کا اشارہ نہ ہو ایک قدم آگے نہیں بڑھاتے۔ مگر قمرو ہمیشہ یہی کہتا۔

''کتا تو کتا ہوتا ہے۔ خون ایک بار منہ کو لگ جائے تو پھر بعض اوقات اشارے کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔''

ذرا دیر بعد ہی کتے زور زور سے بھونکنے لگے۔ قمرو باورچی نے آکے میرے پیر کو ہلایا اور بولا۔ ''اٹھ جا، راتب ڈال دے انہیں۔ بے چین ہو رہے ہیں۔''

میں اٹھ گیا اور بنا کچھ کہے کتوں کو راتب ڈالنے چلا گیا۔

☆☆☆

حویلی میں بڑی رونق، چہل پہل تھی مگر یہ سب حویلی کے دوسرے حصے کی طرف تھی۔ ہم لوگ تو حویلی کے پیچھے والے حصے میں رہتے تھے۔ جہاں نہ بڑے سائیں اور نہ ہی تینوں چھوٹے سائیں آتے تھے۔ برسوں میں کوئی ادھر بھولے بھٹکے چکر لگا لیتا تھا اور وہ بھی جب کوئی کتا ایسا بیمار ہو جائے کہ چل نہ پائے تو کوئی نہ کوئی کتا پرسی کے لیے چکر لگا جاتا تھا۔ بڑے سائیں کو کتوں سے بڑا پیار تھا۔ ایک مرتبہ جب ان کا پسندیدہ کتا بیمار ہو گیا تھا اور مر رہا تھا تو اس کی حالت دیکھ کے بڑے سائیں نے منہ پھیر لیا تھا اور آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ میں نے تو انہیں سائیں سرکار کی رخصتی پر بھی دیکھا تھا۔ وہ بڑی مضبوطی سے خشک آنکھوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

بڑے سائیں بہت مضبوط دل کے مالک تھے۔ مضبوط دل اور سخت اصول...... جن پر وہ کوئی سمجھوتا کرنے کے قائل نہیں تھے۔

ہم سب کو دو دو جوڑے ملے تھے۔ چھوٹے سائیں کی خوشی جو تھی۔ اس لیے حویلی میں کام کرنے والے ہر شخص کو جوڑے ملے تھے اور ساتھ پانچ پانچ سو روپے بھی۔ علاقے بھر میں دیگیں بھر بھر کے کھلائی گئی تھیں۔ سب خوش تھے۔

برات روانہ ہونے والی تھی۔ فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج رہی تھی۔ سجی ہوئی گاڑیاں تیار تھیں اور کچھ ہی دیر میں روانہ ہونے والی تھیں۔ بڑے سائیں کی کالی والی بڑی گاڑی پھر اس کے پیچھے چھوٹے سائیں کی سجی بنی گاڑی پھر دونوں سائیں کی گاڑیاں...... پھر آس پاس کے زمینداروں، رقبے والوں کی گاڑیاں تھیں۔ ذرا دیر میں قافلہ شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں اور قمرو رہ گئے۔

قمرو کا لڑکا نصرو بولا۔ ''ابا! تم شہر نہیں گئے؟''

قمرو باورچی نے کہا۔ ''بھلا ہمارا وہاں کیا کام؟''

میں نے کہا۔ ''دلہن لے کے تو یہیں آئیں گے۔''

''اچھا۔'' نصرو نے خوش ہو کے کہا۔ ''میں دلہن دیکھوں گا۔''

''اچھا...... اچھا...... دیکھ لینا۔'' قمرو نے کہا اور مجھ سے پوچھا۔ ''کھانا کھائے گا؟''

''نہیں، دل نہیں چاہ رہا۔''

نصرو مالی کے لڑکے کے ساتھ پچھلے حصے میں کھیلنے چلا گیا۔

قمرو نے مجھ سے کہا۔ ''مجھ سے ناراض ہے کیا؟''

''بھلا میں کیوں ناراض ہونے لگا تم سے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں نے بتایا جو نہیں کہ بیبیاں جا رہی ہیں۔'' قمرو نے کہتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''بتا بھی دیتا تو کیا ہوتا۔'' میں نے ہنس کے کہا۔ ''کون سا میں انہیں روک لیتا۔''

قمرو نے کہا۔ ''تجھے پتا ہے تو بڑا سوہنا ہے۔''

''اب یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''تو جب مجھے سوہنا لگ سکتا ہے تو ناریوں کو سوہنا نہ لگے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پر یار...... زمین و آسمان مل نہیں سکتے۔ ہاں مٹی میں مٹی مل جاتی ہے۔ یار! ہم لوگ مٹی ہیں، مٹی کے برتن جو ٹوٹ جائیں تو کسی کو ذرہ برابر پروا نہیں ہوتی۔ تو مجھے بہت پیارا ہے بالکل نصرو کی طرح۔'' قمرو چپ ہو گیا۔

میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر ہنس دیا۔ مجھے اپنی ہی ہنسی کی آواز بہت عجیب لگی یوں جیسے میں اپنی ہی ہنسی اڑا رہا ہوں۔

''جاتے جاتے چاندنی بی بی نے تیرا پوچھا تک نہیں۔'' قمرو نے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

''میں وہاں کھڑا تھا۔ چاندنی بی بی کی والدہ نے حویلی میں کام کرنے والے سب کو دو، دو سو روپے دیے۔ شبنم بی بی، شازیہ بی بی نے مجھے سو، سو روپے دیے۔ پر چاندنی بی بی نے مجھے ایک روپیہ تک نہیں دیا۔ نہ کچھ بولیں۔ نہ میری طرف دیکھا۔ یوں جیسے مجھے جانتی ہی نہ ہوں۔ بس چلی گئیں۔''

''تو کیا ہوا؟'' میں نے تیزی سے کہا۔

''تم یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہو، میں کیا کروں اگر انہوں نے کچھ دیا نہیں...... کچھ کہا نہیں۔''

قمرو نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''وہ مجھے نہیں تیرے لیے تو کچھ کہہ سکتی تھیں۔ کوئی بات، کوئی پیغام، پر

یار......وہ......'' قمرو چپ ہوگیا۔
''پر کیا وہ؟'' مجھ سے رہا نہیں گیا، میں نے پوچھ لیا۔
''پر یار! ان سے تیری طرف بس دل پشوری تھی۔ ایسے ہی جیسے کوئی کھلونا اچھا لگا، دیکھا بھالا اور رکھ دیا واپس کارنس پر۔''
میں قمرو کی شکل دیکھتا رہ گیا۔
میں اور کر بھی کیا سکتا تھا؟
اچھا لگنا ایک دوسرے کو دیکھنا۔
کوئی وعدہ، کوئی قول، کوئی قرار تو نہیں ہوتا۔
پر پتا نہیں کیوں لگا کہ جیسے چاندنی حویلی سے کہیں نہیں گئی، شہر نہیں گئی، کہیں سے نہیں گئی۔ بس وہ ایک اداس سی تصویر بن کے میرے دل میں رہ گئی۔
مجھے کوئی گلہ، شکوہ نہیں ہوا کہ وہ اچانک چلی گئی اور مجھ سے ملی بھی نہیں۔ اس کا جانا تو طے تھا۔ وہ چھوٹے سائیں کی امانت تھی اور چھوٹے سائیں کی امانت کی طرف کیسے بری نگاہ، میلی نظر سے دیکھا جا سکتا تھا؟ لیکن میں نے تو کبھی چاندنی کو عورت سمجھ کے، جسم سمجھ کے دیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے تو بس اس کے بالوں سے اٹھتی ہوئی خوشبو ابھی تک اپنے نتھنوں میں محسوس ہوتی تھی۔ اس کی بے ساختہ ہنسی، چاند جیسا گول چہرہ، ناک میں پڑی سرخ موتی والی ننھی میری آنکھوں میں چمکتی رہتی تھی۔
قمرو چلا گیا تھا۔ میں چارپائی پر لیٹا ہوا آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ابتدائی دن تھے۔ چاند پوری طرح روشن نہیں تھا۔ چاندنی میلی میلی سی تھی۔
میں نے سوچا۔ 'چاندنی اس وقت کیا کر رہی ہوگی۔'
اچانک چاندنی کے عقب سے چھوٹے سائیں کا چہرہ کسی سیاہ گہرے بھاری بادل کی طرح نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ چاندنی سیاہ بادل کی اوٹ میں غائب ہوگئی۔
میں نے گہری سانس لی اور برگد کی طرف دیکھنے لگا۔ برگد چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کے پتے بھی خاموش تھے، یوں جیسے وہ بھی چاندنی کے چلے جانے سے اداس ہوں۔ میرا دل ایک عجیب سی کلساہٹ میں گھر گیا۔
مجھے بے چینی ہونے لگی۔ دفعتاً مجھے یاد آیا، قمرو کہہ رہا تھا۔ ''میں تو وہیں کھڑا تھا انہوں نے کچھ کہا ہی نہیں۔''
شاید قمرو کو پتا ہی نہیں چلا کہ چاندنی نے اس کے ذریعے سے مجھے کیا کہلایا ہے۔
اس نے کچھ نہیں کہا۔ کوئی سوال نہیں۔ کوئی جواب نہیں۔
اور جب کوئی سوال نہ ہو، کوئی جواب نہ ہو اور خاموشی ہو تو پھر اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے، انتظار......
خاموشی کی زبان سب کی سمجھ میں کہاں آتی ہے؟ قمرو کو پتا ہی نہیں چلا کہ چاندنی کا پیغام اس نے مجھ تک پہنچا دیا ہے۔ وہ تو بس یہی سمجھ رہا تھا کہ چاندنی مجھے ایک گڈا سمجھ کے کھیل کے چلی گئی ہے۔

☆☆☆

چار دن کے بعد سب واپس آگئے۔
بڑی دھوم دھام سے ولیمہ ہوا۔ آس پاس کے تمام گاؤں گوٹھ کے لوگ شریک ہوئے۔ کوئی ڈھائی تین ہزار کا مجمع ہوگا۔ مبارکبادیاں، سلامیاں، مصافحے، معانقے سب کی مبارکبادیں چھوٹے راشد سائیں بڑے تپاک سے وصول کر رہے تھے۔ رات بھر میں یہ جشن ختم ہوگیا اور پھر تین چار روز بعد صرف تذکرہ رہ گیا۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہوگیا۔
حسب معمول شادی کے گیارھویں دن نئی دلہن کی سواری تیار ہوگئی۔ دربار شریف روانگی کے لیے۔ بڑے سائیں کے دادا کا دربار کوئی دس بارہ کلومیٹر دور تھا اور روایت تھی کہ گاؤں گوٹھ کی ہر دلہن شادی کے گیارھویں دن وہاں سلام کرنے حاضر ہوتی تھی اور وہاں حسب توفیق نذرانہ پیش کیا جاتا تھا۔ میٹھے چاول تقسیم کیے جاتے تھے۔ اس رسم کی ادائیگی سے کسی کو بھی استثنا نہیں تھا۔ کمدار ہوں، مزارے ہوں یا حویلی کے افراد سبھی کے لیے حاضری لازمی تھی۔
سائیوں کی روحانی اور دنیاوی حکومت دونوں طرح جاری تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ بڑے دادا سائیں بہت اللہ والے تھے۔ گاؤں کے رسم و رواج جن کا منبع بڑی حویلی تھی، وہ چل بھی تو اپنے بزرگوں کے اصولوں پر رہے تھے۔ شاید بڑے لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی خاص درجے پر فائز ہوتے ہوں۔ تبھی تو بڑے سائیں کے قبرستان بھی اونچی جگہ پر تھے جہاں سے نیچے نشیب میں پانی آتا تھا۔ بڑی سرکاروں کے قدموں کے بوسے لیتا ہوا نیچے آکے مزارعوں کی قبروں کو تہس نہس کر دیتا تھا اور گاؤں، گوٹھ والے ہر سال نئے سرے سے اپنے پیاروں کی قبروں کو تازہ کرنے میں لگے رہتے تھے۔ اس سے کمی، کمداروں کو اپنی اوقات یاد رہتی اور ساتھ ساتھ مرنے والوں کے مرنے کی وجوہات کا اعادہ ہوتا رہتا تھا۔
صبح ہی صبح مجھے حکم ملا تھا کہ گاڑی تیار رہے، چاند بی بی کو سلام کرانے کے لیے لے جانا ہے۔ میں خاموشی سے گاڑی کے پاس آکے باادب کھڑا ہوگیا۔ فیکے کمدار نے مٹھائیوں کے ٹوکرے ڈکی میں رکھے۔ چند اپھولوں کی چادر

لے آئی اور دروازہ کھول کے کھڑی ہوگئی۔

ذرا دیر میں سرخ چادر اوڑھے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی چاندنی آئی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی چندا بھی بیٹھ گئی۔ میں کھڑا رہا۔

چندا بولی۔ ''اب چلو بھی۔ بت کی طرح کھڑے کیوں ہو؟''

میں نے کہا۔ ''چھوٹے سائیں کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ ساتھ چلیں گے نا؟'' میں نے روایت کے مطابق پوچھا کیونکہ شادی کے بعد پہلی حاضری کے لیے میاں بیوی دونوں ہی جاتے تھے۔

''لو جی، بھلا چھوٹے سائیں کو وہاں تک جانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو ان کے پرکھے ہیں۔ خون کا رشتہ ہے جی۔ سلام کے لیے فاصلے تھوڑی ہوتے ہیں۔''

میں خاموش رہا اور جا کے گاڑی اسٹارٹ کر لی۔

چندا پھر بولی۔ ''تمہیں تو پتا ہی ہے کہ چھوٹے سائیں ظہر کے بعد ہی اٹھتے ہیں۔ ماں جی نے کہا کہ آج گیارھواں دن ہے۔ زوال سے پہلے حاضری ضروری ہے۔''

''اچھا......'' میں نے پیچھے دیکھنے والا شیشہ ٹھیک کیا، اس کا رخ ذرا سا موڑا۔ مجھے اس میں چاندنی کی آنکھیں نظر آئیں۔ میں چونک گیا۔

چاندنی کی آنکھیں خالی تھیں۔ اداس تھیں۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ چاندنی کا چہرہ اداسی کے ہالے میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ چند دن پہلے والی چاندنی تو نہیں تھی۔

اچانک چندا نے کہا۔ ''سامنے تو دیکھو۔''

''دیکھ ہی تو رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور نظروں کا زاویہ بدل کے سامنے دیکھنے لگا۔

چندا نے کہا۔ ''ہماری چاند بی بی پر دلہن بن کے ایسا روپ چڑھا کہ دنیا تو دیوانی ہوئی ہوگی، اپنے چھوٹے سائیں تو نظر پڑتے ہی حواس گم کر گئے ہوں گے۔ ہے نا۔'' چندا نے یہ کہتے ہوئے چاندنی سے اپنی بات کی تصدیق چاہی۔

چاندنی کچھ نہ بولی بس آئینے میں دیکھ کر رہ گئی۔ چند لمحوں کے لیے ہماری نگاہیں ملیں اور پھر بھٹک گئیں۔

چندا مسلسل بولے جا رہی تھی۔

''چاند بی بی آپ کو پتا ہے جہاں ہم جا رہے ہیں وہ بڑے سائیں کے دادا کا دربار شریف ہے۔ ادھر ہر مراد پوری ہو جاتی ہے۔ بس جی دل سے مانگنے کی دیر ہوتی ہے۔ کنواریاں اپنے بر مانگنے کی دعائیں وہیں کرتی ہیں۔ سہاگنیں جب بھی جاتی ہیں مراد پوری ہوتی ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ادھر سے کوئی بغیر پھلے واپس آیا ہو۔''

''اچھا......'' چاندنی نے دھیرے سے پوچھا۔ ''تم کیا مانگو گی......؟''

''میں......'' چندا نے شیشے میں مجھے دیکھ کر کہا۔ ''ایک پتھر کو انسان بنانے کی مانگ کروں گی۔''

''پتھر انسان نہیں بنتے وہ تو بس دوسروں پر برستے ہیں۔'' میں نے چندا سے کہا۔

چاندنی نے میری بات سن کے آئینے میں دیکھا۔ اس کی گہری سیاہ شفاف آنکھیں جیسے اداسی کی دلدل بنی ہوئی تھیں۔

مجھے لگا جیسے اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کے آنسو بھرے ہوئے ہیں۔

چندا بولی۔ ''چاند بی بی آپ تو کچھ بول ہی نہیں رہیں۔ بس میں ہی بولی جا رہی ہوں۔ آپ کیا مانگیں گی ادھر؟''

چندا نے کہہ کے چاندنی کی طرف دیکھا اور خود ہی اپنے دونوں گال نوچ لیے۔

''توبہ توبہ میں بھی کتنی پاگل ہوں، بھلا آپ کو کیا اور کس چیز کی کمی...... آپ کے ایک اشارے پر چاند ستارے دوڑے چلے آئیں گے۔''

''ایسا نہیں ہوتا۔'' چاندنی نے شیشے میں دیکھ کے کہا۔ ''کبھی کبھی سب کچھ ملنے کے بعد بھی انسان کی اتنی بھی حیثیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی مرضی سے ایک گڈا ہی لے سکے۔''

''ہائے میں مر جاواں۔'' چندا نے بے ساختہ اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔

''بھلا ایک گڈا آپ نہ لے سکیں، کیا وہ بہت مہنگا تھا۔ بہت دور تھا۔ کسی نے پہلے خرید لیا تھا۔ آپ پھر بھی اس سے مانگ لیتیں، بھلا آپ کو کون انکار کر سکتا تھا۔''

''اس کی قیمت بہت زیادہ تھی۔'' چاندنی نے دھیرے سے کہا اور شیشے کے باہر دیکھنے لگی۔

ہم تھوڑی دیر میں دربار شریف پہنچ گئے۔ وہاں پہلے سے اطلاع دے دی گئی تھی۔ تمام زائرین کو دربار شریف والے کمرے سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ میں اور چندا، چاندنی کو لے کے باہر نکلے۔ چاندنی سرخ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ بلند مزار شریف تک جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔

چاندنی آگے، اس کے پیچھے چندا اور اس سے ایک قدم پیچھے میں تھا۔ اچانک چاندنی لڑکھڑائی، اس کا پیر چادر میں الجھ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا کہ جیسے وہ گر جائے گی۔ میں نے لپک کے اسے سہارا دیا۔ وہ گرنے سے

بچ گئی مگر اس کا پیر بُری طرح مڑ گیا تھا۔
''میں ٹھیک ہوں......'' چاندنی نے چندا کا ہاتھ تھاما اور آہستہ آہستہ دوبارہ سیڑھیاں چڑھنے لگی مگر اس کے چلنے کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سخت تکلیف میں ہے۔
اندر پہنچ کے چاندنی نے پھولوں کی چادر کو ہاتھ لگایا۔ میں نے اور چندا نے مل کے مزار پر چادر چڑھائی۔ چاندنی نے سرہانے رکھا ہوا دیا روشن کیا، اگر بتیاں جلائیں اور فاتحہ پڑھنے لگی۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ الٹے پیروں باہر نکل آئے۔
نیچے سیڑھیوں کے پاس بڑی سی کرسی رکھی جا چکی تھی۔ اس وقت دربار شریف کے احاطے میں کوئی مرد موجود نہیں تھا۔ سوائے مولوی شفاعت کے جو جدی پشتی دربار شریف کی خدمت پر مامور تھا۔
میں نے ڈکی میں سے مٹھائیوں کے ٹوکرے نکالے اور چاندنی کے پاس لا کے رکھ دیے۔ چاندنی نے اس میں سے مٹھائی نکال کے تقسیم کرنا شروع کر دی۔ عورتیں اور بچے لپک لپک کر مٹھائی لے رہے تھے۔ چاندنی نے اپنا پرس کھولا اور چاندی کا کوئی چھٹانک بھر کا سکہ مولوی شفاعت کو دربار شریف کے لیے پیش کیا اور ساتھ میں پانچ ہزار روپے، مٹھائی کا بڑا ڈبا اور کپڑوں کا ایک جوڑا بھی دیا۔
پھر اس نے سو روپے کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور وہاں جمع عورتوں اور بچوں کو دینے لگی۔ تھوڑی دیر میں مٹھائی اور پیسوں کی تقسیم مکمل ہو گئی اور ہم لوگ واپسی کے لیے چل دیے۔
راستے میں چاندنی کے پیر کی تکلیف بڑھ گئی۔
چندا نے دیکھ کے کہا۔ ''ارے یہ تو سارا سوج گیا۔ لائیں میری گود میں پیر رکھیں، میں مالش کر دیتی ہوں۔''
چندا نے چاندنی کا پیر اٹھا کے اپنی گود میں رکھ لیا۔ چاندنی نے ذرا پچھلی کے دروازے سے ٹیک لگا لی۔ میں نے شیشے میں دیکھا، وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔
''گرمی لگ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔
چندا فوراً بولی۔ ''دیکھو راستے میں دکان پڑے گی۔ ٹھنڈی بوتل لے لو، میں ساتھ پانی رکھنا ہی بھول گئی۔''
''میں ابھی لیتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔
ذرا دور جا کے میں نے دکان سے بوتلیں لیں اور گاڑی میں واپس آ گیا۔ چاندنی نے بوتل سے منہ لگا کے چند گھونٹ لیے اور پوچھا۔ ''کیا راستے میں آموں والا باغ پڑے گا؟''
''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''دل چاہ رہا ہے۔ ذرا سی چہل قدمی کا، کھلی ہوا کا۔''
اس نے کہا اور بوتل مجھے پکڑاتے ہوئے دیکھا۔
میں نے بوتل منہ سے لگائی اور خالی کر دی۔ مجھے خالی بوتل رکھتے دیکھ کے چاندنی مسکرائی اور باہر کی طرف دیکھنے لگی۔
تھوڑی دیر بعد میں نے گاڑی باغ کی سمت موڑ لی۔ ڈیرے پر صرف نسیمہ کمدار ہی تھا۔ چندا اور چاندنی کو دیکھ کے اس نے چار پائیاں بچھائیں اور سر جھکا کے باہر نکل گیا۔
چندا نے سہارا دے کے چاندنی کو چار پائی پر بٹھایا اور اس کا پیر دیکھنے لگی۔ پیر خاصا سوجا ہوا تھا۔
چندا نے کہا۔ ''تم کیوں نہیں پتے مل دیتے بی بی جی کو؟''
''کیا مطلب؟'' میں نے گڑبڑا کے پوچھا۔
''کیا......کون سے پتے؟'' نیم دراز چاندنی نے میری طرف دیکھا۔
''پتا نہیں مگر اس کو جڑی بوٹیوں کا پتا ہے۔ ادھر حکیم صاحب کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ دو مرتبہ اماں کے پیر کی موچ اس نے منٹوں میں ٹھیک کر دی تھی۔''
''تو پھر میری بھی موچ ٹھیک کر دو حکیم صاحب۔'' چاندنی نے کہتے ہوئے میری طرف دیکھا۔
میں نے کہا۔ ''میں کوئی حکیم شکیم نہیں، بس حکیم جی نے دو چار ٹوٹکے بتا دیے ہیں۔''
''اچھا تو وہی سہی۔'' چاندنی مسکرائی۔
''جا اب نخرے مت کر۔ بڑی اماں کو پتا چل گیا نا کہ چاند بی بی کو تکلیف تھی اور تو منہ پھیرے کھڑا رہا تو پھر دیکھنا کیسے جوتے پڑیں گے۔''
''بس بس......'' چاندنی نے ہاتھ اٹھا کر چندا کو مزید بولنے سے روکا اور میری طرف دیکھ کے بولی۔ ''اگر چاہو تو کر دو مالش۔''
''جی بہتر......'' میں نے جواب دیا۔
میں نے باہر آ کے ڈیرے کے پاس سے چند مخصوص پتے لیے اور انہیں لے کر واپس آ گیا اور چار پائی کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ چاندنی نے اپنا پاؤں اٹھا کے میری گود میں رکھ دیا۔
اس کے پیروں میں پائل پڑی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں بے حد سفید اور گدرائے گدرائے سے تھے۔ ٹخنے سے نیچے گوری شفاف کھال میں سے پھولی ہوئی نیلی رگیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے دھیرے سے اس کے پاؤں پر ہاتھ رکھا۔
اس کا پیر کپکپا گیا۔
یا شاید میرا ہاتھ کانپ گیا تھا۔

میں نے اس کی انگلیوں کو مضبوطی سے ایک ہاتھ کی مٹھی میں پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے ایڑی کو سہلایا۔

میں نے چاندنی کے چہرے کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں بند تھیں اور پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔

میں نے اچانک پاؤں کو جھٹکا دیا۔ چاندنی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنا پاؤں کھینچنے کی کوشش کی مگر وہ میرے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں تھا۔ وہ کسمسا کے رہ گئی۔

چند لمحوں میں تکلیف کم ہوئی تو میں نے اس کے پاؤں کو چھوڑا اور دونوں ہاتھوں میں لائے ہوئے پتوں کو زور زور سے مسلا۔ پتوں میں سے پانی نکل آیا۔ میں نے پتوں کا رس دھیرے دھیرے پیر پر ملنا شروع کر دیا۔ ذرا سی دیر میں تکلیف ختم ہوگئی اور معمولی سی سوجن باقی رہ گئی۔

چاندنی آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹی تھی۔ اس کا سر چندا کی گود میں تھا۔ میں دھیمے دھیمے پاؤں سہلا رہا تھا۔ یوں جیسے نرم ریشم کو چھو رہا ہوں۔ جیسے نئی کپاس کے تازہ تازہ ڈوڈے سے روئی کے ریشم، نرم تاروں کو چھو رہا ہوں۔

اچانک میں نے چندا کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بڑی گہری چمک تھی۔ جیسے اس نے کسی راز کو کھوج لیا ہو۔ میں نے جلدی سے نظریں ہٹائیں اور دھیمے سے چاندنی کا پاؤں اپنی گود سے اتار کے کھڑا ہوگیا۔

چندا نے دھیمے سے کہا۔ ''چاندنی بی چلیے۔''

چاندنی نے آنکھیں کھولیں، اس کی نگاہیں سیدھی مجھ پر پڑیں۔ اس نے نظریں گھما کے چندا کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''ہاں چلو۔ رکنے کا فائدہ بھی کیا۔''

''ہاں جی۔'' چندا نے کہا۔ ''جانا تو پڑتا ہے۔'' اس کا انداز کچھ عجیب سا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا مگر وہ چاندنی کی طرف متوجہ تھی۔

ہم واپس آگئے۔ چندا، چاندنی کو سہارا دے کر اندر لے گئی۔ میں واپس اپنے حصے میں آگیا۔

قمرو باورچی اپنے کام میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ''آگئے تم۔ صبح ہی چلے گئے تھے۔ اگر کچھ کھانے کو جی چاہ رہا ہے تو بتادو؟''

''ابھی کچھ دل نہیں چاہ رہا۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا بات ہے، تیرے چہرے کا رنگ کیوں پھیکا پڑا ہوا ہے۔ سب خیر تو ہے نا؟'' قمرو باورچی نے میری طرف غور سے دیکھ کے پوچھا۔

مجھے اس کی باتوں سے الجھن ہونے لگی۔ میرا اس وقت کسی سے بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بس چپ چاپ اکیلا رہنا چاہ رہا تھا۔

''بولتے کیوں نہیں۔'' قمرو باورچی نے دوبارہ پوچھا۔

''کیا بولوں، کیا بتاؤں، کیا سننا چاہتے ہو؟ ایک بار میں ہی بتادو؟'' مجھے غصہ آگیا۔

قمرو باورچی نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''چل نہیں بولتا تو اتنا او کھانہ ہو۔''

وہ چپ ہو کے ہانڈی میں چمچ چلانے لگا۔

میں اپنی کوٹھری میں آگیا اور چارپائی پر بیٹھ کے اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ ہاتھوں میں ابھی تک پتوں کی رنگت باقی تھی۔ اس میں سے مہک آرہی تھی اور ہاتھوں میں ابھی تک چاندنی کے حرارت بھرے پیر کا لمس باقی تھا۔

میں چپ چاپ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ میرے تصور میں چاندنی کے پاؤں تھے۔ خوبصورت، نرم و گداز، سپید پاؤں...... نیلی رگوں والے۔

مجھے یوں لگا کہ جیسے میں نے چاندنی کے پاؤں نہ چھوئے ہوں زندگی کا صلہ پالیا ہو۔ تب پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ چاندنی میری زندگی کا حصہ ہے اور میں اس کے بغیر جی نہیں سکتا لیکن یہ بھی تو سچ تھا کہ چاندنی اب بہت دور تھی۔

اور اب بھی کیا؟ وہ تو ہمیشہ ہی سے میری دسترس سے باہر تھی۔

جیسے چاند سب کا ہوتا ہے مگر کسی کا نہیں۔

اور چاندنی تو چھوٹے راشد سائیں کی چاندنی تھی۔

بھلا حویلی میں ہم جیسوں کا کیا گزر۔

میں تو بس ان کے پاؤں کی خاک بن کے رہ جاؤں تو یہی بہت ہے۔

ان کی راہ گزر میں پڑا رہوں اور کبھی کبھی جب وہ اپنے نرم و سپید گداز پاؤں سے مجھ پر چلتی ہوئی گزریں تو میں دھول کی صورت ان کے قدموں سے لپٹ جاؤں اور......

''سو رہے ہو کیا؟'' کسی نے میرا کندھا ہلاتے ہوئے پوچھا۔

میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا، چندا میرے پاس کھڑی تھی۔ میں اٹھ گیا۔ وہ میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

''کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا بات ہے، اتنا اکھڑا اکھڑا کیوں بول رہا ہے؟'' چندا نے میرے لہجے کی تلخی کو محسوس کر لیا۔

''کچھ نہیں، سو رہا تھا تو نے جگا دیا۔'' میں نے اسے گھورا اور اس سے کھسک کے ذرا دور ہوگیا۔

''سو رہا تھا یا خواب دیکھ رہا تھا؟'' چندا ہنسی اور پھر

سے میرے پاس چپک کے بیٹھ گئی۔
''پرے ہو۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''کتنی بار کہا ہے کہ انسانوں کی طرح بیٹھا کر۔''
''تو کیا میرے کانٹے ہیں جو تجھے چبھتے ہیں۔ چاند بی بی کے پیروں کی تو ایسے مالش کر رہا تھا جیسے پھولوں کو سنبھال رہا ہو۔'' وہ چیخ کے بولی۔
''بکواس مت کر۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''تُو نے ہی تو کہا تھا مالش کر دے۔ میں نے کہا تھا کیا؟''
چندا ہنسنے لگی اور بولی۔ ''میں نے مالش کرنے کو کہا تھا، دل وارنے کو نہیں۔ ایسے مالش کر رہا تھا جیسے پھولوں کو سہلا رہا ہو۔ میں دیکھ رہی تھی تیری آنکھیں کیسی نشیلی ہو گئی تھیں۔''
''تیرا دماغ چل گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تیری عقل ماری گئی ہے۔''
''ہاں۔ میری عقل ماری گئی ہے۔ نوازے! جو عورت پیار کرتی ہو، اس کی زبان نہیں آنکھیں بولتی ہیں۔ سانسوں کا اتار چڑھاؤ بولتا ہے۔''
''ہاں، تجھے تو عشق کے بڑے تجربے ہیں نا۔'' میں بُری طرح چڑ گیا۔ شاید چوری پکڑنے پر ہر بندہ ایسے ہی چڑتا ہو۔
''مجھے تو بس ایک ہی سے پیار ہوا ہے پر وہ ظالم ہے، مانتا ہی نہیں۔'' چندا نے قہقہہ لگایا۔
''کون؟'' میں نے بے دھیانی میں پوچھا۔
''تم......'' اس نے کہا اور میرے کندھے پر سر لگا دیا۔
میں چند لمحے خاموش بیٹھا رہا پھر میں نے دھیمے سے اس کا سر ہٹایا اور کہا۔ ''مجھے نہیں ہوتا ہے پیار۔''
''اچھا؟'' چندا پیچھے ہٹی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی۔ ''اچھا...... تجھے نہیں ہوتا پیار۔ مجھ سے نہیں، کسی سے بھی نہیں؟''
''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔
''اچھا......'' چندا مسکرائی اور بولی۔ ''کھا قسم چاند بی بی کی۔ تجھے پیار نہیں ہوتا؟''
میں چندا کی شکل دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ گال تمتما رہے تھے۔ یوں بالکل جیسے کوئی بہت بڑے راز کو کھوج لیا ہو۔
''تجھے پتا ہے نا میں قسمیں نہیں کھاتا۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے خود کو سچا ثابت کرنے کی...... اور پھر چاندنی کا یہاں کیا ذکر؟''
''چاندنی کا......؟'' چندا کا چہرہ جیسے ایک دم بجھ گیا۔

''اتنی اپنایت...... اتنا مان...... اتنی گہرائی...... نہ چاند بی بی...... نہ بی بی جی...... صرف چاندنی؟''
میں چپ رہا۔
بعض اوقات صرف ایک لفظ ساری قلعی کھول دیتا ہے۔ سارا ملمع اتار دیتا ہے اور پھر چوری پکڑی جائے، وہ بھی رنگے ہاتھوں تو پھر کیا تاویل پیش کی جا سکتی ہے؟
میں چپ کا بیٹھا رہا۔ چندا تھوڑی دیر مجھے دیکھتی رہی پھر اٹھ کے چلی گئی۔

☆☆☆

اس سے پہلے حویلی کی طرف سے کبھی شور کی آوازیں نہیں آتی تھیں۔ دونوں بڑے بھائیوں کی بیگمات اتنی خاموش رہتی تھیں کہ جیسے وہ ہوں ہی نہ۔ دونوں بھائیوں کے دو، دو لڑکے تھے اور چاروں ہی معذور۔ پیدائش کے چند سالوں کے بعد ہی اتنے کمزور ہو جاتے تھے کہ ان کا چلنا پھرنا محال ہو جاتا تھا۔ دنیا جہان کے علاج کے باوجود ان کی حالت نہیں سنبھلی تھی اور عملاً وہ معذوروں والی زندگی گزار رہے تھے۔
اماں جی کی تسبیحات، ذکر و اذکار سب خدا کی مصلحت کے آگے خاموش تھے۔
اڑتی اڑتی خبر سنی تھی کہ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ ایسی معذوری طویل عرصے سے ایک ہی خاندان میں شادی کے باعث ہے۔ اب اگر شادی کریں تو خاندان سے باہر کریں۔
دونوں بھائیوں نے دو، دو شادیاں کیں مگر ان میں سے کسی کو کوئی بچہ نہ ہوا اور اب وہ بیبیاں حویلی کے ایک حصے میں رہتی تھیں۔ باحفاظت پرانے سامان کی طرح کیونکہ خاندان میں طلاق یا علیحدگی کا کوئی تصور نہ تھا۔ ہاں، خودکشی کا رواج ضرور تھا۔ بڑے سائیں کے دونوں بھائیوں نے نامعلوم وجوہات کی بنا پر یکے بعد دیگرے خودکشی کر لی تھی۔ ان کی دونوں بیوائیں بھی حویلی میں مقیم تھیں۔ دونوں بھائی بے اولاد تھے اس لیے تمام جائداد کے اکلوتے وارث بڑے سائیں تھے۔
حویلی کی ہوائیں سرگوشیاں کرتی رہتی تھیں مگر ان ہواؤں کو پھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔
ہاں جب سے چاندنی اس حویلی میں آئی تھی، یوں لگتا تھا کہ حویلی کی سونی فضا میں ارتعاش پیدا ہو گیا ہے۔
کبھی باتوں کی آواز، کبھی ہنسنے کی آواز، کبھی راشد سائیں کی غصہ بھری آوازیں آنے لگی تھیں۔
راشد سائیں گھڑ دوڑ کے شوقین، کتوں کے رسیا اور

خوش بدن عورتوں کے خوشہ چیں تھے۔ ان کا ڈیرا گوٹھ کے باہر واقع تھا۔ جہاں ان کی من پسند سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ وہ اپنے معمول کے مطابق شام ہوتے ہی ڈیرے پر نکل جاتے تھے پھر ان کی واپسی رات گئے ہوتی تھی۔ پھر وہ دوپہر تک سوئے رہتے تھے۔ حویلی میں مردوں کی کسی سرگرمی پر پابندی نہیں تھی۔ یہ بزرگوں کے شوق تھے جو نسل درنسل منتقل ہوتے تھے اور مقبول ہو کر رواج بن گئے تھے لیکن چاندنی ان رواجوں کی عادی نہیں تھی۔

اس کو مکمل توجہ اور مکمل سپردگی چاہیے تھی جو میسر نہیں تھی۔ شاید راشد سائیں بے ثمر گھنا برگد تھے۔

☆☆☆

شادی کو دوسرا برس لگ گیا تھا۔ اماں جی نے پھر حکم دیا کہ دربار شریف جاؤ اور اس مرتبہ منت مانگ کے آنا۔ لہٰذا پھر میری ڈیوٹی لگی اور میں چاندنی کو لے کر روانہ ہو گیا مگر اس مرتبہ ہمارے ساتھ چندا نہیں تھی بلکہ خالہ نوراں تھی جس کو افیم کھانے کی لت تھی اور وہ اسی میں مست رہتی تھی۔

حویلی سے ذرا دور نکلتے نکلتے نوراں گاڑی کی سیٹ سے گردن ٹکا کے بے خبر ہو گئی۔

میں نے آئینے میں دیکھا۔ چاندنی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیسے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''لوگ کہتے ہیں کہ دربار جا کے مرادیں پوری ہو جاتی ہیں مگر میری تو کوئی مراد پوری نہیں ہوئی۔''

''اللہ پر بھروسا رکھیں۔ ضرور کرم ہوگا۔'' میں نے تسلی دی۔

''اچھا۔'' اس نے مضمحل مسکراہٹ سے کہا۔

میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا، اس کے چہرے پر بڑی تھکان تھی۔ یوں جیسے گاڑی میں نہ ہو پیدل چلتی چلی آ رہی ہو۔

ہمارے درمیان خاموشی حرکت کرتی رہی۔

ہم لوگ دربار پہنچے۔ وہی خوشبو، اگربتی، جوڑے، مٹھائی اور روپوں کی تقسیم اور پھر واپسی۔ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ واپسی میں چاندنی نے کہا۔

''پھر وہی موسم ہے جب پہلی بار آئے تھے۔ تب آم کچے تھے۔ کیا اب بھی وہ کچے ہوں گے؟''

میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

''آپ باغ جانا چاہتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''میں نے اس مرتبہ منت مانی ہے۔''

''اچھا کیا؟'' میں نے سر ہلایا اور گاڑی کا رخ آم والے باغ کے ڈیرے کی طرف کر دیا۔

نوراں نے کہا۔ ''چلو اچھا ہوا باغ کا چکر لگا لیا۔ میں تھوڑی کیریاں لے لوں گی آم کے اچار کے لیے۔ اب تو چاند بی بی کو اچار کی ضرورت پڑے گی۔ دیکھ لینا حاضری خالی نہیں جائے گی۔'' وہ پوپلے منہ سے ہنسنے لگی اور پھر بولی۔ ''نوازے! مجھے کیریاں توڑ دینا، بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں ذرا کمر ٹکا لوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

ڈیرے پر ہماری گاڑی دیکھتے ہی کمدار نے چارپائیاں بچھائیں، میز رکھی اور سر جھکا کے چلا گیا۔

نوراں فوراً ہی چارپائی پر پسر گئی اور بولی۔ ''جا بھئی میرے لیے کیریاں توڑ لا۔''

''اچھا۔'' میں نے کہا۔

''میں بھی چلتی ہوں۔'' چاندنی نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہم دونوں نے بہت سارے کچے آم توڑے اور پلنگ پر لا کے ڈھیر کر دیے۔

''تھک گئی ہوں۔'' چاندنی نے کہا۔

''چائے بنا دوں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں بن جائے گی؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔ ڈیرے پر اب سب انتظام ہوتا ہے۔ بلکہ اب تو بڑے سائیں نے ادھر بجلی بھی لگوا دی ہے۔ فریج بھی رکھوا دیا ہے۔ اس میں ٹھنڈی بوتلیں موجود ہوتی ہیں۔ سلنڈر والا چولہا بھی ہے۔ سائیں جب بھی ادھر کا چکر لگاتے ہیں تو سب چیزیں موجود ہوتی ہیں۔''

''اچھا۔'' چاندنی نے مسکرا کے کہا۔ ''تم سب کی خبر رکھتے ہو؟''

''ہاں جی۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''اور میری خبر؟'' اس نے ایک دم پوچھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ براہ راست میری آنکھوں میں۔

میں نے گڑبڑا کے کہا۔ ''میں آپ کے لیے چائے بناتا ہوں۔''

میں ڈیرے میں آ گیا اور چائے بنانے لگا۔ ذرا دیر میں چائے بن گئی۔ ابھی میں نے چائے پیالوں میں نکالی ہی تھی کہ چاندنی آ گئی۔

"آپ یہاں؟"
"کیوں، یہاں آنا منع ہے کیا؟" اس نے مسکرا کے پوچھا۔
"جی آپ ہی کا ڈیرا ہے۔ آپ مالک ہیں۔" میں نے فوراً جواب دیا۔
ہم دونوں کمرے میں بیٹھ گئے۔
"چائے بہت اچھی ہے۔" چاندنی نے کہا۔
میں چپ رہا۔
چاندنی نے کہا۔ "تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟"
"کیا کہوں؟" میں نے دھیرے سے پوچھا۔
"یہی کہ مجھ پر کیا گزری اور کیا گزرتی ہے؟" اس نے کہا اور میری طرف دیکھا۔
"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"نہیں سمجھو گے۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "خاندان کو ایک صحت مند وارث کی ضرورت ہے۔" وہ پھر چپ ہوگئی۔
"کیا مطلب؟" میں نے الجھن سے پوچھا۔
"زمین جتنی بھی زرخیز کیوں نہ ہو، بغیر بیج کے اناج پیدا نہیں کرسکتی۔" اس نے کہا اور اپنا رخ موڑ کے دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر گہری اداسی تھی جیسے وہ خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہی ہو۔
ہمارے درمیان خاموشی چھائی رہی۔
تھوڑی دیر بعد چاندنی نے کہا۔ "میں نے آج منت مانی ہے۔" وہ چپ ہوگئی اور زمین کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی لمبی انگلیاں ایک دوسرے میں الجھ رہی تھیں۔
"کیا؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔
"اگر میں کچھ مانگوں تو وہ مجھے مل جائے۔" چاندنی نے دھیرے سے کہا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

خالہ نوراں اماں جی کے لیے دودھ لینے آئی تو مجھے دیکھتے ہی ہنسنے لگی۔
میں نے پوچھا۔ "کیوں ہنس رہی ہو؟"
"مجھے کچے آموں کا اچار بنانا تھا مگر چاند بی بی تو سارے کے سارے کچے آم ہی کھا گئیں۔" وہ پھر ہنسنے لگی۔
"تو کیا ہوا، میں اور لا دیتا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔
"میں نہ کہتی تھی کہ وہاں مراد ضرور پوری ہوگی...... اور دیکھ لو پوری ہوگئی۔" خالہ نوراں نے ہنستے ہوئے کہا اور دودھ کا برتن لیے واپس چلی گئی۔
میں چارپائی پر بیٹھا ناشتا کر رہا تھا۔ نوراں .... کی بات پر غور کرتے ہوئے میں بہت دور تک چلا گیا تھا...... دل کی عجیب حالت ہوگئی تھی۔ میں بہت مشکل دوراہے پر کھڑا تھا شاید...... اتنے میں چندا آگئی۔
"آ جا روٹی کھا لے۔" میں نے چندا کو دعوت دی۔
"صرف روٹی۔" وہ ہنسی۔
"تو اور کیا؟" میں نے ہنس کے کہا اور گلاس اٹھا کے پانی پینے لگا۔
"تجھے پیاس نہیں لگتی؟" چندا نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔
"پانی ہی تو پی رہا ہوں۔" میں نے گلاس رکھتے ہوئے جواب دیا۔
"پیاس خالی پانی ہی سے تو نہیں بجھتی، کچھ اور بھی چاہیے ہوتا ہے پینے کے لیے۔" چندا نے کہا۔ "نہ جانے تو اتنا سنگ دل کیوں ہے۔"
"پھر شروع تیری بک بک۔" میں نے اسے ڈانٹا۔
"تو باز نہ آنے کی۔"
"میں بھی تو پانی ہوں۔ ٹھنڈا بھی، میٹھا بھی، گرم بھی، شرار بھی۔" اس نے دھیرے سے کہا اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھا۔
اس کا ہاتھ بے حد گرم تھا۔
"چندا......" میں نے دھیرے سے اس کا ہاتھ ہٹایا اور کہا۔ "تو بہت اچھی ہے پر جس نے آبِ حیات پی لیا ہو، اس کو کسی اور چشمے کے پانی کی ضرورت نہیں رہتی۔"
"کیا مطلب؟" اس نے بڑے کڑوے انداز میں میری طرف دیکھا۔
"تم نہیں سمجھوگی۔" میں نے دھیرے سے کہا اور اوپر کی طرف دیکھا۔ کھڑکی کا پٹ بند تھا۔
کچھ راستے دوبارہ چلنے کے لیے نہیں ہوتے۔ کچھ تعلق تجدید سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ بس سنبھالنے ہوتے ہیں۔ دل کی کوٹھری میں چھپا کے رکھنے کے لیے۔ محبت میں کوئی احسان نہیں ہوتا، کوئی ادلا بدلا نہیں ہوتا۔
محبت تو بس چاندنی میں دھیمے دھیمے بھیگنے کا نام ہے۔ جب تھک جاؤ تو بہت ساری امیدوں اور خوابوں کے قافلے میں پڑاؤ ڈالنے کا ایک خوبصورت احساس ہے جو اس سفر کو جاری رکھنے کے لیے پھر سے مہمیز کر دیتا ہے اور سفر پھر سے جاری ہو جاتا ہے شاید معجزے بھی تو ایسے ہی سفر میں ہوتے ہیں۔

✖✖✖